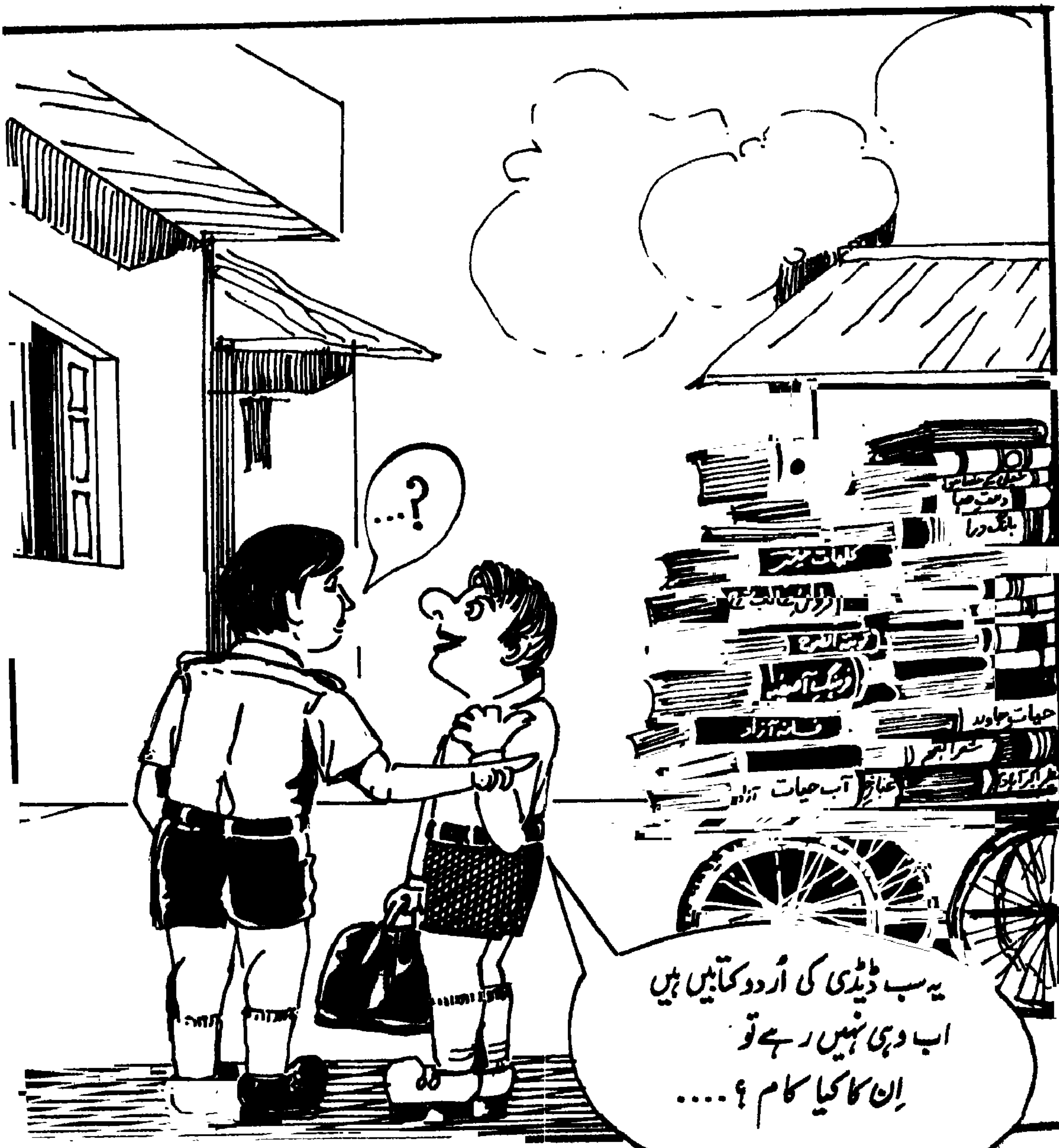
ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد



مارچ ۱۹۹۵ء   قیمت ۹ روپے


قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ۔ "چائے کے باغ" ——
اردو ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتا ہے ۔ —— اور
چائے کے باغوں سے ہماری منتخب کردہ چائے ——
ھائی ویا چائے
اور لذت میں حرف آخر سمجھی جاتی ہے
ملنے کے صرف دو مقام
نیشنل ٹی ڈپو نامپلی بازار، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون : 229476
برانچ
قریب کرانہ بازار
گلبرگہ، کرناٹک
فون: 21102

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

جلد ۲۸ شمارہ ۳:۵ مارچ ۱۹۹۵ء

سرورق: طالب خوندمیری
کتابت: محمود سلیم۔ محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد ۔۲

قیمت فی پرچہ: ۹ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔۱
فون: (آفس) 595716
(رہائش) 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن

8/825-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ، عابڈز حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات دو ۲ اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم ۲۔ خود روزگار اسکیم

۱۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت 10,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ ترکاری فروشی، اگربتی تیار کرنے کے لیے، میوہ فروشی وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25٪ کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

۲۔ خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، گھریلو صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹورس وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20٪ کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½٪ پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن نے مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ ۹۴ء تک 51935 افراد میں 10,02,13000 روپے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 43,22,05,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2453 افراد میں 1,13,15,000 روپیہ مارجن منی قرض جس کی جملہ لاگت 5,33,90,000 روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 85ء سے اب تک 54388 افراد میں 11,15,28,000 روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 48,55,95,000 روپے ہوتی ہے، جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن، گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپیہ کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کا تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دیکر نظام آباد، کرنول اور گنٹور میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں 13 ہنر سکھانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپ رائٹنگ، 100 کو لائٹ موٹر ڈرائیونگ، 11 کو لائٹ ٹیکنیشین، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن، 5 کو ٹیلرنگ، 13 کو ویڈیو گرافی، 15 کو فیبریکیشن، 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ، 5 کو ہیر تراشنا، 6 کو کارپنٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 218، نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔ خواہشمند افراد مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں (مینجنگ ڈائرکٹر)

مشتاق احمد یوسفی

سخن یوسفی

[آرٹس کونسل کراچی کی ادبی کمیٹی کے زیرِ اہتمام مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ایک شام منائی گئی

زیرِ نظر مضمون یوسفی صاحب نے اسی روز پڑھا تھا]

آرٹس کونسل کی اپنے ساتھ منائی جانے والی شام کی تقریب کا کارڈ مجھے ملا تو اس میں کچھ ایسے تعریفی کلمات نظر آئے جن سے ہمارے ہاں کسی ادیب کو صرف اس وقت نوازا جاتا ہے جب وہ مرحوم ہو جائے۔ میں اس قبل از وقت عزت افزائی کے لیے تہ دل سے سپاس گزار ہوں۔ غالب جیسے پراعتماد اور خود آگاہ شاعر نے مفتی صدرالدین آزردہ کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی دل گرفتگی کے ساتھ اپنا مشہور شعر پڑھا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ تم جو قدیم شاعروں کی مدح و ستائش میں محو رہتے ہو، تمہیں غالب کے کمال کا محض اس لیے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بدقسمتی سے تمہارے عہد میں جی رہا ہے۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی ÷ مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

ہمارے ہاں مرنے کے بعد لوگ بڑی سے بڑی خطائیں معاف کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ زبان کی غلطیاں بھی۔ فرانسیسی فلسفی والٹیر کو ایک ہم عصر ادیب کی وفات پر تعزیتی بیان دینے کے لیے کہا گیا تو اس نے جواباً جو کچھ کہا وہ تعزیتی لٹریچر میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ اس نے کہا "وہ ایک مخلص محب وطن، ایک عظیم مصنف، ایک وضع دار دوست، ایک آئیڈیل باپ اور شوہر تھا۔ بشرطیکہ وہ حرامزادہ واقعی فوت ہو گیا۔"

کارڈ میں یہ مژدہ دیکھ کر بھی خفت ہوئی کہ مجھ سے توقع کی جاتی ہے کہ "تازہ مضامین سے اقتباسات پیش کروں گا" پھر یہ سوچ کر قدرے افاقہ محسوس ہوتا ہے کہ تازگی اور باسی پن کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ چاندنی بیگم کو چھپے پانچ چھ سال ہونے کو آئے مگر وہ ہنوز قرۃ العین حیدر کا تازہ ترین ناول ہے۔ صاحبو! "تازہ" تحریر اور گھان سے اتری تازہ جلیبی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ ہم نے ایک دن داد طلب انداز میں کہا کہ غالب کا کمال یہ ہے کہ ہم جب بھی دیوان کھول کر پڑھتے ہیں تو ہر شعر بالکل نیا لگتا ہے۔ اس پر مرزا عبدالودود بیگ بولے کہ اس میں غالب کے کمال سے زیادہ آپ کے حافظے کی خرابی کو دخل ہے۔ میرے ایک دوست میری طرح فارسی میں بس یونہی سی شد بد رکھتے ہیں" اور میری ہی طرح فارسی الفاظ استعمال کرنے کا ہوکا ہے۔ وہ توے سے اتری گرم چپاتی کو نان شبینہ کہتے ہیں۔ شبینہ کا مطلب وہ "تازہ" سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے تازہ مضمون کو وہ بجا طور پر مطبوعہ شدہ کہیں گے۔ اسی طرح امریکن خواتین کے تازہ ترین فیشن THIGH HIGHS

جس سے اس ڈپارٹمنٹ میں منسلک ایک دستی رومال نے ہمارا پیچھا کیا ہے، وہ بھی ابھی دل کی نظر ستر کشا پہ گراں گزرتا ہے۔ اس کو وہ لباس شبینہ یعنی تازہ ترین فیشن کہیں گے۔ یعنی ایسا لباس ہو جو۔

جرائم کو سینوں میں بیدار کردے ؛ نگاہ مسلمان کو تلوار کردے

اس گھپلے سے قطع نظر اس میں شک نہیں کہ مزاح، پھل اور بیان بڑی جلدی بود ینے لگتے ہیں . . . . .

میں نے بیگم قدسیہ اکبر سے دو خصوصی مراعات کی درخواست کی تھی۔ پہلی یہ کہ میں کوئی ایسی تازہ چیز نہ سنا سکوں گا جو کسی نے نہ سنی ہو، نہ پڑھی ہو۔ دوسری یہ کہ مجھ پر کوئی مضمون نہیں پڑھا جائے گا۔ میں اپنی کتابوں کے مقدمے خود لکھتا ہوں۔ اس کی بھی دو وجہیں ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ دوسرے تعریف کرنے اور زبانی جمع خرچ میں اتنی کنجوسی کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے ذاتی خرچ میں اتنی کفایت شعاری سے کام لیتے تو کبھی کے کروڑپتی ہو گئے ہوتے۔ چنانچہ اپنی تعریف و توصیف میں جو کچھ اور جتنا کچھ کہنا ہوتا ہے، وہ خود ہی کہتا ہوں۔ یہ ثواب کا کام ہے اس لیے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں۔

یہ شرائط اور دیگر تفصیلات طے کرنے کے لیے میں محترمہ سے ملاقات کے لیے آرٹس کونسل پہنچا تو وہ "ڈرائیو وے" میں کار سے اتر رہی تھیں۔ سخت گرمی تھی۔ میں پسینے میں شرابور تھا اور ان کے گلے کے چاندی کے چوکر پر پسینے کی ایک بوند کسی ضعیف الاعتقاد کے متذبذب ایمان کی طرح لرز رہی تھی۔ مرزا عبدالودود بیگ نے ہمیں آگاہ کیا تھا کہ یہ گلوبند در حقیقت پلاٹینم کا ہے محض ڈاکوؤں کو دھوکا دینے کے لیے چاندی کا مشہور کر رکھا ہے! انھوں نے دریافت کیا "آپ نیچے بات کرنا پسند کریں گے یا اوپر"؟ صاحبو! ہمیں اس وقت تک آرٹس کونسل کی عمارت کے اوپر اور نیچے کا فرق معلوم نہیں تھا۔ ہماری چھٹی حس نے بے درنگ کہا کہ ہر چیز کا "اوپر" اس کے "نیچے" سے یقیناً بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اوپر کے لیے "آپٹ" کیا۔ یہاں یہ بتاتے چلیں کہ ہم نے زندگی میں جتنے بھی غلط فیصلے کیے ہیں وہ سب SIXTH SENSE کے کہنے ہی پر کیے ہیں۔ اس عمارت میں نہ لفٹ ہے، نہ زینہ۔ ایک لامتناہی RAMP ہے۔ جب ہم سطح سمندر سے پچاس فٹ کی بلندی پر پرواز کیے بغیر پیدل پہنچے تو ہمارے تجربے بلکہ ناتجربہ کاری میں ایک اور اضافہ ہوا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ جن چیزوں کا نچلا حصہ بہتر ہوتا ہے، وہ معدودے چند ہیں۔ یعنی شہد، کھیر اور زردے کی کھرچن، اسامی کا آخری گھونٹ، گنے کی نچلی پور، سانپ کی دُم، پارلیمنٹ کا ایوان زیریں۔ اب اس میں آرٹس کونسل کے گراؤنڈ فلور کا اضافہ کر لیجیے۔

ہم نے دنیا کے تقریباً تمام ممالک دیکھنے کی طرح دیکھے ہیں بزدلی نے الحمدللہ! ہمیں بیرون ملک ہر ایسی تفریح اور تجربے سے باز رکھا جس میں ذرا بھی لطف یا ENJOYMENT کی ملاوٹ ہو۔ وطن آکر ہم نے جھوٹ بولا، نہ خود پر سنگین بہتان لگائے۔ مطلب یہ کہ سفرنامہ نہیں لکھا بلکوں ملکوں گھومے، پر گھاٹ گھاٹ پیاسے مر کے آئے۔ یعنی جیسے گئے تھے، اس سے زیادہ ناتجربہ کار لوٹے۔ خیر پاکدامنی کی یہ الگ حکایت ہے جس کے لیے ایک علیحدہ شام چاہیے۔ ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ ہم اپنے مشاہدے کی بنا پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کراچی کی آرٹس کونسل کا RAMP دنیا کا سب سے لمبا، سب سے زیادہ PERPENDICULAR (عمودی) اور سب سے مردم آزار RAMP ہے۔ یہ تو اچھی خاصی ورزش … ATTRACTION ہو سکتا ہے جس پر ٹکٹ لگا کر روزانہ ہماری شام منائی جاسکتی ہے۔ "مقتدرہ" کی مرتب کردہ ڈکشنری میں ریمپ کا اردو مترادف "ڈھلان" دیا گیا ہے۔ صاحبو! جہاں ڈھلان ایسا ہوتا ہے، وہاں کا

چڑھائی کا اللہ اللہ! کیا عالم ہوگا۔ لغت نویس نے آخری منزل میں بیٹھ کے یہ معنی لکھے ہیں۔ حکومتوں کو بھی اپنی "اولمپین" بلندیوں سے، جو ہماری چڑھائی ہے، وہ پھسلواں ڈھلان ہی نظر آتا ہے۔ ہمیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اترے ہو بام سے۔

مغرب میں ایسے ریمپ صرف INVALID CHAIRS (معذوروں کی کرسی) اور ان خواتین کی سہولت کے لیے بنائے جاتے ہیں جن کے پیر اردو محاورے کے مطابق بھاری ہوں۔ اگر کوئی ٹورسٹ اس ریمپ کو دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ عمارت صرف معذور و مایوس مریضوں اور "پراُمید" خواتین (EXPECTANT) کی آماجگاہ ہے۔ میں نے ذہن پہ بہتیرا زور دیا کہ ایسا ریمپ بنانے کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ غالباً یہ اندیشہ تھا کہ اگر سیڑھیاں بنائیں گے تو لوگ انہیں گن لیں گے اور ہر دسویں سیڑھی کے بعد شربت روح افزا کا گلاس طلب کر کے پوچھیں گے کہ ہمارا دم آخر ہونے میں اب کتنی سیڑھیاں باقی ہیں؟ اس دن میں نے ایک خاتون کو جو اونچی ہیلز پہنے تھیں سارے راستے بحالت رکوع اترتے دیکھا اور ان کے پیچھے ایک بریش بزرگ اس طرح پھونک پھونک کے قدم رکھ رہے تھے جیسے — خدا نہ کرے خدا نہ کرے — ان کے پیر کو وہی اردو محاورہ ہو گیا ہے۔

ہم نے ایسا ڈھلان صرف اپنے وطن مالوف و متروک جے پور کے مہاراجہ کے محل میں دیکھا تھا۔ وہاں ایک چھوٹے سے رتھ میں جسے نازک اندام پاتریں (کنیزیں) کھینچتی تھیں، ضعیف العمر اور بے حد موٹے مہاراجہ کو بٹھا کر رن باس یعنی بھرے پرے حرم میں پہنچایا جاتا تھا۔ سُنتے آئے تھے کہ وہ جوانی میں بھی اتنا ہی موٹا اور بے ہنگم تھا کہ چھ سات پاتریں مل کر اسے بستر نلاست و استراحت پر لٹا دیتی تھیں۔ ان اپسراؤں کے گداز سہارے کے بغیر وہ خود نہ اٹھ سکتا تھا نہ اتر سکتا تھا۔ کھڑا ہو سکتا تھا نہ اشنان کر سکتا تھا اور نہ سونے کا پتر چڑھی صندل کی کھڑاویں پہن کر چاندی کے قدمچوں پہ بیٹھ سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ حکومت کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ جدید حکمرانوں کی یہ ادا سو سال پہلے اس نے کیسے اپنالی۔ اس دن راجہ کا وہ رتھ مجھے بے طرح یاد آیا۔ کاش وہ ہوتا — میں آرزو کرنے لگا۔ ابھی اس فقیر آرزو مند نے تمنا کا دوسرا قدم اس رتھ میں رکھا ہی تھا کہ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ وہ یہ کہ اگر اس وقت وہ رتھ ہوتا تو قدسیہ بیگم مجھ سے کھنچواتیں۔

خیر صاحب، جو بننا تھا سو بن گیا۔ اب فقط اتنی گزارش کروں گا کہ اگر آپ رتھ کا اہتمام نہیں کر سکتے تو کم از کم اترنے کے لیے SKATES تو بآسانی مہیا کر سکتے ہیں۔

راستے میں یعنی کھڑی چڑھائی کے دوران وہ آرٹس کونسل کے ناتمام آڈیٹوریم اور گارڈن ریسٹورنٹ کی روداد سنانے لگیں۔ ابھی میں حرف مدعا زبان پر نہیں لایا تھا کہ جنگ کی صفیہ بی بی آگئیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی، ہاتھ کے اشارے سے ٹھنڈا پانی مانگا۔ پھر آداب کیا۔ ہمیں بالاصرار ادھ ٹھنڈی چائے پلائی گئی، جس کی بظاہر تین وجہیں تھیں۔ اول ہم ہلکا گرم سوٹ پہن کر آگئے تھے۔ دوم بجلی چلی گئی تھی۔ سوم ہم ٹھنڈا پانی پینا چاہتے تھے۔ دونوں خواتین میں باہمی عدم دلچسپی کے موضوعات پہ موسلا دھار باتیں ہوتی رہیں۔ دو خواتین جب ابلاغ کر رہی ہوں، میرا مطلب ہے گفتگو میں محو ہوں تو کسی تیسرے شخص کا موضوع بدلنے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے تیز چلتے ہوئے پیڈسٹل فین کے سامنے جنگ یا نوائے وقت کا صفحہ پلٹنا۔ ہم نے اُن موقر اخباروں کا نام اس لیے لیا کہ ان کی کوئی خبر صفحہ پلٹے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم خاموش بیٹھے پشت کی دیوار پر آویزاں واٹر کلر کو دیکھتے رہے۔ دونوں خواتین سانس لینے کے لیے ایک بٹا سو سیکنڈ

رکیں تو ہم نے یہ کہنا چاہا کہ ہم کوئی تازہ مضمون نہ پڑھ سکیں گے۔ محترمہ قطع معذرت کرتے ہوئے کہنے لگیں۔
"شاہد رسام کی تصویروں کی نمائش میں آپ نے جو مضمون پڑھا تھا، اس کے فقرے لوگ اب تک دہراتے ہیں۔ میں بھی بعض نامناسب فقروں پر تنہائی میں ہنستی ہوں۔"
میں نے پوچھا "مثلاً؟"
بولیں "اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ آپ نے جس تصویر کی کمر کی اتنی تعریف کی تھی، اسے دیکھنے لوگ جوق در جوق آتے رہے۔"

جن سامعین نے وہ تقریر نہیں سنی اور تصویر نہیں دیکھی، ان کی تفریح طبع کے لیے اقتباس سنانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ "شاہد نے ہر میڈیم میں طبع آزمائی کی ہے۔ واٹر کلر پیٹنگ چارکول ڈرائنگ PEN AND INK آئیل۔ مرزا کہتے ہیں کہ پیٹنگ تصویر نازک مزاج نازنین کی مانند ہوتی ہے کہ

نسیم سحر چھو جائے رنگ ہو میلا

آئیل پینٹنگ اور سیاست دانوں کو قریب سے نہیں، ذرا دور سے دیکھنا چاہیئے۔ چارکول ڈرائنگ منکوحہ کی طرح ہوتی ہے۔ قریب سے دیکھو یا دور سے بالکل ویسی ہی نظر آتی ہے پین اینڈ انک والی تصویر محبوبہ کی طرح ہوتی ہے۔ جسے دور سے دیکھیں تو قریب اور قریب سے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔"

سائنس داں کہتے ہیں کہ تتلی کی کم و بیش دس ہزار آنکھیں ہوتی ہیں جن کی مجموعی بصارت سے وہ پھول کو دیکھتی ہے۔ آپ ملاحظہ ہو کہ یہ تتلی ہیں ایک دوشیزہ کے سراپا کا عقبی رخ یعنی ننگی پیٹھ دکھاتی ہے۔ دوشیزہ میں نے رسماً اور اخلاقاً کہا ہے، ورنہ میں تصویر کے چال چلن کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ تصویر کا فوکل پائنٹ یعنی مرکز نظر پر گہرے براؤن شیڈ سے بنایا، اور وہ چھوٹا سا SENSUOUS DIMPLE ہے جو ننگی پیٹھ کے نشیب میں دکھلایا ہے، جسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے جوبن پر آیا ہوا گدرایا بدن کھلکھلا کے ہنس دیا ہے تو یہ ڈمپل پڑا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ گردن تا کمر پیٹھ بالکل ننگی ہے، سراسر غلط ہوگا۔ اس لیے کہ دوشیزہ نے ایک باریک سی زنجیر نظر گزر کے لیے ہندوؤں کے جنیؤ کی طرح ڈال رکھی ہے۔ آرٹسٹ نے عقبی منظر تو دکھا دیا، قیاس بیان ہوگا۔ نظیر اکبرآبادی نے آج سے کوئی دو سو برس قبل کچھ ایسا ہی منظر دیکھا ہوگا اور ایسا ہی سماں ہوگا، جبھی تو کہا۔

آنکا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے ؛ یاں یوں بھی واہ وا ہے، اور ووں بھی واہ وا ہے

کچھ دیر بعد آپ یہ تصویر دیکھیں گے اور شاہد کی مصوری اور نظیر اکبرآبادی کی "ووں" کی داد دیئے بغیر نہ رہیں گے۔"
میں مسکراتا دیکھ کر سر پہ دوپٹا اس طرح اوڑھ لیا ہے جیسے بی بیاں اذان سنتے ہی سر کو تھوڑی دیر کے لیے ڈھانپ لیتی ہیں۔ پھر کہنے لگیں "بعض لوگ جنھوں نے اس دن وہ تصویر دیکھی اور آپ کی تقریر سنی، وہ آرٹسٹ سے اس ماڈل کا پتا اور مجھ سے آپ کی عمر دریافت کرتے ہیں۔"
تو صاحبو! جہاں تک عمر کا تعلق ہے ہم نے اس روز ایک بزرگ کو اس تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر فوٹو کھنچواتے دیکھا تو حیرت ہوئی کہ :

"بزرگ" زاویے اس کی کمر کے دیکھتے ہیں

اس وقت وہ تصویر بلا "کاوش" لے رہی تھی اور کیمرے کے فوکس میں کچھ اور بے صبرے قدر دانوں کے چہرے بھی آ رہے تھے۔ لہٰذا بزرگوار نے انہیں کہنیوں کے آنکس بار بار کے دوسری تصویروں کی طرف دھکیلا اور مذکورا السدر تصویر کی کمر میں دست تصور حائل کر کے اس طرح فوٹو کھنچوایا گویا بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! جس کمر کا اتنا شہرہ سنتے تھے:

وہ کمر کولی میں بھر لی ہم نے کل خنجر سمیت　(میر)

معاف کیجیے میں نے پانچ سطروں میں لفظ بزرگ تین مرتبہ استعمال کیا ہے۔ تحقیر مقصود نہیں تعظیماً کہا ہے اس لیے کہ بزرگ سے مراد اپنے ہی ہم عمر ہیں۔

ہم نے ایک مرتبہ پھر جملہ شروع کیا ہی تھا کہ عین جلسے کے بیچوں بیچ کرنل تنویر اور چودھری صاحب آ گئے۔ کرنل تنویر چوغلے نے کا کرتا جس پر اچھے سچے دیئے قوس والی سوندھی رنگت کام بنا تھا پہنے ہوئے تھے۔ اگر کوئی ہمیں ایسا کرتا پہنا دے تو ہم اسے شیروانی کے نیچے پہننے کی بجائے اوپر پہنا کریں۔ روزانہ۔ یہاں تک کہ اس کا دامن دست زلیخا کے انتظار میں آپ لیر لیر ہو جائے۔ قدسیہ بیگم بتلانے لگیں کہ حکومت سندھ سے آڈیٹوریم کے لیے ایک کروڑ روپے کا کمٹ منٹ کرانے کے لیے انہوں نے کیسے کیسے جتن کیے بڑے بڑے بیوروکریٹس کو کس طرح قائل معقول کیا۔ ہم نے بھی ان کی چند تقریریں سنی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ان کا طوطی بولتا ہے تو پھر کوئی طوطا توپ نہیں چلا سکتا۔

ہمارا خیال ہی نہیں یقین ہے کہ اگر انہیں جنت میں بھی بھیجا جائے تو اول تو وہ "ون وے" ٹکٹ لیں گی۔ پھر جنت کے دروازے پر ہی اڑ کے بیٹھ جائیں گی اور داروغہ جنت کو کہلا بھیجیں گی کہ جب تک جنت میں سندھ گورنمنٹ کے خرچ پر آڈیٹوریم نہ بنایا جائے بندی جنت میں قدم نہیں رکھے گی۔

اتنے میں ہادی نقوی اور رضوان صدیقی صاحبان مع احباب آ گئے۔ ہماری شرائط دھری کی دھری رہ گئیں۔ کمرہ زبان حال سے کہہ رہا تھا:　ہجوم کار ستم گاری تو دیکھو

ریمپ سے اترے تو دیکھا کہ نیچے "شام افسانہ" کے مہمانوں کی آمد آمد ہے۔

یہاں جو نقشہ دیکھا وہ بعینہٖ وہی تھا جو آج سے تیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ سوا کروڑ نفوس کی آبادی اور ملک میں سب سے زیادہ شرح خواندگی والے اس میٹرو پالس میں ایک بھی تھیٹر ہال اور آڈیٹوریم نہیں۔ یہ جگہ جہاں ہمارے ادبی جلسے ہوتے ہیں یہ در حقیقت ایک بے دیوار سا "ریڈور" یعنی رہ گزرگاہ ہے جسے اگلے وقتوں میں غلام گردش کہتے تھے۔ ہم نے سر قریہ زرفشاں ایک غلام گردش کو خاک نشیناں کوچہ ادب کی شہ نشین بنا دیا۔ کم و بیش تیس برس تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم ایک قنات لگا لیجیے، جسے ڈھنگ سے سیدھا کھڑا رہنا بھی نہیں آتا اپنے جلسہ و جلوت کے لیے ایک حصار خلوت کھینچ لیتے ہیں۔ گویا "کھڑکی کا پردہ کھینچ لیا" رات ہو گئی اور یوں ہم ایک قنات قناعت سے شہر نا پرساں کی ادب ناشناسی پہ پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ اور بات کہ شہر قلندر کے شایان شان سماعت گاہ نہ ہونے سے شعر و ادب کے شیدائیوں کے ذوق و شوق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے　؎　جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے　(اصغر)

آنے کو تو ان جلسوں اور شاموں میں بھی آ چکے ہیں۔ ارباب اقتدار کو بھی یہاں رونق افروز دیکھا۔ وزیر باتدبیر، سفیر، امیر کبیر، بینکر، صنعت کار — کون ہے جو یہاں نہیں آیا اور یہ کہتا ہوا نہ چلا گیا "میں آیا، میں نے دیکھا اور

دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہیں۔" اس شہر میں ہم ادیبوں کا احوال وہی ہے جس کی تصویر غالب نے بڑے دُکھ کے ساتھ کھینچی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرا کیا پوچھتے ہو۔ میں تو نابیناؤں کے شہر میں ہونے والا تماشا ہوں۔ میرے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ہوں تماشائے شہر نابینا ÷ ہے برابر مرا خفا و ظہور

اب تو ادب کو اتنا بے ضرر اور بے اثر و بے وقر سمجھتے ہیں کہ کسی ادیب کو گرفتار بھی نہیں کرتے۔

لیکن یہ حکایتیں اور شکایتیں اب پہلی بار تو نہیں سن رہے:

سنی باتوں کا کیا سُننا، کہی باتوں کا کیا کہنا

میں نے سوچا تھا کہ چند سطریں تازہ مضمون پیش نہ کر سکنے کی معذرت میں لکھوں گا۔ لیکن آرٹس کونسل کے ریمپ پہ پھسلا تو بیاں ان کے ٹھہرا۔

یوسف ناظم

غلغلہ، ولولہ اور زلزلہ

جس طرح امراض کے درجے مقرر ہیں اسی طرح اعمال کے بھی مرحلے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کے پاس آپ فوراً جائیں یا دیر سے ان کی تشخیص یہی ہوگی کہ آپ کا مرض تو دوسرے اسٹیج میں پہنچ گیا ہے۔ آپ اپنے ڈاکٹر سے جو آپ کی خوش قسمتی سے نہیں، اپنی خوش بختی سے آپ کا فیملی ڈاکٹر بھی ہو سکتا ہے، التماس کریں کہ ڈاکٹر صاحب آپ اس مرض کو دوسرے درجے سے اتار کر کم سے کم پہلے اسٹیج پر لے آئیں تو ڈاکٹر کا جواب یہی ہوگا کہ کوشش کرنا میرا کام ہے۔ دوائیں دیتا ہوں۔ دعا آپ کیجیے اپنے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ ڈاکٹر کے حق میں جو دعا مانگی جاتی ہے اس کی قبولیت میں دیر نہیں لگتی اور چند دن بعد جب آپ دوبارہ ڈاکٹر کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ کو یہ خوش خبری سنائی جاتی ہے کہ آپ کا مرض تیسرے اسٹیج میں پہنچ چکا ہے۔ اس تدریجی عمل کی روک تھام مشکل ہے۔ یہی صورت حال انسانی اعمال کی ہے۔ جب بھی کوئی واقعہ ہوتا ہے اور جب اس واقعے کو پردہ خفا میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے تو اخباروں میں "غلغلہ" مچ جاتا ہے۔ ہر اخبار میں کم سے کم ایک صفحہ تو ضرور ہوتا ہے جس کے بغیر کسی بھی اخبار کا طلوع ہونا مشکل ہوتا ہے۔ یہ صفحہ، صفحہ اول" کہلاتا ہے۔ انگریزی میں تو اسے فرسٹ پیج کہتے ہی ہیں لیکن اس کے لیے فرنٹ پیج زیادہ صحیح لفظ ہے۔ ایک مرتبہ یہ واقعہ پردۂ خفا سے باہر آگیا تو اب اس واقعے کا غلغلہ ہر روز صفحۂ اول پر آنا ہی چاہیے ورنہ عوام خفا ہو جاتے ہیں۔ (غنیمت ہے کہ اخبار کی قیمت واپس نہیں مانگتے) فوراً اپنی رائے دیتے ہیں کہ یہ اخبار تو بس یونہی سا ہے یا "بیٹھو" ہے (بیٹھو اور بیٹھے میں کافی فرق ہے جو نظر بھی آتا ہے) جب اس واقعہ کا " غلغلہ کئی دن اخبار میں جاری رہتا ہے تو عوام الناس اچانک بیدار ہو جاتے ہیں اور ان میں اس بیداری کے ساتھ ایک قسم کا "ولولہ" بھی پیدا ہو جاتا ہے جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک تحریک اور ہر ہو رہیہ، دھرنا، بھوک ہڑتال اور اس کے حسب نسب کے دیگر اقربا کی شکل اختیار کر کے یہ ولولہ شارع عام نمودار ہوتا ہے۔ جگہ جگہ جلسے ہوتے ہیں۔ تقاریر ہوتی ہیں۔ ریزولیشن پاس ہوتے ہیں۔ اس واقعے کو بے نقاب

کرنے والے شخص کا ہر جگہ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس کے گلے میں ہار، ہاتھوں میں گلدستے اور کبھی کبھی شانوں پہ ایک ادنیٰ شال نظر آنے لگتی ہے۔ جلسوں میں مار پیٹ کا بھی خاصا انتظام ہوتا ہے اور پھر پولیس حرکت میں آتی ہے۔ ایک مرتبہ پولیس حرکت میں آگئی تو پھر "حرکتوں" کا تانتا لگ جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب پولیس حرکت میں آتی ہے تو حرکت بھی غیر محسوس طریقے پر پولیس میں آجاتی ہے۔ یہ ایک زنجیری عمل ہے اور اب تو اس زنجیری عمل کو اعلیٰ ترین اسٹیج پر پہنچانے کے لیے سریع الحرکت فورس کا بھی قیام عمل میں آگیا ہے۔ ولولہ جتنا قوی ہوگا اس کا ردِ عمل اس سے دگنا بلکہ سہ گنا قوی ہوگا۔ اس ردِ عمل میں اصل عمل کو رد نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ایسا ہی مد کی طرح ہوتا ہے جو الف پر لگایا جاتا ہے اور ردِ عمل میں عمل سے زیادہ شدت ہوتی ہے۔ ہونا ہی چاہیے۔ عوام اپنی ذہانت کا مظاہرہ کریں اور انتظامیہ اپنی ذہنیت کا مظاہرہ نہ کرے یہ نہیں ہوسکتا۔ جناب شیخ سعدیؒ یا حافظ شیرازی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جوابِ تلخ می زیبد ادھر مارا ادھر مارا۔ یہ پورا مصرع سعدی یا حافظ کا نہیں ہے۔ ہماری ہندی فلموں میں اس کا یہ حال ہوا ہے اور جب تک ان فلموں کو اردو کا سرٹیفکیٹ نہیں دیا جاتا ہمارے اشعار کا یونہی قلع قمع ہوتا رہے گا۔ اب ہمیں یاد آیا کہ یہ مصرع حافظ شیرازی ہی کا ہے اور اس غزل کا ہے جس کے مطلع میں ایک ترک شیرازی کا ذکرِ خیر ہے۔ جس شعر کا ہم حوالہ دے رہے ہیں وہ یوں ہے:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

کچھ لوگوں نے شکر خارا کے معنی خار کھانے کے بتائے ہیں اس لیے مصرع تبدیل بہ دم سرد ہوا۔ لیکن چونکہ ہم نے یہ مصرع انتظامیہ کی شان میں کہا ہے جس میں اب خواتین کا تناسب بڑھتا جارہا ہے اس لیے شکر خارا کے معنی خار کھانے کے ہوسکتے ہیں

جب انتظامیہ کو (جسے ہم حسنِ انتظامیہ کہتے ہیں) عوام کی طاقت ذرا زیادہ دکھائی دینے لگتی ہے تو پھر زلزلے کے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ زلزلہ البتہ اس زلزلے سے مختلف ہوتا ہے جو صرف ایک سکنڈ یا نصف ثانیے کے لیے آتا ہے (سب سے زیادہ سریع الحرکت اگر کوئی چیز ہے تو یہی زلزلہ ہے) لہٰذا وقتیکہ دوسرا اہم واقعہ نمودار نہ ہوجائے یہ آیا نہیں لایا ہوا زلزلہ تھمتا نہیں ہے۔

اب واقعات بھی معرکے کے ہونے لگے ہیں۔ اگر آج قارون بقیدِ حیات ہوتا تو اس کی حیثیت بھی ایک عام آدمی کی ہوتی اس سے زیادہ دولت مند لوگ تو ان مکھیوں کی تعداد میں ہوتے جو حلوں اور مٹھائیوں کی دکانوں پہ دوکانیں بند ہونے کے بعد موجود رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ واقعات آشکارا ہوچکے ہیں اور اکثر کی "رونمائی" زیرِ غور ہے۔ اس رونمائی میں انتظامیہ کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ عوام الناس کے حافظے سے جو بہت کمزور ہوتا ہے سابقہ واقعہ کی یاد محو ہوجائے اور لوگ کہیں۔ یاد آیا نہیں پانی کا بہا ہوا نا۔ نیا واقعہ جو درحقیقت اندر ہی اندر پرانا ہوچکا ہے عوام الناس کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خود مرکز اس کے پیچھے ہوتا ہے۔

ہوتا ہوگا۔ اصل چیز ہے قلقلہ۔ اسٹیج نمبر ایک ولولہ درجہ نمبر ۲ اور زلزلہ۔ مرحلہ نمبر ۳۔ امراض اور اعمال میں کتنی یکسانیت ہے۔ ڈاکٹر وہاں بھی ہیں اور یہاں بھی کیفیت وہی ہے یعنی مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور دعائیں شاید آسمان پر پہنچ نہیں پارہی ہیں۔ کیسے پہنچیں۔ آلودگی کا بھی خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے ”تاریخ اپنے آپ کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔ اس کا ثبوت ہمارے کیلنڈر بھی ہیں اور تاریخ کے واقعات بھی۔ قارون تو جگہ جگہ پیدا ہوگئے ہیں۔ حاتم طائی البتہ اب تک نمودار نہیں ہوسکے ہیں لیکن بہرحال عوام الناس کی خاطر تواضع جاری ہے۔ باندازِ دگر۔ گلشن تو وہی ہے لیکن اس میں بند و بست ”برنگِ دگر ہے“۔ یہ رنگ جب چڑھ جاتا ہے تو لوگ ننگے ہاتھوں بھی گھومتے پھرتے ہیں تکلف نہیں کرتے۔ خلفشار والے تو بات سمجھ جاتے ہیں کہ جس طرح قانون اندھا ہوتا ہے زلزلہ اندھا نہیں ہوتا۔ قانون تو کبھی کبھی فریادی اور فریق ثانی کی صورت دیکھ لیتا ہے تاکہ انصاف میں آسانی ہو اور کسی ذی حیثیت شخص کے ساتھ ناانصافی نہ ہو لیکن زلزلہ واقعی اندھا ہوتا ہے یا آتے وقت اچھی طرح آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ زلزلے کا ایک اچھا سا نام بھی ہے اور وہ نام ہے انقلاب۔ ●●

رضا نقوی واہی
پٹنہ (بہار)

ریلیاں ہی ریلیاں

یہ ہمارا شہر، جو شہرِ کلیم و شاد[1] ہے
دوست اس کا، آج کل، چرخِ ستم ایجاد ہے

اک زمانہ تھا کہ گنگا کا یہ ہمسایہ نگر
شعر و حکمت کے لیے تھا درس گاہ معتبر

بھائی چارہ اور روا داری کا تھا ہر سُو رواج
اپنے اپنے شغل میں مصروف رہتا تھا سماج

شاعرانِ خوش نوا دن رات آتے تھے نظر
گنگناتے، شعر کہتے، ہر گلی کے موڑ پر

ایسے بے فکروں کو، جن کی طبع، موزوں ہی نہ تھی
شوق تھا کنکوّے بازی کا، بجائے شاعری

مُلک میں تحریکِ آزادی کا آیا دَور جب
مشغلے تفریح کے، ڈھونڈے گئے کچھ اور تب

تھی کبھی تو بھوک ہڑتال، اسٹرائک، مار دھاڑ
اور کبھی تھی نعرہ بازی، دھر اِسے، اُس کو پچھاڑ

بعدِ آزادی نئی معروفیت کا دَر کھُلا
نیم تو ہے نیم ہی، اُس پہ کریلا بھی چڑھا

دل بھرا جب فرقہ وارانہ کرکٹ میچ سے
جب مقابل ٹیم، آؤٹ ہو گئی اک میچ سے

اک نئی تحریک آئی لے کے کچھ تبدیلیاں
یعنی اب تفریح کا سامانِ نَو ہیں ریلیاں

جس طرح ہوں کھیتیوں پر حملہ آور ٹڈیاں
یوں ہی اہلِ شہر کے حق میں ہیں لعنت ریلیاں

کُرسیوں سے جو سیاست زادگاں محروم ہیں
ریلیاں اُن کے لیے بامقصد و مفہوم ہیں

یہ سمجھ کر، قسم ہے کوئی وہ ہلّڑ واد کی
نام ڈنکل کا سُنا اور ایک ریلی داغ دی

گیٹ[2] کے مفہوم سے واقف نہیں تو کیا ہوا
ریلیاں ترتیب دینے کا تو موقع مل گیا

رنگداروں کو بلا کر، بھیڑ اکٹھی کی گئی
چپّے چپّے پہ گلی کوچوں کے جو قابض ہوئے

دفعتاً مفلوج ہو کر رہ گیا ہر کام کاج
شہر میں چلتا رہا کچھ دیر تک راون کا راج

اتفاقاً گر کوئی دوکان کھُلی پائی گئی
خوب جی بھر کے وہ لُوٹی اور جلوائی گئی

ہر در و دیوار کے پیچھے کھٹالوں کی قطار
بیچ سڑکوں پہ مویشی اور غلاظت کی بہار

اور اس منظر کے پیچھے ریلی بازوں کا ہجوم
تجھ کو لے آیا کہاں اے شہر، تیرا بختِ شوم

---

[1] مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد اور شاد عظیم آبادی
[2] GATT

مجتبیٰ حسین

قصہ ایک ہم شکل کا

بعض اوقات کچھ ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ ان واقعات کے پیش آجانے کے باوجود آپ لوگوں کو یہ یقین نہیں دلا سکتے کہ یہ واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا تھا ——————

میں بذریعہ ٹرین دلی سے حیدرآباد جا رہا تھا۔ ایک حیدرآبادی دوست بھی میرے ہم سفر تھے۔ ناگپور کے اسٹیشن پر گاڑی بڑی دیر تک ٹھہرتی ہے۔ ہم دونوں سفر کی بوریت کو ختم کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر آئے تھے کہ اچانک ایک شخص بڑی گرم جوشی کے ساتھ میری طرف آیا اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا "یار! دیپک سکسینہ کیسے ہو تم؟ کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "حیدرآباد جا رہا ہوں" پوچھا "تو کیا اب حیدرآباد میں بھی تم نے اپنا بزنس شروع کر دیا ہے؟" میں نے کہا "شروع تو نہیں کیا ہے۔ شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔" کہنے لگا "بہت اچھا خیال ہے۔ یہ بتاؤ گھر پر سب کیسے ہیں؟" میں نے کہا "سب اچھے ہیں۔ مہندر انجینیرنگ کرنے کے بعد باہر چلا گیا ہے۔ سرلا اپنی سسرال میں خوش ہے۔ ویریندر کے بارے میں تو تم جانتے ہو گے کہ اس نے اب پلاسٹک کی چیزیں بنانے کا اپنا ایک کارخانہ کھول لیا ہے۔" اس شخص نے کہا "اچھا مجھے پتہ نہیں تھا اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ وہ ذہین پہلے ہی سے تھا۔ کاروبار میں تم سے یقیناً آگے نکل جائے گا"

میں نے کہا "بس تمہارا آشیرواد چاہیے۔"

پھر اس شخص نے پوچھا "اور بھابی کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا "بھگوان کی کرپا سے بالکل اچھی ہے۔ وہ جو اپنے الہ آباد کے مشہور وید پنڈت پربھاکر جو ویدی ہیں نا ان کے علاج سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ جوڑوں کا درد بالکل جاتا رہا۔"

اس شخص نے حیرت سے کہا "اچھا تو ویدی جی اب تک زندہ ہیں۔ بہت بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ کیا اس پرانے مکان میں رہتے ہیں؟" میں نے کہا "وہاں وہی گھاس منڈی والے مکان میں رہتے ہیں۔" بولا "اچھا

کیا تم نے بتا دیا۔ انھیں خط لکھا ہوں پچھلے دنوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
سے میں بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوں۔ حیدرآباد سے الہ آباد کب واپس جاؤگے؟ میں نے کہا "ایک ہفتہ میں واپس ہو جاؤں گا۔"

بولا "بیٹے تمھاری دکان کی مٹھائیاں اور نمکین چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔ کئی برس ہو گئے الہ آباد آئے ہوئے اب کے آؤں گا تو ضرور ملوں گا اور وہاں تمھیں یاد ہوگا کہ الہ آباد سے چلتے وقت میں نے تم سے سو روپے ادھار لیے تھے۔ پورے چھ سات برس بیت گئے۔ ہمیشہ خیال آیا تمھیں منی آرڈر کر دوں لیکن فرصت ہی نہیں ملی۔ اب رکھ لو" یہ کہہ کر اس نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے پوچھا "مگر یہ تو بتاؤ تم ناگپور میں کیا کر رہے ہو۔ اپنا پتہ تو دو؟" اس اثنا میں ٹرین نے چلنے کی تیاری شروع کردی۔ اس شخص نے اپنا وزٹنگ کارڈ مجھے دیا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا "الہ آباد کی محبتیں بہت یاد آتی ہیں۔ سارے دوستوں کو میری طرف سے پوچھنا اور بھابی کو نمستے کہنا۔ بچوں کو پیار اور ہاں حیدرآباد سے واپس ہوتے وقت اور ایک دن ناگپور میں رک جاؤ۔ اب میرے حالات اچھے ہوگئے ہیں۔ پہلے کی سی بات نہیں رہی۔"

گاڑی آگے کو نکل گئی اور وہ بڑی دیر تک پلیٹ فارم پر ہاتھ ہلاتا رہ گیا۔ جب ہم ڈبہ میں واپس ہوئے تو میرے حیدرآبادی دوست نے کہا "یار مجتبیٰ! کمال ہے۔ تم تو عملی مذاق بھی خوب کر لیتے ہو۔ یہ تم مجتبیٰ سے دیپک سکینہ کیسے بن گئے۔ یہ الہ آباد، یہ منڈی اور پرچا کر دو دیدی یہ سب کیا ہے اور یہ تمھارا بیٹا مہندر کہاں سے آگیا اور سیٹھ پیارے لال نے پلاسٹک کا کارخانہ کب کھول لیا۔ اور ہاں بھابی تو کبھی جوڑوں کے درد میں مبتلا نہیں ہوئیں۔" میں نے ہنس کر کہا "اس شخص سے سو روپے لینے کے لیے یہ کہنا ضروری تھا۔ میرے دوست نے کہا "مگر تم نے تو اسے کبھی سو روپے نہیں دیے تھے۔ میں نے کہا "مگر دیپک سکینہ نے تو دیے تھے"۔ میرے دوست نے پوچھا "کیا مذاق کرتے ہو کون ہے یہ دیپک سکینہ؟" میں نے کہا "وہی جو الہ آباد میں رہتا ہے۔ رانی منڈی میں اس کی کنفکشنری کی دکان اور جس کی بیوی جوڑوں کے درد کی مریض ہے۔" میرے دوست نے کہا "تب تو یہ سو روپے اس دیپک سکینہ کے ہوئے تم نے کیوں وصول کر لیے۔ میں نے کہا "اور وہ جو میرے مزاحیہ مضامین کی داد ہر ایک سے وصول کرتا رہتا ہے تو یہ داد کس کھاتہ میں جائے گی۔"

میرے دوست نے جھنجھلا کر کہا "یار یہ معمہ میرے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کھل کر تو بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟"

اور میں نے جو بات اپنے حیدرآبادی دوست کو بتائی وہ اب آپ سب کو بھی بتائے دیتا ہوں۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ آج سے سات آٹھ برس پہلے میں دہلی کے کناٹ پلیس کی ریگل بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک شخص نے اچانک پیچھے سے میری پیٹھ پر ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا "ابے دیپک سکینہ، تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ کب آیا الہ آباد سے؟" میں نے اپنی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے کہا "معاف کیجیے۔ میں دیپک سکینہ نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ شخص بولا "ابے لفنگے! مجھ سے مذاق کرتا ہے۔ بچپن کا دوست اور مجھے "آپ" کہہ کے شرمندہ کر رہا ہے۔ اچھا یہ بتا کب آیا الہ آباد سے؟"

میں نے قدرے بلند آواز میں اس سے کہا "دیکھیے جناب۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں دیپک سکینہ نہیں ہوں اور نہ ہی الہ آباد سے میرا تعلق ہے۔ خواہ مخواہ میرا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ" اس پر وہ شخص بپھر گیا اور

غصے سے بولا" اب میں سمجھا کہ تو کس بات پر خفا ہے۔ یہی نا کہ میں تیری دکان سے ڈھائی تین سو روپیوں کی مٹھائی ادھار لی تھی۔ یہ لے پانچ سو روپے اور رکھ اپنی جیب میں۔ میں تیری پائی پائی چکا دوں گا۔ تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ بہت دنوں سے الہ آباد نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تیرے پیسے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تو پیسے کے لیے اتنا گر جائے گا۔ آج سے تیری میری دوستی ختم " اس شخص نے غصے سے پانچ سو روپیوں کا نوٹ میرے شرٹ میں ٹھونس دیا اور میرے منع کرنے کے باوجود آگے کو نکل گیا۔

اس واقعہ کے بعد بہت دنوں تک وہ پانچ سو روپے میری جیب میں پڑے رہے۔ چار برس پہلے کسی ادبی محفل کے سلسلہ میں مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے دو چار دوستوں کے ساتھ امین آباد پارک سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب نے پیچھے سے پکارا" بھئی دیپک سکسینہ کیسے ہو یار؟ دیکھ کر بھی انجان بنے چلے جا رہے ہو۔ مٹھائیاں اچھی بناتے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے دوستوں کو بھی بھول جاؤ۔" دیپک سکسینہ کا نام سن کر مجھے اچانک کناٹ پیلس والا واقعہ یاد آ گیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کی غلط فہمی دور کرتا میرے ریڈیو کے دوستوں نے اس سے کہا۔ معاف کیجیے۔ یہ دیپک سکسینہ نہیں مجتبیٰ حسین ہیں۔ دہلی سے آئے ہیں" مگر میں نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے اس شخص سے کہا " حضور ان کی باتوں میں نہ جائیے۔ میں ہی دیپک سکسینہ ہوں الہ آباد والا۔ آپ نے میری دکان سے جو مٹھائی لی تھی اس کے پیسے اب تک نہیں دیئے۔ میں آپ کو کیسے نہیں پہچانوں گا۔"

اس پر اس شخص نے ندامت سے کہا۔" ہاں بھئی دیپک ابھی پچھلے مہینے تو تم سو روپے کی مٹھائی ادھار دی تھی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اگلے ہفتہ الہ آباد آ رہا ہوں، پیسے دے دوں گا۔"

تب میں نے اس شخص پر اپنی اصلیت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا" حضور! مجھے اس دیپک سکسینہ کا ذرا پتہ بتائیے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ کیسا آدمی ہے کہ ہر ایک کو ادھار میں مٹھائی دے دیتا ہے اور پھر بھی اس کا کاروبار چل رہا ہے۔"

بہر حال میں نے اس شخص سے دیپک سکسینہ کا پورا پتہ حاصل کیا۔ اتفاق سے اس واقعہ کے پورے ایک سال بعد ایک ادبی محفل کے سلسلہ میں الہ آباد جانا پڑ گیا تو میں دیپک سکسینہ کی کنفکشنری کی دکان پر گیا۔ دیپک سکسینہ کو دور سے دیکھا تو یوں لگا جیسے میں خود دکان پر بیٹھا ہوا مٹھائیاں بیچ رہا ہوں۔ جیسے ہی میں اس کی دکان پر گیا دیپک سکسینہ نے مجھے ایک نظر دیکھا پھر زور سے بولا " السلام علیکم مجتبیٰ صاحب! آپ آ گئے۔ آپ دہلی سے الہ آباد! مجھے یقین تھا کہ آپ ایک نہ ایک دن میری دکان پر ضرور آئیں گے؟ میں نے کہا" یار دیپک سکسینہ تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

بولا کمال کرتے ہیں آپ بھی جیسے آپ کو میرا نام معلوم ہو گیا۔ ویسے ہی مجھے بھی آپ کا نام معلوم ہو گیا۔ دو ایک بار دہلی گیا تو جگہ جگہ لوگوں نے مجھے " مجتبیٰ حسین " سمجھ کر پکڑ لیا۔ آپ کے ایک دوست نے تو مجھے بے پناہ گالیاں بھی دیں کہ رات کھانے کی دعوت پر آنے کا وعدہ کر کے میں ان کے ہاں نہیں پہنچا۔

دیپک سکسینہ سچ مچ میرا ہم شکل تھا۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش تھا۔ مجھے خوش خوش اپنے گھر لے گیا۔ بیوی بچوں سے ملایا۔ شام کو مجھے الہ آباد کی ایک ادبی محفل میں شرکت کرنی تھی۔ سو میں دیپک سکسینہ کو

یا ادبی محفل میں شرکت کی دعوت دے دی۔ کسی وجہ سے میں ادبی محفل میں دیر سے پہنچا تو دیکھا کہ ادبی محفل
ہے منتظمین اسے زبردستی پکڑ کر ڈائس پر بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے بروقت بیچ
پڑ کیا ورنہ اس دن دیپک سکسینہ کو پتہ چلتا کہ ہوٹنگ کس کو کہتے ہیں"۔
منتظمین بھی ہم دونوں کی مشابہت پر پریشان تھے۔

بہرحال جب میں الہ آباد سے دہلی واپس جانے لگا تو دیپک سکسینہ میرے لیے مٹھائی کے ڈبے لے
ما گیا۔ میں نے اس کے کناٹ پیلس والے دوست کے دیئے ہوئے پانچ سو روپے دینے کی کوشش کی تو دیپک
نے کہا "مجتبیٰ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کی تصویریں ہندی رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ٹیلی ویژن
پر بھی آپ اکثر آتے رہتے ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں نے آپ کے مزاحیہ مضامین کی جتنی داد وصول کی ہے اس
کے آگے ان پانچ سو روپیوں کی کیا حیثیت ہے۔ انھیں اپنے پاس ہی رکھیے"۔

میں نے پوچھا "دیپک سکسینہ۔ یہ سب تمھیں کیسا لگتا ہے"۔
بولا "بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس ملک میں جب فرقہ وارانہ دنگے ہونے لگتے ہیں تو میں آپ کے تعلق
سے تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں"۔

میں نے کہا "دیپک تم میرے لیے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہو اس بات کی مجھے خوشی اور اطمینان ہے۔ مجھے
اور کیا چاہیے مگر مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے۔ حالاں کہ تمھارا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے لیکن لوگوں کو اصلی مٹھائی تو
نہ دیا کرو۔ بولا "مجتبیٰ صاحب! آپ بھی تو لوگوں کو دھاندلی ہنساتے رہتے ہیں۔ یہ سماج آپ کی باتوں پر ہنس تو دیتا
لیتا ہے لیکن اس کی قیمت آپ کو کہاں ادا کرتا ہے"۔
سکسینہ کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں مٹھائی فروش ہوں اور وہ مزاح نگار ہے۔

شگوفہ کی قیمت میں اضافہ

کاغذ
کی قیمتوں میں مہنگائی کی
وجہ سے شگوفہ کے عام شمارہ کی قیمت میں بھی اس شمارہ
سے اضافہ کیا جا رہا ہے
مارچ ۱۹۹۵ء سے
شگوفہ کی قیمت ۹ روپے ہوگی

(ادارہ)

خامہ بگوش

شاعری کر دریا میں ڈال

ایک مرتبہ ڈاکٹر انور سدید نے لکھا تھا کہ حشر کے دن جب خدا یہ پوچھے گا کہ دنیا میں کیا کیا تو میں اس کے جواب میں اپنی تمام تصانیف پیش کر دوں گا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا کہ اور لوگ تو فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جائیں گے لیکن ڈاکٹر انور سدید اپنے ہی لکھے پر گرفت میں آجائیں گے۔ استاد لاغر مراد آبادی نے ڈاکٹر صاحب کو ان لفظوں سے داد دی تھی۔ "جن کتابوں کو خدا کے بندوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے بھی حجاب آنا چاہیے، انھیں خدا کے حضور پیش کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔"

خیال تھا کہ اس قسم کے تبصرے پڑھ کر ڈاکٹر صاحب محتاط ہو جائیں گے اور خوفِ خدا اور خیالِ بندگان کو دل میں جگہ دیتے ہوئے جناب احمد ندیم قاسمی اور ان کے حاشیہ نشینوں پر کلوخ اندازی سے اجتناب کریں گے۔ یہ خیال جو لینت کے کسی لمحے میں آیا تھا اسی لیے ڈاکٹر انور سدید کی ایک ایسی کتاب بھی بالآخر شائع ہو گئی ہے جس میں قاسمی صاحب کے قلم قبیلے کے کسی فرد کا نام تو کیا، اشارتاً، کنایتاً بھی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اتنی احتیاط برتی گئی ہے کہ عہدِ حاضر کی شاعری اور اس کے مختلف رجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں قاسمی صاحب کا ذکر ناگزیر تھا، وہاں بھی خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کتاب میں ایک مضمون ۱۹۷۵ء کی غزل کے بارے میں ہے۔ اس میں بھی قاسمی صاحب کا ذکر نہیں ہے حالاں کہ اس سال قاسمی صاحب نے ایک درجن سے زیادہ غزلیں کہیں جن میں سے بعض اردو کی بہترین غزلوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ متعدد مجہول الاحوال شاعروں کے دو چند شعر اس مضمون میں درج کیے گئے ہیں لیکن قاسمی صاحب کا ایک مصرع بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ ڈاکٹر انور سدید پر ناانصافی کا الزام عائد کریں [illegible]

ناانصافی پر مبنی ہوگی۔ خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب سے دبستانِ بتوں کو بربنائے احتیاط خارج کیا ہے۔ احتیاط اس بات کی کہ "اغیار" کا ذکر کسی عنوان سے بھی آجائے تو ڈاکٹر صاحب کا قلم رواں ہو جاتا ہے۔ اس روانی کے آگے بند باندھنے کے لیے ضروری تھا کہ اغیار کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی جو کتاب اس وقت پیشِ نظر ہے، اس کا نام شاعری کا دیا ہے اور یہ گزشتہ مہینے شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اس میں وہ تمام مضامین شامل کر دیئے ہیں جو انھوں نے گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں جدید شاعری کے حوالے سے لکھے تھے۔ کتاب کا بڑا حصہ غزل اور غزل گو شاعروں کے بارے میں ہے۔ کچھ مضامین میں نئی نظم اور اس کے رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کا ایک حصہ نعت اور نعت گو شاعروں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے ہر مضمون میں جدید اردو شاعری کے کسی نہ کسی مسئلے کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر انور سدید اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں تاہم قارئین کے لیے اختلاف رائے کی بھی خاصی گنجائش موجود ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی بعض آرا ان کے مطالعے کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کے تعلقات کی وسعت کی بھی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے بعض دوستوں اور نیازمندوں کو بھی اہم شاعروں کی صف میں بٹھا دیا ہے۔ جو دوستوں اور نیازمندوں کی صف میں اچھے لگتے ہیں۔ کسی دوسری صف میں بیٹھ جائیں تو وہ صف ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ ویسے تو آج کل تنقید کا سارا کاروبار ہی تعلقات کی بنیاد پر چلتا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب کو تو خدا نے علم سے بھی نوازا ہے، اگر اس علم کی بنیاد پر وہ دوستی اور شاعری میں امتیاز کر لیتے تو یہ ان کے دوستوں کے حق میں بہتر ہوتا۔

علم کی بات چلی تو بطورِ جملۂ معترضہ یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ دولت کی طرح علم کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ سفید علم، کالا علم، بیدار علم، خفتہ علم۔ سفید دولت کی طرح سفید علم وہ ہے جو آدمی محنت سے حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھتا اور مسرتوں کو سمیٹتا ہے۔ جب علم مزید علم کا ذریعہ بنتا ہے اور دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے تو اسے بیدار علم کہتے ہیں۔ جس دولت کو حفاظت کے خیال سے تجوری میں دفن کر دیا جائے اور کام میں نہ لایا جائے تو وہ دولت خفتہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح وہ علم، علم خفتہ ہے جس سے خود کوئی کام لیا جائے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ سفید دولت کے مقابلے پر کالی دولت (جسے کالا دھن بھی کہتے ہیں) وہ ہے جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی جائے۔ کالا علم بھی اسی قسم کی چیز ہے اس کے ذریعے آدمی اپنے دشمنوں کی غلطیوں اور کمزوریوں کا سراغ لگاتا ہے اور بوقت ضرورت اس علم کے ذریعہ دشمن سے نبرد آزمائی کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے پاس صرف علم خفتہ نہیں ہے باقی ہر طرح کا علم ہے بلکہ کالا علم کچھ زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکیلے درجنوں حریفوں کی مزاج پرسی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں جملہ معترضہ ختم ہو گیا لیکن کالم ختم نہیں ہوا کیونکہ ابھی ہمیں ڈاکٹر صاحب کے ایک اور وصف کا ذکر کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب عالم ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی بھی ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر لکھتے ہیں تو ہر ممکن ذریعے سے معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو بذریعہ کشف بھی حقائق کا سراغ لگاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کی محنت اس نیکی یا شاعری جیسی نظر آنے لگتی ہے جو دریا میں ڈال دینے کے لائق ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایسے موضوعات پر بھی وقت صرف کرتے ہیں جن پر خامہ فرسائی کرنا قرطاس و قلم کے ساتھ نہیں تو وقت کے ساتھ ناانصافی ضرور ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں ہائیکو اور نثری نظم جیسے موضوعات پر مضامین پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ علم کی طرح وقت بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس بے حد و بے حساب ہے۔

ہمارے عام نقاد اچھی شاعری پر بُرے تنقیدی مضامین لکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر انور سدید بری شاعری پر اچھے مضامین لکھنے میں جواب نہیں رکھتے۔ انھوں نے اردو میں ہائیکو کے بارے میں طویل مضمون لکھا ہے اور بے شمار ہائیکو لکھنے والوں کے کلام سے مثالیں دے کر بتایا ہے کہ یہ جاپانی صنفِ سخن اردو میں بھی مقبول ہو رہی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ جاپانی کاروں اور دیگر مصنوعات کی طرح ہائیکو بھی ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہے اور ان مصنوعات کی طرح ہائیکو بھی ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہے اور ان مصنوعات ہی کی طرح ہماری بعض ضروریات کو بھی پورا کر رہی ہے جن میں سرِ فہرست یہ ہے کہ جو شعراء کسی مروجہ صنفِ سخن میں کمال نہیں دکھا سکتے وہ ہائیکو کے سہارے صاحبِ کمال بن جاتے ہیں۔ ہائیکو لکھنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کراچی میں جاپانی سفارت خانے کی طرف سے ہر سال ہائیکو مشاعرہ ہوتا ہے جس میں شرکت کرنے کا معاوضہ بھی ملتا ہے۔ بہت سے شاعر تو صرف اس مشاعرے میں شرکت کے لیے ہائیکو لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے اس پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ ہمارے بڑے شاعروں نے اب تک ہائیکو کی طرف توجہ نہیں کی۔ انھوں نے بڑے شاعروں کی ایک فہرست پیش کی جس میں جمیل ملک، غالب احمد، ذوالفقار احمد اور احمد ظفر کے نام بھی شامل ہیں۔ ان ناموں کو دیکھتے ہوئے یہ عرض کرنا ہے جانہ ہوگا کہ جب ہائیکو لکھے بغیر کسی کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہو تو اسے ہائیکو لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ شعرائے کرام تو اس وقت ہائیکو لکھیں گے جب انھیں بڑے شاعر سے آگے کی کوئی چیز بننا ہوگا۔

ڈاکٹر انور سدید نے ایک مضمون نثری نظم پر بھی لکھا ہے۔ ہمارے یہاں نثری نظم کے مخالف اور حامی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اعلیٰ ادب صرف نثری نظم ہی کے ذریعے تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے گروہ کی یہ رائے ہے کہ جو لوگ نثر لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ نظم لکھنے کی صرف وہی نثری نظم لکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ان دونوں انتہاؤں کا فاصلہ کم کرنے کے آرزومند ہیں اور چاہتے ہیں کہ نثری نظم کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے سے ہمیں اس حد تک اتفاق ہے کہ صرف کامیابی کا فیصلہ وقت پر چھوڑا جائے۔ ناکامی کا فیصلہ نثری نظم لکھنے والوں ہی کو کرنے دیا جائے کہ وہ یہ کام بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

۵۵

معاونین سے التماس

تخلیقات

صاف، خوش خط صفحے کے ایک جانب لکھ کر ارسال فرمائیں۔ اپنا پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں۔

غزل

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

میں ہوں شاعر مجھے دعویٰ نہیں گویائی کا
خود میں لکھتا نہیں قائل ہوں میں لکھوائی کا

تین استادوں سے اصلاح بھی کرواتا ہوں
بات ہے صاف مجھے ڈر نہیں رسوائی کا

کالا چشمہ ہے اُدھر نمبری چشمہ ہے اِدھر
کتنا احساس ہے دونوں کو بھی بینائی کا

چھ برس بیت چکے اُن کو وظیفہ پاکر
آج بھی شوق ہے مولانا کو انگڑائی کا

دے دیا ہاتھ میاں بھائی کو آخر اس نے
کتنا احساس ہے سالے کو میاں بھائی کا

یہ رقم جوڑے کی بیٹے نے نہیں مانگی ہے
راز پوشیدہ ہے یہ باپ کی دانائی کا

ناس لینے کے طریقے بھی جدا ہیں یارو
ناک والوں کو بھی کیا شوق ہے شہنائی کا

تجربے میں کئی بیماروں کو لائے اب تک
پھر بھی دعویٰ ہے انھیں اپنی مسیحائی کا

مرغ آیا تھا بھٹک کر جو پڑوسی کا ظریف
بات پوشیدہ رہے راز ہے انگنائی کا

دو بیویوں کا شوہر

نیاز سواتی (پاکستان)

پوچھو نہ کیسی طرز کی، کرتی ہیں گل فشانیاں
رکھتی ہیں مضطرب مجھے دونوں مری زنانیاں

شادی سے قبل کا سکوں، خواب وخیال ہوگیا
یاد نہ کر دل حزیں! بھولی ہوئی کہانیاں

وقت سے پہلے کر دیا بوڑھا، فساد نے مجھے
عہد شباب کی وہ اب باقی نہیں نشانیاں

میں تو غلام کی طرح، اپنے ہی گھر میں ہوں مقیم
کرتی ہیں دونوں بیویاں، اب مجھ پہ حکمرانیاں

آتا ہوں جب میں اپنے گھر ہوتی ہیں وہ لہو میں تر
رہتی نہیں ہیں امن سے، کرتی ہیں خوں فشانیاں

غائب ہوگیا

محوِ حیرت ہوں، بحالِ زار غائب ہوگیا
جب سُنا جراحی کا، بیمار۔ غائب ہوگیا

کام آدھا بھی نہیں اُس نے کیا کوٹھی کا، اور
پورے پیسے لے کے ٹھیکیدار غائب ہوگیا

جبری شادی کا نتیجہ ہوتا ہے آخر — یہی
دوسرے دن گھر سے برخوردار، غائب ہوگیا

ہم نے رکھا تھا جسے گھر کی حفاظت کے لیے
لوٹ کر سب کچھ وہ چوکیدار، غائب ہوگیا

وارتا تھا جان ہم پر جو الیکشن میں بہت
ووٹ لے کر ہم سے وہ غم خوار، غائب ہوگیا

دیکھ تو یہ ہے وہ جو تھا پھولوں کا میرے پاس ہے
اور جو نوٹوں کا تھا وہ ہار، غائب ہوگیا

اب تو اس میں بھی مِلاوٹ ہوگئی شامل نیاز
کھوٹ سے جو پاک تھا وہ پیار، غائب ہوگیا

جمیل صدیقی بدایونی

خلیل خاں کی فاختہ

سر اڑانے میں چنگیز خاں، کبوتر اڑانے میں شہزادہ سلیم، پتنگیں اڑانے میں لکھنؤ کے نواب زادے، جھوٹ ...ے میں گوئبلز، ہوش اڑانے میں مہنگائی اور افواہیں اڑانے میں اخبار کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ لیکن کسی زمانے ...یل خاں بھی تھے۔ کہتے ہیں وہ فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ فاختہ اڑانا آج الوقت دیگر اڑانوں کی بہ نسبت نہ صرف ...شوق ہے بلکہ ایک انقلابی قدم بھی ہے اگرچہ خلیل خاں کے فاختہ اڑانے کی روایت میں کئی باتیں تحقیق طلب ہیں آیا وہ ...بطہ فاختہ یا فاختائیں پالا کرتے تھے یا پھر جہاں ان کا مکان یا حویلی تھی اس میں فاختاؤں کے گھونسلے رکھ لئے تھے ...یت سحر" یا دوست تو" کی تسبیح مسلسل ان کے دولت خانے کو عبادت خانے میں اور مدات کو بیت الخلاء میں تبدیل ...تھی۔ نتیجتاً خلیل خاں مرحوم باش باش پھٹکار پھٹکار کر صبح و شام فاختائیں اڑایا کرتے یا بالفاظ دیگر بھگایا کرتے تھے۔ ...صداقت جو بھی ہو لیکن روایت یہی ہے کہ خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اس کی تصدیق ہماری زبان کے ...نہ بہ سینہ چلے آرہے ایک بے حد مقبول محاورے سے ہوتی ہے۔ اگر کسی کی گزشتہ شان و شوکت عزت و وقا ...پھیرنا ہو تو ہم اکثر کہہ دیا کرتے ہیں "اماں وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے" اور آپ فوراً سمجھ جاتے ...ہمارا مافی الضمیر کیا ہے۔ ہم اور آپ اسطرح مطمئن ہو جاتے ہیں گویا خلیل خاں کا زوال ہمارے سامنے ہی وقوع پذیر ...پس یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ خلیل خاں ابتدائے آفرینش سے حیات ہیں اور ان کے عروج و زوال کا ہر قوم اور ہر نسل میں جاری ہے اور غالباً قیامت تک جاری رہے گا۔ آنے والی نسلیں بھی انھیں اور انکی کو ہماری طرح ہی یاد کرتی رہیں گی۔

بہرحال یہ تو ایک تمہید تھی ورنہ یہاں اپنے ایک عزیز ترین دوست کا تذکرہ منظور ہے۔ شومئ قسمت سے ہمارے ...دوست کا نام بھی خلیل خاں تھا۔ اور ہم انھیں پیار سے خلیل بھائی کہتے تھے۔ وہ اور ہم نہ صرف آپس میں گہرے دوست ...تھے ایک ہی دفتر میں ملازم، ہم نوالا اور ہم پیالہ بھی تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ نوالے میں تو ہم شریک ہو جاتے تھے لیکن

، وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ بدقسمتی سے ان کا تبادلہ دوسرے شہر کو ہو چکا ہے اور اب ہم ان کے خلوص و محبت سے ہو چکے ہیں۔ لیکن آج بھی پورے اعتماد سے کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ زندہ دل، خوش مزاج اور دوست نواز انسان نہیں دیکھا۔ اس کے برعکس ان کی بیگم صاحبہ انتہائی شعلہ مزاج اور تیز و طرار قسم کی تھیں۔ اور خلیل بھائی کی حرکات و پر کڑی نگاہ رکھتی تھیں۔ مگر بقول خلیل بھائی کے کیا مجال جو آج تک ان کی ایک بھی غلطی پکڑ پائی ہوں۔ خلیل بھائی بیوی کے سامنے انکسار کی مورت بن جایا کرتے تھے۔ لیکن پیٹھ پیچھے وہ مستقل ان کو فاختہ بیگم کے نام سے یاد کرتے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا۔ خلیل بھائی نے بار میں دو تین چڑھائے تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلے جب گھر جانے کا وقت آیا تو ساتھ لیکر ایک سنسان مضافاتی سڑک پر پہونچے اور تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے دماغ کی چولیں درست کرتے تھے تاکہ جب وہ بیوی کے سامنے جائیں تو پورے ہوش و حواس میں ہوں لیکن قباحت یہ تھی کہ وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ نے پر مجبور کرتے تھے اور ہم بھی غیر ارادی طور پر ان کے پیچھے پیچھے بھاگا کرتے تھے۔ مگر ایک دن ہم نے ان کے ساتھ دوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ کیونکہ اس دن بے خیالی میں ہمارا پاؤں غلاظت میں جا پڑا اور ہم پھسل کر چاروں خانے چت، اسی عالم پر ف ہوا کہ آخر ہم کیوں اس نامعقول ریس میں حصہ لیتے ہیں۔ نہ تو ہمیں خمار اتارنا ہوتا ہے نہ بیوی کے سامنے ا ہونا ہے۔ الغرض اس قواعد کے بعد خلیل بھائی ایک تھیلی میں کچھ مٹھائی اور کچھ پھول وغیرہ رکھوا لیتے۔ ایک پڑیا سونف نکال کر منہ میں ڈالکر جگالی کرتے تاکہ بوئے ناخوشگوار نہ آئے۔ پھر ہم کسی سنجیدہ قسم کے مسئلہ پر گفتگو فرماتے ے وہ اپنے گھر تشریف لے جاتے اور ہم اپنے۔

یہاں پر ہم اپنے والد صاحب قبلہ کا بھی مختصر سا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ہمارے ابا بھی کمال کے آدمی تھے ا عمر تو ایسی زیادہ نہیں تھی یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہوں گے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال سفید ہو چکے تھے جس کا م وہ نزلہ پر لگایا کرتے تھے ان کی سب سے ممتاز خصوصیت ان کی پاٹ دار آواز تھی۔ جوانی میں فلم بینی کا شوق تھا ں جہاں تک ہماری ناقص معلومات کا تعلق ہے۔ انہوں نے مغل اعظم کے بعد کوئی فلم نہیں دیکھی۔ اس فلم کو دیکھنے کے ا اچانک انھیں الہام ہوا کہ ان کا تعلق بہادر شاہ ظفر کے گمشدہ قبیلہ سے ہے۔ اس دن سے ان میں وہ خطرناک تبدیلی آئی راجینا دوبھر ہو گیا۔ ہم دیر گئے گھر لوٹتے وہ اکثر صحن میں گردن اکڑائے ایک ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے دوسرے سے خلال تے ہوئے چہل قدمی کرتے ہوئے ملتے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک دم ساکت ہو جاتے اور براہ راست ہماری آنکھوں میں یکھنے لگتے تھے۔ اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے گردش وقت اپنے مقام پر ٹھہر گئی ہو اور ہمارا دل ناتواں انارکلی کی مانند رے سینے سے پھسل کر ہمارے قدموں میں گر رہا ہے۔ پھر اس جمود کو توڑتی ہوئی ان کی بلند آواز ہماری سماعت سے ٹکراتی "سلیم (افسوس ہمارا نام بھی سلیم ہی ہے) آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں" اور ہمیں محسوس ہوتا کہ اب یقیناً داروغۂ زنداں کو پکارا جائے گا۔ اور ہم پا بہ زنجیر کر دیئے جائیں گے۔ لیکن ہمارا شروع سے یہ عمل رہا ہے کہ بڑوں کو جواب نہیں دیا کرتے۔ لہٰذا ہم نہایت سعادت مندی سے سر جھکائے اپنے کمرہ میں جاکر دبک جاتے اور دم سادھے با حضور کے بڑبڑانے کی آوازیں سنتے رہتے۔

دوسرے دن جب ہم دونوں ملتے تو ایک دوسرے کو اپنی اپنی بپتا سنا کر محظوظ ہوا کرتے تھے۔ خلیل بھائی

آخر میں ایک جملہ ضرور دہرایا کرتے تھے۔ "ارے میاں فاختہ بیگم کو اڑانا تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے" اس طرح ہمارا (اپنے والد صاحب) اور خلیل بھائی کا (اپنی فاختہ بیگم کے ساتھ) ناٹک کافی عرصے تک چلتا رہا۔ آخر وہ ساعت نحس آ گئی جب ہمارا مشہور عالم محاورہ خلیل بھائی پر چسپاں ہو گیا۔ اگرچہ لپیٹ میں ہم بھی آ گئے تھے لیکن بعض تکنیکی وجوہات سے وہ ہم پر پوری طرح فٹ نہیں ہو سکا۔ تو صاحب ہوا یہ کہ شامت اعمال سے خلیل بھائی کو ایک خوش گلو اور خوش ادا طوائف کا گانا سننے کا چسکا لگ گیا۔ ان محترمہ کا نام اختر جان تھا۔ ہمارے دوست اس کے حسن اور اس کی آواز دونوں پر مر مٹے۔ انھوں نے ہمیں بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ شام ہوتے ہی حضرت غائب اور ہم حیران و سرگرداں کہ کہاں گئے؟ ایک دن ہم ان کو پکڑ کر بیٹھ ہی گئے۔ اور بہلا پھسلا کر حقیقت اگلوالی۔ اصل ماجرا سن کر ہمیں بڑا تاؤ آیا۔ ہم نے انھیں اس فعلِ قبیح پر کافی ڈانٹا پھٹکارا۔ اور ان سے قول لے لیا کہ وہ اب کبھی اختر کے کوٹھے پر نہیں جائیں گے لیکن دوسرے دن ہی معلوم ہو گیا کہ وہ پھر وہیں جا پہنچے۔ ہم نے سمجھ لیا کہ یہ باز آنے والے نہیں ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ مصیبت کہہ کر نہیں آتی۔ اچانک اس ڈرامے کے آخری سین میں ہم بد نصیب بھی ایک کیرکٹر بن گئے۔ ایک دن خلیل بھائی ہمارے سر ہو گئے کہ آج تو ان کے ساتھ ہمیں بھی اختر کا گانا سننے چلنا پڑے گا۔ دراصل وہ ہمارے سامنے اپنی وارفتگی کا جواز پیش کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے بہت منع کیا مگر وہ نہیں مانے۔ آخر ہم ان کے اصرار کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ بہرحال وہ ہمارے سب سے عزیز دوست تھے۔ ان کا کہنا ٹالنا ایک طرح سے دشوار ہی تھا۔ طے ہوا کہ ہم رات کو چلیں گے۔ احتیاطاً منہ پر مفلر بھی لپیٹ لیں گے حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم نے یہ بھی پوچھ لیا کہ ابھی تک فاختہ بیگم یا کسی اور کو شک تو نہیں ہوا ہے۔ بھائی نے جھٹ ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالی کہ ذرا بھی شک نہیں ہوا ہے۔ اور جب تک دم میں دم ہے شک ہونے نہیں دیں گے۔ بلکہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آج تو فاختہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ اتنے دنوں سے شاہ صاحب کے یہاں جاتے ہو آج ہمیں بھی لے چلو۔ یہ بتا کر خلیل بھائی بڑے فخریہ انداز میں مسکرائے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ خلیل بھائی نے ان دنوں ایک شاہ صاحب سے بیعت ہو جانے کا قصہ گڑھ کر بیوی کو بہکا رکھا تھا۔

رات کے آٹھ بجے کے بعد ہم خلیل بھائی کے ساتھ دھڑکتے دل سے محترمہ اختر جان کے کوٹھے پر قدم رنجہ ہو گئے۔ مگر صاحب وہاں پہنچ کر تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لوگ کوٹھا کوٹھا کہہ کر بلاوجہ بدنام کرتے ہیں ہمیں تو وہ راجہ اندر کا دربار لگا۔ ایک بڑے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بیچ میں انتہائی دیدہ زیب قالین۔ آس پاس گاؤ تکیے لگے ہوئے جن پر بہت سے معزز افراد جلوہ فرما تھے۔ بجلی کی روشنی سے جگمگاتا۔ خوشبوؤں سے مہکتا۔ دھیمی دھیمی موسیقی میں رقص کرتا ہوا اختر جان کا بالا خانہ ہمیں بے حد پسند آیا۔ ہماری اور خلیل بھائی کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ہم دونوں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ایک چنچل حسینہ نے ہمارے آگے خاصدان میں گلوریاں پیش کیں۔ خلیل بھائی نے ایک کڑکڑاتا نوٹ نذر کر کے گلوری منہ میں رکھ لی۔ ہم نے معذرت کر لی۔ اتنے میں ایک بت طناز، سراپا ناز و نیاز پیکرِ ساز و آواز ریشمی پردے کی اوٹ سے نکل کر حاضرین کو آداب و تسلیمات پیش کرنے لگی۔ طبلے پر تھاپ پڑی اور اختر جان نے اپنی سریلی آواز میں داغ کی یہ غزل چھیڑ دی۔ ؎

بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا
وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا

اہل محفل وجد میں آگئے ۔ واہ واہ کے شور سے کمرہ گونج اٹھا ۔ پانچ اور دس کے نوٹوں کی بارش ہونے لگی ۔ خلیل بھائی نے بھی جھٹ سے پانچ پانچ کے ہرے ہرے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بیچ میں سے توڑنے لگے۔ ہم نے کہنی مار کر انھیں روکا ۔ مگر وہ تو گڈی کے دو ٹکڑے کر کے ایک ہی دفعہ میں پانچ سو کا خون کرنے پر آمادہ نظر آئے ۔ اتنے میں باہر کچھ ہنگامہ ہوا ۔ کسی کے روکنے اور کسی کے ڈانٹنے کی آوازیں کان میں پڑیں ۔ ہمارے کان تو پہلے ہی سے اٹھک بیٹھک کر رہے تھے ۔ اب بالکل کھڑے ہو گئے ۔ ہم سانس روک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگے کیا دیکھتے ہیں کہ والد اعظم ایک موٹا سا "مولا بخش" سنبھالے ہوئے نزول اجلال فرما رہے ہیں ۔ پہلے تو ایسا لگا جیسے ہم خواب دیکھ رہے ہیں لیکن محفل پر چھائے موت کے سے سناٹے نے ہمیں بیداری کا احساس دلایا ۔ اور ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے پہلی بار جناب خلیل خاں کے ہاتھوں فاختہ کے بجائے ہرے ہرے طوطے اڑتے اور خلائے بسیط میں گم ہوتے ہوئے دیکھے ۔

••

غزل

محمود نشتر
حیدرآباد

جنتا ہے خوار و زار تو بتلاؤ کس لئے
لیڈر ہے بے وقار تو بتلاؤ کس لئے

لیتے ہیں ووٹ اور گرانی بڑھاتے ہیں
ایسوں کا اعتبار تو بتلاؤ کس لئے

لیڈر تو روز اڑاتا ہے مچھلی بھی مرغ بھی
ہم کھائیں صرف اچار تو بتلاؤ کس لئے

اُس کی گلی میں خوب پٹائی کے باوجود
جاتا ہوں بار بار تو بتلاؤ کس لئے

جوڑے کے روپیے تو اسی وقت چاہئیں
لیکن مہر اُدھار تو بتلاؤ کس لئے

میرے تو عقد کر لئیں نشترؔ ، ابھی انھیں
میرا ہے انتظار تو بتلاؤ کس لئے

رمیش منتری
مترجم: ڈاکٹر محمد اسد اللہ
(ناگپور)

مراٹھی کہانی

دیہاتی کالج

مہاراشٹر میں ایک بستی ہے "شِروَلی"۔ اسے پیٹھ رباچی شرولی (پاگلوں کی شرولی) بھی کہا جاتا ہے۔ جہاں گاؤں ہیں وہاں لیڈروں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ گاؤں کے تمام پرمت جلئیے وہاں کے لیڈر پاگل نہیں اچھے خاصے ہوشیار اور چالاک تھے۔ چوں کہ اس کے قریب ہی ایک بندھ ہے جہاں اسی نام کا ایک اور گاؤں تھا لہٰذا اسے پہچان کے لیے بندھ کی شرولی کہا جانے لگا۔

ایک مرتبہ پیٹھ رباچی شرولی کے لیڈر انجمن امدادِ باہمی کی کسی میٹنگ میں جمع تھے تبھی کسی عقل مند نے کالج کھولنے کی تجویز پیش کی۔ پوچھا گیا "کالج کیوں کھولیں؟"

تجویز پیش کرنے والے نے کہا: "بھئی ہر جگہ کالج کھل رہے۔ ہم بھی کھول لیں۔"

"کوالیج یعنی کیا؟" فسوار کے کارخانے دار تینا اڑگاوے نے بنیادی سوال پوچھا۔

"کالج یعنی ایسا ہے کہ بینیٹ پہن کر پروفیسر لوگ پڑھاتے ہیں اس کو بولتے ہیں کالج۔" دتّو سرگاوے نے آسان زبان میں کالج کی تعریف بیان کی۔

"اور اگر اپنے اسکول کے ماستروں کو پینٹاں پہنا دیئے تو پھر ہوگا کہ نہیں کالج؟"

اڑگاوے نے مسئلہ کا آسان حل بتایا۔

"ارے منگا اسکول کے پوتے بی پے، یم پے کیسے ہوں گے؟" ہری با نے سوال کیا۔

اسی طرح یہ بحث خاص لوگوں میں چلتی رہی۔ اسکول کی انتظامیہ ہی کالج کھولے۔ یہ تجویز سامنے آئی۔ اس کے صدر وٹھو پاٹل کا لڑکا شہر کے کالج میں کئی بار فیل ہو چکا تھا۔ انھیں خیال آیا گھر کا کالج ہوگا تو

نکل جائے گا۔ پھر دو چار لڑکوں کو سفارش کر کے ہر سال پاس کروا سکیں گے۔ انھوں نے حامی بھر لی۔۔۔ ارڈگا وے کو اب بھی تشویش تھی۔ کہنے لگے "پاٹل ایک بات ہے، اپنے لڑکے بی یے یم یے ہو گئے تو منسٹر کیسے بنیں گے۔؟ سنتے ہیں زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو منسٹری میں نہیں لیتے"۔

سارے لیڈر سوچ میں پڑ گئے۔ کالج بھی کھلے اور لڑکے منسٹری میں بھی جائیں۔ ان دونوں میں تال میل پیدا کرنے کے لیے سبھی غور و فکر کرنے لگے۔ آخر مسئلے کا حل وٹھو پاٹل ہی نے نکالا جو اس قسم کی تحریکوں میں پہلوان جیتے رہتے کہنے لگے۔

منسٹری بننے والا سو میں سے ایک آدھ ہوگا۔ وہ منسٹری بننے لگے گا تو کالج کا ریکارڈ پھاڑ کر پھینک دیں گے۔ دوسرا ریکارڈ لکھ کر اسے فیل بتا دیں گے۔ تعلیم کی جھنجھٹ نہیں ہونا۔ کیوں کہ دیہاتی لیڈر شپ کا دور ہے۔ کسی طرح کیوں نہ ہو گاؤں کا لڑکا منسٹری میں جانا ہی چاہیے۔ اسی طرح تعلیم کا بھی دور دورہ ہے، کالج بھی کھلنا چاہیے۔

آخر گاؤں کے خاص لوگوں نے شرولی شکشن منڈل کے تحت کالج کھولنے کی قرارداد پاس کر لی۔ کالج میں بھی کارخانوں کی طرح شیئر ہوتے ہوتے ہوں گے۔ یہ سوچ کر ایک ممبر نے سب سے اپیل کی ۔۔۔ "ہر ایک کو چاہیے کہ وہ ہزار روپے کا شیئر لے اور اپنے گنّے کالج ہی میں بھیجے"۔

"گنّے ؟!" "کالج میں لڑکے بھیجے جاتے ہیں گنّے نہیں"۔ دوسرے ممبروں نے وضاحت کی اور اسے سمجھایا کہ کالج میں نہ تو شیئر ہوتے ہیں نہ ان کا دس فی صد نفع ملتا ہے تو اس کا جوش کم ہوا۔

شرولی کا ایک لکچرر ضلع کے مقام پر کسی کالج میں تھا، اب تک اسے برادری باہر تصور کیا جاتا تھا۔ لوگ کہتے کہ لڑکوں نے پڑھ لکھ کر دیہاتی لیڈر شپ کا ستیاناس کر دیا۔ اب کالج کھولنے کی تیاریاں ہونے لگیں تو اس لکچرر کو عزت کے ساتھ بلوایا گیا۔ اسی کی رہنمائی میں کالج کا نام رکھنے کے لیے کسی سیٹھ کی تلاش شروع ہوئی۔ گاؤں میں ایک مارواڑی ساہوکار رہتا تھا۔ ساہوکاری کو زوال آیا تو کھیتی باڑی کرنے لگا۔ آزادی کے بعد ابھرنے والی دیہاتی لیڈر شپ سے سہما سہما رہتا تھا۔ الکشن میں بے چوں و چرا چندہ دے دیتا۔ ان لیڈروں نے اسے جا گھیرا۔ اسی کے نام پر "سیٹھ گوڑلال چندولال کالج" نام رکھنے کی تجویز پیش کی گئی۔ وہ یہ سوچے ہوئے تھا کہ ایک آدھ ہزار روپے دے کر جان بچالوں گا لیکن ایم ایل اے۔ فوجدار اور دیگر افسروں کو دیکھ کر ۲۰ ہزار روپے دینے پر راضی ہو گیا۔

گاؤں والوں کے تعلقات "اوپر تک" ہونے کی وجہ سے اجازت کا مسئلہ نہ تھا یونیورسٹی کو دکھانے کے لیے لکچررس کی فہرست تیار کرنا ضروری تھا۔ چناں چہ اخبار میں اشتہارات چھپے ڈیڑھ سو درخواستیں آئیں۔ انٹرویو کمیٹی بنی۔ "انٹرویو کمیٹی میں ایک عورت بھی ہونی چاہیے"۔ کسی نے مشورہ دیا۔

"عورتوں کی کیا کمی ہے"۔ وٹھو پاٹل مسکرائے۔ چناں چہ ان کی منظور نظر شیوحتی بائی کو جواب گاؤں میں گھر بسا چکی تھی، نامزد کیا گیا البتہ کاغذ پر اس کا نام شریمتی شیونتی بائی پاٹل لکھا گیا۔

انٹرویو کمیٹی کے ممبران جمع ہوئے۔ امیدواروں میں یا تو ریٹائرڈ لکچررس تھے یا بے روزگار نوجوان

جنھوں نے ابھی ابھی ایم اے کیا تھا۔ حساب کے لکچرر کو جن کا نام تپ ساکھرے تھا بلوایا گیا۔ انھیں امید تھی کہ وہ ایم اے سال دوم کا امتحان آئندہ دوسرے درجہ میں پاس کر لیں گے۔ ان سے نام پوچھنے کے بعد پوچھا گیا۔ کیا پڑھائیں گے؟

"حساب" انھوں نے جواب دیا۔

"ہساب کہیے" تپتا نے گویا تلفظ کی غلطی درست کی۔ ان دو سوالوں کے بعد کیا پوچھا جائے یہ ان کی سمجھ میں آیا۔ چناں چہ معاملہ شیونتی بائی کے سپرد کرتے ہوئے بولے ——— "بائی اب آپ پوچھیے" وہ بھی سوچ میں پڑ گئیں۔ حساب کے لکچرر سے انٹرویو کا یہ پہلا اتفاق تھا تاہم ہمت کر کے پوچھا۔

"روپیے میں کتنے آنے ہوتے ہیں ماسٹر؟"

تپ ساکھرے بری طرح چونکے۔ کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ کوئی ان سے اس قسم کا سوال کرنے کی جرات کرے گا۔ سوچا یہ اطلاع دے دیں کہ اب آنہ پائی کا رواج نہیں رہا۔ فوراً خیال آیا۔ یہ بات ان دیہاتیوں سے ہضم نہیں ہوگی۔ دل پہ جبر کر کے بس اتنا کہا ——— سولہ"

"اچھا ماسٹر ذرا پندرہ کا پہاڑہ تو سناؤ۔ دیکھیں" سرنائک نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ تپ ساکھرے بیزار ہو گئے۔ کیا یہ پرائمری اسکول ٹیچر کا انٹرویو ہے" تجربے کی خاطر دو سال کہیں نہ کہیں تو گزارنے ہی تھے۔ اسکول کا سنہرا زمانہ یاد کر کے پندرہ کا پہاڑہ بمشکل سنایا۔ اس کے بعد سکنڈ ڈویژن پر بحث ہوئی تو تپ ساکھرے کہنے لگے۔ مجھے امید ہے میں حاصل کروں گا۔ آپ میرا پچھلا ریکارڈ دیکھ لیجیے۔

"پچھلا ریکارڈ لے کر کیا بیٹھے ہو۔ وٹھو پاٹل بولے۔" پہلے یہ بتاؤ تمھارے پرچے کون جانچے گا۔ نمبر کون دے گا؟ معلوم کرو۔ مدد کی ضرورت ہو تو ہم ہیں۔ ہمارا ایک لڑکا یونیورسٹی میں چپکا ہوا ہے۔ ہم کہیں گے۔ ہمارے کالج میں لیا ہے کروا دو پاس۔ دیہاتی لیڈر شپ کا زمانہ ہے ماسٹر۔ تپ ساکھرے کا تقرر ہو گیا۔ یوں بھی وہ اکیلا ہی تھا۔

اس تقرر کے بعد گودام میں رکھے کھاد کے بورے اور کاٹھ کباڑ باہر نکال کر کالج کا بورڈ لگا دیا گیا۔ لائبریری کا مسئلہ زیر غور تھا۔ یہی حال لیبارٹری کا تھا۔ دھیرے دھیرے ہی سہی لیکن یونیورسٹی کو یہ چیزیں کبھی نہ کبھی تو دکھانی تھیں۔ انسپکشن کی تاریخ معلوم ہوتے ہی کسی دوسرے کالج سے کتابوں کی الماریاں اور تجربہ گاہ میں استعمال ہونے والے آلات ڈرامہ اسٹیج کی طرح شکر کے کارخانے کی گاڑیوں میں لاد کر لائے گئے اور سجا دیے گئے۔ مشاہدہ کرنے والی کمیٹی کے ممبران کی خاطر مدارات ہو چکی تو انھوں نے کہا۔ "پاٹل اب کالج کی جگہ دیکھ لیں۔" اس پر پاٹل نے پرنسپل بیدرکر سے پوچھا۔

"کیوں ہو، وہ کتابیاں اور کانچ کی نلیاں لے کر ٹرک آئے کہ نہیں؟"

بیدرکر ہکلاتے ہوئے بولے۔" آئے تو ہیں مگر پاٹل صاحب ذرا دھیرے بولیے"

کالج کی جگہ دیکھ کر ممبران نے چند مشورے دیئے اور لائبریری دیکھنے لگے۔ کتابوں کی الماریوں پر دوسرے

کالج کا نام دیکھ کر صدر نے پوچھا ـــــ "یہ نام؟"
"ہاں وہ بات یہ ہے کہ ہمارے کالج کو ایک دوسرے کالج نے ڈونیٹ کیا ہے۔" سرنایک نے جواب دیا۔

تجربہ گاہ میں بھی ہر جگہ دوسرے کالج کا نام دیکھ کر ممبران نے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ بھی کسی کالج کا عطیہ ہوگا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کسی منتری نے اس کالج کی زبردست سفارش کی تھی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے تقرر میں بھی اسی منتری کا ہاتھ تھا۔ اس صورت میں ممبران کمیٹی آنکھیں اور منہ بند نہ رکھتے تو کیا کرتے۔ تجربہ گاہ کے معائنے کے دوران گاؤں کے لیڈروں نے اپنی علمی لیاقت کا مظاہرہ ضروری سمجھا۔ ایک شیشے کی نلی لوٹ گئی تو ہری بابھنے لگے۔

"صاحب یہ کانچ کی نلیاں اسی طرح پھوٹیں گی۔ بس ذرا یہ کالج شروع ہو جائے یہ ساری کانچ کی نلیاں اسی طرح پھوٹیں گی۔ یہ ساری کانچ کی نلیاں نکال کر ہم لوگ لوہے کی نلیاں رکھنے والے ہیں۔ چاہے جتنے تجربے کرو۔ ایک بھی نلی نہیں پھوٹے گی۔"

سائنسی تجربات میں شیشے کے بجائے لوہے کی نلی کے استعمال کا خیال سن کر ممبران بھی پھڑک اٹھے دل ہی دل میں دیہاتی لیڈرشپ کو صلواتیں سناتے رہے۔ اپنا سر تھام کر ریمارک لکھا ـــ "بہت خوب" اور چل دیئے۔

جون میں کالج شروع ہونے جا رہا تھا۔ بڑی امید تھی کہ سیٹھ گنٹولال چندولال ایک لاکھ روپے عطیہ دیں گے۔ اس امید پر پانی پھر گیا تو نام بدل کر وائے ایس کالج (دیئے ٹوسے شرونی کالج) رکھ دیا گیا۔

کالج کے افتتاح کے موقع پر ایک ایم ایل اے "کھڑا ٹھے" فرمانے لگے۔ "میں تو اپنی زندگی میں کبھی کالج نہیں گیا، دیس کے لیے میں نے چوتھی کلاس ہی سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ہاں میں تقریر کرنے کے لیے یعنی کالج کے لڑکوں اور پروفیسروں کی رہنمائی کے لیے کالج جاتا رہا ہوں۔ آج اس کالج کا افتتاح کرتے ہوئے میں آپ کو خاص طور سے دو باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا ہندوستان سن ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اور دوسری بات یہ کہ ہم سب کو گاندھی جی کا رستہ پکڑنا ہے۔ اس سال گاندھی جی کی سالگرہ کی صدسالہ منائی جا رہی ہے میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ کم از کم اس سال تو بھی گاندھی جی کے رستے سے چلو بھلے ہی آپ اس کے بعد اپنے پرانے رستے سے چلے جانا۔"

اس بھاشن پر لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد غیونتی بائی نے رسم شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہم نے تہیہ کر لیا کہ تعلیم کو بہت ہی یعنی بہت ہی زیادہ پھیلا کر رہیں گے۔ میں منتری مہودیہ کو یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ انھیں اس گاؤں کے ہر گھر میں ایک کالج کھلا ہوا نظر آئے گا۔" گھر گھر بجلی پہنچانے کی اسکیم کی طرح ہر گھر میں کالج کھولنے کا انوکھا خیال لوگوں کو بہت پسند آیا۔

جون میں کالج شروع ہو گیا۔ آرٹس کامرس کی چار کلاسس تھیں۔ اور کل چالیس طلبا جن پر آٹھ لکچررس اور ایک پرنسپل کا تقرر کیا گیا تھا۔

کالج شروع ہوئے بہ مشکل تین چار دن ہوتے ہوں گے کہ گاؤں کے گنّے کے بڑے کاشتکار وٹھو پاٹل موٹر میں سوار علی الصبح کالج آئے۔ پرنسپل کو ایک طرف لے جا کر کان میں کچھ کہا۔ کیمسٹری کے لکچرر تاوڑے کو بلوایا گیا۔ اور تینوں جیپ میں سوار ہونے لگے۔ تاوڑے نے کہا۔۔۔ "لیکن ابھی تو پانچ منٹ بعد میرا پیریڈ ہے۔"

"تمھارا پیریڈ گیا چولھے میں۔ ماسٹر یہ کام بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر وٹھو بابا پاٹل نے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا حکم دیا۔ آخر جیپ وٹھو بابا پاٹل کے گنّے کے کھیت میں جا کر رکی۔ ایک ٹین کے سائبان میں پہنچ کر پاٹل نے کہا۔ "بیٹھو ماسٹر۔" پاس کھڑے ہوئے نوجوان کو تین گلاس لانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر میں لڑکا تین گلاس سفید مشروب لایا۔ "لو ماسٹر۔ پہلی دھار کا ہے۔"

"یہ کیا ہے؟" تاوڑے نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

بیدر کر ایک گھونٹ لے کر بولے۔ "بات دراصل یہ ہے ماسٹر کہ ہمارے پاٹل صاحب ہاتھ بھٹّی (دیسی شراب) نکالنے میں ایکسپرٹ ہیں۔ انھیں تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔" تاوڑے نے گلاس منہ کو نہ لگاتے ہوئے واپس رکھ دیا اور چڑ کر بولا۔ "میری مدد؟" "ہاں۔۔۔ بیدر کر بتانے لگے ارے تم رسائن شاستر (کیمسٹری) کے لکچرر ہو تا تمھیں اس رسائن (شراب) کی معلومات زیادہ ہیں۔ اس لیے پاٹل صاحب چاہتے ہیں کہ اس علاقے میں ان کی ہاتھ بھٹّی کی شراب سب سے زیادہ چلے تم کچھ ایسا فارمولا نکالو۔ یعنی اس سے یہ ہوگا کہ تمھاری جو لکچرر کی پوسٹ ہے اس کو پروموشن دے کر تم کو پروفیسر کا گریڈ مل جائے گا۔"

تاوڑے کو زبردست جھٹکا لگا۔ کیمسٹری اس کام بھی آسکتی ہے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ "لیکن اس ہاتھ بھٹّی کا اور کالج کا کیا تعلق؟"

اب وٹھو پاٹل آگے بڑھے۔۔۔ "ارے بھئی تعلق یعنی کالج کا آدھا پگار ہم اسی ہاتھ بھٹّی سے دیتے ہیں۔ دیہاتی لیڈر شپ کا زمانہ ہے۔ تم کو اس میں ہماری مدد کرنا چاہیے۔"

یہ بات اثر کرنے والی تھی۔ ہاتھ بھٹّی بند ہو گئی تو تنخواہ بند اور تنخواہ بند تو ہو گئی چھٹی۔ ماں لینے کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ مگر دل میں ٹھان لی کہ آئندہ برس نئے کالج میں نوکری ڈھونڈنا ضروری ہے۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔۔۔

"اگر پولس کا چھاپہ پڑا اور میں اس میں پکڑا گیا تو؟"۔۔۔ اس پر وٹھو پاٹل کھلکھلا کر ہنس پڑے "ارے ماسٹر تم ناسمجھ ہو کہ تمھارا دماغ چل گیا ہے؟"

کلاس میں مشکل سوالوں کا جواب دینے والے لکچرر سے اس سادہ سوالوں کا جواب نہ بن پڑا۔

"ماسٹر پولس والے چھاپہ ماریں گے کیوں؟ فوجدار کو ہیڈ کانسٹیبل بنایا میں نے۔ اور ویسے ہر مہینے "ہفتہ" شروع ہے۔ اپنا کام نقدی والا۔ سرکار کا پگار رک سکتا ہے اپنا ہفتہ نہیں رک سکتا۔ دیہاتی لیڈر شپ کا زمانہ ہے۔ سب کو ہفتہ برابر ملنا چاہیے۔ بیدر کر اپنے ماسٹر کا ہفتہ بھی تم ہی ٹھیرالو اور دیتے جاؤ مہینے کے مہینے۔"

پروفیسر تاوڑے کے علم کیمیا کے ساتھ انصاف کرکے وہ لوگ چل دیے۔

اسی کالج میں سماجیات کے ایک لکچرر تھے بھیم راؤ وڈو۔ ایم اے کیا اور نوکری مل گئی۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر مقصدیت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ ایک دن آٹھ دس طلبا کو لے کر گاؤں کے باہر کھیتوں کی طرف جانے والے کچے پکے راستے کو درست کرنے کا عزم لے کر چلے انھیں امید تھی کہ کالج کے طلبا نے پروفیسر وڈو کی رہنمائی میں "شرم دان کیا۔" اس قسم کی سرخیاں بمبئی تک کے اخباروں میں مع تصویر شائع ہوں گی۔ دوپہر کی بھری دھوپ میں بارہ بجے تک کام چلتا رہا۔ کھانے کے لیے سیٹی بجانے ہی والے تھے کہ کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے۔ پروفیسر خود پھاوڑا اٹھا کر کام میں جٹ گئے۔

ایک موٹا پہلوان قسم کا آدمی آگے بڑھا— "یہ کیا لگا رکھا ہے لڑکو!"

"ہم راستہ بنا رہے ہیں۔ ہفتہ بھر میں یہاں سے موٹریں جانے لگیں گی۔"

پروفیسر کو امید تھی کہ گاؤں والے اس کام کو سراہیں گے۔ ممکن ہے کھانے کی دعوت بھی دیں۔

"رستہ وستہ تیار کیا تو ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گا۔ ایک ایک کی۔ یہ کام بند کرو اور رستہ پکڑو اپنا سمجھے۔" پروفیسر وڈو کو زبردست جھٹکا لگا۔

"بھئی۔ ہم یہ راستہ بنا رہے ہیں اس سے تمہارے کھیتوں کو کیا نقصان ہے؟" پروفیسر نے اپنی پوزیشن سنبھالنے کی کوشش کی۔

"یہ کون ہے؟" گاؤں والوں میں سے ایک آدمی نے پوچھا:

"ہمارے کالج کے پروفیسر ہیں۔" ایک طالب علم نے جواب دیا۔

"سماجیات کے" دوسرے نے لقمہ دیا۔ گویا طبیعات کے کہا ہوتا تو عزت میں کمی ہو جاتی۔

"اچھا یعنی ماستر ہے۔" پہلوان نے تمام علوم پر اپنی مہارت کا اعلان فرما دیا۔

"یہ دیکھو ماستر! اب تمہارا سارا سامان سمیٹو۔ راستہ بنا تو موٹر آئے گی کہ نہیں ادھر؟"

"ہاں اسی لیے تو ہم شرم دان کر رہے ہیں۔" پروفیسر نے ذرا جوش کے ساتھ کہا۔

"ارے وہی تو ہم کو نہیں چاہیے۔ پہلوان نے آخری فیصلہ سنا دیا۔

"ادھر موٹر آئی تو ہماری ہاتھ بھٹی پر چھاپہ پڑے گا۔ اس سے بچنے کے لیے تو ہم نے رستے پر پتھر ڈال کر رکھے ہیں۔ ماستر تم بھلے آدمی ہو ایسے گندے کام بند کرو۔

"تمہارے وٹھوبا پاٹل پر نہیں پڑتا چھاپہ۔ اس کی پہنچ اوپر تک ہے۔ لگتا تو ہے اسی نے تمہیں بھیجا ہے یہاں راستہ بنانے کے لیے۔"

پروفیسر کی سمجھ میں آ گیا کہ آج کے ہندوستان میں اور خاص طور پر مہاراشٹرا کے دیہی علاقے میں سماجیات کا اور خود اس کا مقام کیا ہے۔ اس نے سیٹی بجائی اور تمام طلبا کو واپس ٹرن کرنے کو "لانگ مارچ" کا حکم دیا۔

دوسرے دن گاؤں والوں نے راستہ اسی طرح کیچڑ بھرا بنا دیا۔

پروفیسر کا سماجی خدمت کا بھوت اتر گیا۔ اسی دوران ہسٹری کے لکچرر کو پرنسپل نے طلب کیا اور کہا تمھیں ایک کام سونپنا ہے۔ سوانح عمری لکھنی ہے۔

"کس کی شیواجی مہاراج کی؟"

"نہیں لیکن اتنی ہی اہم ہے۔"

"اچھا لیکن کس کی؟"

"وٹھو پاٹل کی۔" بیدر کرنے سادگی سے جواب دیا۔

"رقم کتنی ملے گی؟" پروفیسر ننگر کرنے کاروباری لہجے میں پوچھا۔

"دراصل کیا ہے۔ وٹھو پاٹل کو ضلع پریشد میں چن کر آنا ہے۔ اس کے بعد وہ تمھارے لیے کچھ کریں گے۔"

"یعنی پیسہ نہیں ملے گا۔"

"تب تو مشکل ہے۔ اگر آج پانچ سو روپے نقد ملیں تو میں وٹھو پاٹل تو کیا کسی بھینس کی بھی سوانح عمری لکھنے کو تیار ہوں۔"

ٹھیک ہے بیدر کر بولے گے۔ کالج کے کرکٹ کے سامان کے لیے پانچ سو روپے کا خرچ ڈال دیں گے تم رسیدیں دے دینا۔ پروفیسر نے جو سوانح لکھی اس میں رام چندر جی سے گاندھی جی تک سب کی خوبیاں وٹھو پاٹل میں جمع کر دیں۔

وٹھو پاٹل ضلع پریشد کے صدر چن لیے گئے بعد ہی انھوں نے کالج کو ۲۰ ہزار روپے عطیہ دیا۔ واقعتاً ضلع پریشد میں اس کی کوئی شق نہ تھی مگر جعفر آباد سے بھینس خرید کر دودھ کی پیداوار بڑھانے کی اسکیم کے تحت مدد کی صورت نکالی گئی۔ ایک مخالف ممبر نے اس معاملے میں منہ کھولا تو اسے ہوا میں کنواں کھودنے کے لیے ڈیڑھ ہزار کا قرض منظور کر کے بند کر دیا گیا۔

اس طرح کالج کا نام کالج دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اسے یونیورسٹی بنانے کی مانگ کی جا رہی ہے۔ وٹھو پاٹل کو وائس چانسلر بنانے کی بھی تجویز ہے۔ لیکن وٹھو پاٹل نے وائس چانسلر کو ملنے والی تنخواہ اور دیگر مراعات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد ضلع پریشد کی صدارت کے عہدے پر بنے رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۵۵

صاحبِ دیوان

زبیر الحسن غافلؔ
چاتباسہ (بہار)

مر رہے تھے حضرت غافلؔ اِسی ارمان میں
نام ہو میرا بھی شامل صاحبِ دیوان بھی

مبتدی شاعر کے دل کو میں بھی دہلانے لگوں
ایک مجموعہ کا خالق کاش کہلانے لگوں

سڑ رہے ہیں رکھے رکھے سب کلام لاجواب
پبلشر للہ کوئی چھاپ دے میری کتاب

شاعروں کی صف میں میرا نام بھی آجائے گا
مجھ کو اُستادِ سخن یاروں میں سمجھا جائے گا

اُن کے چھپنے کی مگر آئی نہ تھی صورت نظر
کھا رہے تھے رفتہ رفتہ جن کو دیمک چاٹ کر

آخرش کچھ دوستوں نے مشورہ اُن کو دیا
جوڑ لو اُردو اکیڈمی سے تم اپنا رابطہ

آئے ہیں اس بار جو اس کے نئے سکریٹری
ہیں خدا کے فضل سے خود بھی ادب کے آدمی

ہے بڑی اُلفت اُنھیں ہر شاعرِ کنگال سے
کرتے ہیں ان کی مدد وہ جان سے اور مال سے

ایک دن اُن کو بُلا لو اپنے گھر تم چائے پر
ہو ضیافت کے لیے حسبِ الوسع تازہ بٹر

ہے یقیں تم پر بھی وہ نظرِ کرم فرمائیں گے
خرچ سرکاری پہ وہ دیوان چھپوا ڈالیں گے

کارآمد تھا یہ نسخہ کام آخر آگیا
الغرض دیوانِ غافلؔ اس طرح شائع ہوا

دوستوں کے قرض کے بَل پہ ضیافت کی گئی
ہاتھ سے اک منتری کے رسمِ اجرا بھی ہوئی

بیچنا لیکن کتابوں کا بہت دشوار تھا
رِسک لینے کو نہ بُک سیلر کوئی تیار تھا

بھاؤ میں ردّی کے بھی نہ بِک سکی کوئی کتاب
ایک شاعر کی تمنّا بن گئی "چِلّی" کا خواب

دوست بھی اُن کو لقب ناداں کا دینے لگے
"جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے"

پھر مہاجن کورٹ سے لے کے آئے قرقیاں
ضبط کرکے لے گئے سب میز صوفے کرسیاں

فکر کی وادی میں کھو جاتے تھے جس پہ لیٹ کر
کرتے تھے مشقِ سخن وہ جس پہ اکثر دن بیٹھ کر

بزرگوں کی وہ نشانی گھر کی جس سے شان تھی
لے گئے ظالم اُٹھا کر اُن کا وہ دیوان بھی

بیٹھنے تک کے لیے بھی جب نہ فرنیچر بچا
ان کتابوں کو ہی پھر تو کام میں لایا گیا

ساری جلدیں ڈھونڈ کر رکھی گئیں ترتیب سے
تخت کی صورت اُسے بخشی گئی ترکیب سے

نقص جو بھی تھا چھپایا ایک چادر ڈال کر
چین سے سوتے ہیں غافلؔ اب اسی دیوان پر

غزل

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد (جلگاؤں)

جب سے تمھارے غم میں پرفیکٹ ہوگیا ہوں
میں ہر جوان دل کا سبجکٹ ہوگیا ہوں

گلیوں میں مل کے دونوں اُودھم مچا رہے ہیں
تم کیاٹ ہوگئی ہو، میں ریاٹ ہوگیا ہوں

بیلن سے یوں نہ مارو، فریاد میری سُن لو
بس لیٹ ہوگئی تھی میں لیٹ ہوگیا ہوں

باتوں میں اپنے ساجدؔ جب سے سفیدی آئی
اس دن سے میں بھی آؤٹ آف ڈیٹ ہوگیا ہوں

★

خواجہ احمد عباس

باقی کچھ نہیں

ادیب، جرنلسٹ، ہدایت کار، فلم ساز احمد خواجہ عباس کو اردو کے گنے چنے افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ادبی زندگی کے ہر دور میں نئے تجربے کیے ——— اور جز نتائج کی تکنیک کے بعد اب وہ ایک اور نئی "حسابی تکنیک" آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے ——— باقی کچھ نہیں ——!

اردو میں اس تکنیک پر یہ پہلا افسانہ ہے۔

یکم جنوری ۱۹۵۳ء

مکھن لال ساہوکار سے مکان رکھ کر قرض ..	۵۰۰/-/-
خرچ	
گھر کے مصارف کے لیے والدہ کو	۲۰۰/-/-
قیمت اکاؤنٹ بک	/۶/-
بی۔اے کی ڈگری کا فریم	۱/۸/-
کپڑوں کی سلائی (ایک سوٹ دو پتلون)	۴۵/-/-
کرایہ تانگہ	۱/۲/-
کرایہ ریل (لکھنؤ سے بمبئی انٹر کلاس)	۵۵/-/-
قلی	-/۶/-
ریلوے بک اسٹال سے (پیرس کی راتیں، بوسۂ شب اور قتل کا راز)	۷/۱۰/
سائن اسکرین، فلم فیئر، فلم انڈیا اور سچی داستانِ محبت ..	۶/۴/-
چائے اور کیک	-/۱۰/-
سگریٹ گولڈ فلیک	۲/۲/-
جھانسی پیڈ نر (ریفریشمنٹ روم، ایک خاتون ہم سفر کے ساتھ) ..	۳/۱۲/-
کل اخراجات	۳۲۴/۱۴/-
باقی	۱۷۵/۲/-

۴ر فروری ۵۳ء:

باقی ماہ گزشتہ	۶/۸/-
قرض (شیر خاں پٹھان)	۲۰۰/-/-
کل آمدنی	۲۰۶/۸/-

اخراجات:

سود پیشگی ادا کیا گیا	۲۰/-/-
ہوٹل کا بل	۲۵/-/-
کمرہ لینے پر پگڑی	۱۰۰/-/-
سکنڈ ہینڈ میز کرسی وغیرہ	۳۰/-/-
بس کا کرایہ (ایمپلائمنٹ ایکسچینج تک) ..	-/۴/-
بس کا کرایہ (ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے ایک کمرشیل کمپنی تک)	۱/۲/-
چپراسی کی بخشش	۱/-/-
ہیڈ کلرک کو رشوت	۱۰/-/-
سگریٹ پیکٹ (کیپسٹن)	-/۱۰/-
بس کا کرایہ	-/۲/-
سینما کا ٹکٹ (انارکلی)	۱/۵/-
آئس کریم (انٹرویل میں دو عدد)	۱/۸/-
بس کا کرایہ (دو ٹکٹ)	-/۸/-
آشا کے لیے پھول	-/۸/-
ڈنر	۱/۸/-
کل مصارف	۱۹۴/۸/-
باقی	۱۲/-/-

یکم مارچ ۵۳ء

تنخواہ (۲۰ یوم)	۸۵/-/-

اخراجات

کمرے کا کرایہ	۲۵/-/-
بجلی اور پانی	۳/۸/-
ریل کا پاس	۵/۸/-
کپڑوں کی دھلائی (۲۵ عدد)	۲/۲/-
اخبارات (فلم فیئر، اسکرین، فلم انڈیا اور سچی کہانیاں) مارچ ۵۳ء	۶/۸/-
کتابیں (خواب اور ان کی حقیقت، نوجوان دل وغیرہ)	۷/۴/-
ٹیلی فون کال (آشا کو)	-/۲/-
سینما کے دو ٹکٹ (انارکلی)	۲/۱۰/-
آئس کریم	۱/۸/-
ویٹر کو بخشش	-/۴/-
ٹیکسی کا کرایہ (گرانڈ روڈ سے ماربار ہل تک)	۴/۱۴/-
ڈنر (دو عدد)	۴/۱۰/-
آشا کے لیے پھول	-/۸/-
ٹیکسی کا کرایہ (آشا کے گھر تک)	۳/۲/-
بس کا کرایہ آشا کے گھر سے اپنے گھر تک)	-/۴/-
روشنائی کی بوتل	-/۱۲/-
اسپرین کی ٹکیاں	-/۴/-
کل مصارف	۶۹/۱۰/-
باقی	۱۵/۶/-

۳ر جون ۱۹۵۳ء:

آمدنی:

نوٹس کے دوران کی تنخواہ	۱۰۵/-/-

اخراجات:

قرض کا سود	۲۰/-/-
کمرے کا کرایہ	۲۵/-/-
بجلی اور پانی	۳/۸/-
کپڑوں کی دھلائی (۱۲ عدد)	۷/۸/-
اخبارات	۱/۱۲
ٹرام کا کرایہ	-/۲/-
ریل کا پاس	۵/۸/-
لنچ	-/۱۰/-
چائے	-/۲/-
سیکنڈ ہینڈ کتابیں (محبت کی باتیں، ٹوٹا ہوا دل	۲/۸/-
ہیرس کی باتیں، ایک منافق کا اعتراف)	-/۱۲/-

آشا کو ٹیلی فون کال	-/۲/-
سینما کے دو ٹکٹ (انار کلی)	۲/۱۰/-
کوکا کولا (دو عدد)	-/۸/-
بس کا کرایہ	-/۸/-
آشا کے لیے پھول	-/۲/-
سگریٹ (چار مینار)	-/۳/-
میزان کل	۶۳/۱۲/-
باقی	۴۱/۴/-

۸؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء

آمدنی

ساہوکار سے قرض	۲۰۰/-/-

اخراجات

تمام قرض پر پیشگی سود	۴۰/-/-
والدہ کو منی آرڈر	۲۵/-/-
منی آرڈر کمیشن	-/۸/-
لفافے اور رائٹنگ پیڈ	-/۱۲/-
ٹکٹ (۲۰ عدد درخواستوں کے لیے)	۲/۸/-
ناشتہ	-/۸/
بس کا کرایہ (ایمپلائمنٹ ایکسچینج تک)	-/۴/-
ٹرام کا کرایہ (ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے لائبریری تک)	-/۱/-
کتاب لائبریری سے حاصل کی "میں غرض فروخت ہوں" لائبریری کا	-/۸/-
چائے	-/۲/-
بیڑیاں	-/۲/-
آشا کو ٹیلی فون کال	-/۲/-
سینما کے دو ٹکٹ (انار کلی)	۲/۱۰/-
چنا اور مونگ پھلی	-/۴/-
دو چائے	-/۴/-
ٹرام کا کرایہ	-/۲/-
آشا کے لیے پھول	-/۴/-
ڈنر ایک عدد	-/۸/-
کل مصارف	۷۴/۶/-
باقی	

مارچ ۱۹۵۴ء
باقی کچھ نہیں

۲۳؍ دسمبر ۱۹۵۳ء

آمدنی

ردی بیچ کر	۳/۶/-
کرسی میز وغیرہ بیچ کر	۹/-/-
گھڑی بیچ کر	۲/-/-
چور بازار میں کپڑے بیچ کر یعنی ایک سوٹ تین پتلون اور پانچ قمیص	۱۴/-/-
کل آمدنی	۲۹/۶/-

اخراجات

لائبریری (کتاب جو لی گئی فیصلہ مایوسی)	-/۸/-
آشا کو ٹیلی فون	-/۲/-
سینما کے دو ٹکٹ (انار کلی)	۵/۴/-
ڈنر (دو عدد)	۱۲/۸/-
ویٹر کو بخشش	۲/۸/-
آشا کے لیے پھول	-/۸/-
پانی	-/۴/-
پانی والے کو بخشش	-/۸/-
آشا سے گھر تک ٹیکسی کا کرایہ	۲/۴/-
ٹیکسی ڈرائیور کو بخشش	۱/۴/-
آشا کو خط	-/۲/-
نیند کی گولیاں	۲/۹/-
فقیر کو بخشش (جس نے دعا دی۔ بیٹا تو ہمیشہ زندہ رہے)	-/۱/-
کل مصارف	۲۹/۶/-
باقی	"کچھ نہیں"۔

رُجحان

م ۔ آصف آروی
برہ بترا ۔ آرہ

عقلمند ایک تھے ماہرِ نفسیات
ذہن میں ایک دن اُن کے آئی یہ بات

تھا انھیں خوبرو ایک ہی نونہال
عمر اس کی یہی سات یا آٹھ سال

یہ ارادہ ہوا اُس کا لوں امتحان
کیا بنے گا پسر مرا ہوکر جوان

لوں خبر کون رستہ ہے اس کو پسند
علم کا یا تجارت کا خواہش مند

کام پھر یہ مناسب انھوں نے کیا
امتحاں اس طرح سے پسر کا لیا

یعنی ٹیبل کے اک سمت رکھی کتاب
نقد بھی اور پھر ایک بوتل شراب

سوچا دل میں کتاب اس نے لے لی اگر
میں یہ سمجھوں گا ہوگا پسر علم در

نوٹ کی سمت گرچہ بڑھائے گا ہاتھ
اس کا رشتہ رہے گا تجارت کے ساتھ

اور بوتل کا شاید ہوا یہ غلام
تب میں سمجھوں گا غنڈوں کا ہوگا امام

اس کے رجحان کو جاننے کے لیے
چھپ کے وہ اک کنارے کھڑے ہوگئے

آئے نزدیک ٹیبل کے فرزند جب
ان کو چیزیں پسند آگئیں سب کی سب

جیب میں نقد رکھ لی بغل میں کتاب
اور اٹھائی جو رکھی ہوئی تھی شراب

دیکھ کر یہ کہا باپ نے واقعی
یہ گزارے گا کل عیش کی زندگی

گو رہے گا بہت آدمیت سے دُور
میرا فرزند لیڈر بنے گا ضرور

پُرلُطف یاد

بات آصف آئی اک گزری ہوئی پُرلطف یاد
دل یقیناً آپ کا بھی سن کے ہوجائے گا شاد

دوست اک کالج میں تھا میرا نہایت خوش کلام
تیز پڑھنے میں بہت "اولاد احمد" اس کا نام

خوبصورت بھی بہت اخلاق بھی اس کا بلند
میں آسے تھا اور وہ مجھ کو تھا حد درجہ پسند

روز کالج آنا جانا میرا اس کا ساتھ ساتھ
اس قدر قربت تھی جیسے ہوں بدن کے دونوں ہاتھ

پھر ہوا یہ دوستی میں آگیا اک انقلاب
یعنی اس نے کرلیا ساتھی کا اپنے انتخاب

پھنس گیا وہ خوبصورت اک پری کے دام میں
آرہا تھا روز کاغذ دونوں جانب کام میں

لڑ رہی تھی عاشق و معشوق کی چھپ کر نظر
ہورہا تھا رکھ کے کاپی میں ادھر کا خط اُدھر

پورے کالج میں محبت کی یہ پھیلی داستاں
ہر طرف چرچے یہی کرتے ملی سب کی زباں

اُن کی ہستی اس قدر مدہوشیوں میں کھو گئی
اُن کی شہرت ہیر رانجھا سے بھی اوپر ہوگئی

دوستی کا اس نے رشتہ مجھ سے توڑا تھا فضول
اس کی اس حرکت پہ میرا کیوں نہ دل ہوتا ملول

کیوں ہوا مجھ سے الگ وہ جب نہ تھا میرا قصور
میں نے سوچا اس کا بدلہ اس سے لینا ہے ضرور

مل گیا اک روز موقع دل کے لائق بے مثال
دوستوں کے سامنے اس سے کیا میں نے سوال

دوست میرے دو جواب اس کا مجھے تم سوچ کر
اپنی معشوقہ کو ڈیلی خط تو لکھتے ہو مگر

یہ بتاؤ خط کے آخر میں نقطے کے بعد تم
لکھتے کیا ہو "آپ کا" یا "آپ کی اولاد" تم

فضل حسنین
(الہ آباد)

شعری اکھاڑے

ایک زمانہ تھا جب مشاعروں میں با ذوق لوگ ہی شریک ہوا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ زمانہ اس حد تک ترقی کر گیا کہ با ذوق اور بد ذوق میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ فی زمانہ سامعین میں اکثریت ان کی ہوتی ہے۔ جنھیں گانے بجانے سے زیادہ شغف ہوتا ہے اور گلوسازی کے ساتھ ساتھ وہ اداکاری دیکھنے کے بھی متمنی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اصل شعرا کا بازار گر گیا اور وہ صرف شعری نشستوں سے ہی اپنا دل ٹھنڈا کرنے لگے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شعری نشستیں سو فی صدی کامیاب ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ یہ محفلیں عموماً شعرائے کرام پر ہی مشتمل ہوتی ہیں جہاں "من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" کے تحت ایک شاعر دوسرے شاعر کا کلام سنجیدگی سے سنتا ہے اور اپنی لیاقت سے کچھ زیادہ ہی داد دینے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اپنی باری آنے پر وہ بھی اچھی فصل کاٹ سکے۔ شاعری کے میدان میں کچھ خوائین کے کود پڑنے سے گلوکار حضرات مات کھا گئے اور ان کی اداکاری بھی ان مہ جبینوں کی اداؤں تلے دبنے لگی۔ یہاں ترنم کا ڈرامائی انداز بھی بے اثر ثابت ہونے لگا۔ لہذا سامعین کے ساتھ ساتھ انھیں ناظرین سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ چناں چہ ایسے شکست خوردہ شعر نے شعری نشستوں پر دھاوا بول دیا ہے اور یہ شائستہ محفلیں "منی مشاعرہ" میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔

ان شعری نشستوں میں بھی اب شعرا غول در غول اترنے لگے ہیں۔ دوران نشست اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کون شاعر کس اکھاڑے سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ ان نشستوں میں کسی شاعر کو صرف اس کے گروہ والے ہی داد دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دیگر اکھاڑے خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ سے کس حد تک بہ خاش رکھتا ہے، اس کا اندازہ بھی ان محفلوں میں بخوبی لگایا

جا سکتا ہے کیونکہ جو شاعر جس حد تک بدذوق ہوگا اپنے حریف شاعر کے کلام پر اتنا ہی بُرا منہ بنائے گا۔ البتہ کچھ باظرف قسم کے رقیب داد کی جگہ ایسی خاموشی و بے نیازی اختیار کر لیتے ہیں گویا انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ حضرات احتیاطاً دانت پر دانت بھی جما لیتے ہیں کہ کہیں بے خیالی میں کسی اچھے شعر پر بے ساختہ واہ نکل ہی نہ جائے اور انھیں اپنے اکھاڑے میں جوابدہ ہونا پڑے۔

مشاعروں کی طرح شعری نشستیں بھی اب کافی تاخیر سے شروع ہونے لگی ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہر شاعر اس مغالطے میں رہتا ہے کہ جس شاعر کو جتنی تاخیر سے دعوتِ سخن دی جائے گی، وہ اتنا ہی بڑا شاعر سمجھا جائے گا اور چوں کہ شاعر کبھی چھوٹا پیدا نہیں ہوتا اس لیے تقریباً تمام شعرائے کرام خود کو استاد تصور کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تاخیر سے پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض خود ساختہ استاد نشست کے اختتام پر پہنچتے ہیں اور ان کے کلام سے صرف صاحب خانہ ہی اخلاقاً محظوظ ہو پاتا ہے۔ دیگر شرکا قطعی محفوظ رہ جاتے ہیں۔

یہ بات بھی اب بہت عام ہو چکی ہے کہ شاعر مشاعرے میں شرکت کے وقت عموماً علیل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ مشاعرہ گاہ پہنچنے سے قبل ریاضت نیز ریہرسل میں شاعر اپنی تمام توانائی خرچ چکا ہوتا ہے۔ اس لیے مائیک تک بڑی مشکل سے پہنچ پاتا ہے۔ لیکن پہنچنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شاعر کلام پیش کرنے سے قبل اپنی ناسازی طبع کا ذکر نہ کرے تو اسے کم تر درجے کا شاعر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لیے شاعر بطور تمہید اپنی علالت کا اعلان اسی مستعدی سے کرتا ہے گویا یہ بھی اس کے کلام کا حصہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ شعر سناتے وقت جب اس پر وجد کا عالم طاری ہوتا ہے تو وہ اپنی اس مصلحت آمیز نقاہت کو یکسر فراموش کرتے ہوئے اپنی اصل آواز میں دھاڑنے لگتا ہے۔ اسی خدشے کے تحت بعض شعرا ایک دو شعر کے بعد ہی اُٹھا دیئے جاتے ہیں۔

بہت سے ایسے شعرا بھی پائے جاتے ہیں جو سامعین کی بے اعتنائی کے باعث ہمیشہ اپنے قدر دانوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور کوئی موقع ہاتھ آ جانے پر شعر سنا سنا کر خود تو صحت یاب ہو جاتے ہیں لیکن مخاطب کو بیمار کر جاتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے سے شاعری کے میدان میں استاد بننے کا مرض جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں شاگردوں کا قحط سا پڑ گیا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شاگرد کسی شاعر کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ اسے بہت سنبھال کر رکھتا ہے۔ کیوں کہ ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ جس شاعر کے پاس جتنے زیادہ شاگرد ہوں گے وہ اتنا ہی بڑا شاعر تصور کیا جائے گا۔

کبھی کبھی استاد اور شاگرد میں بھی نہایت دل چسپ قسم کی چشمک دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مثلاً کوئی استاد شاعر کلام پیش کر رہا ہے اور اس کا نام نہاد شاگرد بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس راز سے پردہ ہٹتا ہے کہ استاد اپنے شاگرد کی وہی غزل پڑھ رہا ہے جو شاگرد نے بغرض اصلاح استاد کو دے رکھی تھی۔ حالاں کہ استاد شاید قصداً ایسا نہیں کرتا کیوں کہ دونوں کی تخلیق عموماً ایک ہی معیار کی ہوتی ہے

اس لیے یہ چوک ہو جاتی ہوگی۔ کبھی کبھی تو جھگڑا اس حد تک طول پکڑ جاتا ہے کہ شاگرد اپنے استاد پر بے لاگ الزام لگا بیٹھتا ہے کہ موصوف عموماً اپنے شاگردوں کے کلام پر ہی اکتفا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ استاد جوابی کارروائی کے طور پر یہ کہہ بیٹھتا ہے کہ اس کے نام نہاد شاگرد کی تخلیقی صلاحیت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی۔ اس نے تو شاگرد مذکور کو بطور باڈی گارڈ پال رکھا ہے۔

ویسے اب سماج بیزار عناصر بھی ان شعری اکھاڑوں میں کود پڑے ہیں اس لیے تعجب نہیں کہ جلد ہی وہ وقت بھی آجائے جب یہ نشستیں میدانِ کارزار میں بدل جائیں۔

تشویش اس بات کی ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ وقت آ ہی گیا تو بے چارے کہاں جائیں گے جو بدقسمتی سے واقعی شاعر ہیں۔

فارم ۱۷ حسبِ قاعدہ

بابت "شگوفہ" حیدرآباد 500001

مقامِ اشاعت :	۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ۱
وقفۂ اشاعت :	ماہنامہ
پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ۸ ۷۶ ۔ ۱ ۔ ۱۷ دبیرپورہ حیدرآباد ۔ ۲۳
	" 　 " 　 "
مالک کا نام اور پتہ :	قیصر کمال 　 " 　 " 　 "

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط :

سید مصطفیٰ کمال

اقبال شانہ
(حقل، سعودی عرب)

گھونسلہ

(بلبل کاشمیری کی نذر....)

یار نے سر پر سجایا گھونسلہ — اپنی زلفوں کا بنایا گھونسلہ
ہوش کھو بیٹھے پرندے باغ کے — دیکھ کر کالی بلا کا گھونسلہ
چیل کوّے سر پہ ہیں منڈلا رہے — دیکھتے ہیں "واک"[لہ] کرتا گھونسلہ
دوسری منزل بنائیں جانِ جاں — گھونسلے پہ ایک چھوٹا گھونسلہ
اپنے بچے ساتھ لے جایا کریں — سر پہ ہے کافی کشادہ گھونسلہ
دو کبوتر کے مجھے انڈے ملے — رات جب میں نے ٹٹولا گھونسلہ
آدمی کی خصلتیں کوّے میں ہیں — چھینتا ہے دوسروں کا گھونسلہ
جس کا سر شانہ بڑا ہوگا بہت
ہوگا اس کا سب سے اونچا گھونسلہ

لہ WALK

سید علی شبنم کارواری
کاروار (کرناٹک)

ٹی۔وی

شوق سے دیکھئے اجی ٹی وی — دیکھئے گا ضرور نئی ٹی۔وی
نئی ہے تسکینِ ذوق کا ساماں — خوب بہلا رہا ہے جی ٹی۔وی
اینٹینا اس کی جان ہوتی ہے — اس سے پاتا ہے زندگی ٹی۔وی
کوئی رنگین ہے کوئی سادہ — ہے سیاہ بھی سفید بھی ٹی۔وی
اُن کو چشمہ ضرور لگتا ہے — دیکھتے ہیں جو ہر گھڑی ٹی۔وی
کبھی آواز گُل کبھی پکچر — کرتا رہتا ہے گڑبڑی ٹی۔وی
جو نکلتا ہے ویڈیو کیسٹ — ہاں اگلتا ہے بس وہی ٹی۔وی
جتنے چینل ہیں سارے چنچل ہیں — بن گیا دل کی بے کلی ٹی۔وی
کچھ ریپیرنگ کا کام نکلے تو — پھر دکھاتا ہے بے رخی ٹی۔وی
یہی دھندلی نظر کا باعث ہے — دردِ سر کا سبب یہی ٹی۔وی
جو نہ آتے تھے وہ بھی گھر آئے — وجہِ آغازِ دوستی ٹی۔وی
ویڈیو کیا ہے اک مداری ہے — ہم ہیں بندر تو ڈگڈگی ٹی۔وی

رزاق اثر شاہ آبادی

مالِ مسروقہ

میری پیاری زبان شوخ و شیریں کے سچے عاشقو! آدمی کی جب رگ شرافت پھڑکتی ہے تو وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بغیر جھجکے لنگوٹ کس کر اپنوں کی تو اپنوں کی غیروں کی بستی میں بھی مرنے مارنے کے لیے بے خطر کود پڑتا ہے اور جب کسی شریف انسان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے تو شوکت تھانوی، پطرس بخاری، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم یا دلیپ سنگھ ہو جاتا ہے لیکن جب کسی کی رگِ حماقت پھڑکتی ہے تو بے خوف و خطر ادب کے بیش بہا خزانے سے سرقہ کرنے کی جسارت بے مہارت کر بیٹھتا ہے۔ لہٰذا کچھ ایسا ہی دل چسپ حادثہ اس ماہ "بیدار ستارہ" میں رونما ہوا۔ کہ اخبار کی شہ سرخیوں کے مقابلے میں ایک ایسی خبر نے سنسنی پھیلا دی کہ ساکنانِ ادب کی دنیا میں زلزلہ سا آگیا۔ "زندہ دلانِ زبان و ادب" تو زندہ دلانِ زبان و ادب "مردہ دلانِ شہرِ خموشاں" بھی اپنی اپنی قبروں کے اندر جاگ اٹھے نہ صرف جاگ اٹھے بلکہ بیک زبان رمضان کی سحری جگانے والوں کی طرح چلا اٹھے:

ہم تو سو رہے تھے قبر میں کس نے ہمیں جگا دیا

آپ اخباروں میں دن رات پڑھتے ہی رہتے ہیں کہ فلاں شہر کے فلاں محلے میں پولیس نے رنگے ہاتھوں سارق کو پکڑ لیا۔ نہ صرف پکڑ لیا بلکہ اس کی نشان دہی سے مالِ مسروقہ بھی برآمد کر لیا — اب یہ الگ بات ہے کہ مالِ مسروقہ کبھی مالکِ حقیقی تک بہ خیریت جا پہنچا یا نہیں۔ کیوں کہ اخباروں میں صرف مالِ مسروقہ برآمد ہونے کی خبریں تو شائع ہوتی ہیں لیکن مالِ مسروقہ مالکِ حقیقی تک پہنچنے کی جھوٹے منہ بھی کبھی خبر نہیں چھپتی۔ اس لیے ہم سچے دل سے سچی قسم کھا کر یہ کہتے ہیں کہ مالِ مسروقہ چھوٹے بھائی کے گھر سے برآمد ہو کر

بڑے بھائی کے گھر منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس "وجہ انتقال" سے مالِ مسروقہ کی عظمت و حرمت پر کوئی آنچ
بھی نہیں آتی۔ مالِ مسروقہ مالِ مسروقہ ہی رہتا ہے۔

سرقہ کی ایک ایسی ہی اخباری خبر نے دنیائے ادب میں اتنی ہلچل پیدا کر دی کہ ہندوستان
کے وہ خطے بھی جو ماہرین کی نگاہ دوربین میں زلزلوں سے محفوظ سمجھے جاتے تھے زلزلوں سے پہلے ہی جھٹکے کھانے
لگے، اردو ادب اور اردو زبان پر ایسا برا وقت بھی آئے گا اردو کے دوستوں نے تو دوستوں نے اردو
کے دشمنوں نے بھی کبھی نہ سوچا ہوگا۔ اس لیے جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ کسی ایک منچلے کی رگِ ظرافت بلکہ
رگِ حماقت پھڑک اٹھی تو اس نامراد بے ادب نے پوری کی پوری غزل (مقطع میں اپنے تخلص کے اضافہ کے
ساتھ) برائے اشاعت شہر زندہ دلان کے ایک اخبار کو بھیج دی۔ اس غریب کی بدبختی اور ایڈیٹر کی
خوش بختی سے اس غزل کے مسروقہ ہونے کی تصدیق ہوگئی۔ غزل بھیڑ کے اس دورِ ناشناس میں ایڈیٹر
کی رگِ صحافت جو پھڑک اٹھی تو انھوں نے غزل کو اصلی شاعر کی اصلی تصویر اور اصلی نام اور اصلی تخلص کے ساتھ
شائع فرمایا نہ صرف شائع فرمایا بلکہ اردو ادب پر یہ بھی احسان فرمایا کہ سارق غزل کی تصویر کے ساتھ اس کا پورا پتہ
بھی شائع فرما کر یہ نشاندہی بھی کر دی کہ مالِ مسروقہ کس شہر کے کس محلے اور مکان سے برآمد کیا گیا ہے۔
تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ محکمہ پولیس کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے کہ مالِ مسروقہ مالکِ
حقیقی تک کس طرح پہنچایا جاتا ہے۔

اردو ادب میں سرقہ کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ زبانِ اردو۔ جس دن سے یہ بیچاری
اردو شاہی درباروں سے۔ محلوں سے ڈیوڑھیوں سے اور حویلیوں سے نکل کر بازار اور گلی کوچے میں آگئی ہے اسی
دن سے سرقہ کرنے والے اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ گرفتار شدہ سارق غزل نے تو صرف ایک غزل
کا ہی سرقہ کر کے اپنا نام گرامی شاعرانِ باکمال و باہنر کی فہرست میں لکھوانے کی حماقت کی ہے ورنہ اگر تحقیق
کی جائے تو ایک دن یہ بھی ثابت ہو جائے گا صرف ایک غزل ہی نہیں پوری کتاب کا ہی سرقہ کر لیا گیا ہے۔ اگر
سارقانِ ادب اپنے پیشہ میں ثابت قدم رہیں۔ انشاءاللہ وہ دن دور نہیں ایک کالی نظم ایک ٹھنڈی غزل کی طرح
ایک چوری کی غزل کے عنوان سے بھی کلام شائع ہونے لگے گا۔

صاحبو! ایک غزل یا افسانہ کا سرقہ بھی کیا سرقہ کی تعریف میں آتا ہے۔ آزادی کے بعد تو
ہمارے دیش میں سنا ہے کہ ایک صاحب نے دوسرے صاحب کی تحقیقی کتاب کو اپنے نام سے چھپوا کر
اکیڈیمی کا انعام بھی ہضم کر لیا۔ اسے کہتے ہیں آئینِ جہاں مرداں۔ ہمت مرداں مدد خدا کا محاورہ اردو
زبان میں یوں ہی گھس کر نہیں آیا ہے۔ اس لیے سارقانِ شعر و افسانہ سے گزارش ہے کہ وہ اس محاورے کو
ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھیں، اگر کوئی سارق غزل اپنی حماقت سے اور ایڈیٹر کی عداوت سے گرفتار ہو گیا ہے
تو ضروری نہیں کہ وہ بھی پکڑے جائیں گے۔ اس خیال کو دل سے نکال دیں اور برابر اپنی کوشش میں

لگے رہیں۔ ہاں ایک مشورہ یہ ہے کہ وہ زندہ شاعروں کے مقابلے میں مردہ شاعر کے کلام کا انتخاب کریں۔ ظاہر ہے مردے قبر پھاڑ کر باہر تو نہیں آئیں گے۔

شاعرانِ وقت سے بھی میری گزارش ہے کہ وہ اپنے اپنے دیوان، بیاضِ شعر کو محفوظ مقامات پر حفاظت سے رکھیں میرا مطلب کسی بنک کے لاکر میں رکھ کر چین کی نیند سو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی حیات میں ہی ان کا کلام کسی اور کے نام سے شائع ہو جائے اللہ نہ کرے دیکھتے ہی دیکھتے پورا دیوان ہی خالی ہو جائے۔ ویسے بھی ادھر کچھ مہینوں سے مجتبیٰ حسین کی "دیمک" اردو کتابوں پر بڑی مہربان ہے۔ الاماں والحفیظ۔

ooo

محمد حامد علی داغی
(گلبرگہ)

میں کسی ناریل میں کیوں رہتا!!

شہر میں، گھر تلاش کرتے ہوئے
در بہ در گھومتا ہوا اک شام
ساحلی سیر گاہ جب پہنچا
پیاس محسوس ہو رہی تھی بہت
ناریل، میں نے اک خرید لیا
اور سائے میں جا کے بیٹھ گیا
دیر تک ان سلگتے لمحوں میں
میں نے سوچا کہ شہر میں کتنے
ایسے گھر ہوں گے جن میں سب کچھ ہے
عیش و عشرت کے جن میں ساماں ہیں
اور اس شہر میں نہ جانے کیوں
سردی گرمی میں اور بارش میں
لوگ فٹ پاتھ پہ ہی جیتے ہیں
کچھ یونہی سوچتے ہوئے میں نے
ناریل کو کرید کر چھیڑا

(۲)

جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی
جب نمودار ہو گیا اک "جن"
دست بستہ غلام کی مانند
سر جھکائے ہوئے یہ عرض کیا
"حکم کیجے کوئی مرے آقا
ساری خدمات کو ہوں میں حاضر"
حوصلہ باندھ کر کہا میں نے
"حکم کیا! التجا ہے اک تم سے
میں غریب الدیار ہوں تنہا
مجھ کو چھوٹی سی جھونپڑی کوئی
سر چھپانے اگر میسر ہو
عمر بھر میں تمھیں دعا دوں گا"
"جن" ندامت زدہ یہ کہنے لگا
"ساری دنیا میں آج کل آقا
نسلِ آدم کی اتنی کثرت ہے
ہر جگہ بستیاں سی ہیں آباد
اب خلاء اور چاند تارے پہ
اُن کو شاید ملے سکوں

(۳)

جن، شیاطین، بھوت، پریاں سب
بے بسی کا شکار ہیں آقا
اور مجبور ہو کے ہر کوئی
بس گیا ہے یہاں وہاں جا کر
میرے بس میں جو کوئی گھر ہوتا
بے دیاری کا رنج کیوں سہتا
میں کسی ناریل میں کیوں رہتا!!"

سید فضل اللہ مکرم
جگتیال (کریم نگر)

ویلکم پلیگ

مضمون کا عنوان بہت سے لوگوں کو متحیر کر دے گا کہ دنیا میں بھلا ایسا کوئی انسان ہے جو پلیگ جیسے شیطانی مرض کو خوش آمدید کہے گا کیا کریں ہماری اپنی مجبوری ہے۔ ویسے چوہے اور آدمی میں صدیوں سے تہذیبی و ثقافتی تعلق رہا ہے۔ اگر ہم تاریخ کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھیں تو صفحہ صفحہ پر چوہے اور آدمی کو ساتھ ساتھ پائیں گے۔ پلیگ دراصل چوہوں کی بیماری ہے مگر اس کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانے میں آدم زادوں کے تاریخی رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سچ پوچھیے تو ان دونوں کے تعاون سے ہی طاعون کو پر لگ گئے ہیں اور ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے اور چوہے راتوں رات شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ چوہے ہزاروں ٹن اناج کھا جاتے ہیں، پھر بھی ایک چوہا انسان کی غذا کا صرف چھوٹا حصہ ہی کھاتا ہے۔ انسانوں کے مزاج کی طرح چوہوں کے اپنے مزاج ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں چوہوں کے مزاج بھی ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں صرف قاضی کے گھر کا چوہا سیانا ہوتا ہے مگر مغربی ممالک میں ہر چوہا سیانا ہوتا ہے تبھی تو جاپان میں کمپیوٹرائز چوہے پائے گئے ہیں جو غلہ نہیں کھاتے بلکہ کمپیوٹر کے چھوٹے چھوٹے چپس کھا جاتے ہیں جو ہزاروں روپیوں کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے جاپانی حکومت نے بلی کو حج کرنے کے لیے نو سو چوہے کھانے کی شرط کی زبردست حمایت کی ہے۔ امریکہ کا چوہا احساس برتری کا شکار رہتا ہے اور وہ خود کو دنیا کے تمام چوہوں سے اسمارٹ سمجھتا ہے اور فلمی علاقے میں چوہے بلی کا کھیل تو کافی مشہور ہے۔ جس کو دنیا کا سب سے بڑا مداری پیش کرتا ہے۔ البتہ روس کے چوہے آج کل افراتفری کا شکار ہیں۔

خدا نے چوہوں کو زبردست قوتِ مدافعت سے نوازا ہے تبھی تو یہ انسانی امراض کا شکار نہیں ہوتے۔ ہم نے چوہوں کو کبھی کھانستے، کھنکھارتے یا ناک صاف کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی یہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا قتل کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر یہ چھوٹا سا چوہا انسان جیسی عظیم مخلوق سے افضل ترین نظر آتا ہے۔ بھارت میں پہاڑ کھود کر چوہا نکالنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ قوم آپ کو مندر، مسجد، مدرسہ، مکتب اور جھونپڑیوں اور محلوں میں آسانی سے مل جائے گی۔

چوہے کی موہنی سی صورت اور پیاری سی مورت پر نہ جائیے۔ یہ بے پناہ طاقت کا مالک ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے بستیوں کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے گورنر جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ برسوں سے آرام کرنے والے میونسپل ادارے صرف اور صرف اسی کی بدولت جاگ گئے ہیں اور دن و رات سڑکوں پر صفائی و ستھرائی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں تا کہ ہاتھی نے چوہے کے پیر دابے۔ آج کل تو چوہوں کی ازلی دشمن بلی نے دوستی کے ہاتھ بڑھائے ہیں۔ اگر چوہا بلی کا راستہ کاٹ لے تو بلی دم دبا کر یوں بھاگتی ہے جیسے کسی زمانے میں چوہا بھاگتا تھا۔ شاید یہی الٹا زمانہ ہے۔

چوہے پلیگ کے موجد ہیں اور پلیگ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ بھارت میں معاشی پلیگ، سماجی پلیگ، تعلیمی پلیگ، سیاسی پلیگ اور مذہبی پلیگ قابلِ ذکر ہیں۔ معاشی پلیگ میں کچھ چوہے ہرشد مہتا بن جاتے ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ بلیاں بھی منہ پر کپڑا باندھے اس کارِ ثواب میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ سماجی پلیگ میں چوہے زبردست اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب کہ تعلیمی پلیگ میں کتابیں پڑھنے کے بجائے کتابیں چبانے کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور سستا لٹریچر پڑھ کر خود کو باادب سمجھنے کے رجحان کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سیاسی پلیگ میں چوہا دیوار کی بلی بن جاتا ہے اور موقع ملتے ہی شیر کے کان کترنے لگتا ہے۔ البتہ مذہبی پلیگ ہر دور کا مشہور و معروف پلیگ ہے۔ جو ہمہ تن دستیاب رہتا ہے۔ اس میں یاترائیں منظم کی جاتی ہیں اور کارسیوا کے ذریعہ تہذیب و تمدن کی مضبوط عمارتیں ڈھا دی جاتی ہیں۔ بھارت میں پلیگ پھیلنے سے چوہوں کی نسل کشی کی ایسی منظم اور منصوبہ بند تحریک چلائی گئی کہ ان شاء اللہ ہمیں 1984ء کا دلّی، 1989ء کا بھاگل پور اور 1993ء کا ممبئی یاد آ جاتا ہے بھارتی پلیگ سے ساری دنیا میں وہ خوف و دہشت طاری ہو گیا کہ لوگوں کے کان پر جوں رینگنے کے بجائے چوہے رینگنے لگے۔

پلیگ کو خوش آمدید کہنے کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ جہاں جہاں پلیگ کی حکمرانی تھی وہاں نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلم، نہ سکھ تھا نہ عیسائی اور نہ ہی کوئی ہندی اور راجستھانی کا تھا بلکہ سب کے سب ایک جیسے ہو گئے تھے بالکل انسان جیسے ——— سب نے مل کر اس مہلک مرض کا مقابلہ کیا۔ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ گویا پلیگ نے ان تمام کو ایک پلیٹ فارم عطا کیا ہے۔ جو کام بڑے بڑے سورما نہیں کر پائے اس کو معمولی چوہوں نے کر دکھایا۔ ویلکم پلیگ کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ پلیگ کی وجہ سے ہمیں صفائی و پاکیزگی نصیب ہوئی۔ پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔ اور چوہوں نے بہت سے لوگوں کو آدھے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا۔ وہ ملک جو آبادی کی قـ
اور کوڑا کرکٹ کے انبار کے لیے مثال ہے اور یہاں بڑے بڑے شہروں میں روزانہ کئی ٹن کوڑا کرکٹ

سے سڑکوں پر آجاتا ہے۔ سڑ گل جاتا ہے اور بے گور و کفن یوں ہی پڑا رہتا ہے مگر اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔
لیکن اللہ کا فضل اور پلیگ کا کرم ہے کہ ہماری گلیاں اور سڑکیں کوڑا کرکٹ سے پاک و صاف ہو گئی ہیں۔ گزشتہ دنوں ہم نے مقامی بلدیہ کمشنر کو توجہ دلائی کہ فلاں گلی کے نکڑ پر کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہے۔ براہ کرم اسے اٹھوانے کا انتظام کیجیے تو انھوں نے فوراً جواب دیا کہ نہیں ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہائیں۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ یہ کوڑا ہمارے لیے خطرناک ہے۔"

دیکھیے صاحب، ابھی تک ہمارے علاقہ میں پلیگ کا ایک کیس بھی نہیں ملا ہے۔ ایسے میں کوڑا کرکٹ اٹھوا کر وقت ضائع کرنا دانش مندی نہیں ہے۔" کمشنر کے جواب پر ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اب آپ ہی کہیے کہ جس دیش میں ایسی سچویشن ہو تو ہر شہری یہی دعا کرے گا کہ خدایا ہمارے یہاں پلیگ بھیج دے تاکہ ہماری سڑکیں اور گلیاں کوڑا کرکٹ سے پاک ہو جائیں اور ہمارے دلوں کی کدورت بھی دُھل جائے۔

شکیل شاہجہاں (کامٹی)

ڈراما

عجبؔ تیری سرکار

کردار :- پولیس والا، عام آدمی نمبر۱، نمبر۲، نمبر۳، لڑکا، اندھا

[گلے میں موتیوں کی مالا ڈالے، پولیس کی وردی (ہاف پینٹ والی) پہنے، سر پر سفید ٹوپی لگائے ایک موٹی توند والا آدمی اسٹیج کے درمیان اپنی لاٹھی پر ہتھیلیاں اور ٹھڈی لگائے اونگھ رہا ہے، بڑی بڑی مونچھیں، پیروں میں کالا جوتا، بغل میں ایک کیمرہ اور ایک جھولا، ٹوپی ناک کے نیچے تک لٹک رہی ہے۔ اس لیے ٹوپی اور مونچھوں کے علاوہ چہرے پر کچھ نظر نہیں آرہا ہے اس کے علاوہ سارے اسٹیج پر اندھیرا ہے۔ ایک عام آدمی آتا ہے۔ نڈھال، اداس لڑکھڑاتا ہوا۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ اسٹیج روشن ہو جاتا ہے۔]

عام آدمی نمبر ۱ : (پولیس والے کو دیکھ کر) بھائی صاحب! (پولیس والا نہیں سنتا، اس کا ہاتھ ہلا کر) بھائی صاحب! (ادھر اُدھر دیکھ کر پولیس والے کا ہاتھ زور سے ہلاتا ہے) بھائی صاحب! (پولیس والا نہیں سنتا، عام آدمی بڑبڑاتا ہے) سب سو رہے ہیں راجا سے لیکر پرجا تک، آقا سے لیکر غلام تک۔ سب سو رہے ہیں۔ (پھر عام آدمی پولیس والے کی ٹوپی ہٹاتا ہے۔ سفید ٹوپی کے نیچے کالی ٹوپی نکلتی ہے۔ آدمی سفید ٹوپی سے پسینہ پونچھتا ہے۔ اور ادھر اُدھر دیکھ کر کالی ٹوپی ہٹاتا ہے۔ زرد ٹوپی نکلتی ہے۔ زرد ٹوپی ہٹاتا ہے تو بالکل چکنی کھوپڑی نکلتی ہے۔ پھر زور سے کندھا ہلا کر)
بھائی صاحب!

[پولیس والا چونکتا ہے۔ لاٹھی چھوٹ کر عام آدمی کے پیر پر گرتی ہے۔ آدمی زور سے چلّاتا ہے اور چوٹ سہلاتا ہوا بیٹھ جاتا ہے۔]

پولیس والا : (ڈانٹتے ہوئے) کون ہے؟ کیا ہے؟ اے مسٹر کون ہو تم؟ یہاں کیا کرتا ہے؟ سالا مار مار کر گودا نکال دے گا۔ سرکاری آدمی کی نیند ڈسٹرب کرتا ہے۔ (گری ہوئی ٹوپیوں کو سمیٹ کر اپنے جھولے میں رکھتا ہے) سرکاری آدمی کی نیند کو ڈسٹرب کرتا ہے۔ تیرے کو کھال میں بھوسہ بھر کر چڑیا گھر میں ڈال دے گا۔ سالا (لاٹھی اٹھاتے ہوئے) ہمارا ڈنڈا لیکر بھاگتا ہے۔ جانتا نہیں یہی ڈنڈا سے انگریز ہندوستان چھوڑ کر بھاگا۔ اگر انگریز چاہتا تو اس ڈنڈے کو بھی انگلستان لیکر بھاگ سکتا تھا۔ مگر اس نے اس ڈنڈے کو یہیں چھوڑ دیا۔

اور آج یہی ڈنڈا راج کر رہا ہے۔ اور تو اس ڈنڈے کو لے کر بھاگنا چاہتا ہے۔ یہ ڈنڈا تم کو بھگادے گا مگر تم ڈنڈے کو لیکر نہیں بھاگ سکتے۔ ڈنڈا لیکر بھاگنے کی سزا کیا ہے معلوم ہے۔ لے نام بول نام (چیخ کر) نام بول۔ الّو چند۔

نمبر ا : آ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پولیس والا : (قریب جاکر) نام بول، تیرا نام کیا ہے ؟

نمبر ا : رام بھروسے

پولیس والا : باپ کا نام ؟

نمبر ا : بھگوان بھروسے

پولیس والا : باپ کے باپ کا نام

نمبر ا : گھنشیام بھروسے

پولیس والا : رہنے والا ؟

نمبر ا : نظام بھروسے

پولیس والا : (ڈنڈا صاف کرکے دوسری طرف ناک چھنک کر نیکر میں پونچھتے ہوئے) سالا، سب بھروسے ہی بھرے ہے۔ (کچھ رک کر) ادھر کیا کرتا تھا ؟

نمبر ا : (کھڑے ہوکر ڈرتے ہوئے) آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔

پولیس والا : ہم سے ؟

نمبر ا : جی آپ سے

پولیس والا : کیا بات پوچھنی ہے۔ پوچھو۔

نمبر ا : یہاں کہیں پانی ملے گا۔ پینے کا پانی ؟

پولیس والا : ابے یہاں دارو میں ڈالنے کے لیے پانی نہیں ہے بڑے صاحب سے لیکر چھوٹے صاحب تک سبھی دارو پی کر اپنی آنتیں جلا رہے ہیں۔

نمبر ا : مجھے بڑی زور کی پیاس لگی ہے۔ پانی ملے گا ؟

پولیس والا : (زرد ٹوپی پہن کر) پیارے! یہاں پر سب کو کسی نہ کسی چیز کی پیاس ہے۔ کسی نہ کسی چیز کی تلاش ہے لیکن یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ ادھر کچھ نہیں ہے کچھے۔ اوپر والے کے پاس جاؤ۔

نمبر ا : مذاق مت کیجئے۔ گلا سوکھ رہا ہے۔ بڑی زور کی پیاس لگی ہے۔

پولیس والا : (کالی ٹوپی پہن کر، لہجہ بدل کر) پیاس ــــ ؟ ہندو پیاس یا مسلم پیاس۔ بھوک، پیاس، غریبی سب دھرم اور مذہب کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ ہماری مدد تمہارے نسلی کردار، خاندان، خون اور تمہارے دھرم اور مذہب پر منحصر ہے۔

نمبر ا : بھائی صاحب پلیز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (قے آنے کو ہوتی ہے۔ بیٹھ جاتا ہے)

پولیس والا : (گھور کر دیکھتے ہوئے) کیا ہوگیا ؟ سالا ۔! پیٹ میں گڑبڑ ہے کیا ؟

نمبر ۱ : پ — پ — پ — پانی

پولیس والا : (سفید ٹوپی پہن کر نیتا کے انداز میں پیار سے) کیا ہو گیا رام بھروسے جنتا جناردھن جی۔

نمبر ۱ : پانی

پولیس والا : پانی — پانی ضرور ملے گا۔ ارے بھئی تھوڑا صبر کرو۔ ابھی پارلیمنٹ میں پانی کا بل پاس ہوا ہے۔ ابھی ملے گا پانی۔ بہت کنوئیں کھدر ہے ہیں۔ جگہ جگہ ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں۔ بند باندھے جا رہے ہیں۔ کئی جگہ نہریں بنوائی جا رہی ہیں ان نہروں میں پانی آتے آتے کچھ تو سمے لگے گا رام بھروسے جی۔ ہم تو امریکہ اور جاپان سے پانی امپورٹ کرنے کا پلان بھی بنا رہے ہیں۔ ہمارے سائنسداں روس سے بادل اسمگل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ تم صبر کرو۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگلے فائیو (FIVE) ایئر پلان تک تمہیں پانی ضرور مل جائے گا۔

نمبر ۱ : آہ — ہ ..... ہ ....

پولیس والا : (آسمان کی طرف دیکھ کر) وہ تو اس سال وقت پر بارش نہیں ہو رہی ہے۔ ورنہ تمہیں ہم برسات میں کھڑا کر دیتے۔ کھڑا کیا کر دیتے۔ تمہیں لٹا دیتے۔ خود بخود پانی تمہارے منہ میں گھس جاتا — اور صرف منہ ہی کیوں برسات اچھی ہوتی ہے تو پانی تمہارے گھر میں گھس آتا — ویسے بھی تمہارا گھر کسی تالاب یا ندی نالے کے کنارے ہو گا۔

نمبر ۱ : (ہچکی لے کر) میں .... مر .... رہا .... ہوں۔

پولیس والا : (چونک کر، کھڑا ہو کر) تم سالا مر رہا ہے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا الّو چند؟ (کیمرہ نکال کر فوٹو کھینچتا ہے — خوش ہو کر) ہاں — شاباش — مرتے ہوئے آدمی ہم کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ سانس آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے۔ درد اور تکلیف سے تڑپتا رہتا ہے۔ دنیا کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا رہتا ہے۔ ہم کو مرتا ہوا آدمی بہت اچھا لگتا ہے۔

نمبر ۱ : پانی — رحم کیجئے۔

پولیس والا : (جیب سے موٹی فریم کا چشمہ نکال کر آنکھوں پر چڑھاتا ہے، جھولے سے ڈائری اور پنسل نکالتا ہے اور اخبار کے رپورٹر کی طرح مخاطب ہوتا ہے)۔ ہاں بھائی صاحب! دیکھئے آپ سے دو چار سوال پوچھوں گا۔ آپ جواب دیجئے گا۔ ایسی رپورٹ بناؤں گا کہ آپ بھی یاد رکھیں گے۔ ہاں تو میرا پہلا سوال ہے۔ ہمارے ملک کا امریکہ سے دوستی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

نمبر ۱ : پانی —

پولیس والا : ہماری خارجہ پالیسی روس کے تعلق سے کیا ہونی چاہیئے۔

نمبر ۱ : پانی —

پولیس والا : ہماری فوجی طاقت کو اور بڑھانا چاہیئے۔

نمبر ۱ : پانی —

پولیس والا : ہمارے نیتا دیش دیش کا جو دورہ کر رہے ہیں اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

نمبر ۱ : پانی ___

پولیس والا : کیا ہم اکیسویں (۲۱) صدی میں داخل ہو گئے ہیں ؟

نمبر ۱ : پانی ___

پولیس والا : ہمارے ٹی وی پروگرام گاؤں گاؤں تک پہنچ گئے ؟

نمبر ۱ : پانی ___

پولیس والا : ہم اتنی دیر سے سوال کر رہے ہیں۔ اور آپ پانی پانی کر رہے ہیں؟!

نمبر ۱ : ٹی وی تو گاؤں گاؤں تک پہنچ گیا ہے مگر افسوس پانی نہیں پہنچا۔

پولیس والا : واہ ___ واہ ___ کیا بات ہے۔ یہ رپورٹ ہم ضرور چھاپیں گے۔

نمبر ۱ : آہ ..... ہ ___

پولیس والا : (جلدی سے ڈائری میں 'آہ' نوٹ کرتا ہے۔ اسی دوران عام آدمی لڑکھڑا کر پولیس والے کے اوپر گرتا ہے۔ پولیس والے کی ڈائری، پنسل، چشمہ، ٹوپی گر جاتی ہے)۔ (عام آدمی کو جھٹک کر کھڑے ہوتے ہوئے) ایں سالا ___! تم لوگ ڈنڈے کا بھوت ہو۔ بات سے نہیں مانتا۔ تم لوگوں کو ایک لائن میں کھڑے کر کے مشین گن چلا دینا چاہیئے۔ سالا تم لوگ اسی لائق ہے۔ (آگے بڑھ کر ڈنڈا اٹھاتا ہے)

(اتنے میں ایک پھٹے حال آدمی، داخل ہوتا ہے)

آدمی نمبر ۲ : سنتری جی ___ ؟

پولیس والا : کون ہے بے ؟!

نمبر ۲ : ایک چار آٹھ آنے دلا دو نا بابوجی۔ بہت زور کی بھوک لگی ہے۔

پولیس والا : بھوک لگی ہے ___ ؟ بھوک لگی ہے تو روٹی کھا۔ اور روٹی نہیں ہے تو کیک کھا۔ ادھر کیا لینے آتا ہے؟ اتا بڑا ہو گیا بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

نمبر ۲ : اور تم بھی اتنے بڑے ہو کر چڈی پہنتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔

پولیس والا : آتی ہے نا ___ شرم آتی ہے۔

نمبر ۲ : پھر ___

پولیس والا : پھر چلی جاتی ہے تو سالا ہم پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ ہم سے بھیک مانگتا ہے۔

نمبر ۲ : کیا کریں صاحب۔ بھوک تو روٹی مانگتی ہے۔ اور روٹی بھیک منگواتی ہے۔

پولیس والا : چوپ ___! لیکچر بازی اِدھر نہیں۔ ادھر غنڈہ گردی کی تو حوالات میں بند کر دوں گا۔

(اسی دوران ایک آدمی داخل ہوتا ہے۔ پھٹے حال، بیمار، ٹھٹھرا ہوا۔ عام آدمی نمبر ۳)

آدمی نمبر ۳ : اے بھائی ___ او بابوجی۔ (بھوک سے) بہت سردی لگ رہی ہے۔ بخار سے کھانسی ہے۔ چلا نہیں جا رہا ہے۔ چائے پینی ہے بابوجی! چار آنے دے دو۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔

نمبر ۲ : میں تو خود بھوکا ہوں۔ اس سے مانگ

نمبر ۳ : (پولیس والے سے) بابوجی دیا کرو۔ چائے پینے کے لیے چار آنے دے دو۔

پولیس والا: ابے تم لوگ آدمی ہو کہ جانور؟ سالے میرے سے پیسے مانگتے ہو۔ اور وہ بھی چائے پینے کو۔ میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔

(اتنے میں ایک اندھا داخل ہوتا ہے۔ اس کی لاٹھی پکڑ کر آگے آگے ایک لڑکا چل رہا ہے)

اندھا: رام جی ___ رام جی ___ (بچے سے) کوئی ہے۔

لڑکا: ہاں بہت سے لوگ ہیں۔

اندھا: (زور سے) رام جی ___ بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔ کوئی سنسد بھون کا راستہ بتاؤ۔ رام جی۔

پولیس والا: ابے او سالے! سب اِدھر کائے کو جمع ہوا ہے؟۔ ابھی بڑا صاحب آئے گا تو ہم کو گالی نکالے گا۔ تم جانتا نہیں یہ سرکاری زمین ہے۔ چلو ___ راستہ چھوڑو، خالی کرو جگہ۔ نہیں تو ہم لاٹھی چارج کرے گا سالا۔

لڑکا: لاٹھی چارج کیسے کرے گا۔ تیرے باپ کا راج ہے؟

پولیس والا: ابے او اُلو کے چند! تیری چونچ کیوں کھل رہی ہے۔ سالا! جان پیاری نہیں ہے کیا؟

لڑکا: جان پیاری ہے تو کیا کریں؟ راستہ نہیں پوچھیں گے۔ راستہ پوچھنا کوئی گناہ ہے؟

اندھا: بابو جی ایک چائے کے پیسے۔

پولیس والا: راستہ پوچھنا گناہ نہیں ہے لیکن سنسد بھون کا راستہ پوچھنا گناہ ہے۔ جانتا ہے سنسد بھون کس کے لیے ہے؟

لڑکا: ہاں جانتا ہوں۔ ہم وہاں جانا چاہتے ہیں۔

پولیس والا: تم وہاں اس طرح نہیں جا سکتے۔ اگر جانا ہے تو جلوس لیکر جاؤ مورچہ لیکر جاؤ۔ تم اس طرح نہیں جا سکتے۔

لڑکا: کیوں نہیں جا سکتے؟

پولیس والا: دیکھ پیٹے بک جھک مت کر۔ ایک آدمی بیمار پڑا ہے اور تمہیں راستے کی پڑی ہے۔ اس کو سنبھالو کہ تمہاری ہائے ہائے سنوں؟ سالا۔

نمبر۲: بابو جی بھوک کے مارے دَم نکل رہا ہے۔

نمبر۳: بابو جی چائے کے . . . .

پولیس والا: ابے ٹھہر جا چائے کے بچے ایک آدمی بھوک کے مارے اپنا دَم نکال رہا ہے اور تجھے چائے کی پڑی ہے۔ سالا چھوڑ دے چائے۔ چائے پینا بُری بات ہے۔ دارو پی۔

نمبر۱: آہ

نمبر۲: بابو جی ___ بھوک کے مارے . . . .

پولیس والا: کیسا کیسا بھچڑ آدمی اکٹھا ہو گیا ہے۔ وہ آدمی پانی کے بغیر مرنے کو ہے۔ اِدھر تم بھوک بھوک کرتا ہے۔ بھکڑ، ندیدہ۔ کبھی دیکھا نہیں کھانا۔

(پولیس والا نمبر۱ کے پاس جا کر جھکتا ہے)

نمبر۱: (پولیس والے کا بازو پکڑ کر) بابو جی! بھوکا ہوں۔

پولیس والا: (چیخ کر) ہاتھ لگاتا ہے۔ سرکاری آدمی کو ہاتھ لگاتا ہے۔ سرکاری آدمی کو ہاتھ لگانے کا انجام

جاتا ہے۔ ہم سرکاری آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کوئی ہم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ سالا ہم کو ہاتھ لگاتا ہے۔
(ایک ڈنڈا جماتا ہے، نمبر۲ کسائیں کسائیں کرتا پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ نمبر۳ اس سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔)
پلس والا:۔ رام بھروسے جنتا جنار دھن جی۔ گھبراؤ مت ہم پانی کے مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ نہیں غور تو ہم پہلے ہی کر رہے تھے۔ اب تو سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں ٹھیک ہے؟
اندھا:۔ ارے بابا کوئی سسند بھون کا راستہ بتاؤ۔
پلس والا:۔ (ڈانٹ کر) چپ بے الو چند۔!
لڑکا: (للکار کر) کاہے کو چپ؟ بولے گا، ہم ضرور بولے گا۔
پلس والا:۔ (کھڑا ہوکر) کیا بولے گا؟
لڑکا:۔ راستہ پوچھیں گا۔ تیرے کو بتانا پڑے گا۔
پلس والا:۔ سالا۔! چیونٹی جتنی جان اور اتنی لمبی زبان۔ یہ ڈنڈا دیکھ رہا ہے۔
لڑکا:۔ (اپنی لکڑی ہوا میں گھما کر) تو نے یہ لکڑی دیکھی ہے۔
پلس والا:۔ سالا، تو غنڈہ گردی کرے گا؟
لڑکا: غنڈہ گردی نہیں راستہ پوچھے گا۔
پلس والا:۔ راستہ ہم نہیں بتائے گا۔
لڑکا:۔ بتانا پڑے گا۔ ہم چالیس سال سے راستہ پوچھ رہے ہیں۔
نمبر۲:۔ ہم چالیس سال سے روٹی مانگ رہے ہیں۔
نمبر۳:۔ ہم چالیس سال سے دوائی مانگ رہے ہیں۔
لڑکا:۔ اور تم نے ان چالیس سالوں میں صرف وعدے دیئے ہیں۔ آشواسن دیئے ہیں۔ جھوٹے خواب دکھائے ہیں۔ نہ تم نے راستہ بتایا، نہ روٹی دی نہ دوائی دی۔
پلس والا: چپ رہو۔۔۔ خاموش۔۔۔ تم لوگ صرف چالیس سال میں گھبرا گئے۔ شرم آنی چاہیئے۔ ذرا اس کو دیکھو۔ (نمبر ا کو دکھاکر) اس کو چالیس سال سے پانی نہیں ملا ہے۔ یہ شور مچاتا ہے؟!
لڑکا:۔ کیوں نہیں ملا؟
پلس والا: ہم کو کیوں پوچھتا ہے سالا۔
لڑکا:۔ تو پھر کس سے پوچھیں۔
نمبر۲:۔ ہاں۔۔۔ کس سے پوچھیں۔
نمبر۳:۔ کس سے پوچھیں؟
پلس والا:۔ (سوچ کر) تم کو انگریزی آتی ہے؟
(سب نفی میں گردن ہلاتے ہیں)
پلس والا:۔ (تعجب، افسوس اور حقارت سے) انگریزی نہیں آتی؟ ارے سالا تم لوگوں کو انگریزی نہیں آتی۔ تم اتنا بڑا ہو گیا تم کو انگریزی نہیں آتی۔؟

لڑکا :- ہندی تو آتی ہے۔

پولس والا : ارے سالا انگریزی آنا چاہیئے۔ لو!
اپنا باپ ہندی وندی نہیں جانتا۔ سالا ہم کو
چالیس سال سے بھرتی ہوا۔ وہ نہیں بولا۔ مگر
ہم کو انگریزی نہیں آتی اس لیے کچھ بول نہیں
سکتا۔

(پس منظر سے ڈنکوں کی آواز۔ سب چونک
کر دیکھتے ہیں)۔

ایک آواز :- باادب باملاحظہ ہوشیار ——

پولس والا :- (ایک دم اچھل کر جیسے کرنٹ لگ گیا ہو)
اپنا باپ —— اپنا باپ آتا ہے۔ تم لوگ لائن
میں کھڑے ہو جاؤ۔ اے، کوئی پوچھے تو
بولنا پولس بابا بہت اچھا آدمی ہے۔ کیا۔ اے
اندھے بھائی۔ اے چھوکرا بھائی۔ آ، پیارے
بھوکے بھائی۔ اے سالا رام بھروسے سب
بولنا ہم بہت اچھا آدمی ہے۔ کیا لو لے گا؟
دیکھو ہم تم سے اتنی دیر سے کتنا میٹھا میٹھا
بات کیا۔ کیا نا —؟ تم لوگ کو سب ملے گا۔
تم لوگ جو مانگ رہا ہے وہ ملے گا۔ پر ہم کو
اچھا آدمی بولنا۔

لڑکا :- نہیں بولے گا۔ ہم تم کو اچھا آدمی کبھی نہیں بولیں گے

پولس والا :- لے سالا —! تم کو جان سے مار ڈالے گا۔
ابھی سیدھا کھڑے ہو جاؤ سب۔ [پولس والا
اٹنشن میں کھڑا ہو کر بائیں طرف دیکھنے لگتا
ہے۔ سب دیکھنے لگتے ہیں۔ پولس والا جھک کے
جھانکنے لگتا ہے۔ سب جھانکنے لگتے ہیں
پولس والا آنکھوں پر ہتھیلی کا چھپر لگاتا ہے
اچانک پولس والا راحت کی سانس لیتا ہے
اور پیچھے مڑ کر ہنسنے لگتا ہے۔ سب تعجب سے
اسے دیکھنے لگتے ہیں۔]

پولس والا :- ہا — ہا — ہا — سالا اپنا باپ چلا
گیا۔ اب پانچ سال کے بعد آئے گا۔
پانچ سال کے بعد بھی نہیں آئے گا۔ اب بولو۔
(لڑکے کے پاس جا کر) ہم کو خراب آدمی
بولے گا؟ لے —! (ایک لاٹھی مارتا ہے۔
لڑکا گر پڑتا ہے (پھر اندھے سے مخاطب
ہو کر)۔ اندھا سالا —! تیرے کو راستہ
چاہیئے؟ (اندھا چھٹپٹا کر گر جاتا ہے —
(پھر بھوکے سے) تیرے کو کھانا چاہیئے؟
لے —! (لاٹھی مارتا ہے، بھوکا گر جاتا ہے)
(پھر نمبر ۳ بیمار سے مخاطب ہوتا ہے) کیوں بے!
تیرے کو دوائی چاہیئے۔ چائے پیئے گا —؟
لے دوائی۔ لے چائے۔ (دو لاٹھی مارتا ہے اور
وہ بھی گر پڑتا ہے) اور تو بے اُلّو جند —!
(پیاسے سے مخاطب ہوتا ہے) تُو تو پہلے ہی
سے مرا ہوا ہے۔ (آدمی نمبر ایک بھی لڑکھڑا کر
گر جاتا ہے) سارے لوگ زمین پر گر کر بے دَم
ہو جاتے ہیں۔ پولس والا سب کو دیکھ کر خوش
ہوتا ہے۔ اور زور سے قہقہہ لگاتا ہے۔
ہا —— ہا —— ہا ——

[پھر کیمرہ نکال کر ہنستے ہوئے سب کا فوٹو کھینچتا ہے
پھر نمبر ایک کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر ناچنے لگتا ہے۔ اور
جیب سے ایک بوتل نکال کر دارو پیتا ہے اور وحشیانہ
قہقہہ لگاتا ہے۔
منظر ساکت ہو جاتا ہے]۔

— پردہ گرتا ہے —

ماہنامہ — زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد (۲۸) ★ مئی ۱۹۹۵ء ★ شمارہ (۵)

کتابت: محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد ۲

قیمت فی پرچہ: ۹ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

★

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد ــــ ۱
فون آفس: 595716 رہائش: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے ـــــ (فہرست)

دو شگوفے

مالِ مُفت (انشائیے)

فلمیات

جانچ پڑتال (تنقیدی جائزہ)

چُوران (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن!

4-1-825/C سکنڈ فلور، لکشمی اسٹیٹ، عابد روڈ، حیدرآباد - 500001.

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات (2) اسکیمات کے تحت دیئے جاتے ہیں (1). غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار (-/6000) روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح 6½% سود پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ 94 تک 51935 افراد میں 10,02,13,000 روپے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 43,22,05,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2644 افراد میں 1,23,56 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 584.44 لاکھ روپے ہوتی ہے، جاری کر چکا ہے اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985ء سے اب تک 54579 افراد میں 1125.69 لاکھ روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 4906.49 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔

اسکے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 8 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو، اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 426 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (15) ہنر سکھانے کیلئے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپ رائیٹنگ، 100 کو لائٹ ڈرائیونگ، 11 افراد کو لیب ٹیکنیشین، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن، 5 کو ٹیلرنگ، 13 کو ویڈیوگرافی، 15 کو فیبریکیشن، 4 کو بیوی موٹر ڈرائیونگ، 5 کو ہیر تراشنا، 6 کو کار پینٹری کا تربیت دیا جائیگا۔ گنٹور میں 218، نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کیلئے منتخب کیا گیا ہے اسکے علاوہ اس سال 160 اسٹوڈنٹس کو اسکالرشپ کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ خواہشمند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔ — محمد لائق علیخان (مینیجنگ ڈائرکٹر)

یوسف ناظم

دو شگوفے

تنقید اور قافیہ پیمائی

تنقید کوئی اچھی چیز نہیں ہے لیکن اسے اصناف ادب میں بھی جگہ دی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے اس سے زیادہ مروت اور کیا ہو سکتی تھی۔ یہ بھی خیال آتا ہے کہ ممکن ہے اسے اصناف ادب میں آزمائش کے طور پر شامل کیا گیا ہو۔ آزمائش سے مراد امتحان نہیں ٹرائل (trial) ہے۔ اب یہ موقتی انتظام مہنگا پڑ رہا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی معروف ڈیلر (dealer) سے ایک ٹی وی سیٹ ٹرائل پر اپنے گھر لے آئیں لیکن معینہ مدت گزر جانے پر بھی آپ اسے واپس نہ کریں یا ظاہر ہے وہ سیٹ خواہ اس میں کتنے ہی نقائص کیوں نہ ہوں، آپ کو خریدنا ہی پڑے گا۔ یہی صورت حال میں سمجھتا ہوں تنقید کے معاملے میں پیدا ہوئی اور آج تنقید ادب کا جزو لاینفک بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں قصور کسی اور کا نہیں ہمارا ہی ہے — لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اردو میں اچھی تنقید ہے ہی نہیں۔ ہمارے یہاں بہارستان نہ سہی نخلستان تو ہیں ہی۔ خورشید الاسلام کی ایک تنقیدی تحریر نظر سے گزری۔ جی خوش ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

"کالم نویسی کی سب سے مشکل صنف مزاح نگاری ہے کیوں کہ اس کے لیے جو اوصاف درکار ہیں ان میں بنیادی اہمیت طبعی میلان کو حاصل ہے اور یہ کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے جو تربیت سے سکھائی جا سکے۔ دوسرے اوصاف میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کالم نویس کو زبان و بیان پر انتہائی عبور حاصل ہو اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ سنجیدہ بات کا مضحک پہلو بھانپ سکے۔ اس پر تبصرہ کرنے مناسب اور دل چسپ تشبیہات اور تلمیحات سے اس پہلو کو اجاگر کرے اور ہو سکے تو تقابل سے بھی مضحک پہلو کو نمایاں کرے لیکن مضحک پہلو کو بھانپ لینا مشکل ہے اور اس کے بعد اسے نمایاں کرنے میں بھی طبعی میلان ضروری ہے ورنہ تو تصنع پیدا ہوگا اور تصنع مزاح کا قاتل ہے۔"

اس تحریر کو پڑھنے کے بعد خاکسار نے اپنے آپ پر غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مزاحیہ کالم نگاری سے سبک دوش ہو جانے میں عافیت ہے۔

عبرت حاصل کرنے کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ کلیم الدین احمد نے جو کسی کو بخشتے نہیں تھے، سید محفوظ علی بدایونی کی کالم نگاری کو قدر و قیمت سے محروم لکھ دیا تھا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ وہی محفوظ علی بدایونی ہیں جن کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے "گنج ہائے گرانمایہ" میں لکھا کہ "محفوظ علی بدایونی خود اپنے نظام شمسی ہیں" یعنی روشنی حاصل کرتے ہیں تو اپنے آپ سے دوکسی کے مرہون منت نہیں -- عام طور پر قاری مختلف ٹیموں میں بٹ جاتے ہیں لیکن محفوظ علی بدایونی کے معاملہ میں دو ٹیمیں نہیں بن سکتیں۔ ٹیم ایک ہی ہوگی اور اس کے نگراں ہوں گے رشید احمد صدیقی نہ کہ کلیم الدین احمد۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ مولانا محمد علی نے محفوظ علی بدایونی کا ایک خط پا کر یہ خط لکھا تھا کہ :

" بارے خدا کا شکر کہ کل شب کو دورے میں ایک خط ملا جس کے لفافہ پر تو کسی بیگانے کا خط مگر خط کے اندر چار لڑیوں کا موتی کا ہار یعنی ۴ صفحے پر اپنی آشنا خط تھا جس نے آنکھوں کو بہت مدت کے بعد روشنی بخشی"

محمد علی جوہر

یہ خط ۹ اکتوبر ۱۹۱۰ء کا لکھا ہے آج اس کی عمر ۸۳ سال ہوگئی۔

سب جانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ سید محفوظ علی بدایونی مولانا محمد علی کے "ہمدم" میں مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے اور لوگ اس کالم کو فقط آنکھوں سے پڑھتے نہیں، آنکھوں سے لگاتے بھی تھے

شاید ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ اگر غزل گوئی صرف قافیہ پیمائی ہے تو ذرا قافیہ پیمائی کر کے دکھاؤ۔ یہ بات انھوں نے شعر میں کہی تھی۔ وہ شعر جوں کہ آپ کو یاد ہے اس لیے میں نے سوچا کیوں لکھوں؟ یہ بات مجھے یوں یاد آئی کہ ادھر ایک دن یعنی ستمبر کے آخری دنوں میں کیفی اعظمی کے گھر جانا ہوا۔ شوکت کیفی دواخانہ میں زیر علاج رہ کر گھر واپس ہوئی تھیں اور میں مزاج پرسی کے لیے جا نہیں سکا تھا۔ اس دن ملاقات ہو گئی۔ کیفی اعظمی بھی جو پچھلے چند سالوں سے گاؤں میں رہنے لگے ہیں موجود تھے۔ انھوں نے گو کہ طبیعت زیادہ موزوں نہیں تھی (وجہ میں ہوں گا) اس دن انھوں نے "عہد عتیق" کی باتیں سنائیں بتایا کہ اس صدی کے تیسرے دہے میں (جب آتش کا آتشیں زمانہ تھا) انھیں لکھنؤ میں جو صحبتیں ملیں۔ ان کی یاد ان کا سرمایۂ حیات ہیں۔ وہ زمانہ شعر شاعری کی محفلوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے تو ایک شام سے شروع ہو کر وہ رات اور دوسرا پورا دن گزر جانے کے بعد شام ہی کو اختتام کو پہنچتے تھے۔ مشاعروں میں صرف اساتذہ "شریک" ہوتے تھے۔ کسی مبتدی کی مجال نہیں تھی کہ ان مشاعروں میں شعر سنانے کی جسارت کرتا۔ سامعین میں بھی جگہ مل جاتی تو اسے خوش نصیب سمجھا جاتا۔ کیفی اعظمی نے لکھنؤ کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ایک شاعر تھے نام تھا اولاد حیدر اور تخلص تھا دل۔ وہ مشاعرے میں اپنی باری آنے پر فی البدیہہ شعر کہہ کر طرحی غزل سناتے تھے۔ جس مشاعرے میں یہ اپنی غزل سنا رہے تھے۔ اس کے طرحی مصرعے کی

ردیف تھی 'ہوئی' اور قافیہ تھا محل - یہ کوئی ۱۹۴۴ء کی بات ہوگی۔ دل صاحب (بقول کیفی اعظمی) لوگوں سے فرمائش کرکے قافیہ پوچھتے اور اسی وقت شعر کہتے تھے - دو چار شعر سنانے کے بعد انھوں نے پوچھا کوئی اور قافیہ؟ اور کیفی اعظمی نے ہمت کرکے ایک قافیہ بنایا "معتدل" اور دل صاحب نے فوراً یہ شعر پڑھ دیا (میرے حسابے سے گھڑ دیا) :

کس کے غبار کا وہ بگولہ اڑا تھا دل
اب تک نہ یہ ہوائے جہاں معتدل ہوئی

اور شعر سنتے ہی دادِ تحسین کا شور اٹھا

گو کہ میرا حافظہ سال میں چند ہی دن کام کرتا ہے لیکن مجھے اکبر الہ آبادی کا وہ شعر یاد آگیا (بعد میں یعنی گھر آنے کے بعد) جس میں انھوں نے شبلی کا قافیہ قبلی استعمال کیا تھا۔ وہ شعر آپ کو بھی یاد ہوگا :

بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
آتا نہیں ہے مجھ کو قبلہ قبلی (یہاں کا دعوت نامہ تھا)

اور جب شبلی اور اکبر ملے تو علامہ نے فرمایا کیا خوب قافیہ نکالا ہے قبلی۔ قبلی کے علاوہ شبلی کا کوئی اور قافیہ ہو ہی نہیں سکتا تو اکبر الہ آبادی (کہ اکبر تھے) بولے ایک اور قافیہ ہے لیلی۔ علامہ نے پوچھا یہ کیا بات ہوئی۔ اکبر بولے سند پیش کرتا ہوں اور یہ شعر پڑھ دیا :

تم بھی اس راہ پر چلے شبلی
عشق نے آبروئے غالب لی (لیلی)

میرا خیال ہے علامہ شبلی دنگ رہ گئے ہوں گے اور کھانے کا لطف دوبالا ہو گیا ہوگا۔

ایک بات اور یاد آئی۔ کئی سال پہلے ممبئی میں شیام کشن نگم کے گھر پر جوش ملیح آبادی کے اعزاز میں دعوت تھی۔ جوش صاحب ٹھہرے بھی وہیں تھے۔ محفل میں باتوں باتوں میں مجروح سلطان سلطان پوری نے جوش صاحب سے پوچھا کیا خبیث کا کوئی قافیہ ہے۔ جوش صاحب نے فی الفور کہا۔ "پولیس"

رضا نقوی واہی

سرکٹی لاشیں[1]

ادب کے ایک بڑے ناقد و محقق[2] نے
غزل نویسوں کو اک بار یہ دیا تھا پیام
ادب میں آگئی ہے بیجا گھٹن کی کیفیت
ستم ظریفوں نے لیکن دماغ ان کی بات
یہ سانحہ شعرا کے لیے مفید ہوا
ملی جو چھوٹ تو کھل کھیلے شاعران کرام
معاشرے کا جنہیں روز گار طبیعہ ہے
بس کا مشغلہ ہے گھاٹے کا ٹھیٹھ رہتا
یونہی بھرے نہیں غزل ساز ادب کے لشکر میں
مشاعروں میں پڑھا جاتا ہے جو طرحی کلام
محققین کریں لاکھ رات دن تحقیق
عجب نہیں ہے کہ لکھی گئی ہو روز ازل
...وں کا ہے شاید سماع و ادبی مزاج

جو اپنی ذات سے خود شمع علم و دانش تھے
کہ دس برس کے لیے روک لیں غزل کا کام
ہے اس غریب بن کھولے کے جانور کی صفت
اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد پا گئے وہ وفات
جو ان کے شغل میں ہوتا مخل وہی نہ ملا
بجائے شہد بنایا غزل کو گڑ کا قوام
وہ نثر میں اٹکتی ہے شاعر غزل سرا ایسے
گھسے پٹے ہوئے مضموں کو چاٹتے رہتا
گناہگاروں کی ہو بھیڑ جیسے محشر میں
اگر چھپا کے رکھا جائے شاعروں کا نام
پتا چلا نہیں سکتے کہ کس کی ہے تخلیق
ہمارے عہد کے کل شاعروں کی ساری غزل
اسی سبب سے ہے برہمت انتشار و مزاج

شناخت "سرکٹی لاشوں" کی جس طرح ہے محال
یونہی ہے آج کے سرمایۂ غزل کا حال

انعام الحق (پاکستان)

جو کہتی ہے دنیا تو سچ ہے اے بیگم
کہ میں تیرے زیر اثر آگیا ہوں
کہا باس نے جب جہنم میں جاؤ
تو دفتر سے سیدھا ہی گھر آگیا ہوں

---

[1] خامہ بگوش سے مستعار
[2] بعید شمس الرحمن فاروقی / ... (illegible)

مسیح انجم

شامت اعمال ـــ ہم نے بکرا خریدا

یہ کہاوت آپ نے سُنی ہوگی کہ گیدڑ کی جب شامت آتی ہے تو وہ آبادی کا رُخ کرتا ہے۔
لی پر جب نادر شاہ ایک بلا بن کر نازل ہوا تو کسی ہیبت زدہ شاعر سے گھبراہٹ میں فارسی کا یہ مصرعہ
اتظ ہوا تھا، شامتِ اعمالِ ما، صورتِ نادر گرفت

اس تاریخی مقولے اور گیدڑ والی کہاوت کے حوالے سے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "شامت
نث ہے اور ہر مونث" شامت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی مفروضہ کو بنیاد بنا کر چند نکات آپ کی خدمت
ا پیش کرتے ہیں :

- عورت مونث ہے ـــــــ لہٰذا شامت!
- شادی مونث ہے ـــــــ لہٰذا شامت، بلکہ حسین شامت!
- دُلہن مونث ہے ـــــــ لہٰذا شامت، بلکہ خوشگوار شامت!
- بیوی مونث ہے ـــــــ لہٰذا شامت، بلکہ مستقل شامت!
- اولاد مونث ہے ـــــــ لہٰذا شامت، بلکہ مُشترکہ حماقتوں کی شامت!
- بیماری مونث ہے ـــــــ لہٰذا شامت!

اِن تمام بیانات سے آپ یہ نتیجہ اخذ نہ کریں کہ ہم کوئی کُلیہ مرتب کرنے چلے ہیں۔ بلکہ ہم تو صرف
ا تنا یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بعض شامتیں بِن بُلائے تشریف لاتی ہیں جبکہ اکثر شامتوں کو انسان خود
INVITATION CARD بھیج بھیج کر بُلا لیتا ہے کہ آ بیل مجھے مار!

اب یہی دیکھیے نا کہ ایک اچھا خاصا انسان بیٹھے بٹھائے شادی میں مبتلا ہو کر شامت کو اپنے گھر
تا ہے۔ شادی کے روز دولہا کا اپنے رُخِ زیبا کو سہرے میں چھپانا، اسی بات کا اعلان کرتا ہے کہ
ا جو، ہم سے تو ایک حماقت سرزد ہوگئی ہے۔ اب دنیا کو کیا منہ دکھائیں۔ شامت جو مول لی ہے!"
ــ شادی کے بعد یہ "شامت" ہنی مون تک بڑی خوب صورت نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اچانک

اس کی طبیعت اچار، املی اور دوسری کھٹی چیزوں کی طرف مائل ہونے لگتی ہے تو شوہر کی شامت آجاتی ہے۔ اور اس کی حجامت ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک قسم کا سگنل ہے کہ آپ کے گھر ایک اور شامت آنے والی ہے۔۔۔ خبردار! ہوشیار! پھر اس کے بعد شامتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ڈیلیوری۔ اولاد چھلہ۔ چھٹی۔ عقیقہ۔ عید۔ فرمائشات۔ نمائشات وغیرہ۔ یوں اگر ہم گنانے بیٹھیں تو ایک طویل جدول "مونث" اور "شامت" کی وضاحت میں مرتب ہو سکتی ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے پڑھ کر فیملی پلاننگ والے افکارِ عالیہ سمجھ لیں اور پھر انہیں جدید سماجی علوم میں شامل کرلیں! فی الحال ہمارا ارادہ ایسی کوئی طویل جدول مرتب کرکے سماجی علوم کی زد میں آنا نہیں ہے بلکہ "عید" کو مونث بتا کر اس کے شامت ہونے کی جانب اشارہ کرکے ثوابِ دارین حاصل کرنا ہے۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ عید ایک سیدھی سادی چیز ہوتی ہے لیکن اس کی آمد سے بہت پہلے ہی اس کی کچھ اس طرح تشہیر کی جاتی ہے کہ وہ "عید" نہیں "وعید" بن جاتی ہے۔ وحشت بن جاتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک سیدھی سادی عید کو وحشت بنا دیا جائے؟ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک اچھی بھلی اور سکار کردہ فنکار کو اپوزیشن کے پروپیگنڈے کا نشانہ بنا کر اسے جواب دہی کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ چونکہ عید اپنی صفائی میں کوئی تردیدی بیان شائع کرکے غلط فہمی کا ازالہ نہیں کر سکتی، اس لیے شامت کے مارے اس کے چکر میں آکر گھن چکر بن جاتے ہیں۔

اب یہی دیکھئے کہ عید کو ابھی چند دن باقی ہیں لیکن ہمارے گھر میں بکرے کے تذکرے بڑے زور و شور پر جاری ہیں۔ بقرعید جو آگئی ہے۔ بقرعید آئے اور بکرے کا ذکر نہ ہو، بالکل ایسا ہی جیسے بادل گھر کر آئیں اور بغیر گرجے اور برسے گزر جائیں۔ پچھلے دو دن سے تو یہ عالم ہے کہ بکرے کے ذکر کے بغیر بچوں کے حلق سے نوالہ تک نہیں اتر رہا ہے ــ بکرا ایسا ہو۔ بکرا ویسا ہو۔ اس کی چال ایسی ہو۔ ڈھال ایسی ہو۔ اس کی ٹانگیں ایسی ہوں۔ اس پر سواری کی جائے تو سرپٹ بھاگ نکلے۔ گویا بکرا نہ ہوا، ریس کا گھوڑا ہوا۔ ہم بھی ان تمام باتوں کو بالکل ایک بکرے کی طرح پان کی جگالی کرتے ہوئے سنتے جا رہے ہیں۔ تردید کی صورت میں گھر میں سول وار (CIVIL WAR) کے چھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے۔

لیکن جب بکرے کے فربہ ہونے کی بات پر بر سبیل تذکرہ پچھلے سال کا بکرا موضوعِ بحث بن گیا تو ہماری بیوی سے رہا نہ گیا۔ بولیں "پچھلے سال کا بکرا بھی کوئی بکرا تھا۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا لیکن اس سال ایسا بکرا نہیں چلے گا۔"

جواباً ہمیں بھی منمنانے کا حق پیدا ہو گیا تھا، سو ہم نے کہا "بیگم پچھلے سال کے بکرے کو خواہ مخواہ برا بھلا کیوں کہتی ہو؟ اس سے مرحوم کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ اور آخرت میں وہ اپنی پیٹھ پر بٹھا کر پل صراط پار کرانے سے صاف انکار کر دے گا۔ اب رہی ہڈیوں والی بات تو اس معاملے میں خاکسار بھی مجبور تھا اور بکرا بیچارہ بھی مجبور کیوں کہ ابھی تک کسی بکری نے ایسا کوئی بکرا نہیں پیدا کیا جس میں فقط گوشت ہی گوشت ہو۔ اور ہڈیاں نہ ہوں۔"

یہ سُن کر اُدھر وہ خاموش ہوگئیں۔ تو اِدھر ہم بھی خاموش ہوکر بکرا خریدنے کی مہم کے بارے میں سوچنے لگے۔

اب یہاں سے ہماری بکرا خرید مہم کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ بقرعید کے دنوں میں بکرا خریدنے کے لیے نکلنا گویا ایک بہت بڑی مہم سر کرنا ہے۔ آپ کو یوں لگے گا جیسے آپ بکرا خریدنے نہ نکلے ہوں بلکہ ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ کو سر کرنے نکلے ہوں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ بکرا خریدنے کی مہم کی بہ نسبت ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی مہم زیادہ آسان ہے۔ وہ اس لیے کہ چوٹی پر چڑھنے اور نہ چڑھنے کا اختیار آپ کے بس میں ہوگا۔ جب تک جی نے 'ہاں' کہا چوٹی پر چڑھتے رہے اور جہاں سے جی نے انکار کر دیا تو موسم کی خرابی اور صحت کی بربادی کا بہانہ بناکر واپس لوٹ آئے۔ اب آپ سے کوئی پوچھنے سے تو رہا۔ اگر بالفرض کسی نے پوچھ بھی لیا کہ بھئیا کب لوٹے اور کیوں ناکام لوٹے تو آپ فرما سکتے ہیں بلکہ احتجاج کر سکتے ہیں کہ کیا کریں صاحب موسم بڑا خراب تھا اور شدید برفباری ہو رہی تھی، اس لیے ماؤنٹ ایورسٹ کی مہم کو پوسٹ پون (POST PONE) کرنا پڑا۔ انشاء اللہ آئندہ سال، بشرطِ فرصت، ایک بار اور آزما کر دیکھیں گے لیکن بقرعید کے دِنوں میں آپ بکرے کی خریدی کو التوا میں ڈال کر مختلف بہانے بنائیں گے تو آپ کی کوئی سننے والا نہیں۔ بیوی بات بند کردے گی۔ بچے منہ پھُلالیں گے۔ نان کوآپریشن کی پالیسی پر عمل ہوگا۔ نتیجتاً باپ صاحب کو باہر کی ہوا کھانی پڑے گی۔ یہ تو خیر اندرونی معاملات ہوئے لیکن باہر بھی آپ سماج میں کیا منہ لے کر پھریں گے اور کونسی ناک لے کر اپنے عزیز و اقارب کے پاس جائیں گے۔؟

چنانچہ اِنھیں اندیشوں کے پیشِ نظر ہم نے عید سے دو دن پہلے ہی بکرا خریدنے کا پروگرام بنایا۔ ہمارا کچھ ایسا خیال تھا کہ دو دن پہلے ہی اگر بکرا خرید لیا جائے تو ایک تو قیمت بھی کم ہوگی، اور دوسرے، بچوں کو بکرے کی دو دن کی رفاقت بھی نصیب ہوگی۔ پھر تو ہم نے رختِ سفر باندھا اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک رسی خرید لائے (بکرے کو باندھ کر لانے کے لیئے) ہاتھ میں ایک لمبی سی چھتری لی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے بغل میں چھتری دابی۔ ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل کندھے پر لٹکائی۔ ٹائم پاس کرنے اور بھوک کو مارنے کے لیئے کچھ مونگ پھلیاں اور بسکٹ ساتھ رکھے۔ ایک چھوٹی سی فولڈنگ چیر بھی ساتھ رکھ لی کہ پتہ نہیں کہ کہاں کہاں پڑاؤ ڈالنا پڑے؟ اور جوتوں کا ایک جوڑا اسپیر (SPARE) میں رکھا کہ پتہ نہیں کہ کب پُرانے جوتے پھَٹ جائیں۔ اِن تمام چیزوں سے لیس ہوکر جب ہم باہر نکلے تو بالکل ایک خانہ بدوش قسم کی مخلوق دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی ہم کوئی ڈیڑھ، دو کیلو میٹر ہی چل پائے تھے کہ ہمیں ایک، ایک فرلانگ کے فاصلے سے دو، تین کیمپ نظر آئے۔ یہ کوئی پناہ گزینوں کے کیمپ نہیں تھے بلکہ بکروں کے کیمپ تھے جن میں مختلف رنگ و نسل کے بکرے اور بکریاں اپنے مستقبل سے بے خبر، خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔ جہاں چند بردہ فروش اپنی چرب زبانی سے بکرے اور بکریوں کے سِن و سال اور عیب و ہنر کچھ اس یقین و اعتماد کے ساتھ بیان کر رہے تھے۔ جیسے وہ بردہ فروش نہ ہوں بلکہ بکروں اور بکریوں کے والدین ہوں۔ جس کے

نتیجے میں خریدار بھی کچھ خوش فہمیوں اور کچھ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر بکروں کا سودا کر رہے تھے۔ گویا وہ بھی بکرے بن رہے تھے۔ یہاں ہم کیوں نہ اعتراف کرلیں کہ بکروں کے بارے میں ہماری معلومات انتہائی محدود ہیں۔ ہم بکرے کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا بکرا خود اپنے بارے میں جانتا ہے۔ یعنی یہی کہ بکرا ایک چوپایہ جانور ہے اور وہ ویجیٹیرین ہے اس سے آگے ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ چنانچہ لوگوں کی تقلید میں ہم بھی بکرا بن گئے اور اصل سے ڈگنے تگنے دام دے کر ایک بکرے کو پٹالیا۔

بکرا خریدنا ایک الگ بات ہے اور خریدنے کے بعد اُسے بہلا پھسلا کر گھر لانا ایک الگ بات ہے۔ یہ بڑا ہیٹا جانور ہے۔ اور چلتے چلتے اچانک یوں پسر جاتا ہے جیسے آج کل کے دولھے جہیز کی فہرست نہ پاکر محفل عقد میں پہنچتے پہنچتے اچانک راستے میں رُک جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا راستے میں بکرے نے دو تین بار رسی چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی اور ہم اوندھے منہ گرتے گرتے بچے۔ بلکہ ایک بار یوں بھی ہوا کہ اُس نے جو جھک کر چھلانگ لگائی تو رسی ہمارے گلے میں آگئی اور چھتری اُس کے سر پر۔ وہ تو اچھا ہوا کہ رسی کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں تھا۔ ورنہ بکرا ہمیں داغِ مفارقت دے جاتا۔ اگر ہم اُن تمام واقعات کو مع جزئیات بیان کرتے جائیں تو اندیشہ ہے کہ عید بھی آجائے گی اور نماز کا وقت بھی نکل جائے گا۔

خیر جوں توں صبح و شام ایک کرکے ایک عدد بکرا اپنے گھر لے آئے۔ بکرے کو دیکھتے ہی بچّوں کے چہرے کھِل اُٹھے اور بیوی کی باچھیں کھُل گئیں کہ اب بکرے کے ساتھ باتیں ہوں گی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ بکرے کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کی وجہ سے ہمارا کوئی ڈیڑھ کیلو وزن کم ہو گیا ہے اور اُدھر بکرے کا ایک کلو وزن کم۔ بیوی کو ہمارے وزن کے کم ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہے بلکہ وہ تو خوش ہیں کہ چلو بکرے کے لیے دوڑ دھوپ کے بہانے کچھ تو ہماری توند چھٹی اور کچھ تو وزن کم ہوا لیکن بکرے کے ایک کلو وزن کی کمی کا انھیں سخت ملال ہے جس کی تلافی کی خاطر بکرے کے لیے وٹامن سے بھرپور چارے کا بندوبست کیا ہے۔ لیکن بکرا ہے کہ چارے کو چھو نہیں رہا ہے۔ چھونا تو دور کی بات ہوئی۔ اُس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اور سرِ شام ہی سے مسلسل "میں، میں" کیے جارہا ہے۔

دیکھیں کیا گزرے ہے بکرے پہ سحر ہونے تک! ▭▭

(آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نشر شدہ)

پرویز یداللہ مہدی
(شارجہ)

(دوسری قسط)

علمِ فلمیات

وقت کے ساتھ جوں جوں فلمی کوائف ہم پر کھلتے گئے علم کی تشنگی بھی بڑھتی گئی۔ چناں چہ ہم نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، فلم اور علم دونوں گھوڑوں پر ایک ساتھ سوار ہوگئے۔ یہاں علم سے ہماری مراد نصابی علم نہیں خالص فلمی علم سے ہے۔ نتیجتاً تھوڑے ہی عرصے میں علم فلمیات پر اتھاریٹی ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے ضخیم فلمی انسائیکلوپیڈیا میں ستاروں کے باب میں ان کی نجی زندگی کے تعلق سے اچھا خاصا ناقابلِ اشاعت قسم کا مواد جمع ہوگیا! بالخصوص اس وقت کے تمام مشہور اداکاروں اور اداکاراؤں کے زبردست معاشقوں کی تفصیل ان کی جائز و ناجائز شادیوں اور طلاق کے صحیح اعداد و شمار کے ساتھ کتوں، بلیوں اور بچوں کی صحیح تعداد ان کے عادات و اطوار، رنگ ڈھنگ، ان کی کاروں کے ماڈل اور نمبر ان کی جسمانی پیمائش تیکھے ناک کرتے ان کے جنم دن کی تاریخیں غرض سبھی کچھ ازبر ہوگیا۔ ویسے یہ تمام تفصیلات آج کی نئی نسل کے لیے بھی مرغوب ترین موضوعات ہیں۔ آج کے کسی بھی نوجوان سے اس کے آباؤ اجداد کے بارے میں پوچھیے۔ ہمارا دعویٰ ہے۔ باپ دادا کے نام بمشکل تمام بتا پائے گا۔ اس کے بعد لائین ایک دم ڈیڈ ہوجائے گی جب کہ آج کسی مشہور ہیرو یا ہیروئن کی بابت کچھ پوچھیے۔ ایک ہی سانس میں اس کا حسب نسب، ہڈی نسل سبھی کچھ تفصیل سے کھول کے رکھ دیں گے۔ جہاں سے جو چیز درکار ہو اٹھا لیجیے۔

کسی زمانے میں ہم اپنی من پسند ہیرو اور ہیروئنوں پر اس قدر جان چھڑکتے تھے کہ کسی رسالے یا کسی اخبار میں جب ان کے معمولی نزلے زکام میں مبتلا ہونے کی روح فرسا خبر پڑھ لیتے تو چھینکے چھینکتے ادھ مرے ہو جایا کرتے بلکہ ان کی صحت یابی کی خاطر جان کا بدلہ جان سے کے جان لیوا اصول پر چلتے ہوئے ان کی تازہ و باسی تمام فلموں کو بار بار دیکھنے کی غرض سے شہر کے سینما گھروں کے اتنے چکر کاٹتے کہ اولیں مغل تاجدار..

شہنشاہ بابر نے بھی اپنے بیمار ولی عہد ہمایوں کے چارپلنگ کے اتنے چکر نہیں لگائے ہوں گے۔ اس کے علاوہ روزمرہ گفتگو بھی کلیتہً فلمی رنگ میں رنگی ہوتی بعض جملوں کے جملے فلمی مثالوں اور حوالوں سے پر ہوتے۔ اس ذکر پر ہمیں اس ہم جماعت کی یاد آرہی ہے جس کی سنگت کے نتیجے میں ہمیں اسکول کو بیٹ مار کر مارننگ شو دیکھنے کا چسکا لگا تھا وہ بھی بلاناغہ وہ ہمیں نہ صرف یہ کہ اس کی ترغیب دلاتا تھا بلکہ اساتذہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی نت نئی ترکیبیں بھی سمجھاتا تھا۔ البتہ خود اپنی توانائیوں کو ہمیشہ ترکیب و ترغیب تک محدود رکھتا تھا جبکہ دیگر امور کی بجاآوری میں ہماری جیب زیر بار ہوا کرتی تھی فلمی اصطلاحات کو جملوں میں استعمال کرنے میں ہمارے مذکورہ ہم جماعت کو کمال بلکہ ید طولیٰ حاصل تھا۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ اس نے ایک شادی کا آنکھوں دیکھا حال فلمی بول چال کے انداز میں کچھ اس طرح سنایا تھا " کل ہمیں ایک شوٹنگ یعنی شادی میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ جس کا مہورت کارڈ یعنی دعوت نامہ بہت پہلے مل چکا تھا۔ جس وقت ہم سیٹ (set) یعنی دلہا کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ہیرو یعنی دلہا میک اپ کر رہا ہے۔ ایکسٹرا یعنی باراتی بھی خاصی تعداد میں سیٹ پر موجود تھے۔ ہیرو نے جیسے ہی کیمرہ Face کیا یعنی باہر نکلا مہورت شاٹ لیا گیا۔ اس کے ساتھ بیک گراونڈ میوزک شروع ہوگئی۔ مہورت کے ساتھ ہی باقاعدہ شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا یعنی بارات روانہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے سارا یونٹ سجے سجائے اسٹوڈیو یعنی شادی خانے پہنچا جہاں فینانسر یعنی دلہن کے والد نے سارے یونٹ کا استقبال کیا پھر ڈائرکٹر یعنی قاضی صاحب کے تشریف لاتے ہی سنجیدہ اور ڈرامائی مناظر یعنی ایجاب و قبول کی رسم فلمائی گئی اور پھر جیسے ہی یہ تمام شاٹ اوکے ہوئے۔ ڈائرکٹر یعنی قاضی صاحب کے ساتھ تمام یونٹ نے ہم آواز ہو کر کٹ کٹ یعنی مبارک باد ہی کے نعرے بلند کیے۔ اس آوٹ ڈور شوٹنگ یعنی مردانے والی کارروائی کے بعد ہیرو کو ان ڈور شوٹنگ یعنی زنانہ کارروائی کے لیے اندر کے خوب صورت سیٹ یعنی زنان خانے میں بھیج دیا گیا جہاں مختلف ٹیری ٹیریز (Territories) کے ڈسٹری بیوٹروں یعنی دلہن کی رشتہ دار خواتین نے رش پرنٹ (Rush print) یعنی دلہا کو غور سے دیکھا اس کے بعد کچھ رومانٹک سین یعنی آرسی مصحف کی رسم وغیرہ فلمائے گئے پھر جہیز کے سامان کا جائزہ لینے سنسر بورڈ کے کچھ ممبران یعنی دلہا کے قریبی و خرانٹ قسم کے متعلقین اندر پہنچے، کچھ ممبروں نے بعض مناظر یعنی جہیز کے اسباب پر اعتراض کیا جس کے نتیجے میں سنسر بورڈ کے ممبران اور فلم پروڈیوسروں یعنی دلہن کے متعلقین کے مابین کلائمکس فائٹ ہوئی لیکن چونکہ ہیرو چونکہ ہیروئن کے ساتھ کچھ رومانٹک سین کر چکا تھا اس لیے اپنے زور بازو کا مظاہرہ کرکے فلم کو ہیپی اینڈنگ (Happy ending) پر ختم کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ جس کے نتیجے میں فلم ڈبے میں بند ہونے سے بچ گئی۔ اب خوشی خوشی پرنٹ یعنی دلہن ڈسٹری بیوٹروں کے یعنی دلہا کے متعلقین کے حوالے کر دی گئی تاکہ دھوم دھام سے ازدواجی تھیٹر میں اس کا شاندار پریمیئر ہو سکے البتہ دلہن دلہا کے حق میں ہٹ ہو گی یا فلاپ اس کی ضمانت نہیں دی جاتی کیونکہ ڈسٹری بیوٹر یعنی دلہا کے مقدر کا لکھا کوئی نہیں جانتا۔

دنیا کی فلمی تاریخ پر صرف سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ فلمی صنعت کرۂ ارض کے ہر چھوٹے بڑے مرفع الحال، مفلوک الحال، خوش حال، بدحال ہر طرۂ خاک یعنی کہ ملک کی معیشت کا اٹوٹ حصہ ہے اور ہندوستانی

فلمی صنعت کو صنعت و حرفت کے میدان میں وہی رتبۂ بلند حاصل ہے جو کہ عجائبات میں "تاج محل" کو اور "فرانتیا" میں بھول بھلیوں کو حاصل ہے بلکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ بھارت کی فلمی صنعت بجائے خود ایک بھول بھلیاں ہے۔ ایک طلسماتی نگری ہے جس میں مڑکر دیکھنے والا پتھر کا تو خیر نہیں ہوتا مٹی کا ڈھیر ضرور ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ہماری یعنی ہندوستانی فلموں کا تعلق ہے ان میں کوئی اور خوبی ہو نہ ہو، ایک نشہ ضرور ہوتا ہے اور وہ اس قدر زود اثر ہوتا ہے کہ اس کے آگے چرس، گانجہ، افیم بلکہ برادن شوگر عرف گرد کا نشہ بھی گرد ہو جاتا ہے یعنی ہرن ہو جاتا ہے۔ یہ نشہ نابالغوں کو وقت سے پہلے جوان، جوانوں کو منہ چھپئے اور نافرمان اور ادھیڑ دو معمر افراد کو ہوس کی کان بنا دیتا ہے۔ چناں چہ کچھ عرصہ پہلے ہم نے خود اپنی چشم گنہ گار سے ایک عدد نانا جان کو فلم "گیت گیاتی" کے لیے میں بیلو جان عرف چھپن چھپری کے خفیہ مکان کی طرف زود دار اڑان بھرتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد نانا جان کے ساز و سامان عرف ہوش و حواس کا کیا حشر ہوا غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں کی خوبیاں گنوانا آسمان کے لاتعداد تارے گننے کے مترادف ہے تاہم ایک خوبی اظہر من الشمس والقمر ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی پہلے تو صرف فلم دیکھنے پر اکتفا کرتا ہے مگر بعد میں غیر محسوس طور پر اپنے آپ کو فلم کے پردے پر دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا ہے لیکن اس تمنا کا شجرہ چونکہ براہ راست مرزا غالب کی اس تمنا سے جا ملتا ہے جس کا دوسرا قدم انھیں بھی کم سے کم دشت امکاں میں نہیں ملا چناں چہ فرماتے ہیں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

چناں چہ جو نوجوان فلمی آسمان پر ایک روشن ستارے کی صورت چمکنے کی خواہش لے کر والد کے قلم دان یا والدہ کے پاندان [illegible] کاٹ [illegible] اندازی ہوئی رقم پر ہاتھ صاف کر کے فلم نگری کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکنے میں کسی طرح [illegible] کامیاب ہو جاتے ہیں [illegible] کے دامن میں بھی اکثر ناکامی کی دھول ہی آتی ہے۔

اگلے وقتوں میں تو سنتا ہے کسی ایرے غیرے کا فلم اسٹوڈیو میں محض داخل ہو جانا ہی کامیابی کی دلیل ہوا کرتا تھا کیوں کہ مقدر آزمانے والے کا سابقہ سب سے پہلے اس کے اور فلم اسٹوڈیو کے درمیان دیوار چین کی طرح [illegible] والے دربان سے پڑتا تھا جو بقول راویان حسب زبان فلمی ستاروں کے آگے بڑھ کر [illegible] اور غیر طلبیدہ افراد کی گھنڈرے سے خبر لیا کرتے تھے۔ کچھ سخت گیر قسم کے دربانوں کے بارے میں [illegible] تک مشہور [illegible] ٹکراتا تو دور اپنی مونچھوں پر مکھی تک کو نہیں بیٹھنے دیا کرتے تھے چناں چہ اکثر قسمت [illegible] انگلی پتنگ کی مانند ان کی وسیع و عریض مونچھوں کی وسعت اور [illegible] میں گزارشات کی عرضی لیے الجھ کر رہ جاتے۔ یہاں ہمیں ایک کہانی کار کی یاد آ رہی ہے جن سے کبھی ہماری بھی اچھی خاصی یاد اللہ تھی۔ موصوف نے جس زمانے میں فلموں میں مقدر آزمانے کے لیے فلم نگری کا رخ کیا تھا وہ زمانہ اگلے دور کی مقبول ترین تاریخی فلم "پکار" کی کامیابی کا زمانہ تھا گویا چاروں طرف پکار ہی کی چیخ و پکار تھی۔ موصوف فلم "پکار" کے کم عمر مصنف کمال امروہی کی شہرت اور نام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود کو کمال امروہی [illegible]

ثانی ثابت کرنے کے ارادے سے آؤ دیکھا نہ تاؤ عازم بمبئی ہوئے۔ موصوف کے جوش نے انھیں یہ بھی سوچنے کا موقع نہیں دیا کہ آیا ان کے قلم میں کمال امروہوی کے قلم جیسی روانی ہے بھی یا نہیں لیکن ان دنوں موصوف جو کمال امروہوی بننے کے ہم عمر تھے لہٰذا کم عمری ہی کو عزت و شہرت کا پیمانہ جان کر سیدھے ایک فلم اسٹوڈیو کے گیٹ پر لینڈ کیا اور لینڈ کرتے ہی اس دور کے دستور کے مطابق دربان کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہوگئے لیکن کم عمری کا جوش حواس و ہوش پر پوری طرح غالب ہوتا ہے لہٰذا روزانہ قسمت آزماتے رہے۔ دربان انھیں روز باہر کا سے چلتا کر دیتا۔ یہ اگلے روز پھر پہنچ جاتے اور اس کی مونچھوں کو خوشامد کا مسکہ اور تعریفوں کا تیل پلا کر اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش میں لگ جاتے۔ آخرش تنگ آ کر دربان نے ایک دن ان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ اپنا قلم کان پر لگائے اسٹوڈیو میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ اور بات ہے کہ موصوف وہ سب حاصل نہ کر سکے جو کمال امروہوی نے حاصل کیا تھا۔ خیر یہ تو ایک شاذ و نادر مثال بھی ورنہ عموماً ہوتا یہ تھا کہ دونوں کی مسلسل مونچھ برداری سے بیزار ہو کر فلمی دنیا کا رخ کرنے والے خواہش مندوں کی اکثریت یہ کہتے ہوئے مایوس لوٹ جایا کرتی تھی :

کون جیتا ہے تری "مونچھ" کے سر ہونے تک

ڈاکٹر سید عباس متقی
(حیدرآباد)

کھاؤ قسم

جب سے شہر کے لیڈروں میں قسما قسمی ہو رہی ہے قسموں سے متعلق کچھ زیادہ ہی جان کاری کے مواقع حاصل ہوگئے ہیں۔ مثلاً قسم کیوں کھائی جاتی ہے۔ قسم کیسے کھائی جاتی ہے۔ قسم کھانے والے کیسے ہوتے ہیں۔ قسم کھلانے والے کیسے ہوتے ہیں۔ قسم کھانے سے فائدے کیا ہیں اور نقصانات کس قسم کے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس میں اور مباہلہ بازی سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب ہم بھی قسم کھانے اور کھلانے پر صدق دل سے آمادہ ہوگئے ہیں۔

پرسوں قصاب سے گوشت کم تولنے پر جھگڑا ہوگیا۔ قصاب بھی اگر برابر تولنے لگے تو قصاب بے حساب کا محاورہ غلط قرار پائے۔ بیگم نے شہہ دی کہ قصاب نے تمھیں الو بنایا ہے۔ اب اس بے چاری کو کیا پتہ کہ ہندوستان میں الو بنانے کا فن آزادی کے بعد بام عروج پر پہنچ چکا ہے۔ ہر شریف آدمی کو اس سے زیادہ شریف آدمی الو ہی بناتا ہے اور یہ الو بنانے کا کار خیر سارے معاشرے میں رواں دواں ہے۔ بیگم کے طیش دلانے پر ہم نے بالآخر قصاب پر گوشت کی کمی کے ساتھ ہلہ بول دیا اس خوف سے قطع نظر کہ عام اس کے دست و بازو تیز دھاری والے اوزار سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ ہم نے جوں ہی الزام لگایا وہ مباہلہ پر اتر آیا۔ یہ مباہلہ بھی عجیب شے ہے اچھے اچھوں کو اس سے بہلایا جاسکتا ہے۔ ہم نے لاکھ منع کیا بھائی آؤ شریفوں کی طرح دو دو ہاتھ ہو جائے لیکن مباہلہ سے اجتناب کرلو۔ وہ راضی نہ ہوا۔ اس نے قسم کھائی اور آس پاس کے دوکان داروں کی ہمدردیاں حاصل کرلیں اور ہم بہت مغموم و بدحال اپنے گھر روانہ ہوئے قصاب سے ہار گئے تھے اب بیگم سے شکست کھانی باقی تھی۔ شکست برابر والوں سے کھائی جائے تو غم غلط کرنے کے مواقع پیدا نہیں ہوتے لیکن کمتر لوگوں سے شکست کھائی جائے تو بہت برا لگتا ہے۔ شریف مرد کی طرح ہم نے مباہلہ کی روداد سنائی۔ شریک حیات نے کہا جھوٹوں کا مباہلہ غیر معتبر ہے اور ہم حیرت۔ مباہلہ قسم اور سچائی جیسے مادیں پر سیر حاصل تفکر کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کیوں نہ شہر سے تمام [illegible] اور

فوجداری عدالتوں کو بازیچۂ اطفال بنا دیا جائے جس میں ضرورتاً لوگ مباہلہ بازی سے اپنے تمام معاملات حل کرتے ہوئے اپنی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حیات کو پایۂ اختتام تک پہنچائیں۔ کاش ہماری حکومت بھی شواہد و ضوابط کی بجائے قسم اور مباہلہ کو قانونی شکل دے دے تاکہ شہادت و استدلال کے لایعنی ہونے کے سبب جو مقدمات عدالتوں میں برسوں سے زیر التوا ہیں تیزی سے سر ہو سکیں، ویسے بھی کون یہاں مقدمات کی یکسوئی پر دل و جان سے خوش ہے۔ اگر تمام مقدمات دنیا ہی میں فیصل ہو جائیں تو روزِ قیامت کیا معنی رکھتا۔

مباہلہ بازی کے اس دور دورے نے ہماری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل ہماری صبح قسم سے شروع ہوتی ہے تو شام قسم پر۔ ہفتے میں دو چار دفعہ مباہلہ بازی بھی ہو جاتی ہے۔ پولیس والے نے ہماری سائیکل پکڑ لی۔ ہم نے قسم کھائی وہ چھوڑ دیا۔ لائٹ والے نے آواز دی۔ تار نکالنے میں تاخیر ہو گئی۔ اس نے الزام جڑ دیا۔ ہم مباہلہ پر اتر آئے۔ اس نے نظر انداز کر دیا۔ ویسے کون ہے جو بھارت میں قسم نہیں کھاتا۔ پتی سے راشٹرپتی تک سب ہی تو قسم کھاتے ہیں۔ درزی بچا ہوا کپڑا نہیں دیتا قسم کھاتا ہے۔ دودھ والا خالص دودھ نہیں دیتا مباہلہ پر اتر آتا ہے۔ اساتذہ پڑھاتے کم ہیں قسمیں زیادہ کھاتے ہیں۔ بیویوں کی وفاداری اور دشمنوں سے رواداری محض قسم پر ٹکی ہوئی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ممالک کے سربراہان تک قسموں پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ جھوٹی قسم کھانا چار بڑے بڑے گناہوں میں ہونے کے باوجود عوام کا ایک طبقہ اس خوف سے مبرا ہے۔ بعض علما تو سعدی علیہ الرحمہ کے اس قول "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" پر اس شوق و ذوق سے عمل کرتے ہیں گویا ایسا سعدی نے نہیں اللہ میاں نے فرمایا ہے۔ بعض عقلا کہتے ہیں کہ اگر سارے ہی سیاسی معاملات محض قسما قسمی اور مباہلہ بازی سے طے ہو جاتے تو جنگیں کیوں لڑی جاتیں اور خون خرابہ کیوں ہوتا۔ دوسرے اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ عرصۂ جدال میں ہی تو صحیفۂ آسمانی کو نیزوں پر اٹھایا گیا تھا۔ قسم کا اعتبار بہر حال و بہر صورت لازم ہے خواہ وہ میدانِ جنگ میں ہو کہ بیش دالان میں عبداللہ کے گھر میں ہو یا اللہ کے گھر میں۔ جب ہم نے دیکھا کہ سماج نے قسم کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے تو اب اس کے کھانے میں ہم پیچھے کیوں رہیں۔ خواہ مباہلہ کے فضائل کچھ رہیں، مسائل کچھ رہیں۔ اب حالات کچھ ایسے ہیں کہ مباہلہ بھی ضروریات کے ایک شئے ہے جس سے غربا و فقرا اور مساکین سے زیادہ امرا، رؤسا اور مقربین استفادہ کر رہے ہیں۔ کوئی مباہلہ کی ضد میں ہے تو کوئی اثبات میں، کوئی کہتا ہے کہ ہر قائل کو قسم کھا کر کہنا چاہیے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے حالانکہ یہ بھی کہ ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا کہ تم قسم کھاؤ کہ میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں یا نہیں، آج کل بچوں کو اپنے والدین کے چال چلن پر کچھ زیادہ ہی شک ہونے لگا ہے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا معمولی معمولی باتوں پر قسما قسمی اچھی چیز نہیں تاہم کہتے ہو تو میں قسم کھاتی ہوں۔ بچہ تعلیم یافتہ تھا یہ کہہ کر اپنی ماں کی بات رد کر دی کہ ایک عورت کی شہادت قابلِ قبول نہیں۔ اب تو ہم خوف زدہ ہو گئے ہیں کہ کہیں لوگ ہم باتوں پر ہم قسم کھانے پر مجبور نہ کر دیں۔ جن پر ہم تاقیامت مجبور رہیں قسما قسمی کے اس فیشن سے شرفا کی پگڑیاں اچھلنے کا موقع آگیا ہے۔ شاید ہی کوئی شریف آدمی ہو جو نہایت شرافت سے اس روش پر چلتا ہو۔

چھوڑ پہلوان نے ایک کمیٹی بنائی ہے اور اس کا نام رکھا ہے "انجمن مباہلہ" اس کا افتتاح ایک ایسے لیڈر کے ہاتھوں انجام پایا جو قسم کھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

اب تو پہلوانوں ہی کا طوطی بول رہا ہے۔ مگدر گھمانے والے لیڈر ہوگئے اور ڈنڈ پیلنے والے منسٹر۔ ہم تو ڈر رہے ہیں کہیں ترنگے کی بجائے لنگوٹ نہ لہرانے لگے اور اسمبلی ہال میں لال مٹی نہ بچھائی جائے۔ "انجمن مباہلہ" میں ایک مولانا کو بلایا گیا۔ وہ چپ چاپ چلے آئے کہ کہیں تالاب ان کے موقف کو کمزور نہ کردے۔ ان سے پوچھا گیا آپ کیا کرتے ہیں۔ موصوف نے تو پہلے اپنی نئی نئی برآمد شدہ توند سہلائی۔ سرخ و سفید طویل القامت داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ گویا ہوئے خادم قوم ہوں۔ خدمت کرتا ہوں، پوچھا گیا کہ مہینہ کتنا کماتے ہیں۔ جواب دیا۔ بس خدا کے فضل سے چل جاتا ہے۔ کوئی بینک بیلنس۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ سوال ہوا۔ جو دو کروڑ کا بنگلہ آپ بنوا رہے ہیں قسم کھائیے کہ وہ آپ کی اپنی محنت کی کمائی کا حاصل ہے۔ وہ قدرے جز بز ہوا اٹھے۔ ہم سوچتے ہیں کہ روز قیامت کتنی توندیں تعفن کی آماجگاہ ہوں گی۔ دوسرے شخص کو آواز دی گئی جس کی آواز خطاب و موعظت کے لیے منفرد حیثیت رکھتی تھی۔ سوال ہوا "آپ کی مصروفیت" کہنے لگے۔ امامت کرتا ہوں۔ ایک چھوٹا سا مدرسہ ہے وہ چلا لیتا ہوں۔ آمدنی یہی کوئی ۳ ،۴ ہزار۔ پوچھا گیا، آپ نے جو بیٹی کی شادی میں چالیس ہزار کا ڈنر دیا ہے قسم کھائیے کہ وہ روپیہ آپ کا اپنا تھا قوم و ملت کا نہیں۔ کہنے لگے ہر آدمی جو بڑے بڑے کام انجام دیتا ہے اس سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ ہلکی پھلکی غلطیوں سے آپ کی کیا مراد ہے۔ یہی کوئی چند لاکھ کا ہیر پھیر

دنیا جانتی ہے کہ ہم ایک شاعر ہیں متشاعر نہیں۔ جہاں سناتے ہیں اپنی ہی غزل سناتے ہیں۔ ترنم سے ہار گئے ہیں۔ ورنہ مشاعرہ لوٹ لیتے۔ اب سامعین کے ذوق کا یہ عالم ہے کہ الاپ کو شعر و ادب کی فکر سے تعبیر کر رہے ہیں۔ مرزا غالب اگر اس دور میں ہوتے تو محض تخلص ہی بدلنے پر اکتفا نہ کرتے اپنی شخصیت ہی بدل دیتے اور وہ پیشۂ آبا اختیار کرتے ہوئے بیک جنبش شاعری ترک فرما دیتے لیکن ہم کوئی غالب نہیں جو اس قدر زود خفگی و سریع الحس کیفیت سے یکمشت دوچار ہوں۔ اپنی آفاقی ناقدری کے باوجود ہنوز مشاعرے پڑھ رہے ہیں۔ اب یہ قسمت ہی کی بات ہے کہ تحت اللفظ شعر سنانے کے باوجود غزل چل جاتی ہے گو اس میں صرف ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں جو گرفت ادراک سے ماورا ہی نہیں بلکہ فہم کو ترستی بھی ہیں۔ ایک دفعہ جب ہم مشاعرہ لوٹ کر لوٹے اور اپنی نشست پر براجمان ہوئے۔ ایک بھاری بھرکم آدمی جو ناسخ کی غزل لگ رہا تھا آدھمکا پوچھا۔ یہ غزل آپ کی اپنی ذاتی تھی۔ ہم نے کہا ہاں ہماری ہے۔ کہنے لگا۔ کھاؤ قسم۔ ہمیں بھی غصہ آگیا۔ پرجوش انداز سے قسم کھائی۔ جو غزل ابھی آپ نے سنی اور ہم نے پڑھی ہے وہ کہیں سے چرائی ہوئی ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اپنی ذاتی ہی ہے۔ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو میرا ذوق شعر گوئی غارت ہو جائے سماج میں ایک اچھے شہری کا اضافہ ہو۔ اور ہماری بیوی کی تمنا پوری ہو جائے اور اگر سچ بول رہا ہوں تو خدا تمھیں ساحر سے شاعر بنا دے اور تمھاری جیب سے سکوں کی بجائے مصرعے برآمد ہوں۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ ہم خوش

ہے کہ چلیے سماج ایک اور شاعر کو برداشت کرنے کے قابل ہو گیا۔

ہم تو ایک مار دو ٹکڑے کے قائل ہیں۔ تبھی تو سوچتے ہیں کہ اچھے اچھوں کو قسم کھلا کر آئینہ دکھا دیں۔ مثلاً ہم شہرت کے دلدادہ اور دولت کے بھوکے انسانوں سے حلفیہ جواب چاہتے ہیں جن کی جے جے کار سے بھارت گونج رہا ہے۔ ہم دنیا کی پوجا کرنے والوں اور چڑھتے سورج کے آگے سجدہ ریز ہونے والوں کو قسم دے کر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ غیبت جیسی منحوس شئے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ہاں کھاؤ قسم۔ الدنیا سجن المومن کیا آپ کا مطمح نظر دنیا نہیں ہے۔ نہیں کھاؤ قسم۔ کیا آپ اپنے لیے جو پسند کرتے ہیں اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند کرتے ہیں۔ ہاں کھاؤ قسم۔ اردو کے شاعروں ادیبوں اور قلم کاروں سے پوچھیں گے کہ کیا آپ کے بچے اردو پڑھتے ہیں۔ ہاں کھاؤ قسم۔ تاجروں سے پوچھیں گے جو ترازو تھامے بیٹھے ہیں۔ کیا آپ ڈنڈی نہیں مارتے۔ نہیں۔ کھاؤ قسم۔ پڑوسیوں سے دریافت کریں گے، کیا آپ پڑوسی کو اس کا حق دیتے ہیں۔ ہاں۔ کھاؤ قسم۔ ہم عالموں سے پوچھیں گے۔ کیا آپ جاہ و ثروت، حشمت و دولت، عزت و عظمت کے خواہاں نہیں ہیں۔ نہیں۔ کھاؤ قسم۔ اہل شباب سے سوال کریں گے۔ کیا تم پری رو خواتین پہ اپنی آنکھیں نہیں گاڑتے۔ نہیں۔ کھاؤ قسم۔ واعظوں سے پوچھیں گے، کیا آپ کے گھروں میں ٹی وی نہیں۔ نہیں۔ کھاؤ قسم۔ ہم مسلمانوں سے دریافت کریں گے۔ تم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ نہیں۔ کھاؤ قسم۔ اگر ہم ایسا کرنے لگیں تو ہمیں یقین ہے کہ لوگ ہمیں پکڑ لیں گے اور اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک ہم اس بات پر قسم نہ کھا لیں کہ اب کسی کو قسم کھانے پر مجبور نہ کریں گے۔

فضلِ حسنین
(الٰہ آباد)

آہ بے چارہ مرد!

ایک زمانہ تھا جب لفظ مرد سے ایک بارعب شخص کی شبیہ ذہن کے پردے پر ابھرتی تھی جس کی مونچھیں (جو اس زمانے میں عموماً ہوا کرتی تھیں) تنی ہوئی ہوتیں، اور گھر کے لوگ اس کا بڑا لحاظ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیوی بھی اس کا کہنا مان لیا کرتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے زمانے نے ترقی کی اور تحریک آزادیٔ نسواں ور نٹی گئی صورت حال اس کے برعکس نظر آنے لگی۔ دیکھا مرد جو بیوی کو انگلی پر نچانا اپنی اضافی لیاقت سمجھتا تھا، ب خود بیوی کی "جی حضوری" کو ہی اپنی زندگی کا واحد مقصد تصور کرنے لگا۔ کہیں مجبوری کے تحت تو کہیں فیشن کے طور پر آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ شریکِ حیات کے ساتھ چلتے وقت سازوسامان کا بوجھ کتنا ہی زیادہ یوں نہ بڑھتا جائے لیکن بچے گود میں شوہر نامدار ہی ٹانگے پھرتے ہیں اور جہاں بچے نے کسی احتجاج کے دیر رونے کی غرض سے منہ کھولا نہیں کہ والد بزرگوار نے بچے کے منہ میں جھٹ دودھ کی بوتل بطور ڈھکن فٹ کر ی۔ اپنے بچوں کو خود ہی دودھ پلانے کا کریز (CRAZE) بھی مردوں میں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

خواتین کو اتنی ترقی کرتے دیکھ کر ہی شاید اب بہت سے مرد اپنی وضع قطع عورتوں جیسی ہی بنانے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ رنگ برنگے پھول دار لباس کے ساتھ بال بھی زیادہ سے زیادہ لمبے رکھنے لگے ں۔ خواتین غالباً اسی ضد میں اب اپنے لیے بجائے کے بعض لڑکوں جیسے بال پسند کرنے لگی ہیں۔ فیشن کی یہ لٹا بدلی کبھی کبھی مسئلہ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ آپ نے وہ واقعہ تو سنا ہی ہوگا جب کسی میچ کے دوران اپنے ٹھیک منے کھڑی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا۔ "ذرا سا بغل سے ہٹ جاؤ بیٹی!" تو ان صاحب ا بغل میں بیٹھے شخص نے انہیں ٹوک دیا۔ "وہ لڑکی نہیں، لڑکا ہے۔" ان بیچارے صاحب حیرت کے ساتھ بولے "بھئی صاحب! اب میں لڑکی اور لڑکا نہیں پہچان سکا۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں بھائی صاحب؟" ۔جواب ملا۔

"دیکھیے مسٹر! بہتر ہوگا کہ آپ پہلی فرصت میں اپنی آنکھیں ٹھیک سے چیک کرالیں۔ ابھی تک میرا بیٹا آپ کو لڑکا نظر آرہا تھا اور اب آپ مجھے بھائی صاحب کہنے لگے۔ میں اس لڑکے کی ماں ہوں، مدرا!"

بال کالے کرنے میں خضاب مرد عورتوں کے بھی کان کاٹنے لگے ہیں۔ اگر خضاب بازی کی یہی رفتار رہی تو کہیں یہ نوبت نہ آجائے کہ کسی بزرگ صورت یعنی سفید بالوں والے ضعیف کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں ترس ہی جائیں۔ کیوں کہ بال رنگوانے کا مرض اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے کہ اب تو اوریجنل (اصل) کالے بالوں پر بھی قلعی (خضاب) کا ہی گمان ہوتا ہے۔

خیر! خواتین کے لیے تو سمجھ میں آتا ہے کیوں کہ انھیں اپنی جو چیز سب سے زیادہ چھپا کر رکھنی پڑتی ہے وہ ہے ان کی عمر، جس کے انھیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں یہ تو خواتین ہی جانتی ہوں گی یا پھر انھیں میک اپ اشیا سپلائی کرنے والا یعنی بے چارہ شوہر۔ اب اگر ان کے سر میں دو چار بال بھی سفید نظر آگئے تو ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے۔ لیکن مردوں کے لیے ایسی کیا مجبوری ہے، اس پر ریسرچ کی ضرورت ہے کیوں کہ اب تو ہم جب بال کٹوانے کی غرض سے حجام کی دوکان پر پہنچے تو وہاں بال کٹوانے والوں سے زیادہ بال رنگوانے والے نظر آتے ہیں اور ایک روز تو ستر پچھتر سال کے ایک بزرگ کو نہایت اطمینان سے بال کو ڈائی (خضاب) کراتے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ جب بڑے میاں اپنی چھڑی ٹھکٹھکاتے، ہانپتے کانپتے نکل گئے تو ہم حجام سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔ "خلیفہ: یہ بابا کیوں اپنے بال کالے کراتے ہیں؟ حجام نے مسکرا کر جواب دیا بابو جی کیا بتاؤں۔ اصل بات تو منہ سے نکالتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ بڑے میاں پھر سے نوشہ بننے کی چکر میں ہیں۔

اب ہمیں خیال آیا کہ مردوں کے ساتھ بھی تو مجبوری ہے کہ مرد جیسے جیسے بوڑھا ہوتا ہے۔ اس کا دل جوانی کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتا ہے یعنی مردوں کا دل ہمیشہ ریورس گیئر (RIVERSE GEAR) میں ہی چلتا ہے۔ ایک بڑے میاں تو نت نئی شادی رچانے کے ہی شوقین تھے۔ آخر ایک روز کسی دل جلے نے کہہ ہی دیا۔ "بابا! اب آپ کو شادی نہیں، اوپر جانے کی تیاری کرنی چاہیے۔" اس پر بڑے میاں بولے۔ "کیا بتاؤں بچے نکاح کے بعد جب عورتیں آپس میں میرے بچے کہتی ہیں، سنو بھئی لڑکا سلام کرنے اندر آیا ہے تو مجھے اتنا مزہ ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔" یعنی بڑے میاں خود کو "لڑکا" کہلوانے کے چکر میں ہی اتنے رسکی ایڈونچر (RISKY ADVENTURE) کے سفر پر نکل پڑتے تھے۔

چوں کہ لڑکوں کو بچپن سے ہی یہ خیال پریشان کرنے لگتا ہے کہ بڑے ہونے پر گھر کی ذمہ داری انھیں ہی سنبھالنا ہوگی۔ اس لیے اپنا کیریر (CAREER) بنانے کے چکر میں وہ اپنا لڑکپن قربان کردیتے ہیں۔ ڈاکٹر، انجینیر یا کلکٹر وغیرہ بننے کے لیے انھیں اپنا خون پسینہ ایک کردینا ہوتا ہے جب کہ لڑکیوں کو یہ سب بننے کے لیے صرف شادی کرنی پڑتی ہے یعنی کسی ڈاکٹر سے شادی کی نہیں کہ بن گئیں ڈاکٹرائن۔ کلکٹرائن یا دھنائن کہلوانے کا شوق ہوا تو کلکٹر یا دارو فہ سے شادی کرلی ورنہ ماسٹرائن یا بیوائن کی پوسٹ تو کہیں گئی نہیں۔

جب سے خواتین میں بیداری کی لہر آئی مردوں کے لیے ملازمت کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوتا جارہا ہے

کیوں کہ سلکشن کمیٹیاں عموماً مردوں پر ہی مشتمل ہوتی ہیں اور امیدواروں میں اگر لڑکیاں بھی ہوئیں تو انتخاب سو فی صدی میرٹ پر ہی ہوتا ہے یعنی سب سے اچھی لڑکی ہی منتخب کی جاتی ہے جہاں میرٹ ذہنی و تعلیمی لیاقت کے علاوہ دیگر باتوں میں دیکھی جاتی ہو وہاں۔ لڑکے غریب کہاں تک پائیں گے۔ چنانچہ جانے کتنے میری ٹوریس (Meritorious) لڑکے جگہ جگہ سر مارتے ہوئے تھک ہار کر بیوی کی غلامی کو ہی غنیمت سمجھنے لگتے ہیں۔

تحریک آزادیٔ نسواں نے مرد کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

دو صاحبان ایک ہوٹل میں بیٹھے اپنی اپنی شریک حیات کی شان میں قصیدہ خوانی میں غرق تھے۔ ایک نے کہا بھئی میری تو بس یہی دعا ہے کہ خدا سب کو میری ہی جیسی رحم دل رفیقہ حیات عطا کرے۔ جب کبھی میری طبیعت ذرا خراب ہو جاتی ہے تو نیک دل بیوی مجھے باورچی خانے میں قدم نہیں رکھنے دیتی۔ سارا کھانا ہوٹل سے منگوا لیتی ہے۔ اس پر دوسرے صاحب نے بھی سینہ تانتے ہوئے فرمایا "تو آپ نے میری وائف کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ جب کبھی ہوٹل بند رہتا ہے، بے چاری پورا کھانا خود پکا لیتی ہے اور مجال ہے کہ ماتھے پر ذرا بھی شکن آجائے"۔ اس پر پہلے والے صاحب نے حسرت کے ساتھ پوچھا "آپ کی وائف کو کھانا پکانا آتا ہے کیا؟" فخر سے ٹیڑھے ہوتے ہوئے جواب دیا "کیوں نہیں" "دو چار روٹیاں تو کھانے لائق نکل ہی آتی ہیں۔ اب جوابی کارروائی کے طور پر دوسرے نے بھی پوچھ لیا "آپ کی بیوی کیسی روٹیاں پکاتی ہے؟" منہ لٹکائے ہوئے جواب دیا۔ "پتہ نہیں، مجھے کبھی اس کے ہاتھ کی روٹیاں کھانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا!"

ہمارا تو دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر اور آپ سے باتیں کر کے اپنا اور آپ کا غم غلط کرتے لیکن مجبوری یہ ہے کہ بیگم نے صرف اتنی ہی دیر کی اجازت دے رکھی ہے۔ وہ بھی تو اسی زمانے کی ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں اور ہم نئے زمانے کے مرد۔!

اقبال شانہ
(حقل جیک، سعودی عرب)

گرمیوں کا موسم

دھوپ میں یوں نہ جاؤ، گرمیوں کا موسم ہے
چھاؤں میں چلے آؤ، گرمیوں کا موسم ہے

نرم نرم ہاتھوں سے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا
اک گلاس لے آؤ گرمیوں کا موسم ہے

لگ رہا ہے یوں مجھ کو، خطِ استوا پر ہوں
بحرِ منجمد لاؤ، گرمیوں کا موسم ہے

دیکھنا ہے گر منظر ہو بہو جہنم کا
میرے گھر میں آ جاؤ گرمیوں کا موسم ہے

تم تو ہو گئے یارو تر بتر پسینے میں
اب نہ غسل فرماؤ گرمیوں کا موسم ہے

ہو سکے اگر جانا برف ہاتھ میں لے کر
خواب میں چلے آؤ گرمیوں کا موسم ہے

گر پڑو گے چکرا کر کوچۂ حسیناں میں
عاشقی نہ فرماؤ، گرمیوں کا موسم ہے

گرمیوں کی گرمی یار سہہ نہیں سکتے
چاند پر چلے جاؤ، گرمیوں کا موسم ہے

دھوپ کی حرارت سے تم بہک گئے شانہ
شاعری نہ فرماؤ، گرمیوں کا موسم ہے

صوفے

ایسے بیٹھا ہے یار صوفے پر
اونٹ جیسے سوار صوفے پر

دامنِ ضبط دیکھ کر ان کو
ہو گیا تار تار صوفے پر

اس قدر نرم نرم ہے صوفہ
اونگھ لگتی ہے یار صوفے پر

بیٹھنے کے لیے خریدا تھا
سو گیا میرا یار صوفے پر

شرم تم کو مگر نہیں آتی
مانگتے ہو ادھار صوفے پر

کروٹیں لے رہے ہیں وہ جیسے
لوٹتی ہے بہار صوفے پر

سر کے اوپر کسی کے ہے صوفہ
اور کوئی سوار صوفے پر

پاس ان کے رقیب ہے جیسے
پھول کے ساتھ خار صوفے پر

کر رہے ہیں وہ لیٹ کر شانہ
غلطیاں بے شمار صوفے پر

غزل

حسن جب بھی علیل ہوتا ہے
عشق "انا علیل" ہوتا ہے

یار کے سر پہ ہے یہ منڈلاتا
دل محبت میں چیل ہوتا ہے

یہ محبت کا فیض ہے یارو
دل مسلسل ذلیل ہوتا ہے

عاشقی چھوڑ دے اگر صاحب
آدمی خود کفیل ہوتا ہے

حسن میک اپ میں اک پوڈر کا
اور زیادہ جمیل ہوتا ہے

شاعری سے علاج کرتے ہیں
جب بھی شانہ علیل ہوتا ہے

سید محمود حسینی
(حیدرآباد)

بنیاد پرست

دلہن کے والد عقد خوانی کے دن دوڑ دھوپ کے بعد شادی خانہ میں قریب ساڑھے چھ بجے کے وقت ء آرام کی خاطر اگلی صف میں رکھے صوفہ پر نشست افروز ہوئے ہی تھے کہ اتنے میں جناب قاضی صاحب موجود ہوئے۔ دلہن کے والد حیران ہوئے کہ قاضی صاحب یوں چلے آئے ہیں ضرور یہ نکاح نامہ کے فارمس ں خانہ پری کر کے چلے جائیں گے کہ دوسری جگہ بھی اسی طرح فارمس بھر کر لوٹ آئیں گے مگر ان کو ڈھونڈنا ہ مشکل ہو جائے گا۔ چلیں ان کو مصروف ہی رکھ لیتے ہیں۔ قاضی صاحب کو دلہن کے متعلق ضروری باتوں وغیرہ کی تفصیلات بتا کر فارمس کی تکمیل کر چکے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ دلہا اپنی معمولی طور پر سجی موٹر ے اتر کر اسٹیج کی طرف چلا آرہا ہے یہ آگے بڑھے اس کا استقبال کیا اور لیجا کر مسند پر بٹھایا اور کہا کہ بیٹے ابھی تو پونے سات بجے ہیں۔ آپ کچھ جلد ہی تشریف لے آئے۔ دلہا نے کہا کہ بابا مجھ سے پہلے تو قاضی صاحب موجود ہوئے ہیں۔ میں دیر سے آتا تو یہ چلے جاتے اور پھر تو ان کا ملنا مشکل رہتا ہے۔ مگر اصل بات تو یہ ہے آپ نے شادی کے رقعہ میں وقت نکاح سات بجے کا لکھا ہے اور اب سات بجنے والے ہی ہیں۔ اگر پ کی دختر نیک اختر اور میری ہونے والی زوجہ محترمہ اگر اندر موجود ہوں جو ہوں گی ہی تو نکاح کا نیک کام بھی تکمیل کیے لیتے ہیں۔ آپ لوگوں کی فکر نہ کریں۔ لوگ آتے رہتے ہیں' نکاح تو میرا ہونے جا رہا مام سب موجود ہیں چنانچہ ایجاب وقبول کی رسم بھی ہوئی اور خطبہ نکاح پڑھا گیا اور مبارک مت شروع ہوئی۔ گرمی کے دن آئس کریم پیش کی جانے لگی۔ لوگ آتے گئے گلے ملتے گئے یہاں تک سا ساڑھے آٹھ بجے دلہا آہستہ سے دلہن کے والد کے قریب آیا اور کہا بابا اب رسم جلوہ

کا انتظام فرمائیں۔ مجھے اندر لے چلیں ۔ دلہن کے والد حیران ہوئے اور کہا کہ بیٹے ابھی تو سوا آٹھ ہی بجے ہیں، یہ کوئی جلوہ کا وقت ہے ۔ دلہا نے کہا آپ نے رقعہ میں وقت جلوہ ساڑھے آٹھ بجے ہی لکھا ہوا ہے ۔ وقت پر نیک کام ہو ہی جانا چاہیے اور وہ یہ کہہ کر چلا زنانے میں جہاں دلہے کی بہنیں پہلے ہی سے منڈپ میں دلہن کو لے آئی تھیں۔ بس پھر کیا تھا کچھ ہی دیر میں جلوہ کی رسم بھی پایۂ انجام کو پہنچی اور دلہا سب سے ملتے قدم بوسی کرتے مردانے میں واپس ۔ پھر کوئی دس بجے کا وقت قریب تھا دلہا پھر اپنے سسر کے پاس چلا آیا اور کہا کہ اب رخصتی کی تیاری کروائیں۔ دلہن کے والد نے فوراً کہا کہ میاں شادی کے رقعہ میں رخصتی کا وقت میں نے نہیں دیا ہے۔ آپ اپنی دلہن کو لے جانے میں جلدی نہ کریں۔ اب دلہا میاں کی باری تھی کہا کہ بابا میں آپ کی دختر نیک اختر کا شوہر ہوں اور اس کو لے جانا میرا بنیادی حق ہے اور آپ مجھے میرے بنیادی حق سے باز نہیں رکھ سکتے۔ دلہن کے والد نے یہ سنتے ہی ایک فلک شگاف آواز بلند کی ۔ اف میرے خدا میرا داماد تو بنیاد پرست نکلا ۔

جمیل صدیقی بدایونی

پتلون

ہمارے ملک پر یورپ کی تہذیب کے اثرات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم نے لباس کے معاملہ میں اہلِ یورپ سے کافی استفادہ کیا حیرت کا مقام ہے کہ اس ملبوس نے صرف یہاں نہیں، تمام دُنیا میں اپنا سکّہ جمالیا۔ سبھی لنگوٹی بند، تہبند پوش، اور دھوتی دھاری دیکھتے دیکھتے پتلون پوش ہو گئے۔ پاجامے، دھوتیاں اور لنگیاں پیر پٹخ کر رہ گئیں۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس پرکالۂ آفت نے تمیز بندہ و آقا ہی نہیں اٹھائی بلکہ مردِ و زن کو بھی ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا کہ بیک نظر مرد و عورت کی پہچان دشوار ہو گئی۔ اس کا سہرا اتفاق رائے سے پتلون پر سنہری بیلٹ کی صورت میں باندھا جا سکتا ہے۔ مبالغہ نہ سمجھا جائے تو آج کے دور کو پتلونی دور کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

خدا جانے یہ بات کہاں تک سچ ہے کہ پتلون ایک کلمہ گو ٹیلر ماسٹر زریاب مرحوم نے اسپین کی سرزمین پر ایجاد کی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اسلامی لباس ہے جو زریاب علیہ رحمۃ نے رائج الوقت تہہ بند اور پاجامے کے امتزاج سے تخلیق فرمایا۔ یعنی تہہ بند کی بالائی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے پاجامے کے پائنچوں کو اس میں ٹانک کر ایک شاہکار میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح اس دور کے نیم وحشیانہ تمدن میں انقلاب عظیم برپا کر دیا جس کے دوررس نتائج نکلنے والے تھے۔

یہاں پر ہمیں ایک تاریخی ناانصافی یاد آتی ہے۔ جس کا تذکرہ حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنی "یادوں کی برات" میں کیا ہے کہ ان کے دادا جان نے ایک بار اپنے ایک لڑکے کو پتلون پہنے دیکھ کر فی الفور عاق کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی کیا تھا کہ "آپ کیا طوئے ظوئے، طوئے ظوئے کرتے ہوئے چل رہے ہیں"۔ دادا جان کا یہ فرمان پتلون سے اس نفرت کی بنا پر تھا کہ وہ اسے انگریزوں کی دین سمجھتے تھے۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ یہ تو اہلِ ایمان کی اختراع ہے تو شاید وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ برسبیل تذکرہ جوش صاحب کے دادا جان کا پتلون پوش نوجوان پر کیا گیا تبصرہ اتنا برجستہ ہے کہ شاید اس سے بہتر تبصرہ ہو نہیں سکتا۔ یہ پتلون پوش طبقہ آج بھی اسی طرح چراغ پا ہوتا ہے جس طرح اس وقت ہوا تھا کیوں نہ ہو آخر جوش صاحب کے دادا جان بھی فقیر محمد خان گویا جیسے صاحب سیف و قلم کی نسل سے تھے۔ عاق کرنے کا حکم اگر سیف تھا تو طوئے ظوئے کی پھبتی براہ راست زبان و قلم سے نسبت رکھتی تھی۔

پتلون کا لفظ انگریزی کی بجائے پرتگالی زبان سے اردو میں وارد ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پرتگالیوں سے ہمارے مراسم انگریزوں سے زیادہ قدیم ہیں۔ ہمارے ملک کی سرزمین پر سب سے پہلے جو سفید فام اترا وہ پتلون پہنے تھا اور اس کا نام واسکوڈی گاما تھا۔ پرتگالی میں اسے پنٹالون کہتے ہیں ہم نے معمولی سے لفظی تغیر سے پتلون کر دیا اور پھر جھجکتے جھجکتے پہن بھی لیا۔ انگریزوں نے تحریف کر کے اس لفظ کو پینٹ کر دیا کیوں کہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ ایک نہ ایک دن لوگوں کے بدن پر صرف PAINT ہوا کرے گی۔ بعد میں ان کا یہ قیاس بالکل درست ثابت ہوا اور ٹیڈی ازم کے دور میں پینٹ نوجوانوں کے جسم پر محض PAINT ہونے لگی تھی۔

ٹیڈی پتلون کے ذکر پر ہمیں اپنے ایک دوست کا لطیفہ یاد آتا ہے! انہیں چست سے چست پتلونیں پہننے کا جنون تھا۔ سوئے اتفاق ایک بار ان کی ٹیڈی پینٹ میں کھنکھجورے کا بچہ دبک گیا اور تب تک دم سادھے پڑا رہا جب تک انہوں نے کاغذ کی مدد سے پتلون اپنے جسم پر نہ منڈھ لی۔ اس ننھے سے کھنکھجورے کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ تو زندہ درگور ہو چکا ہے تو اس نے بطور احتجاج ہمارے دوست کی پنڈلی بھرلی۔ اب تو ان کا بُرا حال ہو گیا۔ کافی اچھل کود کی مگر پتلون ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سوئی کے ناکے سے اونٹ تو نکل سکتا تھا مگر ٹیڈی پتلون سے انسان کا نکلنا مشکل تھا۔ بالآخر جب ان کی حالت کافی دگرگوں ہو گئی تو ہم نے قینچی لیکر نیچے سے اُوپر تک نصف پائینچے کا آپریشن کیا تب کہیں اس نابکار کھنکھجورے سے نجات ملی۔

پتلون نے بھی زمانے کے بہت گرم و سرد دیکھے کبھی اس کو گیلس کی مدد سے پہنا گیا تو کبھی برجس کے روپ میں ٹیڈی پینٹ کا رواج بھی ہوا۔ بعد ازاں درزیاں شیریں سخن نے اس کے پائنچوں میں غرارے کی قلم لگا کر بیل باٹم ایجاد فرمائی لیکن پتلون اپنی سیمابی فطرت سے مجبور تھی۔ چنانچہ وہ اس پر بھی قانع نہیں ہوئی اور دیکھتے دیکھتے بیلی میں تبدیل ہو گئی۔ بیلی پتلون شلوار کی رومالی معدوم کر کے تشکیل دی گئی تھی مگر اس دور میں جو مقبولیت جینز (JEANS) کو ملی اتنی کسی قسم کی پتلون کو نہیں ملی۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں امریکہ کے خاکروب اس ٹائپ کی پتلونیں پہنتے تھے۔ اتنا تو ہمیں بھی یاد ہے کہ ایک زمانے میں کارخانوں اور فیکٹریوں میں کچھ مستری قسم کے لوگ چار چار جیبوں والی میلی کچیلی پتلونیں پہنا کرتے تھے۔ اور آگے پیچھے کی جیبوں میں اپنے اوزار اڑسے رہتے تھے۔ لیکن قربان جائیے اس فیشن کے کہ وہی گھسی پٹی پتلون آج لوگوں کی آنکھ کا تارا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب پتلون کی کریز ایک ضروری خوبی مانی جاتی تھی۔ تمام وضع دار لوگ اس کا بہت دھیان رکھتے تھے کہ پتلون کی کریز نہ ٹوٹنے پائے۔ ایک دفعہ ناک پر مکھی تو بیٹھ سکتی تھی مگر کیا مجال کہ پتلون کی کریز پر حرف آجائے۔ مگر جینز نے اس بورژوائی اندازِ فکر کو بالکل گھس ڈالا ہے۔ سُنا تو یہاں تک ہے کہ اگر گھٹنوں وغیرہ پر جینز کی نیلی رنگت اُڑی اُڑی سی نہیں ہوتی تو پتھر سے گھس گھس کر اُڑائی جاتی ہے۔ جینز کے چلن کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی نقاشی یا کشیدہ کاری نے بھی جنم لیا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اب اس پر کچھ اقوالِ زرّیں منقش ہونے

لگتے ہیں۔ جو جذبات خود تو انتہائی بے ضرر قسم کے جملے ہیں لیکن پتلون کے جن حساس مقامات پر کندہ ہوتے ہیں اس سے ان کی معنویت میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً رانوں پر "ٹچ می ناٹ"۔ سامنے "کس می" پیچھے "ہٹ می" وغیرہ وغیرہ جنھیں پڑھ کر مُردہ جذبات بھی خواہ مخواہ کلبلانے لگتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بچوں کی ریڈی میڈ پتلونوں پر دل مجروح اور تیر ستم کی نقاشی پتلونی تہذیب کی بالغ نظری کی شہادت دیتی نظر آتی ہے۔

انسانی جسم پر پتلون بظاہر بمقام اسفل السافلین پر نظر آتی ہے۔ لیکن اہل ذوق کے نزدیک اس کا مقام علیّین میں ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ شرٹ کا ہونا ضروری ہے لیکن جس باریک بینی اور تنقیدی شعور کے ساتھ پتلون کا کپڑا خریدا جاتا ہے اتنا بیچاری شرٹ کا نہیں۔ پتلون کا کپڑا قمیص سے دوگنا مہنگا ہوتا ہے اسی طرح اس کی سلائی بھی قمیص کی سلائی سے دوگنی مہنگی ہوتی ہے لیکن شائقین پتلون اس صرف بیجا کو بہ رضا و رغبت برداشت کرتے ہیں۔ کیونکہ پتلون میں آدمی کی شخصیت ایکدم فائیو اسٹار ہو جاتی ہے بوڑھا ہو یا جوان، نوعمر ہو یا بچہ حتیٰ کہ صنف نازک کو بھی جب سے اس راز کا پتہ چلا ہے انھوں نے بھی اس روگ کو بخوشی گلے لگا لیا ہے۔ اس کا سب سے مایوس کن پہلو یہ ہے کہ یہ روگ لاعلاج ہے اور جو لوگ ابھی تک اس کی لپیٹ میں نہیں آئے ہیں ان کے خون کی جانچ کرنے پر مرض پتلون کے مثبت جراثیم پائے گئے ہیں جس سے اس مرض کا ان کی اولادوں میں منتقل ہونے کا پورا پورا خطرہ ہے۔

مندرجہ بالا تجزیہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پتلون کی سماجی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اور چونکہ ادب بھی سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ پتلون جیسی شئے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا موضوع بننے سے چھوٹ جاتی۔ مرحوم اکبر الٰہ آبادی نے سب سے پہلے اس پر توجہ فرمائی اور اس پر کئی اشعار کہے لیکن ان کے ایک شعر نے تو اسے واقعی زندہ جاوید کر دیا۔ ؎

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو ⁂ اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو۔

اور جب پتلون کا شعر و ادب کے میدان میں پاؤں پسارنے کا تذکرہ چھڑا ہے تو ایک واقعہ اور سن لیجئے ایک بار ہمارے ایک دوست جو بزعم خود اپنے آپ کو مزاحیہ شاعر کہتے ہیں ہمیں اپنے ساتھ ایک شعری نشست میں لے گئے۔ وہاں پر سبھی غزلیں مصرعہ طرح کے مطابق پڑھی گئیں۔ زمین تھی "جانی نہیں جاتی، پہچانی نہیں جاتی"۔ بہر حال جب ہمارے دوست کی باری آئی تو انھوں نے اپنی غزل یا ہزل جو بھی تھی پڑھی۔ اچھی داد ملی مگر جب انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا

؎ عجب طرفہ صفت پتلون میں ہم کو نظر آئی ⁂ ڈھکا ہوتا ہے سب کچھ پھر بھی عریانی نہیں جاتی

تو ساری محفل پر عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ دو ایک نے داد بھی دی تو بڑے شرمیلے انداز میں۔ لوگ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔ ایسا تو ہمارے دوست نے ایک مہمل سا خیال ظاہر کیا تھا یا پھر اپنی حماقت سے کسی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ خیر جو بھی ہو اسی لمحہ ہمیں اپنی ایک نفسیاتی کمزوری کا دھیان آیا جو پتلون پہننے کے بعد ہمارے

اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔ اکثر جب ہم پتلون پہن کر گھر سے نکلتے ہیں تو نہ جانے کیوں ہمیں اپنی برہنگی کا احساس ستانے لگتا ہے۔ حالانکہ ایک عدد انڈرویئر بھی چڑھائے ہوئے ہیں۔ بلکہ ایک زمانہ میں جب ہمارا جسم کچھ لوبیا سا تھا تو ہم دو دو انڈرویئر ایک ساتھ چڑھا لیتے تھے مگر تب بھی برہنگی کا احساس پیچھا نہیں چھوڑتا تھا! اسی حالت میں اگر ہمیں کسی بینک، دفتر یا راشن کی دکان پر لائن میں کھڑا ہونا پڑتا ہے تو بس کچھ مت پوچھیے ایک جھرجھری سی رگ و پے میں دوڑتی رہتی ہے۔ ذہن میں ایک بات چکر کاٹتی رہتی ہے کہ ہمارے آگے بھی پتلون پوش اور پیچھے بھی۔ یعنی ہمارے مفروضے کے مطابق ننگوں کے درمیان ننگا۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ آپ ہم پر ہنسیں گے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مگر کیا کریں اپنی اپنی سوچ ہے اور اپنی اس بیک ورڈ قسم کی سوچ پر ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔

بابو آر کے (اچل پور سٹی)

لائبریری، اہلِ محلہ اور ہم!

ہم اہلِ محلہ کے ساتھ قدرت کا خاص لُطف وکرم رہا ہے یعنی ہر معاملہ میں ہم لوگ خودکفیل رہے ہیں. ہمارے محلے میں ویڈیو ہال بھی ہیں اور جوئے کے اڈے بھی۔ دیسی دارو کی دوکان اگر ہے تو دوری مٹکے کا استھان بھی). ..... لیکن ہمارے اس بھرے پُرے محلے میں اگر کسی چیز کی کمی تھی .... تو وہ تھی لائبریری کی۔ اس لیے اپنے محلے میں لائبریری کے قیام کا ارمان ایک عرصہ سے ہم اپنے دل میں رکھتے تھے۔ ہر نشست اور ہر تقریب میں یار دوستوں سے ہم، لائبریری کے قیام کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ لائبریری کی افادیت اور اس کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرنا اور لائبریری کے قیام پر زور دینا گویا ان دنوں، ہماری زندگی کا جیسے معمول ہوگیا تھا۔

الغرض ہمارے صبح وشام کے لائبریری کے اس ورد سے بیزار ہوکر ایک دن احباب نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم اپنے دولت کدہ پر "مشورہ برائے قیامِ لائبریری" کا اہتمام کریں جس میں محلے کے پڑھے لکھے حضرات کو مدعو کریں اور ان کے ذریعہ لائبریری کا قیام عمل میں لائیں۔ اس طرح ایک شام احباب کے مشورہ پر اہلِ ذوق حضرات کو ہم نے بطورِ خاص مدعو کیا۔ ہم نے مدعو سامعین کی سماعتِ عزیز کو خطبۂ لائبریری سے سرفراز کرتے ہوئے فرمایا ۔ کہ دیکھیے حضرات، قوموں کے عروج وزوال کو جہاں تک چشمِ بینا سے ہم نے دیکھا ہے اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بغیر لائبریری کے نہ کوئی قوم زندہ قوم کہلاتی ہے اور نہ ہی ترقی یافتہ۔ حاضرین! آج دنیا کے نصف دانشوروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مہذب قومیں وہی مانی جاتی ہیں جن کے بیچ لائبریریاں پائی جاتی ہیں جب کہ بقایہ دانشوروں کی دانست میں مہذب قوموں کے بیچ لائبریریاں نہیں پائی جاتیں بلکہ لائبریریوں کے بیچ مہذب قومیں پائی جاتی ہیں...

بس ثابت یہ ہوا کہ لائبریری اور ایک مہذب قوم کا چولی دامن کا ساتھ ہے ویسے یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی حاضرین کہ آج تک مذکورہ دانشور حضرات پوری طرح یہ طے نہیں کر پائے ہیں کہ وہ چولی کسے کہیں اور دامن کسے مانیں؟ لیکن دانشوروں کے سنگین طور سے سر جوڑ کر بیٹھنے سے صاف ظاہر ہے کہ بہت جلد آج نہیں تو کل، دانشور حضرات لائبریری کو بطور چولی تسلیم کرلیں گے اور مہذب قوم کو دامن سے منسوب کرنے میں انھیں کوئی عار نہ ہوگا۔ خیر صاحب، چولی اور دامن کی اس لایعنی سی بحث سے قطع نظر ہم لائبریری کے تعلق سے یہ بات عرض کرتا چلوں کہ سقراط ہی نہیں بقراط بھی،

نیوٹن کے ساتھ ساتھ واٹسن بھی اور ارسطو، افلاطون کے علاوہ مارٹن لوتھر کنگ اور سارترے تک الغرض دنیا کا ہر بڑا آدمی اپنی زندگی میں لائبریری کا مرہونِ منت رہا ہے کامیابی اور شہرتِ دوام، لائبریری سے جل کر ہی اس کے حصہ میں آئی ہے اس لیے اگر ہم بھی کامیاب و کامران ہونا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔ تو ہمیں لائبریریوں کو اپنی زندگی کے دن میں شامل کرنا ہوگا ہمیں اپنے شب و روز لائبریریوں میں گزارنے ہوں گے۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کردوں ۔۔۔ کہ آج ہمارا دیش محض اس وجہ سے پیچھے ہے کہ ہمارے ملک میں پہاڑ اور ندیاں تو بے شمار ہیں لیکن ملک میں لائبریریاں بہت کم ہیں۔ حاضرین، ہمارا ملک صحیح معنوں میں مہذب ملک اس وقت ہی کہلائے گا جب ملک میں بیرونی سید جیکوٹس اور بیرونی ہاتھ کے ساتھ ساتھ بیرونی لائبریریاں بھی درآمد ہونے لگیں گی۔ قصہ مختصر یہ کہ لائبریری کے قیام کے لیے ہم نے اپنی جوشیلی تقریر سے ایک سازگار ماحول پیدا کر دیا اور نتیجہ میں محلے کے ادب نواز حضرات نے لائبریری کے قیام کا بیڑہ اٹھالیا اور پھر بہت جلد ہمارے محلے میں ایک عدد عظیم الشان لائبریری کا قیام عمل میں آگیا۔

لائبریری کے قیام کے ابتدائی دنوں میں لوگوں نے بڑی لگن اور بڑے ہی چاؤ کے ساتھ لائبریری میں بلاناغہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ لوگ جوق در جوق لائبریری میں آنے لگے اور اپنے مطالعہ کی دولت سے لائبریری کے در و دیوار کو مالا مال کرنے لگے۔ جہاں محلے کے ظلم زدہ نوجوان اخبارات میں فلموں کے اشتہار دیکھنے کے لیے رنگین سوزن کشاں کشاں آنے لگے وہیں لاٹھی بند چشمہ بردار ریٹائرڈ حضرات کھانسی کی ٹھس ٹھس کے ساتھ لائبریری میں مقیم رہنے لگے الغرض ان دنوں لائبریری میں ہنگامے اور خوب چہل پہل رہنے لگی۔ لائبریری سے عوام کی دلچسپی دیکھ دیکھ کر ہم بھی پھولے نہیں سماتے تھے اور پھر یہ ہوا کہ ہمارا بھی زیادہ وقت لائبریری کی نذر ہونے لگا۔ پھر ہمیں یا بیٹھے بیٹھے ہم لوگوں میں بجائے مطالعہ کے گپ شپ اور ہنسی ٹھٹھول ہونے لگی اور کبھی کبھی تو تاش کی بازیاں بھی چلنے لگیں۔ چونکہ لائبریری کی تحریک محلے میں ہم نے اور ہمارے احباب نے چلائی تھی اس لیے لائبریری زیادہ سے زیادہ ہمارے ہی تصرف میں آتی گئی اور ۔۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری انہی کارگزاریوں سے لائبریری اپنے لائبریری پن سے دور ہوتی گئی۔ چونکہ لائبریری میں دن رات یار دوستوں کا مجمع جمنے لگا تھا اس لیے آہستہ آہستہ لائبریری میں بجائے مطالعہ کے مباحثے ہونے لگا۔ یہیں بیٹھے بیٹھے ہم محلے کے قضیئے نمٹانے لگے اور نئے نئے مسئلے پیدا بھی کرنے لگے۔ یہیں پر رشتے جوڑے اور توڑے جانے لگے۔ بس یوں ہی جوڑ توڑ اور لگائی بجھائی کی آماجگاہ بھی یہ لائبریری بن گئی۔ اسی لائبریری میں ہم احباب کے ہجوم میں گھرے اپنے مطالعہ کے رعب اور علمیت کے زعم میں سرشار ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں کھوئے رہتے اور شکیل جمالی کے رومانی ناولوں پر ناقدانہ رائے زنی بھی کرتے رہتے۔ شوکت تھانوی کی مزاحیہ تحریر پر بھی ہم گرفت کرتے اور کرشن چندر، پریم چند کی کہانیوں کے تانے بانے پر معترض رہتے۔ قصہ مختصر یہ کہ مصنفین کی مخالفت اور موافقت میں کئی مباحثے ہونے لگے، تو تو میں میں کا شور مچنے لگا۔ جس کے باعث لائبریری میں پڑھنا لکھنا برائے نام رہ گیا اور لڑنا جھگڑنا عام ہو گیا۔ اخبارات بجائے پڑھنے کے پھاڑے جانے لگے اور کتابیں

سرقہ نجات کا ذریعہ بنتا گیا۔ الغرض لائبریری، افراتفری کی نذر ہونے لگی اور پھر بات یہاں تک پہنچی کہ ابن صفی کے ایک ہی ناول کو بیک وقت پانے کے لیے لائبریری کے اندر پانچ پانچ چھ چھ جاسوسی لٹریچر کے جیالے پرستاروں میں باقاعدہ صف آرائی ہونے لگی۔ جس کے نتیجہ میں لائبریری کے ریڈنگ ٹیبل، فائٹنگ ٹیبل میں بدل گئے۔ کرسیاں بطور اسلحہ استعمال ہونے لگیں۔ القصہ ادب نواز حضرات کی بے ادبی اور ان کے ذریعہ کتابوں کی چھینا جھپٹی کے باعث لائبریری میں کتابیں جا بجا بکھری پڑی رہنے لگیں۔ جس سے لائبریری کے در و دیوار عنقا اور فرش کتابی ہونے لگے۔۔۔ جب لائبریری کا ماحول ایسے ہی ہنگاموں اور شور شرابے سے آباد ہوا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ہفتہ عشرہ میں لائبریری کے اندر پڑھے لکھے افراد کے مابین فوجداری کے واقعات بھی سرزد ہونے لگے۔ اس صورتِ حال میں لائبریری کے متعلق اہلِ محلہ میں تشویش کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

محلہ میں اکثر خاندان کے بڑے بوڑھے اپنے جوان بچوں کو لائبریری کے شر سے محفوظ رہنے کی دعائیں دینے لگے۔ یہاں تک کہ گھروں کی بڑی بوڑھیاں اللہ پیر کا واسطہ دے کر، جوانوں کو لائبریری کی طرف کوچ نہ کرنے کی قسمیں دیتیں اور انھیں لائبریری کی لت میں نہ پڑنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتیں، "دیکھو بیٹا زمانہ خراب ہے کل کو تمہاری شادی ہونی والی ہے خدانخواستہ تم ایسے دیسوں کی صحبت میں پڑ کر محلہ کی اس موئی لائبریری میں آنے جانے لگو اور پھر وہاں غنڈوں کے ساتھ تمہاری مار پیٹ ہو جائے۔ تو ہم شریف لوگ کیسے منہ دکھائیں گے؟ اس لیے تم اپنے پیر پہ کلہاڑی نہ مارو۔۔۔ لہٰذا اچھا ہے، لائبریری جاؤ نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ لائبریری کی اس تشہیر کا انتہا یہ ہوئی کہ۔۔۔ محلے کے ان گنواروں کو اپنی ناخواندگی بھی اچھی معلوم ہونے لگی اور لائبریری کی لعنت سے محفوظ رہنے پر وہ ناز کرنے لگے۔

القصہ ہمارے ذریعہ لائبریری کے غلط استعمال کے باعث محلہ بھر میں لائبریری معتوب ہو گئی لوگ اسے بیکاری کا اور عاقبت خراب کرنے کا مرکز سمجھنے لگے اور۔۔۔ ہمارے محلے میں شرفاء اور غیر شرفاء کی تمیز لائبریری میں جانے یا نہ جانے سے ہونے لگی محلہ بھر میں لائبریری سے بیزارگی کی ایک لہری دوڑ گئی۔۔۔ لائبریری بند کروانے کے لیے عوام الناس جلسوں اور سڑکوں پر نکل آئے جلسے جلوس آندولن ہونے لگے۔ اہلِ محلہ کی اس قدر شدید ناراضگی کو بھلا ایک ناتواں لائبریری کہاں تک برداشت کرتی بالآخر۔۔۔ ایکدن وہ بھی آیا جب اس لائبریری نے دم توڑ دیا اور ایک اچھی خاصی بسی بسائی لائبریری اُجڑ کر رہ گئی۔ ویسے لائبریری کا صد فیصد اُجڑنا اس لیے بھی ممکن ہوا کہ۔۔۔ اس کی عمارت غیر قانونی طریقے سے نزول کے اوپن پلاٹ پر کھڑی کی گئی تھی۔ اس لیے اہلِ محلہ کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر سرکار نے بلا دریغ تیشے اٹھا لیے اور آنِ واحد میں لائبریری زمین دوز کر کے رکھ دی۔ لائبریری کے زمین دوز ہوتے ہی ہمیں تو، پیروں کے نیچے کی زمین جیسے سرک گئی۔ ہمیں فکر لاحق ہوئی کہ اب ہم لوگ اپنی گپ شپ کی محفلیں کہاں جمائیں گے؟ کہاں بیٹھ کر ہم لوگوں میں جوڑ توڑ کریں گے اور کس جگہ بیٹھ کر ہم سیاسی چالیں چلیں گے؟ کیوں کہ ہم نے محلے کی اسی لائبریری مرحومہ میں بیٹھ کر لوگوں کی پگڑیاں اچھالا کرتے تھے اور یہیں لوگوں کو ٹوپیاں بھی پہنایا

ئے کرتے تھے۔ چونکہ ہمارے شب و روز اسی لائبریری کے دم سے رنگین ہوا کرتے تھے اور اسی کی چھت کے
کو اس کے در و دیوار کے درمیان مختلف لوگوں کے خلاف ہم نے کتنی ہی سازشیں رچی تھیں اور کتنے ہی ہنگامہ
ت دیا تھا۔۔۔ اور اب جبکہ اس کا سایہ ہمارے سروں سے اُٹھ چکا ہے ہر پل ہر آن مرحومہ کی کمی ہم لوگ شدت
نو محسوس کرنے لگے ہیں۔ لائبریری مرحومہ مغفورہ کی اس ناگہانی موت نے حقیقتاً ہمیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ان دِ
خلا ہم یہ سوچ سوچ کر اپنا خون پانی کرنے لگے ہیں کہ لائبریری کے اُٹھ جانے سے محلہ میں جو خلاء پیدا ہوا ہے
اس کا سدِّباب اہلِ محلہ کس طرح کریں گے ؟ اس روح فرسا سانحہ پر ہم قارئین حضرات سے استدعا کرتے
کہ وہ ہمارے حق میں دُعائیں مانگیں کہ ہم اس غم کو برداشت کر جائیں اور اس جانکاہ صدمے کو ہنستے ہوئے جھ
جائیں۔ نیز، قارئین یہ بھی دُعا مانگیں کہ۔۔۔۔ اللہ رب العزت ہمیں لائبریری نہ سہی۔۔۔ کسی اور ذریعہ سے ہی ہما
بقراط، نیوٹن، واٹسن، ارسطو، افلاطون بنا دے یا پھر مارٹن لوتھر کنگ یا کم سے کم ماوزے تنگ ہی بنا دے !

قطعات

نیاز سواتی (پاکستان)

شوہر شادی سے پہلے اور شادی کے بعد

شادی نہ ہوئی تھی تو بہت اس پہ فدا تھا
اب بچوں کی ماں کے لیے جلاد ہے شوہر
سو سامنے محبوبہ تو ریشم کی طرح نرم
بیگم ہو مقابل میں تو فولاد ہے شوہر

شادی کا شوق

والدہ بولی کہ بہنیں تین ہیں بیٹھی ہوئی
آپ شادی کا ارادہ ترک ہی فرمائیے
اس پہ بیٹے نے کہا جلدی کریں شادی مری
بہنیں گر بیٹھی ہیں تو کہیے کھڑی ہو جائیے

شاعر کی بیگم

دلہن نے جب کہا میں تو پکانے سے نہیں واقف
مری جو ہے یہ کمزوری تجھے ہر دم ستائے گی
کہا شاعر نے "مت بے تاب ہو اس بات پر بیگم!
یہاں یہ کھانے اور پینے کی نوبت ہی نہ آئے گی"

ڈاکٹر اور نقاد

ڈاکٹر اور حضرت نقاد
سخت الجھن میں ڈال دیتے ہیں
جسم و تحریر گو درست بھی ہوں
نقص پھر بھی نکال دیتے ہیں

پنشن

تازہ پنشن لے کے جب بابو سے ہم نے یہ کہا
اب گزشتہ سال کی پنشن عنایت کیجیے
وہ یہ بولا تب ملے گی سابقہ پنشن حضور!
آپ پچھلے سال بھی زندہ تھے ثابت کیجیے

آبادی کی لوڈ شیڈنگ

بڑھ رہی ہے برق رفتاری سے آبادی حضور
اپنی چادر سے زیادہ پاؤں مت پھیلائیے
لوڈ شیڈنگ جس طرح بجلی کی فرماتے ہیں اب
لوڈ شیڈنگ آپ آبادی کی بھی فرمائیے

مہنگائی اور عاشقی

روز پیپسی میں پلا سکتا نہیں ہوں تجھ کو
سادہ پانی کے علاوہ کوئی مشروب نہ مانگ
اب گرانی میں دکھا سکتا نہیں میں اخلاص
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

بستے اور بچے کا وزن

بستے کا وزن بڑھ گیا ہے بچے کے وزن سے
کیوں بچے کے لبوں پہ نہ فریاد و آہ ہو
اس حال میں وہ خاک پڑھے اور لکھے نیازؔ
دیکھو اُسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

ڈاکٹر محبوب الرحمٰن بزمی (رانچی)

غزل

مدد مولا، مصیبت کی گھڑی ہے
درِ محبوب پر کتنی کھڑی ہے

اُسی سے آنکھ میری جا لڑی ہے
جو مجھ سے عمر میں دگنی بڑی ہے

الٰہی کیا کروں دستِ ہنر میں
قلم کے بدلے اک موٹی چھڑی ہے

نئے مہمان ٹوٹے پڑ رہے ہیں
پرائے دل کی اُن کو کیا پڑی ہے

سراپا کیا لکھوں اس مہ جبیں کا
ہے لب لٹّو تو عارض رابڑی ہے

فلاکت، مفلسی، بے روزگاری
ہمارے عہد میں در در کھڑی ہے

جو ہیں اہلِ نظر آکر بتائیں
وہ ہے گلفام یا وہ پھلجھڑی ہے

تری دہلیز کو کیسے پھلانگوں
کہ میری تاک میں بیوی کھڑی ہے

شریعت اور طریقت کا یہ شوشہ
خدا کے ساتھ بھی دھوکا دھڑی ہے

دعا لو بیٹ گیا بزمی تمھارا
دکھا دے کی تمھاری ہیکڑی ہے

غزل

(ع کوئی احوال تازہ نہیں ہے)

یہاں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہے
محلّہ وہ کیا جس میں غنڈہ نہیں ہے

نہ میں سیٹھ ہی ہوں نہ کوئی منسٹر
مرے ساتھ میں کوئی چمچہ نہیں ہے

جوانی تو رنگ اپنا دکھلا کے گزری
بڑھاپا بھی کچھ کم رنگیلا نہیں ہے

وہ برسائے چپل تو برساؤں جوتے
کہ بھادوں تو ساون سے دبلا نہیں ہے

کھلائے پلائے بھرے جیب میری
مجھے ایسا مُلّا تو ملتا نہیں ہے

جو قسمیں ہیں جھوٹی جو وعدے ہیں جھوٹے
ترے جیسا جھوٹا تو دیکھا نہیں ہے

یہ دن بھی مقدر نے مجھ کو دکھایا
حسینوں میں اب میرا چرچا نہیں ہے

مرا قرض لوٹا دے احسان ہوگا
گزارش ہے پیارے تقاضہ نہیں ہے

اسے جھوٹے وعدوں سے بہلائیے مت
کہ عارف تو اب کوئی بچہ نہیں ہے

رشید عارف (بہار)

یوسف امتیاز
ٹورنٹو (کینیڈا)

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے

جادو بھی عجیب چیز ہے چاہے وہ یورپ کا ہو یا ایشیا کا ـــــ مشرق کا ہو یا مغرب کا ـــ بھانامتی ہو۔ یا پی سی سرکار کا جادو۔ بنگالی جادو یا آفریقہ کا جادو جس کے علاج کا دعوے دار VOODO ڈاکٹر ہے۔ انسانوں، گرجون، شیر، گیدڑ جیسے یا کسی بھی جانور کی ہڈیاں، سب ہی اس کے جادوگر مسیحا استعمال کرتے ہیں۔ نسخے، تعویذ، گنڈے کے ذریعہ شرطیہ علاج کا دعویٰ ہندوستان، پاکستان میں عامل اور پنڈت کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ بنگالی عورتوں کی سیاہ زلفیں جادو کے ذریعہ اپنا اسیر بنالیتی ہیں۔ عاشق یا معشوق کے فراق میں بھٹکتی ہوئی بے چین روحیں نہ جانے کیسے معصوم انسانوں کی نیندیں خراب کردیتی ہیں جو کبھی بند دروازوں کو کھول کر آجاتی ہیں یا پھر بند دروازوں کی لگی ہوئی چٹخنیوں کو خاموش رات کی تاریکی اور بھیانک گہرائی میں زوردار آواز کے ساتھ کھول کر آدھمکتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا انسان جب اپنی چارپائی پر چادر تان کر سوجاتا ہے تو یہی روحیں اس کے پلنگ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتی ہیں۔ بعض لوگ راستہ چلتے چلتے تنہا تاریک راتوں میں روحوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ بکھرے ہوئے بال ہونٹوں سے بھی نیچے اور باہر نکلے ہوئے لمبے لمبے دانت، بغیر ناخنوں کے ہاتھ، منہ سے آگ کے شعلے برساتی ہوئی سانسیں، پیشانی پر جڑی بڑی بڑی آنکھیں، پیچھے کی طرف لگے ہوئے پاؤں اور پیچھے کی طرف لگے ہوئے پاؤں اور پنجے ـــ لوگ جوتے یا چپل چھوڑ کر ایسا بھاگتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لوگوں کے ہوش ٹھکانے نہیں ہوتے مگر انھیں ہر وہ بھولی ہوئی دعائیں اور منتر یاد آنے لگتے ہیں جو دماغ کے کسی گوشے میں برسوں سے منجمد پڑے ہوتے ہیں۔ بعض سورما ایسے بھی ہیں جو بھوتوں اور روحوں سے مونچھوں پر تاؤ دے کر بات چیت بھی کرتے ہیں اور مراسم بھی قائم کرلیتے ہیں۔ ان کے

پاس رگڑنے کے لیے الہ دین کا چراغ تو نہیں ہوتا مگر کوڈ ورڈ (CODE WORD) انھیں ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جی میں آیا تو فوراً اسی کے سہارے غلام کو بلا لیا۔ پتہ نہیں یہ کون سے دل گردے اور جگر کے ہوتے ہیں کہ انھیں نہ اللہ کا ڈر ہے اور نہ بھوتوں سے خوف۔

کچھ جادو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو روحوں، بھوت پریت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے نہ بنگالی حسینہ کی سیاہ زلفوں کی ضرورت ہے اور نہ یورپ کی کٹی چوٹیوں یا بلونڈ BLOND کی۔ یہ ایسا جادو ہے جو چڑھ جائے تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نہ دن کی روشنی نظر آتی ہے اور نہ رات کی تاریکی۔ کچھ پر تو صحبت کا اثر ہے۔ عمر کا تقاضا ہے اور کچھ کے لیے حالات، ماحول اور قسمت کو دخل ہے۔ دنیا کے سیاسی حالات اور معاشی مشکلات و تباہی نے ایسا رنگ جمایا کہ رسوئی گھر کی تپش اور گرمی انھیں باہر نکال لائی ہے۔ نئی دنیا کی تلاش میں کچھ سیدھے اور قانونی طریقوں سے ترقی یافتہ دنیا میں سر چھپانے میں کامیاب ہوگئے یا مغرب جانے کی دھن میں ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے۔ اس جادو نے انسانی دماغ کے سوچ بچار کے سارے خانوں کو ایک دم سرخ RED ALERT کر دیا ـــ قانونی اور غیر قانونی ذرائع کا استعمال ہوا۔ اس مغربی دنیا میں خوش حال زندگی سے پیسے کی چمک دمک، موٹروں کی ریل پیل، اور ٹیلی ویژن کی چکا چوند ٹی وی اور ویڈیو کی رنگا رنگی ـــ آنکھیں خیرہ کر دینے اور سر بازار آزادی کے ساتھ گھومنے پھرنے والے حسن نے یوسف کو بھی سر بازار لا کھڑا کر دیا اور خود کو نیلام کے لیے پیش کر دیا۔ اسی جادو نے حضرت انسان کو جعلی پاسپورٹ، جھوٹے رفیوجی ہونے کے دعوے، فرضی شادیاں کرنے اور طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔ کس کس کا ذکر کیا جائے کہ اس جادو نے اکثریت کو ایک ہی حمام میں ننگا کر دیا ہے۔ وکیلوں کی تجوریوں اور جیبوں کو بھرنا شروع کر دیا۔ اخبار، ٹی وی کے اشتہار آئے دن ایسے ہی وکیلوں اور صلاح کاروں سے پر ہیں جو سر چڑھ کر بولنے والے اس جادو کا علاج جاننے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ان میں وہ (VOODO DOCTOR) بھی شامل ہیں جن کے پاس نہ تو قانونی ڈگری ہے اور نہ کھوپڑیاں اور ہڈیاں بس کچھ جانے پہچانے چند نسخے تعویذ اور گنڈے۔

مغربی دنیا سے پہلی بار کھلے بندوں متعارف ہونے پر ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں۔ ملاؤں اور پنڈتوں کی کمی نے خود کو ان کی گدی پر بٹھا دیا۔ آنکھوں کے آگے تاریکی چھانے لگی۔ سماج کے بالکل مختلف رسم و رواج نے ان کو دن میں تارے دکھلا دیئے۔ جسم کے سارے انجر پنجر ڈھیلے ہونے لگے۔ صدیوں کے گزرے آبا و اجداد یاد آنے لگے۔ ان کے آزمودہ غیر آزمودہ کامیاب یا ناکامیاب نسخوں کی تلاش ہونے لگی۔ بچپن میں پڑھی ہوئی اس کہانی کا منظر سامنے آنے لگا۔ جب کہ ایک چوہے کے سر پر درخت سے ایک پتہ گرا تھا اور اس نے یہ سمجھ کر کہ آسمان گر رہا ہے سارے جنگل کو سر پر اٹھا لیا اور سب ہی جانور بشمول شیر اور ببر بھی چوہے کے پیچھے پیچھے سر چھپانے بھاگنے لگے۔ بشمول شیر اور ببر بھی چوہے کے پیچھے پیچھے سر چھپانے بھاگنے لگے۔ ایسی ہی بھاگ دوڑ نئی دنیا ذہن میں بھولا ہے کہ جب نے سر اٹھایا تھا کہ سنگ یاد آیا۔ سامنے مجنوں اور لیلیٰ اپنے اپنے مذہبی

عقیدوں اور ایمان کے مطابق اللہ کے گھروں کی طرف بھاگنے لگے ہیں۔ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے فلسفے سے دماغ معطر ہونے لگے ہیں۔ اس آسمان گرنے کے خوف سے بہت سوں کو تارے نظر آنے لگے۔ ہر خلیل خاں کے ہاتھوں کے فاختے اڑتے دکھائی دیئے۔ ہری گھاس سمجھ کر چرنے کا زرین موقع فراہم کر دیا۔ حلال حرام، سور، غیر سور اور شراب نوشی کے مسئلہ پر محفل محفل، گھر گھر بحث ہونے لگی۔ اس ہراسانی اور بھاگ دوڑ میں اگر کچھ نہ ہوا تو ہر ایک کو اپنی ایک علیحدہ مسجد، مندر بنانے کا موقع ضرور مل گیا۔ مذہب کا شناخت کے جادو نے بہت سوں کے اچھے بھلے چہروں کو بدل دیا۔ لمبے لمبے قمیص اور پاجامے، سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی کو نجات کا ذریعہ سمجھ لیا گیا —— ہندوؤں نے مندروں کا رخ کیا اور دن رات کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ماتھے پہ ہزار قسم کی ہمہ رنگی ٹیکے اور لکیروں میں ملکی دکھائی دی۔ فیشن ایبل بغیر پگڑی اور داڑھی والے سردار پھر سے وہیں پہنچ گئے۔ جہاں سے چلے تھے —— نہ خدا ہی ملا اور نہ وصالِ صنم مذہب کی اہم اور بنیادی باتیں اس سیلاب کی نظر ہو گئیں مگر غیر اہم اور نظر انداز کر دینے والی روایتوں پر گرفت مضبوط تر ہو گئی۔ مذہب کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔

مغربی ممالک کے دروازے ہر اس شخص کے لیے کھلے ہیں جو قسمت آزمائی کرتا ہے۔ بعض کو بن مانگے موتی مل جاتے ہیں اور بعض کو ریت۔ اب ان کے کیا کہنے جنھوں نے اپنے آبائی ملکوں میں کبھی بھولے سے بھی قلم نہیں اٹھایا۔ امتحانات نقل بازی کے ذریعہ کامیاب کیے۔ کسی اخبار کے دفتر میں کلرکی کی۔ کبھی کبھار سماجی روایت کو پورا کرنے کسی ادبی محفل یا مشاعرے میں بطور تفریح شرکت کر لی۔ ادبی صلاحیتوں کو اللہ کی دین سمجھ لیا اس لیے کبھی مشقت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ نئی دنیا میں تجارت کے مواقع دیکھے تو جی بہت ہی تلملایا۔ بغیر محنت پرانی دنیا سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کو کاٹ کر کاغذ پر چسپاں کر دیا۔ کچھ اشتہارات جمع کر لیے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر بن بیٹھے اور ماتھے پہ صحافی کا لیبل چسپاں کر لیا۔ اللہ نے ان کو نہ کبھی توفیق دی اور نہ ہمت ہوئی کہ اداریہ یا مضمون لکھ سکیں۔ کسی نے یہ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں کی کہ شریمان یہ آپ ایڈیٹر کس طرح بن بیٹھے ہیں۔ اچھی اچھی تحریروں کو اپنی جہالت کم علمی اور بد ذوقی کی عینک سے دیکھتے ہیں! دل جی چاہے اعتراضات کر بیٹھتے ہیں۔ بے چارے لکھنے والے حالات اور خبروں کا تجزیہ کرنے والے تو بلا معاوضہ لکھے جا رہے ہیں۔ اور ان فرضی مدیروں کا پیٹ بھر رہے ہیں۔ دوسری زبان کی مہارت تو دور کی بات ہے اپنی ہی زبان کا ایک جملہ خالص نہیں بول سکتے۔ ایسے ہی حضرات ٹی وی پر اپنی ہی زبان کی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ شرم کی بات ہے کہ جن کا انٹرویو لیتے ہیں ان کا نام صحیح طرح ادا نہیں کر سکتے۔ ایک قوال کو ٹی وی اور ریڈیو پر یہ کہہ کر متعارف کر دیا کہ یہ پہلے تعلیم یافتہ قوال ہیں۔ اس کی تشریح بولنے اور سننے والے کی ذہانت پر چھوڑ دی جاتی ہے۔ یہ وہی ہیں جو نون اور نونِ غنہ کے فرق سے لاعلم ہیں مگر ریڈیو ٹی وی کے بل بوتے پر

اپنی قابلیت کا لوہا ، پیتل یا کانسہ منوانے کے خواہش مند ہیں ۔

نئی دنیا میں بسنے والوں کو جب پیٹ بھر جانے سے فراغت مل جاتی ہے دن بدن بڑھتی ہوئی توند ہاتھ سہلاتے تھکن محسوس ہونے لگتی ہے تو دل و دماغ روشن ہونے لگتے ہیں ۔ مغربی موسیقی کچھ تو آباؤ روایات اور کچھ زبان کی ناسمجھی سے پلے نہیں پڑتی ۔ خالص ساز سننے کے کان عادی نہیں ہیں ۔ تیسرے درجے کی گھٹیا تک بندی سہی مگر شاعری ضرور چاہیے ۔

شیکسپیئر نے کبھی کہا تھا کہ موسیقی روح کی غذا ہے ۔ بجائے جاؤ ۔ بجائے جاؤ لیکن یقیناً شیکسپیئر نے ان کو ہرگز ہرگز دعوت نہیں دی تھی جنھیں سر تال کا کوئی پتہ نہیں ہے اور پھر اس وقت تک اپنا راگ الاپتے رہیں ۔ جب تک کہ سننے والوں کے کان پک نہ جائیں ۔ ساز کی کمی گھر کی ڈائننگ ٹیبل برتنوں کانٹے چمچوں نے پوری کر دی ۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ایسے گانے والوں کی تعداد میں صرف خرگوشوں کی طرح اضافہ ہو رہا ہے بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو پہلے شہر پھر صوبے پھر ملک بلکہ continent کا محمد مہدی حسن ، لتا منگیشکر اور مکیش بنا لیا ہے ۔ بھگوان کی کرپا سے ٹی وی کے میزبان انھیں اسی خود ساختہ خطاب سے بڑے فخر کے ساتھ متعارف بھی کرواتے ہیں ۔ سیکھنے ، محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے جب کام مکھی پر مکھی بٹھانا ٹھہرا اگر ایسے تان سین اور بیجو اس کی صلاحیت نہیں رکھتے مگر پورے سازوں کے ساتھ گانے پر اصرار بھی کرتے ہیں چاہے سازندوں کو ان کے بھٹکتے آوازہ سر تال کے پیچھے اندھادھند بھاگنا ہی کیوں نہ پڑے ۔ موسیقی بھی عجیب جادو ہے جو ایک بھانڈ کو قوال بنا دیتا ہے اور پھٹے گلے والا گائے بھینس ضرور فراہم کر دیتا ہے

سیاست سے بے پناہ دلچسپی اور اس پر بے لاگ تبصرے ہماری زندگی کا حصہ پرانے ملک میں بھی تھے اور نئی دنیا میں بھی ۔ جس دنیا میں اب رہ رہے ہیں جو اپنا اور اپنے بچوں کا وطن ہے اس سے اس قدر دور دور رہتے ہیں جیسے کوئی بھوت پریت ہو مگر پرانے دیس کی بے کار غیر مفید سیاست سے اس قدر لگاؤ کہ ہر ایک نے گلی گلی کوچہ کوچہ اپنی ایک علیحدہ انجمن بنا رکھی ہے اور اپنے چمچوں حواریوں کی مدد سے خود اس کے لیڈر بن گئے ۔ بعض نے تو خود ہی اپنی صدارت کا اعلان کر دیا ہے ۔ نعرے لگانا ، خواہ مخواہ خود کا دباؤ بڑھانا ، آواز بلند کرنا ، ایک دوسرے کی غیبت اور گریبان پکڑ لینا ایجنڈے میں شامل ہے ۔ ہر ایک کو لیڈری کا شوق ہے ۔ پرانے ملکوں میں روزانہ کے سیلاب ، زلزلوں اور آئے دن کی مصیبتوں کے چندہ جمع کرنے پر ہر ایک تیار ہے مگر متحد ہو کر کار خیر میں حصہ لینا یہ تو شیطان نے نہیں سکھایا ۔ دشمنی اور آپس کی رقابت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے ۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے والی انجمنیں اور ان کے قائدین سب ہی ایک دوسرے کی پلیٹ سے روٹی چھیننے میں مشغول ہیں ۔ ہے کوئی ان کا مسیحا اور ہے کوئی تعویذ یا گنڈا جو اس سحر سے نجات دلائے ۔

قلمی معاونین مضامین خوش خط ، سیاہی سے لکھ کر روانہ فرمائیں جو کاغذ کے ایک رخ پر ہوں ۔ براہ کرم زیراکس کاپیاں نہ بھیجیں ۔

شکیل شاہ جہاں
(کامٹی)

تنخواہ کا دن اور ہم

دن تو بہت سے آتے ہیں۔ بُرے دن کے بعد اچھے دن، اچھے دن کے بعد برے دن۔ ان کے علاوہ بھی کچھ خاص دن ہیں، جن کی آمد کا ہم بے چینی سے انتظار کرتے ہیں جیسے عید کا دن، بقر عید کا دن، ہولی کا دن، دیوالی کا دن ایک اہم دن اور ہے جس کے بعد زندگی ایک انوکھا موڑ لیتی ہے یعنی شادی کا دن ——— لیکن ان تمام دنوں پر بھاری ایک دن اور ہوتا ہے اور وہ دن ہے تنخواہ کا دن ——— جب پتہ چل جائے کہ کل تنخواہ ہوگی، ہماری چال ڈھال میں ہی نہیں بلکہ چال چلن میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مزاج میں رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ دل مچلنے لگتا ہے۔ آنکھیں خواب دیکھنے لگتی ہیں اور ہاتھوں کی انگلیاں حرکت کرکے نوٹ گننے کی مشق کرنے لگتی ہیں۔

ہماری اس غیر معمولی حالت کو دیکھ کر بیگم بھانپ جاتی ہیں کہ ضرور کوئی خاص بات ہے اور ان کی خاص بات کا اشارہ ہماری نئی محبوبہ کی جانب ہوتا ہے جو پوری طرح خیالی ہے۔

تنخواہ والی صبح جب ہم اٹھتے ہیں تو ہر کام میں ایک پراسرار تیز رفتاری آجاتی ہے۔ اس صبح کے علاوہ باقی صبح جب تک بیگم ہم کو تین چار مرتبہ نہیں اٹھاتیں۔ ہم نہیں جاگتے۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ جلدی اٹھ کر وقت پر آفس پہنچ جائیں۔ لیکن تنخواہ والے دن ہمارا معمول یکسر بدل جاتا ہے۔ بیگم کی ایک آواز پر ہی ہم بستر چھوڑ دیتے ہیں اور جلدی جلدی اپنے سارے کام مکمل کرتے ہیں۔ اس دن ایسا لگتا ہے کہ ہم واقعی ملازمت کرتے ہیں۔ ہماری باتوں میں شیرینی، ہمارے لہجہ میں نرمی اور ہماری چال میں گرمی آجاتی ہے۔ ہر کام پورے اعتماد کے ساتھ اور وقت پر ہوتا ہے۔ بیگم سے بھی بڑی محبت

سے پیش آتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ باقی دن ہم بیگم سے محبت سے پیش نہیں آتے لیکن اور دنوں اور تنخواہ کے دن کے روپئے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے ۔

اس دن معمول کے خلاف بچوں سے بھی کچھ زیادہ پیار سے پیش آتے ہیں۔ بیوی ہماری اس تبدیلی کو دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہوتی ہوں گی اور اس جھاڑ پھونک کرنے والے بابا کا شکریہ ادا کرتی ہوتی جس کے دیئے ہوئے تعویذ اور گنڈے ہمارے گھر کی چھت پر لپیٹے ہوئے ہیں۔ خیر ہم بیوی کی اس سمجھ کی توہین نہیں کرنا چاہتے۔

اب ہم وقت سے پہلے ہی گھر سے آفس کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یوں ہی ایک تنخواہ والے دن ہم وقت سے پہلے دفتر کے لیے روانہ ہوئے تو اپنی جانب آتا دیکھ کر صغیر ہوٹل والے نے دور سے پکارا ، بابو صاحب —— ! دودھ ابھی نہیں آیا پھر ہم نے ان کو اشارے میں سمجھایا کہ ہم دودھ لینے نہیں بلکہ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے ہیں کیوں کہ آج تنخواہ کا دن ہے۔ تنخواہ کا نام سن کر صغیر ہوٹل والا بڑے پیار سے بولا جائیے بابو صاحب جلدی جائیے ۔

تنخواہ کا ذکر کرنا ہی ہماری سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ اس دن بستی کے سارے کرم فرما جن میں کرانے والا ، دودھ والا ، کپڑے والا ، برتن والا اور میک اپ کے سامان والا سبھی اپنے اپنے کھاتے کھول کر حساب دیکھنے لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ سوچ رہے ہوں کہ اس تنگ دستی میں میک اپ کے سامان کی کیا ضرورت —— ! تو ہم عرض کر دیں کہ میک اپ کی اصل ضرورت تو تنگ دستی سے گھرے ہوئے لوگوں کو ہوتی ہے جن کے چہرے کا رنگ بڑھتی ہوئی مہنگائی ، پیر پھیلاتے ہوئے بس اور ٹرین کے کرائے اور منہ پھاڑے ہوئے اسکول اور کالج کی فیس کچھ اس طرح اڑا دیتی ہے کہ اس کو کور کرنے کے لیے میک اپ کے لوازمات کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر ہم کو سماج میں بابو صاحب بن کر رہنا ہے اور بابو صاحب کے اس معیار کو قائم رکھنے کے لیے جھوٹ اور تصنع کے لیبل کے ساتھ چہرے پر میک اپ کا لیپ بھی ضروری ہے کہ جو ہم ہیں وہ نظر نہ آئیں اور جو ہم نہیں ہیں وہ نظر آئیں۔

بہر حال خوشی خوشی وقت پر دفتر پہنچتے ہیں ورنہ دفتر اور وقت کی پابندی دو الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ دیر سے پہنچے ، دستخط کی دو چار فائلوں کو ادھر ادھر رکھا۔ سستی آنے لگی۔ چائے پینے نکل گئے۔ چائے پی کر پان کھانے آگے بڑھے تو کرکٹ کے اسکور میں الجھ گئے۔ ذرا اور آگے بڑھے تو سیاسی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ پھر کام کی ذمہ داری کا احساس ہوا اور اپنے ٹیبل کی جانب لوٹے تو راستے میں پھر کسی نے ٹی وی کا پروگرام کا ذکر چھیڑ دیا۔ بس اسی طرح کام کاج کا وقت گزرتا ہے اور بہت خوب گزرتا ہے۔ بس صرف اتنی احتیاط ضروری ہوتی ہے کہ بڑے بابو کو دو چار مرتبہ اپنے ٹیبل پر نظر آجائیں کہ اس ٹیبل کی وجہ سے ہی ان ساری باتوں کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔

لیکن تنخواہ والے دن کا معمول کچھ اور ہوتا ہے۔ کام میں بڑا دل لگتا ہے۔ فائلیں تو روز ہی دیکھتے ہیں۔ اس دن اپنی خفیہ ڈائری کی طرف نگاہ زیادہ مرکوز ہوتی ہے۔ اس خفیہ ڈائری میں کرانے والے سے

لے کر کپڑے والے تک ہر کسی کی کنڈلی ہوتی ہے۔ ویسے ہم حسابات میں بہت کچے ہیں۔ حساب میں یوں کہ عمر بتانے میں اکثر گڑبڑ کر جاتے ہیں اور کتاب میں یوں کہ اگر کسی سے کتاب مانگ کر لائیں تو لوٹاتے نہیں ہیں۔ خفیہ ڈائری کو پڑھنے کے بعد ہمارے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ ماتھے پر پسینہ نکل آتا ہے۔ یکے بعد دیگرے سگریٹ جلا کر لمبا لمبا کش لینے لگتے ہیں۔ قرض داروں کی شیطان کی آنت کی طرح لمبی فہرست اور آمدنی کا دامن تنگ، سر چھپائیں تو پیر نظر آئے اور پیر کو ڈھانپیں تو سر کھل جائے۔ عجیب گھمبیرتا کا ماحول ہوتا ہے۔ بڑے بابو کنارے بیٹھے ہماری مصروفیت کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ دیکھئے کتنا ایمان دار ہے۔ کتنی لگن سے کام کر رہا ہے۔ اسے اپنے دیش کا کتنا خیال ہے۔ ایک پل کے لیے بھی اپنا ٹیبل نہیں چھوڑتا۔ بڑے بابو کو کیا معلوم کہ ہمارے ہاتھ میں ڈائری نہیں جام جم ہے۔ جس میں کرانے والا اور نہ جانے کون کون والا کے چہرے نظر آتے ہیں۔ جو بڑے غصے سے ہم کو تکتے رہتے ہیں۔ یہ دھمکی دیتے رہتے ہیں کہ اس مرتبہ اگر تم نے چکتا نہیں کیا تو بھرے بازار میں تمہاری عزت لے لوں گا۔ ہم متوسط طبقے کے پاس صرف یہی ایک سرمایہ تو ہوتا ہے جس کے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے دھمکیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

خدا کا شکر کہ وہ لمحہ بھی آتا ہے کہ چپراسی آکر کہتا ہے کہ صاحب، کیشیر صاحب بلا رہے ہیں۔ ہم فوراً خفیہ ڈائری کو جیب میں رکھ کر ساری فائلوں کو ایک کنارے کر کے کیشیر کی جانب لپکتے ہیں اور خوشی خوشی تنخواہ لے کر دفتر سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ تنخواہ چاہے کسی بھی وقت ہو اس کے کام میں جی نہیں لگتا۔

تنخواہ سے لدے، پھولی ہوئی جیب پر احتیاط سے ہاتھ رکھ کر ہم خوشی خوشی مگر آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ ہم کبھی بھی اس روزانہ گزرنے والے راستے سے نہیں گزرتے بلکہ پھیرا لگا کر نئے اور اجنبی راستوں سے ہو کر گھر پہنچتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح تنخواہ کے روپے زیادہ دیر تک جیب کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں اور دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اجنبی راستوں پر کسی شناسا کی کوئی دکان نہیں ہوتی جہاں سے ہماری ادھاری کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اگر ان کو خبر ہو جائے کہ بابو صاحب کو تنخواہ مل گئی ہے تو یہ خلوص و محبت کا سلسلہ جو ادھاری کی شکل میں جاری ہے بند ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور ادھاری ادا ہو جانے کے بعد سلام و آداب کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے جو دونوں کے لیے اچھی بات نہیں ہے۔

معمول سے دو چار گھنٹہ تاخیر سے گھر پہنچنا اس بات کی علامت ہے کہ تنخواہ مل گئی ہے اس لیے بغیر کچھ کہے بیگم صاحبہ سمجھ جاتی ہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ نے کبھی بھی تاریخوں سے تنخواہ کے ملنے کا اندازہ نہیں لگایا کیوں کہ ہم جس دفتر میں ملازم ہیں وہاں کبھی بھی وقت پر تنخواہ نہیں ملتی۔ جس دن تنخواہ مل گئی وہ دن تنخواہ کا دن، باقی دن ادھار سے لمحہ لمحہ گن ——— خیر بیگم کو تنخواہ کا اشارہ کیا ملتا ہے کہ ان کے سلوک میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب ان کی بات چیت کا انداز رکھ رکھاؤ، سب سے محبت کے فوارے پھوٹتے ہیں

اور ہم بیگم کی اس چاہت کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے کہہ اٹھتے ہیں کہ کاش روزانہ تنخواہ کا دن ہوتا —— بیچ ملازم اور مزدور پیشہ لوگ بھی ہیں جن کو روزانہ تنخواہ یا اجرت ملتی ہے۔ کیا وہ بھی اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔ جس کا جواب ہے —— نہیں —— اس لیے تنخواہ مہینے میں ایک بار ہی ہونی چاہیے۔

روزانہ سے کہیں زیادہ خاطر تواضع کے بعد بیگم اپنے آنچل میں بندھے چند تڑے مڑے کاغذ نکال کر اس کو سیدھا کر کے ہمارے سامنے رکھتی ہیں۔ جس کو دیکھ کر ہماری حالت آڑی ترچھی ہو جاتی ہے۔ یہ کاغذ کوئی معمولی چیز نہیں، ادھاری کی فہرست ہوتے ہیں۔ اس فہرست کو دیکھ کر ہمارے ہوش اڑ جاتے اور کب ہماری پھولی ہوئی جیب خالی ہو جاتی ہے۔ ہم کو ہوش ہی نہیں رہتا اور ہم پہلے ہی کی طرح خالی ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ تنخواہ ملنے کی وہ خوشی جو تھوڑی دیر پہلے ہمارے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ اچانک بہت دور جا کر پھر ہم کو اپنی جانب بلانے کا اشارہ کرنے لگتی ہے . . .

عنایت علی خاں
(پاکستان)

○

ادھر اصرار تھا بولی بڑھاؤ
کہ سو من بھر سے کم بکرے نہیں ہیں
ادھر بکرے دہائی دے رہے تھے
کہ ہم بکرے ہیں ایم ایل اے نہیں ہیں

○
○

کہتا ہے یہ قصائی سے جا کر کہ مہرباں
اب میں نہیں ہوں منتظروں کی قطار میں
بکرے جو چار لا رہا تھا میں عید کے لیے
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

○
○

مرزا کھونچ
(پیتیا بہار)

ڈاگ لینڈ

"دور دراز اور نزدیک پاس سے آئے ہوئے میرے مہمانو، میرے پیارے کتّو اور کتّیو، آج آپ نے کئی نسلوں سے چلی آرہی آپسی لڑائی بھول کر میری ایک آواز پر لبیک کہا، یہاں آئے اور ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنی یک جہتی کا ثبوت دیا۔ اس کے لیے آپ کا شکریہ۔ کتّوں کی تاریخ میں آج کا دن سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا کہ ہم کتّوں نے اتحاد کا نعرہ بلند کیا تھا۔ میں اپنے مہمانوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اپنے ساتھ آئے ننھے منّوں کو ذرا خاموش رکھیں۔ یہ نازک گھڑی ہے اور وقت بہت کم ہے ہمیں یہ میٹنگ جلد ختم کرنی ہے۔ کیوں کہ ہمیں اگر میونسپل کارپوریشن والوں کو پتہ چل گیا تو خیر نہیں۔ ہماری گرفتاری ہو سکتی ہے۔ پٹّے والے کتّے کے مالک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو سکتے ہیں۔ ہم آزاد کتّوں کے لیے بڑا سنگین مرحلہ آگیا ہے۔

بھائیو اور بہنو ہم نے آپ کو ایک خاص مقصدِ عظیم کے تحت یہاں بلایا ہے۔ آج ہمارے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور ہماری انفرادی شناخت پر ضرب لگنے لگی ہے اب ہماری صورت کتّے کی طرح رہ گئی ہے مگر خصلت انسانوں جیسی ہوتی جارہی ہے۔ کبھی ہم زمانے کو وفاداری کا درس دیا کرتے تھے مگر کہتے شرم کی بات ہے کہ ہمارے اندر سے وفاداری ختم ہوتی جارہی ہے۔ چور جب چوری کر کے چمپت ہو جاتے ہیں تو ہم مالک کو بھونک بھونک کر جگاتے ہیں تاکہ چور کا دھندا بھی چلے اور مالک کی نظروں میں بھی ہم سرخرو رہیں۔ یہ دوغلی پالیسی ہماری وفاداری پر بدنما داغ ہے۔ یہ عادت ہم نے انسانوں سے سیکھی ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے مگر یہاں تو انسان کو دیکھ کر کتّا رنگ پکڑ رہا ہے جو ہماری سراسر توہین ہے۔ انسانوں کی طرح ہم بھی کمیشن کھا کر بے موقع بھونکنے لگے ہیں اور موقع پر دم دبا کے دبکے پڑے رہنے لگے ہیں۔"

"میں ایک بار پھر گزارش کرتا ہوں کہ اپنے پلّوں کو ذرا خاموش رکھیں۔ ہماری تعریف میں جتنے محاورے ایجاد ہوئے ہیں انھیں حضرت انسان نے دھیرے دھیرے اپنے اندر ضم کرنا شروع کر دیا ہے کہ دنوں میں ہم بے محاورہ رہ جائیں گے۔ یہ ہماری روایت اور ہماری تہذیب کو داغ دار کرنے کی ایک سازش ہے۔ مثـ اس محاورے کو دیکھیے کہ کتا بھی اپنے دروازے پر شیر ہوتا ہے۔ بھلا بتلائیے ہم شیر نہیں بنیں گے تو دشمن سے مقابلہ کیسے کریں گے۔ لیکن اپنی بدقسمتی کو کیا کہیے۔ ہم جس چور پر شیر کی طرح جھپٹتے ہیں وہ مالک کا خا آدمی نکل آتا ہے۔ اگر ہم نے زیادہ وفاداری دکھائی تو چور صاحب کی بدولت مالک کا دروازہ ہمارے لیے بند ہو جاتا اب ہم شیر بنیں گے تو کیسے۔ کتا کبھی کینہ نہیں پالتا۔ مالک ہمیں لاکھ مارے ہم اس سے بدلہ لینے کی نہیں سوچتے۔ جہاں اس نے روٹی کا ٹکڑا دکھایا ہم دم ہلاتے اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اس دم ہلانے میں مصلحت کی کہیں سے کوئی گنجائش نہیں رہتی مگر یہ انسان مارنا تو درکنار اگر مالک نے آنکھ بھی دکھائی تو اس آنکھ لینے پر تل جاتا ہے۔"

"بہنو اور بھائیو! کہا گیا ہے کہ دنیا کی بدترین موت کتے کی موت ہوتی ہے۔ لیکن دعوے سے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج جو ایک انسان کے ذریعہ دوسرے انسان کی موت ہو رہی ہے وہ کتے کی موت سے بدتر ہے۔ حضرات! کیا یہ ہمارے لیے باعث شرم نہیں کہ ہماری بھونکنے اور کاٹنے کی روایت پر دھیرے د انسان کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ہڈی کے لیے جس طرح ہم لوگ آپس میں لڑتے ہیں ٹھیک اسی طر یہ انسان بھی معمولی باتوں کے لیے آپس میں جوتم پیزار نظر آتے ہیں۔ اب تو ہڈی انسانوں سے ہی نہیں بچتی تو پھر ہم لڑیں تو کس بات پر لڑیں۔ اور جب تک ہم آپس میں لڑ نہ لیں کتا کہلانے کے حق دار نہیں ہو سکتے۔ یہ آپس میں بھونکنا لڑنا اور کاٹنا ہی ہماری پہچان ہے۔ اسی سے ہمارے خون میں حرارت ہے اور ہم ہمیشہ چست اور درست نظر آتے ہیں۔ ہم کم کھاتے کم سوتے ہیں، اور محنت بھی زیادہ کرتے مگر یہ انسا زیادہ کھاتا ہے اس سے زیادہ سوتا ہے اور سب سے کم کام کرتا ہے۔ ہڈی پانے کے لیے وہ ہر حر استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ ایک کہاوت ہے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ اب کتے کو کون کہے دھو خود کہیں کا نہیں رہتا۔ گھر پر اس کی بیگم کا قبضہ ہے اور گھاٹ پر ٹھیکہ داروں کا۔ اسی لیے کپڑے اب لا میں دھلتے ہیں۔"

"بھائیو اور بہنو! ہمارے کاٹے کا علاج ہے مگر انسانوں کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے آپ کو بچانے، اپنی وفاداری کی علامت کو برقرار رکھنے اپنی محاوراتی روایت کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔ کیوں کہ اس ماحول میں ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔ ہم بے چینی کی زند بسر کر رہے ہیں۔ انسانوں کی اس دراندازی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایک ترکیب سوجھی۔ وہ ہے ہمارا اپنا ہوم لینڈ یعنی "ڈاگ لینڈ" اس ڈاگ لینڈ میں ہماری اپنی حکومت ہوگی جس سے ہمارا وجود سلا رہے گا، ہماری تہذیب مضبوط رہے گی۔ میں دعوے کے ساتھ تو نہیں مگر اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کچھ انسانی ہاتھ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ آخر وہ بھی تو ہمیشہ کسی نہ کسی لینڈ کی مانگ کرتے رہے ہیں۔"

"حضرات! تاریخ گواہ ہے کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے تو آپ بھی قربانی دینے کے لیے تیار رہیں۔ میونسپل بورڈ والوں کے زوردار حملے کا سامنا کرنا ہوگا۔
مالک کے بندوقوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ ہمیں آپس میں لڑانے کی سازش کی جائے۔ بہت ہی اچھا ہے کہ ہمارا ایک ہی مذہب ہے اس لیے ہمیں مذہب کے نام پر نہیں لڑایا جاسکتا مگر بہت ممکن ہے کہ اسٹریٹ ڈاگ اور پٹے دار ڈاگ کو رجعت پسند اور ترقی پسند کے نام پر لڑایا جائے۔ لیکن ہمیشہ چوکنا رہنا پڑے گا۔ کیوں کہ کسی بھی قوم میں غداروں کی کمی نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنے وجود کا سودا نہیں کرنا ہے۔ ہمیں اپنی مانگ پر ڈٹے رہنا ہے۔ پہلے ہم بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیں گے پھر [illegible] چلا کر اپنے مخالفین کے چھکے چھڑا دیں گے۔ سائیلنس پلیز! ذرا غور سے سنیے۔ کتا پکڑنے والی گاڑی کی مخصوص آواز آرہی ہے۔ غداروں سے بعد میں نپٹا جائے گا۔ فی الحال آپ لوگ دم دبا کر نکل بھاگیے۔ کسی خاص موقع پر آپ لوگوں کو بلایا جائے گا۔" خدا حافظ

ڈاگ لینڈ۔ زندہ باد

غزل

قمر الزماں قمر (مالیگی)

طرح: ہمائے شام تجھ سے کوئی نادانی ہوئی ہوگی (صدیق مجیبی)

رقیبوں کو مری آمد سے حیرانی ہوئی ہوگی
امید ان کی پگھل کر برف سے پانی ہوئی ہوگی

کسی کو رام کرنے میں پریشانی ہوئی ہوگی
کئی جوتے پڑے ہوں گے ستم رانی ہوئی ہوگی

لکھا تھا ریت پر پیغام عاشق نے محبت کا
"ہمائے شام تجھ سے کوئی نادانی ہوئی ہوگی"

ذرا سی پیش دستی پر سزا جو دی زیادہ تھی
یقیں ہے بعد میں اس کو پشیمانی ہوئی ہوگی

جنابِ پارسا کے جسم پر بلدی د چونا ہے
یقیناً ان سے لغزش کوئی شیطانی ہوئی ہوگی

گنوا دی عمر زاہد خواہشِ حورانِ جنت میں
ملے گی حور تم کو جو بھی وہ نانی ہوئی ہوگی

نظر جو آرہے ہیں حضرت شاعر بہت اجلے
حسیناؤں کے ہاتھوں چونا گردانی ہوئی ہوگی

عمارت دیکھ کر اونچی گماں اکثر یہ ہوتا ہے
ہزاروں مفلسوں کے خوں کی ارزانی ہوئی ہوگی

ملوث ہوگئے ماڈا میں کتنے احمد و اصغر
سزا یہ ہو نہ ہو وجہ مسلمانی ہوئی ہوگی

محبت ہو گئی تبدیل نفرت میں قمر کیسے
یقیناً لیڈروں کی زہر افشانی ہوئی ہوگی

غزل

سید علی شبنم کارواری

کوئی چالاک ہے گیدڑ کی طرح
کوئی بے باک ہے لیڈر کی طرح

بند مٹھی کی طرح ہے کوئی
کوئی منہ پھٹ ہے چیتھڑ کی طرح

زرد ہے کوئی پپیتے جیسا
سرخ ہے کوئی ٹماٹر کی طرح

کوئی پھولا ہے غبارے جیسا
کوئی پچکا ہوا ٹائیر کی طرح

بیل گاڑی ہے کسی کی قسمت
کہیں تقدیر ہے موٹر کی طرح

نوجوانوں میں کوئی جوش نہیں
خون اب ہوگیا واٹر کی طرح

بوڑھا شوہر تو ہے فادر جیسا
نوجواں بیٹی ہے ڈاٹر کی طرح

نرم خاوند ہے کولر جیسا
گرم ہے اہلیہ ہیٹر کی طرح

شیخ صاحب ہیں نشے میں شبنم
یہ مسلماں ہے پیٹر کی طرح

رقیب

پوچھا جو میں نے کون تمہارا رقیب ہے
اس نے کہا جو سب سے زیادہ قریب ہے

ڈستا ہے موقع دیکھ کے یہ آستیں کا ناگ
مطلب پرست دوست بھی کتنا عجیب ہے

ڈاکٹر محمد کوثر اعظم
(پٹنہ)

بائی بائی

اگلے وقتوں کے لوگ اپنے خویش و اقارب کو رخصت کرتے وقت 'خدا حافظ' یا 'فی امان اللہ' کہا کرتے تھے لیکن آج اس طرح کے الفاظ ماڈرن فیشن کی زد میں آکر پامال اور متروک قرار دیئے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ بائی بائی، ویلکم، سوری، تھینک یو، گڈ مارننگ، گڈ آفٹر نون اور گڈ نائٹ (رنگ برنگے سلام) نے لے لی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ روز مرہ کی زندگی میں ان الفاظ کا استعمال افراد و معاشرہ کے لیے ماڈرن ہونے کی ضمانت بن چکا ہے۔ چنانچہ یہ بات سامنے آئی ہے کہ معاشرے کی بدلتی قدروں کے ساتھ ہی ہمارے رہنے سہنے کھانے پینے کے طور طریقے اور بولنے چالنے کے آداب میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔

اب والدِ محترم ——— ابا، بابا، ابو، پپا، پاپا، ڈیڈی سے بجائے ڈیڈ ہو کر رہ گئے ہیں۔ میرے خیال میں بجائے ڈیڈ (DAD) کے ڈیڈ (DEAD) بھی کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ اسی طرح ماں، اماں، امی، ممی سے گزر کر آج کل مخفف لفظ "مم" مستعمل ہے خدا جانے ہمارے معاشرے کا یہ ترقی کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے یا کچھ اور لیکن اتنا تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہم ہندوستانی مغرب کی تقلید کرتے کرتے ہیں اس قدر مہذب ہو چکے ہیں کہ خود اپنے گھر کا منھ تک دیکھنے کا ہمیں موقع نہیں ملتا۔ بقول اکبر الہ آبادی:

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

مغرب کی تقلید کے زیرِ اثر ہی ہمارے سماج میں آج کل سالگرہ منانے کا رواج زور و شور پر ہے خواہ وہ پیدائش کی ہو یا شادی کی یا اور کسی خوشی کے موقع کی۔ جہاں تک برتھ ڈے کا سوال ہے بچے اور بچیوں کی سالگرہ منانا تو خیر کسی قدر گوارا لیکن بڈھے اور بڈھیوں کا برتھ ڈے منانا کیا معنی رکھتا ہے؟ ذرا آپ

ہی سوچیے اب نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اور چلے ہیں برتھ ڈے منانے۔ ایک طرف تو آپ اپنی موت سے ہر لمحہ قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف جشن بھی منا رہے ہیں اور آپ کے حق میں لوگ دعائیں کر رہے ہیں۔

'تم جیو ہزاروں سال، سال کے دن ہوں پچاس ہزار'

ہماری رائے یہ ہے کہ آپ برتھ ڈے کی سالگرہ ضرور منائیں۔

.... لیکن بجائے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، کہنے کے سب لوگ مل کر نوحہ خوانی کے طور پر سوری سیڈ (SAD) ڈے ٹو یو، کہا کریں تو زیادہ حق بجانب ہوگا۔

اور اگر آپ خدانخواستہ تحائف اکٹھا کرنے کی غرض سے منایا کرتے ہیں تو سود مند نسخہ ہے کہ گھر کے کتوں بلکہ پالتو جانوروں کی بھی سالگرہ منائیں۔

ابھی کچھ دنوں پہلے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ بہت سے نقلی معالج پکڑے گئے جن میں کچھ کے پاس تو کوئی ڈگری تھی ہی نہیں، اور کچھ کے پاس ڈگریاں تو تھیں لیکن فرضی۔ نقالی اور جعل سازی کا یہ دھندہ کم و بیش زندگی کے ہر شعبے میں اور بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبوں اور محلوں تک میں پھل پھول رہا ہے۔ آپ نے بارہا یہ سنا اور دیکھا ہوگا کہ اگر کسی کمپنی کی کوئی چیز بازار میں چل گئی تو بس راتوں رات اس کی نقل کے لیے ایک کمپنی کے طفیل کئی کمپنیاں وجود میں آ جاتی ہیں۔

ملاوٹ کے موضوع پر ایک واقعہ یوں ہے کہ روزانہ دودھ لینے والی عورت نے ایک دودھ والے سے ایک دن یہ شکایت کی کہ آج دودھ کا رنگ بدلا ہوا ہے، کیوں ہے ؟" تو دودھ والے نے جواب دیا "کیا کروں مالکن! آج صبح سے نل میں پانی آیا ہی نہیں"

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ نقالوں کا یہ گروہ زندگی کے کسی ایک شعبے میں ہی سرگرم نہیں بلکہ تمام شعبے اس کی کارستانیوں کی زد میں آ چکے ہیں۔ چنانچہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ کسی محلے یا گاؤں میں جب کوئی شخص اپنے بچے کا نام گڈو یا پپو رکھ دیتا ہے تو پھر .... سال دو سال کے اندر اس محلے یا گاؤں میں درجنوں گڈو اور پپو نظر آنے لگتے ہیں۔ نتیجتاً آپ کسی خاص گڈو یا پپو کی تلاش صرف اس کی نام کی بدولت نہیں کر سکتے بلکہ اس کام کے لیے آپ کو اس کے باپ دادا کا نام اور کام وغیرہ سے بھی واقفیت رکھنی ہوگی۔

اچھا تو قارئین بائی بائی!۔ اوہ' معاف کیجیے خدا حافظ!

پوپولیشن

م۔ آصف آروی (آرہ)

بڑھ رہا ہے پوپولیشن روز و شب — ہے وطن کی یہ تباہی کا سبب
آرہا ہے ایک بچہ ہر سکنڈ — یعنی ڈیلی لاکھ سے اوپر کا ڈنڈ
حکم ہے سرکار کا بچے ہوں کم — دو سے آگے مت بڑھائیے ہرگز قدم
ہے مگر قانون کا پالن کہاں — خوف کا دل میں نہیں نام و نشاں
مفلسی کی جن کے گھر میں ہے گزر — ہیں مگر وہ آٹھ بچوں کے پدر
اس طرح چلتا رہا جو سلسلہ — دب سکے زورِ گرانی کیا بھلا
جوش پر ہے کس قدر سیلاب یہ — اور زیادہ مت کرے بے تاب یہ
کیوں نہ ہوتا دوسرا پھر یہ جہاد — یعنی چاروں سمت دنگا اور فساد
اس کا نفرت سے نہیں کوئی لگاؤ — غرض آبادی کا رک جائے بڑھاؤ
ختم ہے اب آدمیت کا گزر — روز دھرتی خون سے ہے تر بہ تر
پھر بھی آبادی نہ اس سے گھٹ سکی — پوپولیشن کی نہ قوت ہٹ سکی
کر دیا قدرت نے اچھا انتظام — ایک طاقت ہو کے آئی بے لگام
یعنی اک خطے میں آیا زلزلہ — اس نے بے شک پوپولیشن کم کیا
ایک جھٹکے نے دکھایا وہ کمال — کر گئے لاکھوں اچانک انتقال

قطعے

○

آخر میں بزرگوں کے بخشوں بھی کیا ان کی روح کو — رشتہ ہی جب نہیں مجھے مذہب سے دور کا
ٹوپی پہن کے بیٹھا ہوں خاموش بزم میں — اور ہو رہا ہے قُل مرے دادا حضور کا

○

اہلِ ہندی کا کرم دریادلی تو دیکھیے — لکھ کے ہندی میں مرے ساغر کو ساگر کر دیا
ہو گئی پوری کھدائی جب خدائی کو لکھا — کس قدر میرے مقدر کو مکدر کر دیا

واحد انصاری (برہان پور)

ملنے معشوق سے گیا تھا مگر — اس کی خالہ سے آنکھ چار ہوئی
کھیل قسمت کا یہ عجیب ہوا — فصلِ گل پر خزاں نثار ہوئی

○

بدل جائے گا حلیہ اک دن غزل کا — ہواؤں میں الفاظ بہنے لگیں گے
یہی حال جدت کا واحد رہا تو — وہ بیوی کو بھی اماں کہنے لگیں گے

شگوفہ حیدرآباد

خالد شبحانی (ریسرچ اسکالر)

(حیدرآباد)

مشتاق احمد یوسفی کا شستہ اور عالمانہ مزاح
ایک تبصرہ

اس مضمون کو اس جملے سے شروع کیا جائے کہ "ہم طنز و مزاح کے دور یوسفی میں سانس لے رہے ہیں"۔ تو یہ ایک حقیقت کا اظہار ہی ہوگا۔ اس صنف ادب میں ملیبا یہ ادیبوں کی کمی نہیں۔ خصوصاً شہر حیدرآباد اس کی آبیاری میں بڑا پیش پیش رہا ہے۔ "زندہ دلان لاہور" کی طرح "زندہ دلان حیدرآباد" اور ان کا موثر ترجمان "شگوفہ" اب طنز و مزاح کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ بزرگ ادیب یوسف ناظم اور ہر دلعزیز مجتبیٰ حسین مسیح انجم، رشید قریشی، نریندر لوتھر اور محترمہ حبیب ضیاء (فہرست نامکمل) جیسے مزاح نگار حیدرآباد کے طنز و مزاح کے ممتاز لکھنے والے ہیں۔ یا پھر ادھر پاکستان میں "بجنگ آمد" والے کرنل محمد خاں مرحوم، ابن انشا اور ضمیر جعفری ایسے نام ہیں جنھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر جب مشتاق احمد یوسفی کو پڑھا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم زبان اور بیان کے انتہائی اعلیٰ معیار پر پہنچ گئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے عالمانہ اور شستہ مزاح کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے قاری کا ایک حد تک کوالیفائڈ ہونا بھی ضروری ہے ان کا مزاح نہ صرف واقعات و حالات سے کشید ہے بلکہ اس میں وہ علمیت موجود ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ادب عالیہ کا نچوڑ ہے۔ غالب، اقبال، شکسپیئر کے علاوہ کئی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے حصے ان کے مزاح کا لطیف جزو بن جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یوسفی اپنے قاری کو educate بھی کرتے ہیں۔ اگر کسی ادبی تخلیق کا نقطۂ عروج ہے۔ نہ صرف قاری کی ذہنی ضیافت ہوتی ہے بلکہ سیکھنے اور اپنے ذوق کو جلا بخشنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے ڈکشن یا لفظیات تک شاید ہی کوئی ادیب پہنچ پایا ہے۔ ان کا طنز و مزاح ایک ایسا سیل رواں ہے جس میں قاری خود کو فراموش کر دیتا ہے۔ ان کی زیر لب ہنسی فکر و دانش کے سوتوں کو جگا دیتی ہے۔ زندگی کی ناہمواریوں کا لطیف احساس ان کی دردمندی سے لی گئی چٹکیوں سے ہوتا ہے۔ وہ بپھرتا نہیں بلکہ رکتا اور سوچتا ہے کہ مصنف نے صحیح مقام پر چرکا لگایا ہے۔ ان کی لطیف کسک اسے خود کو بدلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اور یہ کیفیت ان کی تمام تخلیقات

میں ملتی ہے چاہے وہ "چراغ تلے" سے ہو، خاکم بدہن سے ہو یا "زرگزشت" سے۔ یا نئی کتاب "آبِ گم" سے

یوسفی کے مزاح کی اہم خصوصیت یہ ہے وہ دوسروں کی خامیوں کا ذکر کم کرتے ہیں اور خود اپنی ہی خامیوں اور کوتاہیوں کو بنیاد بناکر اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے کو نہ صرف ہنسی آتی ہے بلکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ خامیاں اس میں کس حد تک موجود ہیں۔ اور دیانت سے سدھار کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ یقیناً یہ بڑا وصف ہے کسی بھی ادبی تخلیق کا۔

خود اپنے مزاح کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے اس بات سے واضح ہوتا ہے جب وہ لکھتے ہیں طعن و تشنیع سے کام نکل جاتا یا اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی!" یا پھر "میں نے وسیلۂ اظہار — مزاح — کے باب میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ قہقہوں سے دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی، اچار لاکھ چٹخارے دار سہی لیکن اس سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جاسکتا۔ نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اندوہ و انبساط کرب و لذت کی منزلوں سے بے نیازانہ گزر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے"، اور واقعی ان کی تحریروں سے یہ حوصلہ ملتا ہے۔ زندگی کے بوجھل پن اس کی صعوبتوں کو، ہنسی خوشی جھیل لینے کا حوصلہ۔ مزاح نگار کا کیا منصب ہے وہ لکھتے ہیں "سچا مزاح نگار وہ ہے جس نے دنیا اور اہل دنیا سے رج کے پیار نہ کیا ہو"۔ مزید لکھتے ہیں کہ "پھر بھی کدورت دل میں راہ نہ پائے"! (قاری کے) "انسان کو حیوان ظریف کہا جاتا ہے مگر یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے اس لیے کہ دیکھا جائے تو انسان وہ واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے پر سب سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔ یوسفی اس بات کے حامی ہیں کہ "مزاح نگار کے نصیحت، فضیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قدِ آدم دیوارِ قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔"

مشتاق یوسفی کا واحد متکلم سر تا پا انکسار ہے۔ ہاں وہ جو بھی کچھ کہتے ہیں ان دو کرداروں کی مدد سے جو ان کے ماؤتھ پیس ہیں۔ مرزا عبدالودود بیگ اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس، مرزا چرب زبان، منہ پھٹ اور فقرہ کسنے میں ماہر اور پروفیسر عبدالقدوس مجسم حماقت۔ یہ دونوں کردار ان کے تینوں مجموعوں چراغ تلے، خاکم بدہن اور زرگزشت میں بار بار نظر آتے ہیں اور خصوصاً خاکم بدہن میں "صبغے اینڈ سنز" پہلا مضمون ہے جو بے حد و حساب مزاحیہ سچوئیشن فراہم کرتا ہے اور عمومی انداز میں ہمارا جو سلوک کتابوں یا تجارت کے ساتھ ہے اس پر لطیف تنقید ہے ان کے بچپن کے دوست صبغۃ اللہ کی دوکانداری کے بارے میں لکھتے ہیں "زمانہ سے اس عقیدہ پر قائم ہیں کہ علم الحساب درحقیقت کسی متعصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔" تجارت میں ناکامی ان کے نزدیک قیاس الشرافت تھی۔ "فحش کتابوں کے بارے میں ان کی رائے تھی اسے دیمک نہیں لگ سکتی۔ یوں کہ دیمک ایسا کاغذ کھا کر افزائش نسل کے قابل نہیں رہتی!"

جیفے کی شعر فہمی ان کی کمزوری بھی تھی۔ جو ان کی تجارت میں مانع تھی۔ "دیوانِ غالب مصور دکان میں پڑا رہا۔ محض اس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا اس کے بغیر دکان سونی سونی معلوم ہو گی۔" مرزا کہا کرتے تھے ان کو

اس نصاب کا کیا ہے جو بچوں سے ختم ہو جائے۔" ایسے بے شمار جملے اس مضمون میں مل جاتے ہیں۔ جو قاری کو محظوظ کرتے ہیں بلکہ اس کی سوچ کو مہمیز بھی لگاتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کا وسیلۂ روزگار بینک کاری رہی ہے۔ وہیں انھیں ان کا عجیب غریب باس "اینڈرسن" بھی ملتا ہے۔ جس پر یوسفی نے ایک پوری کتاب "زرگشت" لکھی ہے جس میں وہ فلسفیانہ جملے ملتے ہیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ہنسی کا فوارہ ہے جو قاری کے منہ سے چھوٹتا رہتا ہے۔ "اینڈرسن" کے علاوہ اور بہت سے کردار اس میں ملتے ہیں جن کی حماقتیں بڑی اوریجنل ہیں۔

اینڈرسن نے انھیں انگلینڈ جاتے جاتے ایک کتا سیزر بطور تحفہ دیا تھا۔ یوسفی کو کتے بہت پسند ہیں گھر لے گئے تو بیگم نے پوچھا "یہ ہاتھی کا ہاتھی کتا کاہے کو لے آئے" ہم انہوں نے کہا "چوکیداری کو۔ بہت ہوشیار کتا ہے گھر میں کچھ بھی نہ ہو تب بھی چوکیداری کر سکتا ہے"۔ اس زمانہ میں وہ ایک چھوٹے مکان میں رہا کرتے تھے اس لیے کہتے ہیں "اس زمانہ میں مکان اتنا تنگ تھا کہ جانور کا تندرست رہنا محال" اس لطیف طنز کی چبھن سے دیر تک قاری کا ذہن متاثر رہتا ہے ان کے پڑوسی شیخ خیرالدین کے پاس ایک بڑا جید کتا تھا۔ خالص گرے ہاونڈ "جیسے وہ پڑوسیوں کا خون پلا پلا کر پال رہے تھے۔ مسلمان ملکوں میں بکریوں کو اپنی پاکی وطہارت کی وجہ خاصا نقصان پہنچا ہے"۔ یا پھر "مسلمانوں نے کتے کو ہمیشہ کتا ہی کہا ہے بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا ہے"۔ وہ گھر میں کتا اس لیے رکھا کرتے تھے کہ "جب بھی بھونکے گا افسر کی یاد تازہ ہو جائے گی"۔ پروفیسر عبدالقدوس کا یہ خیال تھا کہ "کتے میں سے اگر جبڑا نکال دیا جائے تو خاصا معقول اور مخلص جانور ہے"

مشتاق احمد یوسفی کا تازہ ترین چوتھا مجموعہ "آبِ گم" ہے۔ زرگشت اور آبِ گم کے درمیان کافی عرصہ وہ لکھ نہیں پائے۔ وہ چاہتے تھے کہ "زرگشت" کا ایک اور حصہ شائع کیا جائے۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔ پانچ کہانی نما خاکوں پر مشتمل "آبِ گم" فی الوقت ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ تین چوتھائی حصے پر ایک نئے کردار بشارت علی فاروقی سے قاری کا تعارف کرواتے ہیں جن کی زندگی کے اُتار اور چڑھاؤ کو یوسفی صاحب نے پوری طرح اُجاگر کیا ہے۔ ان کہانیوں کو وہ نیا نام FACTION یعنی FACT+FICTION کہتے ہیں۔ بشارت کا کانپور سے کراچی ہجرت کرجانا اور لکڑی کے کاروبار میں جُت جانا وغیرہ سے اس کا پلاٹ ترتیب پاتا ہے بگر ان واقعات کے درمیان بے حساب ایسی سچویشن بن جاتی ہیں جو نہ صرف مزاح سے بھرپور ہیں بلکہ انفرادی تجربات سے ان حقائق کی کشید ہوتی ہے جو مقام و زمانہ کی قید سے آزاد ہو کر عمومیت حاصل کرتے ہیں۔ اسی سے کوئی بھی ادب پارہ دوام ETERNAL اور آفاقی UNIVERSAL بن جاتا ہے۔ ایسے ان گنت اقتباسات پیش کیے

جا سکتے ہیں جو اُن کی دانشوری، سیاسی، سماجی سوجھ بوجھ کے آئینہ دار ہیں۔ لکھتے ہیں، "لیڈر خود غرض، علماء مصلحت پسند، عوام خوف زدہ اور دانشی بوفائے حاکم، دانشور خوشامدی اور ادارے کھوکھلے ــ ہو جائیں تو جمہوریت …یت میں بدل جاتی ہے۔" قاری ان لفظوں کے پیچھے چھپے سیاسی، سماجی حالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے …گے لکھتے ہیں: "ڈکٹیٹر خود نہیں آتا ــــ لایا اور بلایا جاتا ہے اور قیامت اس کے ہمرکاب ہوتی ہے۔"

مطلق العنانیت کی جڑیں دراصل "مطلق الانانیت" سے پیوست ہوتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ اپنے محبوب کردار …زا عبدالودود بیگ کے منہ سے کہلواتے ہیں "مرزا جو ابتدا میں ہر حکومت کی زور و شور سے حمایت کرتے ہیں آخر …ں اتنی ہی شدومد سے مخالفت کرتے ہیں۔ ایک زمانے سے اپنے کان پکڑ یہاں تک کہتے تھے کہ ــــ میں جب بھی …ذ باللہ من الشیطان الرجیم کہتا ہوں تو رجیم سے یہی Regeme مراد ہے نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ـــ مطلق العنانیت …ے اس دور میں ادب پر کیا گزر رہی ہے اور ادیبوں سے کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے ان جملوں میں کھینچ کر آ گیا ہے۔" جس …جی چاہے، جس زمین جس بحر میں قصیدہ کہے قطعاً روک ٹوک نہیں ــــ بلکہ وزن، بحر اور عقل سے خارج ہو تب …ناہم خارج نہیں ہوں گے۔" خود اپنے مزاح کے بارے میں لکھتے ہیں "ایک ادیب کا سماج سے گہرا تعلق ضروری …ہے۔ کوئی لکھنے والا، اپنے لوگوں، ہم عصر ادیبوں، ملکی ماحول و مسائل، لوک روایات اور کلچر سے کٹ کر کہیں کوئی …ندہ اور تجربے کی کٹھالی سے نکلا ہوا فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔"

یوسفی کے بیشتر کرداروں کا مرض ناسٹلجیا ہے اور یہی ان کے مزاح کی بنیاد بنا ہے انھیں اس بات کا …ساس ہے کہ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آتا ہے اور مستقبل نظر آنا بند ہو جائے تو یاد کرنا …ہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔" لہٰذا یاد ماضی اور فینٹسی FANTASY تھکے ہاروں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ …ر ایسے لوگ جو حال سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے اپنی انا کے قتیل ہو جاتے ہیں۔ ـــــ یوسفی کی زبان ستھری، نکھری …ر چست رہتی ہے اپنے لب و لہجہ کو کرداروں کی مناسبت اور واقعات کی ضرورت کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔ اور …ہی مصنف کا بڑا وصف ہے۔ "آب گم" کے بارے میں اظہارِ خیال یوں کرتے ہیں۔ "آپ اس کتاب کا موضوع، مزاج …ر ذائقہ مختلف پائیں گے۔ موضوع اور تجربہ خود اپنا پیرایہ اور لہجہ متعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال خدا کے حضور …سلمانوں کا شکوہ اپنے استاد فصیح الملک داغ دہلوی کی نخرے، چونچلے کرتی زبان میں نہیں کر سکتے تھے۔"

یوسفی کا مطالعہ انتہائی وسیع ہے اردو کے ادب عالیہ کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کا مطالعہ اور پھر …لسفہ اور نفسیات کا بھی پورا گیان رکھتے ہیں۔ کسی بھی شاعر کے کلام کو شرح کی مدد سے سمجھنے کو وہ غیر ضروری اور معیوب …جتے ہیں ـــــ مرزا کہتے ہیں کلام غالب کی سب سے بڑی مشکل اس کی شرحیں ہیں۔ وہ نہ ہوں تو غالب کا سمجھنا …چنداں مشکل نہیں ـــ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا میں غالب وہ واحد شاعر ہے جو سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔ …دراصل یہ طنز ان تعلیم یافتہ لوگوں پر ہے جو غالب فہمی سے زیادہ غالب پرستی جتلاتے پھرتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کو پڑھتے جائیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ذہن کی گرہیں کھل رہی ہیں۔ دل و دماغ کو ایک انمول مسرت کا احساس ہوتا ہے قاری محسوس کرتا ہے کہ ہر وہ چیز جو پڑھ رہا ہے موضوع کے لحاظ سے نئی نہ ہو مگر انداز بالکل نیا، اچھوتا اور چھو جانے والا ہے۔ زبان و بیان کا لطف لیتا جا اور فکر کو مہمیز بھی لگتی محسوس کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ تحریریں ایک جینئس یوسفی کے دماغ کے علاوہ اور کہیں پیدا نہیں ہوتیں۔ ایسی نادر ترکیبیں تقریباً ہر صفحہ پر مل جاتی ہیں۔ جو گدگداتی بھی ہیں اور دعوت فکر بھی دیتی ہیں۔ چند مثالیں بطور ضیافت قاری پیش ہیں۔

" آزاد شاعری کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر ٹینس کے بیچ کھیلنا"۔ "سانپ کا زہر کینچلی میں، بچھو کا دم میں ہوتا ہے، بھڑ کا اس کے ڈنک میں ہوتا ہے اور پاگل کتے کا اس کی زبان میں ــــ انسان وہ واحد حیوان ہے اپنا زہر دل میں رکھتا ہے "!

"چار دن کی زندگی ملی تھی سو دو آرزوئے حضوری میں کٹ گئے، دو جی حضوری میں"۔

"مفلسی و بے نوفری اور ذلت کی سب سے بڑی ذلیل صورت یہ ہے کہ آدمی خود اپنی نظر میں بے وقعت ہو جائے"

"کامیابی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پھر آپ کو کوئی مشورہ دینے کی جسارت نہیں کرسکتا"۔

" لفظوں کی جنگ میں جیت کسی کی بھی ہو ــــ شہید صرف سچائی ہوتی ہے"۔ "اب ارب پتی کا املا عرب پتی کر دینا چاہیئے"۔ "کان کی گنتی ہر گوشی اور لطیفہ تو اپنی مادری زبان ہی میں مزہ دیتا ہے"۔

غرض ایسے بے شمار جملے ان کی تحریروں میں مل جاتے ہیں جو قاری کے ذہن کو اونچا بھی اٹھاتے ہیں اور اسے محظوظ بھی کرتے ہیں۔ یوسفی کے فن پر مضامین اور تنقیدیں اردو ادب میں گرانقدر سرمایہ کے اضافہ کا موجب ہوں گے۔ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ طنز و مزاح جیسے صنف ادب پر یونیورسٹی میں ایک مستقل شعبہ قائم ہونا چاہیے مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ ساتھ ہند و پاک کے اور ادیبوں کی تخلیقات پر کام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ایک مغربی مفکر کا خیال ہے کہ کسی ملک کا طنز و مزاح اس کی ترقی اور اس کے باشندوں کے تعلق کا پیمانہ ہوتا ہے۔ خود ہمارے شہر میں "شگوفہ" اور شگوفے چھوٹنے چاہئیں کہ آج زمانے کو اس کی سخت ضرورت ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد: ۲۸
شمارہ: ۶
جون ۱۹۹۵ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی:
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (ریاض)
سعید شوکت (دمام)
یس۔ ایم۔ حسینی (آسٹریلیا)
غلام نجم الدین (دبئی)

مجلس ادارت
مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

سرورق: محمود کحیل (بشکریہ اردو نیوز۔ جدہ)
کتابت: محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ الکٹرک پریس۔ حیدرآباد

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

قیمت فی پرچہ: ۹ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱
فون آفس: 595716، فون رہائش: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

ADVT. No.34/DR.BRAOU/PR/95 حیدرآباد 500 033 فون: 244728

بی اے کورس سال اول اُردو میڈیم میں راست داخلہ :

اوپن یونیورسٹی پہلی بار تعلیمی سال ۹۶-1995 سے بی اے کورس سال اول میں اردو میڈیم کا آغاز کررہی ہے ایسے امیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں جنھوں نے حسب ذیل امتحانات کامیاب کئے ہوں۔

1۔ انٹرمیڈیٹ/اُس کے مماثل امتحان (اقل ترین عمر کی تحدید کے بغیر) 2۔ یونیورسٹی کی جانب سے 94-1991ء کے دوران منعقدہ اہلیت' ٹسٹ (ان امیدواروں کے لیے جنھوں نے 23۔جنوری 1995ء کو منعقدہ اہلیت کا امتحان کامیاب کرلیا ہو امتحان کی مارکس لسٹ اور درخواست فارمس پہلے ہی سے ارسال کردیئے گئے ہیں)

<u>درخواست فارمس کا حصول: ذریعہ ڈاک</u>، ڈائرکٹر اسٹوڈنٹ سرویسیس برانچ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی روڈ نمبر 46 جوبلی ہلز حیدرآباد 033 500 سے ڈیمانڈ ڈرافٹ کے ذریعہ 25 روپئے کی ادائیگی پر حاصل کئے جاسکتے ہیں جو رجسٹرار ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد کے حق میں اور 24 مئی 95ء کے بعد کی تاریخ کے حاصل کردہ ہوں۔

<u>درخواست فارمس کا شخصی طور پر حصول</u>: -/۱۵ روپے نقد ادائیگی پر مندرجہ بالا دفتر سے صبح 30-10 بجے تا 5 بجے شام کے دوران یا ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی اسٹڈی سنٹرس سے جن کی فہرست ذیل میں دی گئی ہے۔ ماسوا جمعرات صبح 30-10 بجے تا 4 بجے شام کے دوران تمام ہفتہ کے ایام میں الا ... 2 بجے دوپہر تا 6 بجے شام کے دوران حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

<u>درخواستیں ان اسٹڈی سنٹرس پر دستیاب ہیں</u> (۱) گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد (2) گورنمنٹ جونیر کالج فار گرلز نامپلی (3) پرنسس شہکار کالج فار ویمن پرانی حویلی (4) گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد (5) ایس آر آر گورنمنٹ کالج کریم نگر (6) ایم۔ وی ایس آرٹس اینڈ سائنس کالج محبوب نگر۔

اگر امیدواروں کی کافی تعداد ہو تو یونیورسٹی اردو میڈیم میں مزید اسٹڈی سنٹرس کے آغاز کرنے کے لئے غور کرسکتی ہے۔ شخصی طور پر یونیورسٹی کے دفتر اور ڈسٹرکٹ / سٹی اسٹڈی سنٹرس پر درخواست فارمس کی 24 مئی 1995ء فروخت کا آغاز۔ درخواست فارمس کی فروخت اور ذریعہ ڈاک اور شخصی طور پر ادخال کی آخری تاریخ 12 جون 1995ء۔ مکمل کردہ درخواست فارمس کی شخصی طور پر یا ذریعہ ڈاک' اسٹڈی سنٹرس پر داخل کرنے کی آخری تاریخ ۱۶ جون 1995ء

دستخط / پروفیسر پی۔ رامیا
رجسٹرار

مُجتبیٰ حُسین

میرا کالم

کانگریسی ـــ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟

ہم نے آج کے کالم کے لیے مندرجہ بالا عنوان لکھا تو ہمیں مشہور فلم ساز سعید مرزا یاد آ گئے جو اپنی فلموں کے ایسے ہی لمبے لمبے نام رکھتے ہیں جیسے "البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے؟" "ہروند دیسائی کی عجیب داستان" "لنگڑے سلیم پہ مت رو" اور "موہن جوشی حاضر ہو" وغیرہ سعید مرزا کی فلموں کے ایسے ہی لمبے لمبے ناموں سے اختلاف کرنے کے لیے ہندی کے ایک مشہور فلمی صحافی نے ایک بار ان کے بارے میں مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "سعید مرزا کو عقل کب آئے گی؟" چاہے کچھ بھی ہو آج جب ہم کانگریسیوں کی بات بے بات پر ناراض ہونے کی عادت کے بارے میں لکھنے بیٹھے تو احساس ہوا کہ ایسی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اتنا لمبا عنوان نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری بھی ہے پھر کانگریسیوں کی ناراضگی کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ پچھلے دو دہوں سے کانگریسی لگاتار ناراض ہوتے چلے آ رہے ہیں اور جس ناراضگی کی داستان اتنی طویل ہو اسے بیان کرنے کے لیے تو اس سے بھی کہیں زیادہ لمبا عنوان درکار ہے۔

ابھی ہفتہ دس دن پہلے ناراض کانگریسیوں کا جو کنونشن دہلی میں منعقد ہوا تھا اور اس کے بعد ایک نئی کانگریس پارٹی وجود میں آئی تھی اس کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ اب اس نئی کانگریس پارٹی کے قیام کے دو دن کے اندر اندر ہی اس میں بھی ناراض کانگریسی پیدا ہو گئے ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے ناراضگی اور وہ بھی صرف دو دن کے اندر اسد اللہ خاں قیامت ہے۔ ناراض ہونے کی ایسی خداداد صلاحیت کسی آدمی کے بس کی بات نہیں تاوقتیکہ ناراض ہونے والا بھلے ہی آدمی ہو نہ ہو کانگریسی ضرور ہونا چاہیئے۔ پچھلے دنوں ایک سماجی محفل میں اس نئی کانگریس پارٹی کے ایک لیڈر سے ہماری ملاقات ہو گئی تو ہم نے شکایت کی کہ بھلے آدمی ناراض ہونا ہی تھا تو ایک ہفتہ کے بعد ناراض ہوتے، دو دن کے اندر ہی ناراض ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں کہ ناراض ہونے کی بھی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیئے۔ کوئی ڈھنگ کا سبب ہی ڈھونڈ لیتے۔ یوں بیٹھے بٹھائے کوئی کسی سے کیوں کر ناراض ہو سکتا ہے ہماری شکایت کو سن کر اچانک آگ بگولہ ہو گئے اور ہم پر ناراض ہونے کا جو سلسلہ شروع کیا تو ناراض ہوتے ہی چلے گئے۔ کہنے لگے وہ زمانے تو گئے جب ناراض ہونے کے لیے کسی معقول وجہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب تو معقول وجہ کے ساتھ ناراض ہونا ایک نہایت نامعقول بات ہے" اور ہم حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے آگے کو نکل گئے۔ پانچ منٹ بعد محفل میں اتفاقاً پھر آمنا سامنا ہوا تو دیکھا کہ اب کی بار ان کے ہونٹوں پر ایک لمبی چوڑی مسکراہٹ چپکی ہوئی ہے۔ بڑی انکساری کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ہم سے پوچھا "کہیں آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟" ہم نے کہا "ناراض تو اصل میں آپ ہیں ہم نہیں" بولے "بے شک پانچ منٹ پہلے میں آپ سے ناراض تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ بھیا! آج کی مصروف زندگی میں پانچ منٹ کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ میں تو ایک ہی منٹ میں کسی سے ناراض ہو کر اس سے خوش بھی ہو جاتا ہوں۔

ہم نے پوچھا "آخر آپ اپنی ناراضگی پر اتنی جلدی کیسے قابو پا لیتے ہیں؟"

بولے "بجلی کا کرنٹ کبھی محسوس کیا ہے؟ بہت خطرناک ہوتا ہے لیکن اسے بھی قابو میں رکھا جاتا ہے یا نہیں؟ ہم نے بھی اسی طرح ناراضگی کے سوئچ اپنی ذات میں لگا رکھے ہیں۔ کسی سے ناراض ہونا ہو تو سوئچ آن (ON) کر دیا اور ناراض نہ ہونا ہو تو سوئچ کو آف (OFF) کر دیا۔"

ہم نے کہا "کانگریس کے دورِ حکومت میں بھلے ہی سائنس نے ترقی نہ کی ہو لیکن خود کانگریسیوں نے اس میدان میں بڑی ترقی کی ہے بلکہ بعض کانگریسی لیڈر تو ہمیں اعلیٰ پایہ کے سیاستدان ہونے کے علاوہ عالی مرتبت سائنسدان بھی دکھائی دیتے ہیں۔" ہماری بات سے مزید خوش ہو کر وہ آگے کو نکل گئے کیوں کہ اس وقت ان کی ناراضگی کا سوئچ آف تھا۔ ہمارا تو دعویٰ ہے کہ قدرت بھی کسی فرد میں اتنی قلیل مدت میں ناراض ہونے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ خوش ہونے کا ایسا بے دریغ مادہ پیدا نہیں کر سکتی جو کانگریسیوں کا طرہ امتیاز ہے۔ ہمارے ایک دوست عملی سیاست کے امور سے کوئی خاص شغف نہیں رکھتے بلکہ اخبار بھی پندرہ بیس دن میں کہیں آسانی سے دستیاب ہو جائے تو پڑھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں اخبار میں روز کونسی اچھی خبریں چھپتی ہیں کہ انہیں پڑھا جائے۔ مہینہ میں دو ایک بار بری خبریں پڑھ کر صبر کر لینا کافی ہوتا ہے۔ حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ خدا کی قسم جب بھی پندرہ بیس دنوں میں اخبار کھولتا ہوں تو خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں اس میں خود میرے انتقال کی خبر نہ شائع ہو گئی ہو۔ بہرحال ہمارے یہ دوست پچھلے دنوں ملے تو کہنے لگے "پرسوں اخبار پڑھا تو پتہ چلا کہ ایک اور کانگریس پارٹی تشکیل پا گئی ہے۔" ہم نے کہا "آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ جن ناراض کانگریسیوں نے نئی پارٹی بنائی تھی ان میں بھی اب ناراض کانگریسی پیدا ہو گئے ہیں۔" پوچھا "یہ کس سے ناراض ہیں؟" ہم نے کہا "ان ناراض کانگریسیوں سے ناراض ہیں جنھوں نے نئی پارٹی بنائی ہے۔" بولے "تو پھر یہ یقیناً دوبارہ پرانی والی کانگریس پارٹی سے خوش ہو گئے ہوں گے۔" ہم نے کہا "جی نہیں! یہ ان سے بھی ناراض ہیں۔"

ہنس کر بولے "سچ پوچھیے تو کانگریسیوں کی ناراضگی بھی غالب کے خطوط کی طرح ہے کہ غالب کی خطوط نگاری کی بنیاد بھی اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ جب بنا مطلب کی خطوط نگاری کو ایک اعلیٰ مقام عطا ہو سکتا ہے تو بنا مطلب کی ناراضگی کا بھی [illegible] نہ کوئی مرتبہ ہو گا؟"

خدا کی قسم پچھلے دنوں ہم کسی بات پر اپنی بیوی سے ناراض ہو گئے تو بیوی نے ہمیں سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا "خیال رہے یہ گھر ہے کوئی کانگریس پارٹی نہیں ہے کہ جہاں ہر ایک کو ناراض ہونے کی آزادی حاصل ہے۔ کانگریس پارٹی میں رہ کر ناراض ہونے کا ایک فائدہ تو پھر بھی ہے کہ بھلے ہی ملک برباد ہو جائے لیکن جو ناراض ہوتا ہے کبھی کبھی اس کا بھلا بھی ہو جاتا ہے۔ گھر میں رہ کر ناراض ہونا تو اپنے ہی گھر کو آگ لگانے کے مترادف ہے۔" بات چونکہ معقول تھی اس لیے ہم نے فوراً اپنی ناراضگی کا سوئچ آف کر دیا۔ اب عام زندگی میں بھی لوگ کانگریسیوں کی ناراضگی کو ضرب المثل کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں۔ پرسوں ہم نے کافی ہاؤس میں کسی بات پر بیرے کو ڈانٹا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور آپ تو شریف آدمی ہیں۔ کانگریسی تھوڑا ہی ہیں کہ مجھ پر یوں بلاوجہ ناراض ہونے لگیں۔ یہی بات آپ شریفانہ لہجہ میں نہایت مؤثر طور پر کہہ سکتے ہیں۔" اب ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ زندگی میں چاہے کچھ بھی ہو جائے ہم کسی بات پر کسی سے ناراض نہیں ہوں گے تاکہ کہیں خدانخواستہ کانگریسی نہ سمجھ بیٹھے۔

سارا مسئلہ یہ ہے کہ کانگریس پارٹی کی عمر اب سو سال سے زیادہ کی ہوگئی ہے اور اس میں اب ان لیڈروں کی اکثریت ہے جنھوں نے نہ تو گاندھی جی کو دیکھا نہ مولانا آزاد کو، نہ جواہر لال نہرو سے واقف نہ سبھاش چندر بوس سے آشنا۔ کانگریس نے کبھی نعرہ دیا تھا "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے"۔ لیکن آج کے کانگریسیوں کا نعرہ ہے "ناراض ہونا ہمارا پیدائشی حق ہے"۔ برگد کا پیڑ جب پرانا ہو جاتا ہے تو اس میں ہوائی جڑیں نکل آتی ہیں۔ ان جڑوں کا اصل پیڑ کی نشوونما سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سدا ہواؤں میں معلق رہتی ہیں۔ آج کے اکثر کانگریسی لیڈر بھی اسی طرح کی ہوائی جڑوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

کالم کے آخر میں ہمیں وہ عنوان پھر یاد آگیا جو ایک فلمی صحافی نے فلم ساز سعد مرزا کے بارے میں لکھا تھا اور جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے۔ ہم ذرا سی تحریف کے ساتھ اسی عنوان پر اس کالم کو ختم کریں گے کہ "ان کانگریسیوں کو عقل کب آئے گی؟"

▲▼

غزل

اقبال شانہ
(حقل، سعودی عرب)

سرخ چہرہ اک حسیں خاتون کا
سیب تازہ جیسے دہرہ دون کا

عشق جائز ہے یقیناً آپ سے
آپ سے رشتہ نہیں ہے خون کا

دھوپ میں نکلو نہ چھتری کے بغیر
آگیا یارو مہینہ جون کا

شاعری کیا خاک سمجھیں آپ کی
فلسفہ گویا ہے افلاطون کا

چائے کیوں تم کو پلاؤں میرے پاس
کیا خزانہ ہے کوئی قارون کا

بادشا "مامون"، ماموں بن گئے
بھول بیٹھے ہم جو نقطہ "نون" کا

مصر کے اہرام میں لگتا ہے ڈر
مقبرہ ہے "توتنخ امون"* کا

یہ مریضِ عشق ہے سلے محترم
یا کوئی پیشنٹ ہے طاعون کا

چاند پہ کیسے میں تم کو لے چلوں
کوئی طیارہ نہیں ہے مون کا

فاصلے دیکھے نہ شانہ عشق میں
میں نے دلبر چن لیا رنگون کا

* فرعون مصر جس کا سونے کا مقبرہ مشہور ہے۔

دِوانی غزل

سُنی جب سے ان کی زنانی غزل
مری ہوگئی ہے دِوانی غزل

اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی رہی
مگر ہوگئی درمیانی غزل

ہیں آزاد نظمیں مرے روبرو
مرے گھر میں ہے اک پرانی غزل

یہ کیا روز مجھ کو سناتے ہو تم
سناؤ کوئی خاندانی غزل

وہ کاغذ غزل جس پہ تھی اُڑ گیا
غزل بن گئی آسمانی غزل

جو چلتی ہے رُخ پہ ہوا کے فقط
وہ ہے دوستو! بادبانی غزل

بِنا پان کھائے سناتا نہیں
مرے یار کی پاندانی غزل

وہ دنگل میں کہنے لگے شاعری
سنانے لگے پہلوانی غزل

کبھی دیکھ کر شعر پڑھتے ہیں
نہیں یاد ہے "منہ زبانی" غزل

یہ چھوڑو میاں بے تکی شاعری
کہو یار شاعر سیاسی غزل

پرویز ید اللہ مہدی
(شارجہ)

(فلمیات ـ تیسری قسط)

فلمی ستارے
فلمی بخارے

ہندوستانی فلموں کا گلیمر (GLAMOUR) اور ان کی ظاہری چمک دمک ہر دور میں لوگوں کو بالخصوص نوجوانوں کو اپنی طرف شرطیہ راغب کرتا رہا ہے۔ جو نوجوان اس چمک دمک میں بہہ جاتے ہیں یعنی جو فلموں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں وہ فلم نگری کو خالہ جی کا گھر سمجھنے لگتے ہیں۔ ان فلم زدہ نوجوانوں کی اکثریت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ فلمی دنیا میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے ہی خود کو دلیپ کمار سے لیکر امیتابھ بچن تک سارے ہی سپر اسٹارس سے کم نہیں سمجھتے بلکہ ان سے دو چار جوتے آگے ہی سمجھتے ہیں، لیکن فلم نگری میں چمک دمک میں پہنچتے ہی یہ "اونٹ" گلیمر کے پہاڑ تلے آجاتا ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے نیچے دب جاتا ہے پھر مسلسل فاقوں اور ٹھوکروں کی دھواں دھار یلغار رہی سہی کسر بھی پوری کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو نوجوان فلمی ستارہ بننے کے خواب لیے اس بے رحم نگری میں آتا ہے وہ چپ چاپ "فلمی بخارہ" عرف ایکسٹرا (EXTRA) بن کر پیٹ کی آگ بجھانے پر مجبور ہو جاتا ہے الغرض یوں اسے نہ خدا ہی ملتا ہے نہ وصال صنم، نہ ادھر کا رہتا ہے نہ اُدھر کا کیوں کہ ادھر کھائی اس کی منتظر ہوتی ہے تو ادھر کنواں۔

یہ درست ہے کہ فلمی بخاروں کے بغیر کسی فلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، مجموعی طور پر ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہوتی ہے لیکن انفرادی طور پر یہ اس چنے کی طرح حقیر ہوتے ہیں جو اکیلا پہاڑ نہیں پھوڑ سکتا اور انجام ان کا ظاہر ہے وہی ہوتا ہے جو سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں بارش کے قطرے کا ہوتا ہے۔ جس طرح بقول شاعر ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسی طرح فلمی بخارے جیسے پردے پر سجے جائے ہنستے مسکراتے ناچتے گاتے دکھائی دیتے ہیں، پردے کے باہر یعنی اپنی اصلی زندگی میں بالکل اس کے الٹ ہوتے ہیں یعنی روتے بسورتے ایک جھوٹی آس میں زندگی کے دن کاٹ دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک فلمی بخارے ایکسٹرا کے نام سے یاد کیے جاتے تھے لیکن اس لفظ سے چونکہ ایک قسم کی تحقیر کا احساس ہوتا ہے لہٰذا انھیں جونئر آرٹسٹ کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ ایکسٹرا کے مقابلے میں جونئر آرٹسٹ کی اصطلاح کسی قدر باوقار ضرور ہے تاہم ان بد نصیبوں کے معیار زندگی میں نام کی تبدیلی کے باوجود کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی گویا صرف لیبل بدلا ہے، قسمت ویسی ہی ہے ـــــــــــ کل بھی یہ یومیہ اجرت پر کام کرتے تھے آج بھی ان کی حیثیت روز

کنواں کھود کر روز پانی نکالنے والے مزدور کی سی ہے۔ کل بھی "سپلائیر" کی جیب میں ان کی اجرت کا ایک حصہ بطور کمیشن کے جاتا تھا اور آج بھی سپلائیر کسی جونک کی طرح ان کی محنت کی کمائی سے اپنا حصہ بٹور کران کا خون چوستا ہے۔

ویسے فلمی ستارے اور فلمی بنجارے بظاہر ایک ہی فلمی تھیلی کے چٹے بٹے ضرور ہیں لیکن فلمی دنیا کی اندھا دھند فیض رسانی دونوں کے ساتھ الگ الگ قسم کا سلوک کرتی ہے فیض بخشی کے اس دہرے معیار کا اندازہ محض اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں یہ فلمی ستاروں کے دامن میں زندگی کی ساری آسائشیں، سارا گلیمر ڈال دیتی ہے وہیں فلمی بنجاروں کی پیوند زدہ جھولی میں ناکامیوں، محرومیوں اور مجبوریوں کی سوغات کے سوا کچھ بھی نہیں آتا۔ جب یہ فلمی بنجارے کیمرے کے روبرو نہیں ہوتے تب حالات کی گردش کیمرے کی جگہ لے لیتی ہے اور پھر کبھی لانگ شاٹ (LONG SHOT) میں ان کی خیریت پوچھتی ہے تو کبھی "مڈ شاٹ" (MID SHOT) اور کبھی "کلوز اپ" (CLOSE UP) میں ان کی مزاج پرسی کرتی ہے۔

اگرچہ فلمی بنجارے ہوتے عام آدمیوں ہی کی طرح ہیں پھر بھی ان کی پہچان بڑی آسان ہے کہ ان کا ہر انداز، چال ڈھال، ہاؤ بھاؤ، بات چیت ہر چیز فلمی رنگ میں رنگی ہوئی ہے بالخصوص بات چیت میں فلمی پیوندکاری انہیں بے مرعوب ہوتی ہے، مثال کے طور پر جب یہ فون پر کسی سے گفتگو کر رہے ہوں اور کوئی پیغام انہیں واضح طور پر اگلے شخص کو ذہن نشین کروانا ہو تو یہ عام آدمیوں کی طرح حروف تہجی کا سہارا لے کر مخصوص حرف سے شروع ہونے والے کسی مشہور تاریخی شہر یا پھل کو بطور حوالے اور شناخت کے استعمال کرنے کی جگہ اپنے پیشے کی مناسبت سے فلمی ناموں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح میں MONDAY کو بیچ رہا ہوں یعنی M فار مدر انڈیا، O فار اونچے لوگ، N فار نمک حلال، D فار دیوداس، A فار آوارہ، Y فار یادوں کی بارات۔

قصہ مختصر یہ کہ جو شخص ایک بار فلم لائن میں آجاتا ہے وہ فلمی رنگ ڈھنگ سے بچ نہیں سکتا چاہے لاکھ کوشش کرے کمبل کو چھوڑنے کی لیکن کمبل اسے نہیں چھوڑتا بلکہ یہ کہتے ہوئے اس سے لپٹا رہتا ہے۔

تو چھوڑے تو چھوڑے پر میں نہ چھوڑوں

مختلف شعبہ ہائے حیات میں آدمی کو یہ سہولت اور آزادی حاصل ہے کہ وہ جو بننا چاہتا ہے بن سکتا ہے، جو پیشہ اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے، جس میدان میں چاہے جھنڈا لہرا کر مردِ میدان بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آدمی کا بچہ اگر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہے تو مسابقتی امتحان کامیاب کر کے، یا سرکار کی طرف سے مقرر کردہ کیپٹیشن فیس عرف عام ادا کر کے ڈاکٹر بن سکتا ہے اور معصوموں کی جانوں کے ساتھ کھلم کھلا کھیل سکتا ہے، انجینئر بن کے ایسے گھر تعمیر کر سکتا ہے جس کی بچت، مکینوں کے سر پر کسی بھی وقت بلا نوٹس بیٹھ سکتی ہے۔ جہاں تک چھوٹے موٹے پیشوں کا تعلق ہے آدمی چاہے تو دھوبی، نائی، درزی، رنگکاری، بداری کوئی بھی پیشہ اپنی ذاتی محنت، کوشش، لگن اور جستجو سے اختیار کر سکتا ہے۔ تاہم اسی دنیا میں جہاں یہ سہولتیں قدم قدم پر حاصل ہیں، رنگوں اور روشنیوں کی ایک اور دنیا بھی آباد ہے جو عرف عام میں فلمی دنیا کہلاتی ہے، یہاں معاملہ ہی دیگر ہے، صرف معاملہ ہی نہیں ہر بات دیگر ہے یعنی

سوال دیگر، جواب دیگر
عذاب دیگر، ثواب دیگر

فلمی دنیا کا چونکہ باوا آدم ہی نہیں، رہا تو بھی نرالا ہے یہاں آدمی جو بننے کی تمنا لے کر آتا ہے وہ نہیں بنتا بلکہ کچھ بننے کی تمنا لے کر آنے والے زیادہ تر لوگ کچھ بھی نہیں بنتے اور معدودے چند کچھ بنتے بھی ہیں تو وہ نہیں بنتے، جو بننا

ہیں یعنی اداکار بننے کی تمنا لے کر آنے والے ہدایت کار بن جاتے ہیں، رائٹر، فائٹر بن جاتے ہیں۔ فائٹر، رائٹر بنا دیئے جاتے ہیں، ڈائرکٹر لائٹ مین (LIGHT MAN) بنا جاتے ہیں اور پروڈیوسر اسپاٹ بوائے (SPOT BOY) بن جاتے ہیں فلمی دنیا کی اس الٹی ریت کے تعلق سے کسی شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

لوگوں کو فلمی شوق نے کیا کیا بنا دیا
آئے تھے ہیرو بننے تماشا بنا دیا

فلمی دنیا کی یہ الٹی ریت، الٹی چھری سے صرف تازہ واردان بساط ہی کو ذبح نہیں کرتی بلکہ جن کا کم سے کم وہ ایک پشت سے پیشہ آبا فلم گری یعنی کہ فلموں میں اور فلموں کے لیے کام کرتا رہا ہو، انہیں بھی نہیں بخشتی، سلوک کی اس بے رحم سولی پر انہیں بھی ٹانگ دیتی ہے۔ فلمی دنیا میں اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں، فی الحال صرف ایک ہی پر اکتفا کرتے ہیں، یہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی مثال فلمی حلقوں میں مسٹر گل بکاؤلی کے نام سے بدنام ہے۔!

اگلے وقتوں اور اگلی فلموں کے بعض معتبر راویوں اور خود مسٹر گل بکاؤلی کی زبانی ان کے جو حالات زندگی وقفہ وقفہ سے ہم تک پہنچے ان کا لب لباب یہ ہے کہ موصوف نے نیم فلمی و نیم وحشی ماحول میں آنکھ کھولی تھی کہ ان کے والد بزرگوار مسٹر امرود خاں مرحوم ولد بیداد خاں مرحوم جو کہ جنگلی جانوروں کو ٹرینڈ کرنے میں چار کھونٹ مشہور تھے اور خاموش فلموں کے دور میں "اسٹنٹ" (STUNT) کرنے والے جانور سپلائی کیا کرتے تھے ایک روایت کے مطابق اس دور کی ساری ہی فلموں میں جو گھوڑے اپنے سوار سمیت ایک ہی چھلانگ میں لمبی چوڑی کھائیوں کو پار کر جایا کرتے، جو کتے دلہن کے ہاتھوں سے زیورات کے قلمدان، ہیروئن کی اکلوتی و شیر خوار سنتان کو اپنے دانتوں سے جھپٹ کر رفوچکر ہو جایا کرتے، جو طوطے، فلمی جادوگروں کے چھومنتر کے کارن ہیرو کے ڈپلی کیٹ بن کر، اس کی ماما گری کی اینٹ سے اینٹ بجا دیا کرتے تھے وہ سب کے سب مسٹر گل بکاؤلی کے والد مرحوم ہی کی بلا شرکت غیرے ملکیت ہوا کرتے تھے۔ مرحوم ان کماؤ پوت جانوروں اور اپنی آل اولاد میں کوئی تمیز نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انہیں بھی اپنی آل اولاد ہی کی طرح چاہتے تھے جن دنوں میں فلموں نے بولنا شروع کیا یعنی کہ بولتی فلموں کا دور شروع ہوا انہی دنوں مسٹر گل بکاؤلی نے عدم سے وجود میں قدم رنجہ فرمایا یعنی کہ تولد ہوئے اور ابھی پالنے ہی میں پڑے پڑے پوتڑے گیلے کر رہے تھے کہ اتفاق سے ایک فلم کے کسی سین میں ہیروئن کی گود میں ایک شیر خوار بچے کو دکھانے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ موصوف کے والد مرحوم نے فوراً عادت سے مجبور ہو کر انہیں سپلائی کر دیا۔ مسٹر گل بکاؤلی جب بھی یہ واقعہ سناتے جسے وہ اپنی دانست میں تاریخی واقعہ کہا کرتے تھے بڑے جذباتی بلکہ آبدیدہ ہو جایا کرتے، البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس آبدیدگی کی وجہ والد مرحوم کی یاد ہے یا کسی ابتدائی بولتی فلم میں ملنے والے پہلے پہلے بریک (BREAK) کا فخریہ احساس یا اس بات کا غم و غصہ کہ والد مرحوم نے انہیں بھی اسی طرح سپلائی کر دیا تھا جس طرح اسٹنٹ کرنے والے جانور سپلائی کیا کرتے تھے اور اس طرح اپنے تعلق سے مشہور اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ وہ واقعی جانوروں کو اولاد کے اور اولاد کو جانور کے برابر سمجھا کرتے تھے۔ بہر حال بات چاہے جو بھی رہا ہو یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسٹر گل بکاؤلی کا شمار دنیا کے ان معدودے چند کلاکاروں میں ہوتا ہے جنھیں پالنے میں لیٹے لیٹے ہی مشرف بہ فلم ہونے کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے۔!

اسمٰعیل ظریف
حیدرآباد

پیروڈی

مرزا غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ

دنیا کا ہے بگڑا ہوا نقشہ مرے آگے ۔۔۔ آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے
بہبودیٔ اطفال کا مرکز بھی ہے لیکن ۔۔۔ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
پکچر بھی چلا جاتا ہوں دن میں کبھی شب میں ۔۔۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
کیوں عقل کی ناقص ہو وہ آخر کو ہے عورت ۔۔۔ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
گھر چھوڑ کے بھاگا نہیں طغیانی کے ڈر سے ۔۔۔ گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
نانا سے رہی دوستی اُس کے مری برسوں ۔۔۔ اب کوئی اکڑتا نہیں دادا مرے آگے
چلتا تھا جو میں باپ کے پیچھے بے ادب تھا ۔۔۔ چلتا ہے ادب سے مرا بیٹا مرے آگے
پی پی کے ہی مرنا ہے مجھے موت سے پہلے ۔۔۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

رشتے سے ادب کے ہے ظریف آپ کا بھائی
پھر اس کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

نیاز سواتی
(پاکستان)

قطعات

غیر حاضر دماغ افسر

میں نے تو پایا نہیں اُن کو کبھی حاضر دماغ
کس طرح کرلوں یقیں، وہ اب بھی سٹھیائے نہیں
کل کا پورا دن تو گزرا تھا اُنھیں کے ساتھ اور
آج فرمانے لگے، کیوں آپ کل آئے نہیں؟

ماتحت کی حاضر جوابی

غصے میں ماتحت سے کہا ایک باس نے
سروس میں کس گدھے کی سفارش سے آئے ہیں؟
کی ماتحت نے عرض ذرا یاد کیجیے!
مجھ کو جناب! آپ ہی سروس میں لائے ہیں

ماہرِ امراضِ چشم

ستم یہ ڈاکٹر! کیسا کیا ہے
ہمارے دیدے دھندلانے لگے ہیں
ہوا ہے جب سے اپریشن ہمارا
ہمیں دو دو نظر آنے لگے ہیں

تعلیم سے عدم دلچسپی کا علاج

کہا اک دوست نے "پڑھتے نہیں ہیں شوق سے بچے
بتاؤ کیا کریں، اس کے لیے ہم لوگ تدبیریں!
کہا میں نے کہ تب وہ کورس میں دلچسپیاں لیں گے
اگر شامل کریں ہیروئنوں کی اس میں تصویریں"

منظور الامین
(حیدرآباد)

بس یہی کچھ

کیا آپ اس بچّے یا بچی کا نام جانتے ہیں جو جولائی ۱۹۸۹ء کی آخری ساعتوں میں یعنی رات کے بارہ بجتے بجتے پیدا ہوا تھا یا ہوئی تھی اگر نہیں جانتے تو کوئی بات نہیں۔ شیکسپیر نے کہا تھا "نام میں کیا رکھا ہے"۔ کسی کا نام جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا حضرتِ آدم پہلے انسان تھے جو اس دنیا میں آئے انھیں خبر بھی نہ ہوگی کہ ان کے یہاں آنے کے لاکھوں برس بعد ۱۹۸۹ء میں ایک دن ایسا آئے گا جب انھیں کی طرح کے انسان اس دھرتی پر اربوں کی تعداد میں ہوں گے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس بے نام نومولود نے اس دنیا میں آکر دنیا کے باقی تمام لوگوں کو اپنے وجود کا احساس دلاکر ایک لمحۂ فکریہ دے دیا ہے کیوں کہ اس کے وجود میں آتے ہی دنیا کی آبادی ایک عظیم نشانے تک پہنچ گئی ہے۔ یعنی پانچ بلین ہو گئی ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو ہم اس برخوردار سے ہاتھ ملاتے کیوں کہ اس کی شخصیت تاریخی ہے۔

آج دنیا کی آبادی ایک منٹ میں ایک سو اسّی بچّوں کی شرح سے بڑھ رہی ہے۔ دنیا کی آبادی کو ۴ بلین سے ۵ بلین تک پہنچنے میں کل تیرہ برس لگے۔ ایک اندازے کے مطابق سن ۲۰۰۰ء تک دنیا کی آبادی ساڑھے چھ بلین ہو جائے گی۔ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے سن ۲۰۰۵ تک ہمارے ملک کی آبادی ایک بلین سے تجاوز کر جائے گی۔ ماہرینِ آبادی کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں ہر سال ایک کروڑ ستر لاکھ انسان پیدا ہوتے ہیں، ذرا یہ اعداد و شمار ملاحظہ ہوں، اس آبادی کے لیے ایک لاکھ بیس ہزار اسکولوں کی ضرورت ہوگی۔ ان اسکولوں کے لیے تین لاکھ تیس ہزار اساتذہ چاہییں۔ صرف اس آبادی کا تن ڈھانکنے کے لیے دو کروڑ میٹر کپڑا اور ۲۵ لاکھ مکان درکار ہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آج بھی سات سو پچاس ملین لوگ Bare subsistance level کے نیچے زندگی

گزارنے پر مجبور ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا وزارت صحت عامہ نے دلی میں لحظہ لحظہ آبادی کی تعداد بتانے والی گھڑیاں POPULATION CLOCKS لگائی ہیں۔ عوام کے ذہن نشین کرنے کے لیے کہ آبادی کا ٹائم بم کس طرح اپنے گھیرے میں لے رہا ہے، اس خوف ناک شرح پیدائش کو دیکھ کر اب ہر لب پر یہی دعا تمنا بن کر آ جانا چاہیے:

اے مرے نورِ نظر لختِ جگر پیدا نہ ہو
دوپہر پیدا نہ ہو تو سہ پہر پیدا نہ ہو — شام کو پیدا نہ ہو وقتِ سحر پیدا نہ ہو
کیا ہی اچھا ہو کہ تو شب میں بھی گر پیدا نہ ہو — لاکھ آفت تجھ پہ آئے تو مگر پیدا نہ ہو
الغرض تو اے مرے نورِ بصر پیدا نہ ہو

ہمارے ایک پڑوسی ہیں جنھیں لوگ عام طور پر Much-daughtered father کہتے ہیں۔ ان کو خدا نے بہت ساری بیٹیاں عطا فرمائی ہیں ان کا تخلص ہے ناشاد بھارتی۔ تخلص خواہ کچھ ہو وہ دیکھنے میں ہمیشہ یا تو ہشاش یا بشاش نظر آتے ہیں۔ گو لوگوں کا خیال ہے کہ ان کو اپنے سر تا کی ذرا بھی پرواہ نہیں کل ملا کر ان کی دس بیٹیاں ہیں۔ آج بھی وہ ایک عدد بیٹے کی تمنا لیے شہر میں سیٹی بجاتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تمنا ان کی آنکھوں سے امڈی پڑتی ہے لیکن محض تمنا کرنے یا کرتے رہنے سے تو بیٹے وجود میں نہیں آ جاتے اور نہ بیٹے کھیتوں میں اُگتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ناشاد صاحب شاداں ہو کر گاڑی بھر بیٹے لے آتے۔

برطانیہ کے ایک حکیم معاش تھے جن کا نام تھا مالتھیوس، ان کا نظریہ ہے کہ انسانی آبادی سلسلۂ ہندسیہ کے لحاظ سے بڑھتی ہے۔ یعنی چار ضرب چار = سولہ جب کہ انسانوں کی غذا کی فراہمی ہوتی ہے سلسلۂ حسابیہ سے یعنی دو جمع دو = چار، دوسرے لفظوں میں آدمی اس تیز رفتاری سے اشیائے مایحتاج پیدا نہیں کر سکتا جو صلاحیت بچے پیدا کرنے اسے ودیعت ہوئی ہے یہاں ایک جملہ معترضہ آ جائے تو امید کرتا ہوں، آپ کو اعتراض نہ ہوگا اور وہ یہ کہ مشہور سائنس داں چارلس ڈارون نے اتفاق ہی سے مالتھیوس کی تحریر کی ہوئی کتاب "آبادی کا اصول" پڑھی اور اس عقدے کو حل پانے کی کوشش میں کہ جہد للبقا کے سلسلے میں انسانی زندگی میں کس طرح حیاتیاتی تغیر واقع ہے وہ Natural Selection کے شہرۂ آفاق نظریہ تک جا پہنچا۔

مالتھیوس کے نظریۂ آبادی کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ آبادی کو کنٹرول کیا جائے گا یہ حد لگائے کون؟ یہ احتساب کون عاید کرے؟ بیاہتا جوڑے؟ اگر یہ نا معقول جوڑے ایسا کر سکتے تو وہ تاریخی بچہ یا بچی وجود میں کیسے آ جاتا یا آتی جس کا ذکر اوپر کیا گیا، کیا یہ حد حکومت مقرر کرے ہماری حکومت ہی کو یہ قدم اٹھانا چاہیے۔ جنگ کی صورت میں جن ملکوں میں CONSCRIPTION یا جبری بھرتی فوج میں کی جاتی ہے تو حالتِ امن میں ہماری آج کی اور آنے والی نسلوں کے لیے جبری آبادی کنٹرول کرنا وقت کی آواز ہے۔ اقبال کا یہ مصرعہ کبھی پرانا نہ ہوگا ع نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں

اب جب کہ دنیا کی آبادی پانچ بلین کا نشانہ پار کر چکی ہے ۔ یہ لفت نہ عالم انسان کے لیے لمحۂ فکریہ بن گیا ہے، دنیا کی آبادی کی اکثریت غربت اور افلاس کا شکار ہے اور اقلیت امارت عزت اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ آبادی کے سلسلے میں مردم شماری کا ذکر بے جا نہ ہوگا، ابھی چار سال پہلے فروری ۱۹۹۱ء میں ہمارے ملک میں مردم شماری کی گئی، جو اعداد و شمار سامنے آئے ان کا ذکر بھی اوپر کیا گیا ہے۔ ایشیا کی مردم شماری کے مطابق ایشیا میں ساری دنیا کی تین چوتھائی آبادی بستی ہے۔ اس طرح یہ وہ نرالی بستی ہے جو بستے بستے ہی بسی ہے بلکہ اب بھی بستی ہی جا رہی ہے۔ ہمارے اس غریب براعظم کی کچھ خصوصیات اور ہیں:

(الف) اسی براعظم میں وہ علاقے ہیں جن کی Density of population (گنجان آبادی) دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔

(ب) ہمارے براعظم کا نام ہے ایشیا، یہاں ایک یوریشیا ہے اور دوسرے ولیشیا، یوریشین تو وہ اولادیں ہیں جو یورپ اور ایشیا کی ملی جلی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی چھٹے کار اور ولیشیا کی بھلا کیا تعریف کی جائے تنہا خوانِ تہذیب مشرق اس منظلوم سے اور اس سے متعلق دنیا کی قدیم ترین پیشے کے ریشے ریشے سے اچھی طرح واقف ہیں۔

اس طرح ایشیا، یوریشیا اور ولیشیا ایک نرالی تثلیث ہے۔ اور اتفاق سے ان تینوں کا راست یا بالواسطہ تعلق آبادی کے گھٹنے یا بڑھنے سے ہے۔

یہ ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ کسی خاندان میں اگر بہت زیادہ بچے ہوں تو بچے داخل تو ہوتے ہیں ایک خاموش دروازے سے اور صدر دروازے سے آتی ہیں بی غربت، چیختی، چلاتی، شور مچاتی، واویلا کرتی، ایسے گھرانوں کی دقت تو یہ ہے کہ ہر ماہ آمدنی کا پیسہ تو پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے مگر مہینہ کافی باقی رہ جاتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو گھر کی کوئی چیز گھر میں باقی نہیں رہتی۔ اُدھر گھر کی دولت بی غربت صدر دروازے سے لے کر آتی ہیں اور ادھر اسی دروازے سے گھر کی عزت رخصت ہو جاتی ہے اور اس کے بعد گھر کے باقی ماندہ دروازوں کے کواڑ بھی نیلام ہو جاتے ہیں۔

فیض نے مجازِ مرسل کا سہارا لے کر گھر کے اندر موجود بے خواب انسان کو ایک مشورہ دیا تھا:

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

اس صورت میں جب کسی گھر میں بہت سارے بچے پیدا ہو گئے ہوں تو صاحب خانہ کو کواڑوں کو مقفل کرنے کی حاجت نہیں ہوتی کیوں کہ ایک وقت آتا ہے جب گھر کے کواڑ بھی بک جاتے ہیں۔ پلنگوں کے ساتھ پلنگوں کی نواڑ بھی۔ ویسے اس طرح کے گھر میں کواڑ ہوں یا نہ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا، ایسے گھر کے سارے مکیں ہمیشہ ہی بے خواب رہتے ہیں ۔ دائمی بھوک کی بنا پر تب گھر، گھر باقی نہیں رہتا۔ شارع عام بن جاتا ہے کہ جس کا جی چاہے ایک طرف سے اندر داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل جائے۔ ایسے گھر کا نہ تو آگا ہوتا نہ پیچھا، ایسے مکان کا فرش (فلور) فرش ہوتا ہے

سڑک اور چھت ہوتی ہے، آسمان، ایسا گھر یاران نکتہ داں کے لیے صلائے عام ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک ایسے ہی پرلیار کی یاد اس وقت دماغ کا کواڑ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ ہوا یہ کہ اس خاندان میں فٹ بال کی ایک پوری ٹیم تیار تھی۔ کل گیارہ بچے اور بارھواں منظرِ عام پر آنے کے لیے بے قرار، کسی نے اس خاندان کے ولی عہد سے پوچھا۔

"کیوں برخوردار کیا آپ کے اور بہن بھائی بھی ہیں؟"

لڑکے نے جواب دیا: "جی ہاں، ہم لوگ کل ملاکے گیارہ ہیں"۔

"کیا کرتے ہیں آپ کے والد صاحب؟" Investigative Reporter کا سوال تھا۔

"جی بس یہی کچھ کیا کرتے ہیں"۔ مظلوم کا معصوم سا جواب تھا،

ٹیلی ویژن کا پروگرام دیکھنے کے لیے ایک ہی خاندان کے بارہ افراد، دس بیٹے بیٹیاں اور ماں باپ TV Set کے سامنے بیٹھے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نے والد ماجد سے سخت معصوم سوال کیا "پاپا جی جب TV نہیں تھا تو آپ اور ممی اپنا وقت کیسے گزارتے تھے؟"

امجد علی فیض
(گلبرگہ)

کرایہ کے قفس میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ مکان بدلنا، سیاسی پارٹی اور کپڑے بدلنے سے ذرا مشکل کام ہے مگر اس کا کیا کیجیے گا۔ ہمارے حالات اور مکان دار کبھی ایک سے نہیں رہے اس میں بھی ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم نے تو ایک اور نیک کرایہ دار بنے رہنے کی بساط بھر کوشش کی لیکن افسوس ہر بار سالانہ کیلنڈر کی طرح دیوار سے اتار دیئے گئے۔ حالاں کہ ہم نے ایک شریف کرایہ دار کی طرح مکان دار کے سارے قواعد و ضوابط کا اہتمام کیا۔ کرایہ وقت پر ادا کیا۔ کلام سے پہلے سلام کیا۔ اپنی رائے پر مکان دار کی رائے کو ترجیح دی۔ وہ اگر دن کو کبھی رات تو رات کہا، سورج کو کبھی چاند تو چاند کہا۔ اس کے بچوں کو اپنے بچوں سا پیار دیا۔ وہ اگر منہ بچکاتے تو کہا خوب اور گالیاں بکتے تو کہا بہت خوب۔ حتیٰ کہ بچے ہم پر پتھر بھی پھینکتے تو ہم رومینٹک موڈ میں گایا کرتے! :

پھول آہستہ پھینکو، پھول بڑے نازک ہوتے ہیں۔

پھر بھی مکان تو آخر مکان دار کا ہوتا ہے۔ بھائی سے کا گھر، خالی کر سو ہم نے خالی کر دیا۔ اور یوں ایک سے دوسرے دوسرے سے تیسرے مکان میں منتقل ہوتے رہے اگر ان مکانوں کا ریکارڈ دیکھا جائے تو عرض ہے ہم نے آج تک صرف اتنے ہی مکانات بدلے جتنے کہ اپنی وقت کی مشہور ہیروئن الزبتھ ٹیلر نے اپنے شوہر۔ اب ہمارا ذاتی مکان ہوگیا ہے۔ ایسا بھی نہیں بلکہ ہم فی الوقت بھی کرایے کے مکان سے ہی لو لگی رہے ہیں۔

یہاں ہم پوری طرح سے مطمئن تو نہیں ہیں البتہ ہم دونوں یعنی مکان دار بھی اور ہم مکان دار کو مطمئن کرنے کی کوشش میں ایک عرصے سے ایک دوسرے کو پریشان کرتے آ رہے ہیں۔

خدا سلامت رکھے ہمارے مکان دار کو بڑے ہی نیک نفس انسان ہیں۔ غرور تو انھیں چھو کر

چھو کر بھی نہیں گزرا۔ ایسی مسکین صورت بنائے اس انکساری کے ساتھ کرایہ طلب کرتے ہیں گویا یتیم
کے لیے چندہ مانگ رہے ہیں اور یقین مانیے ہم نے بھی انھیں کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ اس وقت جو
بھی اپنی جیب میں ہوتا ادا کر دیا۔ اور بقایا کے لیے وقت، مانگ لیا اور جو مانگا مل گیا' طبیعت میں غ
نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ جب دیکھو سمندر کی طرح پرسکون نظر آتے ہیں۔ سرکاری ملازم جو شہر
سرکاری ملازمت کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے۔ آدمی سرکاری ملازم بننے سے قبل کچھ اور ہوتا ہے اور
میں کچھ اور پہلے وہ کام کا آدمی ہوتا ہے اور بعد میں کسی کام کا نہیں رہتا' ایسا ہمارا خیال تھا لیکن یہ
بالکل برعکس نکلے۔ روزانہ بلا ناغہ تین گھنٹے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ جھوٹ بولیں تو ہمارا منہ کالا خود
کا حلفیہ بیان ہے۔ دو گھنٹے تو آمد و رفت کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ حاضری رجسٹر میں دستخط کرنے
کے لیے وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ چوں کہ نوکری کے بعد بہت سارا وقت بچا رہتا ہے اس لیے انھوں
سائیڈ بزنس شروع کر دیا اور چندیوں کی ایک بڑی سی دکان کھول لی۔ آخر کرتے بھی کیا۔ بارہ بچ
بچے کے واحد باپ تھے۔ اس کثیر العیالی کی بھی کئی ایک وجوہات بتلائی جاتی ہیں۔ اول تو یہ نسل سے کثر
میں وحدت کے متلاشی تھے اور دوم اس بات کا شدید احساس کہ ہماری قوم اقلیت میں ہی کیوں ر
اور سب سے ہٹ کر تو یہ بیوپاری تھے۔ گھاٹے کا سودا کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ چناں چہ خاندانی
بندی ان کے در پر بُری طرح پسپا ہو کر رہ گئی۔ تاہم ہر سال ان کے گھر نئے بچے کی پیدائش اس با
کا بین ثبوت تھی کہ خدا اپنے بندوں اور یہ اپنے بچوں سے بیزار نہیں ہیں جب کہ مکان کے چپے چپے
بچوں کی چھاپ تھی۔ دالان میں بچے، صحن میں بچے، محراب میں بچے، کوٹھری میں بچے، باورچی خانے
بچے، حمام میں بچے، گلی میں بچے، سڑک پہ بچے، الغرض جہاں جہاں نظر گئی ہمیں ان کی محبت کاملہ
سعی جمیلہ کا ثمرہ ہی نظر آیا۔ اور ان کی ہی وجہ سے محلہ میں ایک عجیب سی رونق اور گہما گہمی تھی ہم بھی
چہل پہل اور شور و غل کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ جب بھی مکان دار
پر کہیں چلے جاتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا پڑوس میں لگا ہوا میلہ مہینوں بعد اٹھ گیا ہے۔
سرکاری ملازم اور بیوپاری تو تھے ہی دوراندیش بھی واقع ہوئے ہیں۔ چناں چہ ہر بچے کی پیدائش
دور دراز علاقے میں ایک پلاٹ اور گھر میں ایک مرغی کا اضافہ ضرور کر لیتے۔ مرغیوں کے بارے میں بھ
ان کی رائے عجیب و غریب قسم کی تھی کہتے "نکمی اور آوارہ اولاد سے تو یہ مرغیاں اچھی جتنا کھاتی ہیں کم از
اتنا تو انڈوں کی صورت میں ہمیں واپس لوٹاتی ہیں۔ مرغیوں سے ان کی غیر ضروری دل چسپی کو لے کر ان
بیگم کافی فکرمند تھیں اور انھوں نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ بازار سے ایک توانا و خوب صورت مرغا خرید لائ
اس کی وجہ ان کی شکی طبیعت تھی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھیں کہ ان کے میاں اور ہمارے مکان د
مرغیوں کے دام الفت میں گرفتار ہو چکے ہیں اور سوائے مرغ کے کوئی انھیں اس چنگل سے آزاد نہیں کر س
مرغ کی آمد سے جتنی خوشی مرغیوں کو ہوئی اس سے کہیں زیادہ بیگم مکان دار کو ہوئی لیکن مکان دار پر اس کا کوئی

اثر نہ ہوا بقولِ خود ان کی بیگم کے یہ "چکنے گھڑے تھے۔ کسی بات کا اثر لیتے ہی نہیں تھے اور سچائی بھی یہی تھی ان کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح سرِ شام جوں ہی مکان میں داخل ہو جاتے ساری مرغیاں اور بچے ان کے اطراف جمع ہو جاتے اور یہ مرغیوں کے دانے اور بچوں کو گڑ دانے تقسیم کرنے میں جٹ جاتے ۔ انہیں بچوں سے محبت اور مرغیوں سے خاص لگاؤ تھا۔ جب کہ ہمارے دانش ور دوست کا خیال ہے کہ "جہاں بچوں کا اتنا اچھا گلکشن ہو وہاں مرغبانی تو شوقِ فضول ہے عیال دار لوگوں کو مویشی مرغیاں وغیرہ کچھ نہیں۔ بلکہ صرف اور صرف بچے پالنا چاہیے کیوں کہ اس بھیڑ اور چھینا جھپٹی میں کوئی ایک بے چارا پیار کا مارا ضرور آپ کی دستِ شفقت سے محروم رہ جاتا ہے اور یہی محرومی نفسیاتی الجھن بن کر دونوں فریقین کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ آگے چل کر وہ فرماتے ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جس مکان میں بچوں کی کثرت ہوتی ہے وہاں سوائے بچوں کے کچھ نہیں ملتا" اسی لیے ایسے مکانات عموماً دوست احباب ، رشتہ دار اور چوروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ہمارے مکان دار کے ہاں بھی کچھ ایسے ہی حالات ہیں۔ ان کے ہاں جو بھی آتا ہے اپنی مرضی سے آتا ہے لیکن واپسی بچوں کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے ۔ کیوں کہ عین واپسی کے . . . . وقت معلوم ہوتا کہ بچے مہمان کے جوتوں کو فٹ بال بنا کر کھیل رہے ہیں یا پھر موٹر سیکل کا ٹرائل لے رہے ہیں۔ ان میں کئی لوگ ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو موٹر سیکل پر سوار ہو کر آتے اور جاتے وقت موٹر سیکل ان پر سوار ہوتی دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے "کسی نے ٹائر پنکچر کر دیا . . . . یا پھر پٹرول غائب ہے۔ ایک مرتبہ ہماری موٹر سیکل بھی ان کے نشانوں کی زد میں آگئی۔ ہم شکایت کرنے پر غور کر ہی رہے تھے کہ اندر سے بیگم مکان دار کی آواز آئی بچے آخر بچے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہوں یا آپ کے ادریوں بھی ہمارے بچوں نے ہیڈ لائٹ ہی توڑی ہے، کسی کے ہاتھ پیر تو نہیں"!!!

مکان دار کا مکان بھی ان ہی کے دل کی طرح وسیع اور کشادہ تھا، بڑا سا صحن، ڈھیر سارے کمرے تین حصے پر وہ قابض اور ایک حصہ ہمارے تصرف میں جسے دو دروازوں اور ایک دیوار سے الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ آڑی دیوار کا مقصد تھا کہ ہم دونوں کی privacy بنی رہے لیکن یہاں صرف ان کی privacy اور ہماری جان پر بنی ہوئی تھی کیوں کہ اکثر مکان دار کے لڑکے اس دیوار کو پھلانگ ہمارے صحن میں خوشی خوشی یوں چلے آتے گویا دیوارِ چین فتح کر کے آ رہے ہوں ۔ ایک دن کی بات ہے دوپہر کا وقت تھا ہم کھانے کے بعد بیوی سے کچھ خانگی امور پر بحث کر رہے تھے کہ اس پار سے مداخلت شروع ہو گئی۔ گھریلو سامان مثلاً چمٹا، پھونکنی، بیلن، وکٹ، لوٹا، پتھر وغیرہ یوں آ آ کر صحن میں گرنے لگے جیسے غالب کے خیال میں غیب سے مضامین آتا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا خود مکان دار صحن میں کود پڑے اور کہنے لگے سوری جناب کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔ ہمارے بچوں کا غصہ بڑا

دوسری مرتبہ آ رہیں گے، ادھر مکان دار سامان سمیٹ کر چلے گئے ادھر ہماری بیگم رانی شروع ہو گئی، کم بخت سکون سے جینے بھی نہیں دیتے۔ وقت بے وقت بن بلائے مہمان کی طرح گھسے چلے آتے ہیں۔ میرا تو ناک میں دم آگیا ہے اور آپ بھی ان گھس بیٹھوں کے خلاف کچھ نہیں کرتے" ہم نے کہا "بیگم جب ہماری حکومت فوج ہتھیار سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں کر پا رہی ہے تو ہم کس کھیت کی بھینڈی! ہم تو ٹھہرے آخر کرائے دار!!

"کرایہ دار، کرایہ دار، اس کے آگے بھی تمہیں کچھ آتا ہے۔ ہم کرایہ دار ہیں تو کیا ہوا، کیا کرایہ داروں کو سکون سے جینے کا کوئی حق نہیں؟ ظالم وہ سکون سے جینے نہیں دیتے اور تم مرنے نہیں دو گے۔ اور نہ ہی مکان خریدنے کے بارے میں غور کرو گے!" ہم نے سنجیدگی سے کہا۔ "چلو تم کہتی ہو تو مکان خرید ہی لیں گے لیکن وہاں بھی پڑوسی اور ان کے بچے ہوں گے" تو وہ کہنے لگیں "اس وقت تم اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گی۔ بھونکنے کا جواب توپ سے دوں گی اور کٹورا پھینک کر دیگچہ اٹھوا لاؤں گی۔ بیگم کے موڈ کو اس طرح اچانک تبدیل ہوتے دیکھ کر ہم نے خوشامدانہ انداز میں آخری پانسہ پھینکا۔ "تم میں یہ اچانک انقلابیوں سا جوش اور جنگجوؤں سا جذبہ کہاں سے پیدا ہو گیا کہیں تم مایاوتی کے بیانات تو نہیں پڑھ رہی ہو۔" وہ مسکرا کر بولیں: "نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کل میں نے ٹی۔ وی پر ایک ڈاکومنٹری دیکھی تھی۔" ہم نے چونک کر کہا "کس پر؟" بیگم نے اطمینان سے جواب دیا "ڈاکو رانی پھولن دیوی پر!"

جہاں تک ہمارے چھوٹے سے خاندان کا تعلق ہے۔ پانچ نفوس پر مشتمل ہے جن میں بیوی بچوں کے علاوہ ہمارا کتا بونی بھی شامل ہے پہلے پہل جب ہم اس مکان میں داخل ہوئے ایک عجیب سی الجھن سے دوچار ہوئے۔ مکان دار کے لڑکے اور لڑکیاں میز اور کرسیاں رکھ کر دیوار کے اس پار سے ہمارے حرکات و سکنات کا یوں جائزہ لے رہے تھے گویا ہم چڑیا گھر کی مخلوق ہوں اور وہ باضابطہ ٹکٹ خرید کر آئے ہوں کچھ دنوں تک ہم ان کی دل جوئی کا سبب بنے رہے۔ اس دوران ہمیں بیگم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے مبینہ طور پر ہمارے زوالوجیکل نام بھی رکھ چھوڑے ہیں۔ ہمیں بندر، بیگم کو ہرن اور بچوں کو گلہری اور خرگوش سے منسوب کیا گیا ہے۔ ہم اس مغالطے میں تھے کہ اس ادلا بدلی میں ضرور بچے کا فائدہ ہوا ہوگا۔ لیکن مایوسی ہوئی کہ کتا ہی کہا گیا تھا شیر نہیں!! اب ہمارے کتے کے بارے میں سن لیجیے۔ جب ہم اپنے آبائی مکان میں تھے تو یہ جناب واقعی کتے تھے ان کا بھونکنا بھی محلے میں کافی مشہور تھا اور اس کی مدد سے اجنبی لوگ ہمارا مکان آسانی سے تلاش کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اب کیا کہیں، کرایہ کے مکانوں میں رہتے رہتے یہ بھی احساس کمتری کا شکار ہو کر بھونکنا تو جیسے بھول ہی گیا ہے۔

یہاں بھی بونی پر شروع شروع سخت اعتراضات ہوئے لیکن رفتہ رفتہ سب اس کی متانت اور کم آمیزی کے قائل ہو گئے۔ ہمارے مکان دار نے تو اس کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیئے۔ کہتے بڑا صاحب بوجھ کتا ہے اپنے وزیراعظم سے کافی متاثر معلوم ہوتا ہے۔

پہلے تو بھونکتا ہی نہیں۔ بھونکتا بھی ہے تو ایک مرتبہ بھونکنے سے قبل ہزار مرتبہ سوچتا ہے۔" مکان دار کی چھ سالہ لڑکی ثریا تو اس جیسے فریفتہ سی تھیں۔ بونی بھی اکثر ما سے کھا ۲،۲، گ، ۱ ۰۵ بھی ۱۳۱، کا ۱۲خا۱،

رکھتیں روٹیاں، اور بریڈ کھلاتیں اور اسے نہلا دُھلا کر صاف ستھرا رکھتیں۔ بونی بھی ان ساری چیزوں کا عادی ہوگیا تھا۔ وہ آج کل ہمارے مکان دار کے ہاں ہی زیادہ رہنے لگا تھا۔ سارے گھر میں اسی کے چرچے تھے کوئی اسے مصافحہ کرنا سکھا رہا ہے تو کوئی اس کی دم پکڑ کر خود چلنا سیکھ رہا ہے۔ ثریا تو ان سب سے آگے تھی اسے بونی کی بڑی فکر تھی۔ اس نے ہمارے سامنے بونی کی شادی کی تجویز بھی رکھی جسے ہم ہنس کر ٹال گئے تو وہ خود ہی اپنے دفتر کے ایک رشتہ دار کے ہاں اس کا رشتہ لے کر گئی۔ اور واپس آ کر ہمیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ "انکل ہماری وہ بلقیس آنٹی ہیں نا وہ بڑی پتھر دل نکلیں۔ جب میں نے اپنے بونی کے لیے ان کی روزی کا ہاتھ مانگا تو انھوں نے پہلے مجھے خوب ڈانٹا اور بعد میں مسکرا کر کہنے لگیں "ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے! انکل آپ ہی بتلائیے روزی بکری جتنی اونچی ہوگئی ہے کیا اس کی شادی کی عمر نہیں ہے؟؟ ہم جواب میں صرف اتنا ہی کہہ پاتے "ہاں مُنّی والدین کو اپنے بچے وہ چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں بچے ہی نظر آتے ہیں۔"

نرگس، ثریا سے برابر ایک سال کی چھوٹی ہے۔ پہلی جماعت میں پڑھتی ہے، عمر بچوں کی اور ذہن بڑھیوں کا رکھتی ہے۔ روپ سلونا اور جسامت گول گپے جیسی، ناک چھوٹی سی لیکن اس کا سارا غصہ ناک پر رہتا ہے تبھی تو وہ ہر وقت گنگا۔ جمنا۔ سرسوتی بنی رہتی۔ اور ناک صاف کرنے کا ایک آسان اور قریب ترین راستہ اس نے ڈھونڈ نکالا تھا کہ جب بھی ناک بھر آتی تو یہ فوری منہ سے زبان نکال کر ناک پر جھاڑو پھیر دیتی۔ میں نے اسے ایک مرتبہ ٹوکا "ناک زبان سے نہیں کپڑے سے صاف کی جاتی ہے" کہنے لگیں "اس سے کپڑے گندے ہوتے ہیں" یہ وقت بے وقت آفت کی طرح نازل ہو جاتی اور مصیبت کی طرح ٹالے نہیں ٹلتی۔ زبان تو جیسے ٹائپ کرنے والی مشین۔ ایک منٹ میں ۱۰۲ الفاظ بولا کرتی۔ ابھی دروازے میں داخل بھی نہیں ہوتی کہ فرمان جاری ہونے لگتے "لگتا ہے آج صحن صاف نہیں کیا، بلب اتنی دیر سے کیوں جل رہے ہیں، کل انکل چاکلیٹ نہیں لائے بھول گئے ہوں گے یا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان معصوم حرکتوں سے اس نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ جب بھی آتی ہمارے بچوں کو مختلف طریقوں سے چھیڑتی اور بہلاتی، دل کی اچھی مگر مزاج کبھی شعلہ تو کبھی شبنم۔ ایک مرتبہ ہم دفتر سے لوٹ رہے تھے دروازے پر کھڑی تھی ہمیں پتہ نہیں تھا کہ اس کا موڈ خراب ہے "اس نے غصہ سے ہماری طرف دیکھا ہم نے بھی جیساً غصہ کا اظہار کیا۔ اس نے منہ چڑایا تو ہم نے بھی منہ چڑایا۔

اس نے کہا " انکل کیر دیجئے "

ہم نے کہا "یاں کی بیگم "

اس نے کہا " دماغ خراب ہوا ہے کیا؟"

ہم نے کہا۔ ہے ہی نہیں تو خراب کیسے ہوگا

اس نے کہا " پپا کو بولوں گی -!

ہم نے کہا: "پپا اور ممی دونوں کو بولیے"!!
اس نے کہا: پانی بند کروا دوں گی!
ہم نے کہا: "سرکاری نل زندہ باد"۔
اس نے کہا: "بجلی کٹ کروا دوں گی!
ہم نے کہا: "قندیل سے کام چلائیں گے"!!
اس نے کہا: "مکان خالی کروا دوں گی"!!
یہ جواب سن کر ہماری گھگھی بندھ گئی۔

ہم نے ہکلاتے ہوئے کہا: "تم ایسا نہیں کر سکتیں"۔ "میں ایسا ہی کروں گی اور ضرور کروں گی"۔ اتنا کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی گھر میں چلی گئی اور ہم خاموش اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے!

اس واقعہ کے کچھ دن بعد ہوا یوں کہ ہم نے واقعی مکان خرید لیا، سامان تو سب جا چکا تھا۔ آخر میں ہم ہم بھی کہا سنا معاف کروانے کی غرض سے مکان دار کے گھر میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ نرگس سے ملاقات ہو گئی اور پھر وہی محاذ آرائی شروع ہو گئی اسے شاید اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہم نے مکان خالی کر دیا ہے۔ چناں چہ اس نے پھر وہی ڈائیلاگ دہرانے شروع کر دیئے۔

"پانی بند کروا دوں گی، بجلی کٹ کروا دوں گی اور مکان خالی کروا دوں گی تو ہم نے فوراً انکشاف کیا۔

"مکان تو ہم خالی کر چکے ہیں"! اتنا سننا ہی تھا کہ وہ ہمارے پیروں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "انکل آپ ہمیں چھوڑ کر مت جائیے۔ میں پھر کبھی مکان خالی کرنے کے لیے نہیں کہوں گی، بجلی کٹ کرنے کی بات نہیں کروں گی اور پانی بھی نہیں بند کرواؤں گی۔ ہم نے نرگس کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی ممی کے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ صحیح ہے کہ ہم تمہارے مکان سے جا رہے ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

فراق کی رباعیاں

فراق گورکھپوری

امریکہ پاکستان میں فوجی معاہدہ

پیدا جو ہوا ہے ہو میں تیرے فساد
ہل جائے گی جڑ سے زندگی کی بنیاد
لنگڑی ماریں گے دستگیری کر کے
لے ڈالے گی تجھے یہ فوجی امداد

لٹکے یہ ملوکیت کے اب بھی پہچان
نادان یہ تریاکِ مرگ ہے بات تو مان
بے تاب ہے تو جس سے گلے ملنے کو
وہ خطرۂ ایشیا ہے اے پاکستان

امداد کے طوفان میں بہہ جاؤ گے
امداد کی بھونچال میں ڈھ جاؤ گے
دستِ شفقت سے پیٹھ ٹھونکی ہے رکو
وہ مار کہ بلبلا کے رہ جاؤ گے

خود اپنے خلاف چال تو نے چلی
ہمسایہ دا اکبہ کو کس درجہ کھلی
ڈوبیں گے تو یار کو بھی لے ڈوبیں گے
یہ بغضِ معاویہ ہے یا حبِّ علیؑ

الزام مداخلت ابھی جاری ہے
ہر چال نئی بات ہر اک نیا سا ہے
چور لٹنے کو کوتوال کو ڈانٹے خوب
کیا کیجیے سب سے کی بجھاری ہے

لیتے ہیں یہ چوم چاٹ کر خون نچوڑ
پھر بیٹھ کے اپنی ہڈیاں آپ چچوڑ
دیں نسبت امریکہ و پاکستان خوب
یہ شیر و شکر کا دیدنی ہے گٹھ جوڑ

بدحال سے ہو جانے کو ہے بدتر حال
ہو جاؤ گے تم نڈھال سے اور نڈھال
سب یانکیوں کے ہاتھ آ جائیں گے
صنعت، حرفت، زراعت و مال و منال

ہے اک پروانۂ غلامی امداد
خود اپنے کیے کیا ہو داد و فریاد
ہو جائے گا راج پاٹ سارا ان کا
تیرے پلے پڑیں گے عرس و میلاد

کیا تو نے سنی نہیں صدائے دلّی
کیا ہیں یہ طریقہ ہائے حفظ ملّی
دم تک وہ ہڑپ جائے گی دمڑی کا کیا ذکر
چوہوں کی محافظ جو بنے گی بلّی

یارو ٹھینگا دکھا کے چھوڑیں گے تمھیں
ٹھڑی ہی میں دھتا بتا کے چھوڑیں گے تمھیں
حق کر کے خوانِ نعمتِ پاکستان
لیمو و نمک چٹا کے چھوڑیں گے تمھیں

(سلسلہ ص ۳۴ پر)

سنگینوں سے گد گدا کے چھوڑیں گے تمھیں
خاک و خوں میں ملا کے چھوڑیں گے تمھیں
ان توپوں سے منا دو اب جان کی خیر
جن کا ایندھن بنا کے چھوڑیں گے تمھیں

تاتا تھیا سکھا کے چھوڑیں گے تمھیں
یہ انگلیوں پہ نچا کے چھوڑیں گے تمھیں
ہیں انکل سام آج دنیا کے چچا
اس بار چچا بنا کے چھوڑیں گے تمھیں

اپنوں کو نہ چھوڑ کر کنارے ہو جاؤ
ایسا نہ کرو کہ بے سہارا ہو جاؤ
آزادئ قوم رہن کرنے والو
اس سے تو تم اللہ کو پیارے ہو جاؤ

ڈاکٹر رام منوہر لوھیا

ان کا ہے روس سے پرانا پردا
کرتے ہیں یہ چین سے بھی پورا پردا
گھونگھٹ ہے برائے نام لوہیا جی کا
امریکہ سے کرتے ہیں یہ کانا پردا

ماضی کی پرستش

دامن ماضی سے ان کا الجھا سو بار
کھایا ہٹ دھرمیوں کا جھٹکا سو بار
ماضی کے دوش پہ گئے تھے پڑھنے
ماضی نے اٹھا اٹھا کے پٹکا سو بار
uncle "sam" سام

یہ تغلق کے نور باف، مانے جانے
نیتا بھی ہیں روپے میں سترہ آنے
بھارت کا کفن بنتے ہیں پھر کرکے درست
ماضی کے یہ ٹوٹے ہوئے تانے بانے

ست جگ کی بات چھانتے بیٹھے ہیں
ڈھیلے تاروں کو تانتے بیٹھے ہیں
زر بل اور ہاتھ بل سے ہو کر محروم
پرکھوں کے گن بکھانتے بیٹھے ہیں

ماضی کی اہمیت کو سمجھاتے ہیں
کیا پھول حماقت کے وہ برساتے ہیں
درشن ہو جاتے ہیں ابھی بھگتوں کو
سوٹا لیے وہ راج رشی آتے ہیں

اس نظم کے بچنے کا نہیں کوئی اپائے
بیٹھے ہیں مگر چارہ گر اک آس لگائے
جیسے مرتے مریض کے سمبندھی
سوچیں کہ عجب کیا یہ کہیں بچ ہی جائے

اونچا سودا پٹا رہے ہیں بونے
پگلا رکھا ہے پاپیوں کی رونے
گھاتے میں دبے رہے ہیں مستقبل کو
اور حال کو بیچتے ہیں اونے پونے

(شاہراہ طنز و مزاح، نجم)

ممتاز مہدی (حیدرآباد)

"سـ ـــــ نا"

ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ سونا سے مُراد "گولڈ" ہی ہو یہ بھی ضروری نہیں ـــــ سونا وہ حسین جبلّت ہے جو ہر جاگنے والے کا مقدر ہے۔ ایک تکیئے پر لکھا تھا ؎

سونے والا سوتا رہے جاگتی تقدیر رہے

رات کے سناٹے میں جب کہ لوگ مست نیند کا لطف لیتے رہتے ہیں سنتری چلّا چلّا کر اعلان کرتا پھرتا ہے۔ "جاگتے رہو ـــــ" ہر سرکاری ملازم عوام پر ظلم کرنے میں یقین رکھتا ہے۔

مختلف سونے والوں کی مختلف مجبوریاں ہوتی ہیں کسی کو سوتے میں بڑبڑانے کی عادت ہوتی ہے۔ اِس عادت کی وجہ سے شرابیوں کی طرح ان کے راز دشمن تک پہنچ جاتے ہیں۔

کچھ لوگ آدھی آنکھیں کھول کر سوتے ہیں۔ اُن کی چمکتی پتلیاں خواہ مخواہ آپ کا تعاقب کرتی ہیں۔ بعض لوگ ونے والوں کی ایسی کیفیت سے ڈر کے مرجاتے ہیں۔ شیر خوار بچے سوتے میں نیم وا آنکھوں سے آپ کو دیکھ کر ل مسکراتے ہیں گویا آپ کوئی احمق سی چیز ہیں ـــ

کچھ لوگ مصنوعی خراٹوں کے ذریعہ سونے کی اداکاری کرتے ہیں اور اپنے دوستوں میں سے دشمنوں کو ڈھونڈھ التے ہیں ـــــ جس زمانے میں ایر کنڈیشنڈ سینما متعارف ہوا تھا ہمارے ایک دوست کا معمول تھا کہ وہ روزانہ ے سینما تھیٹر جاتے اور آرام سے سوجاتے۔

جو لوگ زبردست خراٹے لیتے ہیں وہ نہ صرف اپنی نیند کے بلکہ ساتھی سونے والوں کی نیند کے بھی دشمن ثابت تے ہیں۔ سینما دیکھتے ہوئے تھیٹر میں خراٹے لینے والے صاحب کو دوسرے صاحب نے ٹوکا "بھائی صاحب! اِتنی نچی آواز میں خراٹے لینے سے دوسروں کی نیند میں خلل پڑ رہا ہے" لہٰذا آوازیں سونے والوں کی دشمن ہیں۔ جبکہ لیش اپنے پڑوسی دیشوں کا دشمن ہوتا ہے، ہر دشمن مستقل دشمن نہیں ہوتا۔ جب تک "سمجھ" سوتی رہتی ہے۔ دوست شمن کا تمیز مشکل ہوتی ہے۔

"رامائن" میں ایک کردار ملتا ہے جو چھ مہینے تک سوتا ہے اور اتنی مست نیند سوتا ہے کہ اس کے کانوں میں داخل رکی شہنائیاں ایک ساتھ بجائی جائیں تب بھی وہ نیند سے بیدار نہیں ہوتا۔ یہ تو مست نیند کا نتیجہ ہے۔ زوردار زیں مستقل عذاب ہوجائیں تو بھی آدمی وقت پر سوجاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ہماری دیٹ نام اور کمبوڈیا کے عوام کا مدبن گئی تھی ایسے حالات میں بھی لوگ دھیرے دھیرے سونے کے عادی ہوگئے اور حسبِ معمول شیر خوار بچے

کی معمولی صدا پر مائیں جاگ جاتیں اور اپنے فرائض کی تکمیل کرتیں ۔

دشمن کو بھگانے کے لیے کبھی ہتھیار تو کبھی حکمتِ عملی درکار ہوتی ہے۔ چرند پرند کو بھگانے کے لیے ہاؤ ہو کی سی آوازیں کافی ہیں لیکن نیند کو بھگانے کے لیے ایک کپ چائے کافی ہے اگر زیادہ دور بھاگ گئی ہو اور آپ سونا چاہتے ہوں تو نیند کو بلانے کے لیے خواب آور گولیاں استعمال کی جاتی ہیں اگر ان گولیوں کی تعداد بڑھ جائے تو لوگ زیادہ دیر تک سونے والے کے بیدار ہونے کا انتظار نہیں کرتے سیدھے آخری آرام گاہ تک پہنچا دیتے ہیں۔

ایک صاحب سے ہم واقف ہیں جو بڑی شاہراہ کے فٹ پاتھ پر ہمیشہ سوتے رہتے ہیں۔ ایک دن با ہوش و حواس بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے پوچھا "آپ دن بھر سوتے رہتے ہیں" بولے "نائٹ ڈیوٹی کرتا ہوں" کیا کرتے ہو۔۔؟ ہر تھوڑے دن میں محلہ بدل دیتا ہوں، کود نے پھلانگنے میں ماہر ہوں، قفل بغیر کنجی کے کھولنے میں جواب نہیں :" یہ حواس بیدار کرنے والی بات تھی ہم سوچ میں ڈوب گئے کہ یہ ایسی چیز تو نہیں کہ یہ ہمارے دا مکان میں اور وہ بھی رات میں گھس آئے ہماری سٹی ایسے گم ہو جائے کہ لایعنی چیخ و پکار کرنے لگیں۔ وہ ہمیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر گویا ہوئے۔ "لٹھ گھمانے میں جا تو چلانے میں بھی استاد کا شاگرد ہوں ۔ پولیس والوں سے ہر سنیچر (یعنی فیصدی) پر معاہدہ ہے ۔ لہٰذا جب سب سوتے ہیں میں جاگتا ہوں، جب سب جاگتے ہیں میں سوتا ہوں" ہم وہاں سے کھسکنے پر مجبور ہو گئے آگے بڑھے تو یوں محسوس ہوا گویا ہم چلتے ہوئے سو رہے ہیں ۔

ہم ایسے حضرات سے بھی واقف ہیں جو نیند میں چلنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ نیند میں اٹھے گھر سے چلے تو پھر کبھی گھر نہ لوٹے۔ کچھ لوگ سوتے سوتے وہی حرکتیں کرتے ہیں جو دن بھر ان کا مشغلہ ہوتا ہے، جیسے ہمارا چھوٹا بھائی ہر رات اپنے بستر پر پتنگ اڑانے لگتا ہے۔ یکایک شور مچاتا ہے "پکڑ لیا ۔" "ارے کھینچ" ۔ ارے کھینچ ۔ "اپے چھوڑ" ۔ "دے ڈھیل"! ۔ دے ڈھیل ۔" اور ایک دوست ہیں جن کی کرانے کی دوکان ہے۔ وہ چیخ پکار نہیں کرتے بلکہ نیند کے آتے ہی پڑیاں باندھنے لگتے ہیں جو پر انہیں سے کہیں تو حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہیں اور سب کے ساتھ خود پر قہقہے لگاتے ہیں ۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں جن پر "سونا" (یعنی نیند) جنون کی حد تک طاری رہتا ہے۔ بات کرتے کرتے ہیں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے سو جاتے ہیں۔ تیمار دار کا تیمار داری کے دوران سو جانا کسی کا چلتی ٹرین میں سو جانا، چوکیدار کا ڈیوٹی پر سو جانا، اکثر و بیشتر خطرے سے خالی نہیں ہوتا اور دولہے کا سہاگ رات میں سو جانا بہت ہی خطرناک ثابت ہوتا ہے ۔

حیدرآباد کے ایک مشہور ابن الوقت نے اردو کے معروف روزنامے کو اطلاع دی کہ حسین ساگر کے مجسمے جاگ گئے۔ اخبار کے مدیر سوتے سوتے جاگ گئے اور ابن الوقت جو ان کی آنکھوں کا تارا تھا اس کی بات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لائے فوری طور پر ایک ضمیمہ شائع کر دیا ۔ لوگ دوڑے چلے جا رہے تھے جاگتے مجسموں کو دیکھنے کے لیے وہاں ابن الوقت مائیک پر اعلان کر رہے تھے ۔ "اپریل فول ۔ اپریل فول" ۔ لہٰذا افواہوں پر کان نہ دھریئے سگے بھائیوں پر بھی بھروسہ نہ کیجیے

کب تک لہو قلم سو نگھا دیں، سوتے میں گما باخبر رہیئے کہ
وا رکھ سدا دریچۂ خود آگہی کر تو ۔ اچھے تو کیا بروں کو پرکھ

قلیسی قمر نگری (کرنول)

بتیسی

اردو زبان نے جن ہندسوں کا عاقلانہ استعمال کیا ہے ان میں چھ[۶] کے بعد بتیس[۳۲] کا ہندسہ مقبولیت کی فہرست میں درجۂ دوم حاصل کرنے کا حقدار ہے۔ جسمِ انسانی کے جس خاص حصے کی نشاندہی کے لیے بتیس کا ہندسہ مستعمل ہے وہ انسانی زبان کے اطراف نیم دائروی شکل میں بہ حیثیت پہرہ دار مسلط ہے اور خالقِ حقیقی نے اس پر جبڑوں اور ہونٹوں کا لحاف نہایت خوبصورتی سے چڑھا رکھا ہے۔

جی ہاں — دانت — دانتوں ہی کو اردو میں بتیسی کہا جاتا ہے۔

سولہ[۱۶] سولہ[۱۶] کی تعداد میں منقسم ہو کر یہ انسان کو چبانے، کترنے اور منجن رگڑنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند انسان کے منہ میں دانتوں کی تعداد کا بتیس ہونا لازمی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اپنی غلط حرکات کی وجہ اس تعداد میں گاہے گاہے کمی بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً بیگم سے تکرار پر اگر باورچی خانے میں خاموش و ساکت پڑا ہوا بیلن دستِ بیگم میں ٹیپو سلطان کی تلوار یا ایوانِ پارلیمان و اسمبلی کے غصیلے اراکین کے سامنے رکھا ہوا مائیک بن جائے تو شوہرِ نامدار کے دانتوں کی تعداد میں کمی کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یا پھر مشاعرہ میں سامعین کے موڈ کا خیال کیے بغیر غزل سرائی بھی بتیسی کو اکتیس[۳۱]، تیس[۳۰] یا ستائیس[۲۷] بنا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں سیاسی جلسوں میں حقیقت آمیز تقریر بھی مقرر کے دانتوں کی تعداد گھٹا سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر انسان چاہے وہ جوان ہو یا نوجوان اس کے دانتوں کی تعداد بتیس[۳۲] ہی رہے۔ مذکورہ وجوہ کی بناء پر تعداد میں کمی تو ممکن ہے لیکن بتیسی ناممکن ہی ہے۔ دو اصحاب کو آپس میں جھگڑتے دیکھ کر ہم ایک تجربہ کار صحافی کی طرح لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے جھلا کر کہا "اگر ایک طمانچہ ماروں تو چونسٹھ[۶۴] دانت منہ سے باہر آ جائیں گے۔" ہمیں دانتوں کی تعداد میں اس دوگنے اضافے پر نہایت تعجب ہوا تو مداخلت کرتے ہوئے بولے "بھائی صاحب دانت تو بتیس ہی ہوتے ہیں یہ چونسٹھ کیسے گریں گے؟" تو اس نے ہمیں حقارت آمیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا "مجھے معلوم تھا تم درمیان میں بولو گے اسی لیے تمہارے بتیس بھی اس کے ساتھ ملا لیے تھے۔"

بتیسی ایک قدرتی گرائنڈر ہے جس میں انسان مہد تا لحد کا سفر طے کرنے کے دوران لاکھوں ٹن اناج پیس کر معدہ تک پہنچاتا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے اس سفر کی ابتدا اور انتہا کے وقت حضرتِ انسان کے منہ میں دانتوں کی تعداد صفر ہوتی ہے۔ فی زمانہ وقتِ پیدائش تو یہ تعداد برقرار ہے لیکن وقتِ رحلت اس تعداد میں کمی طبی نظر انداز

نہیں کی جاسکتی۔ ہماری ہم محلہ ایک نوّے سالہ معمر خاتون کے دانت آج بھی مکمل اصلی صورت میں محفوظ ہیں جب کہ ان محترمہ نے آج تک ایسا کوئی بھی ٹوتھ پیسٹ کا استعمال نہیں فرمایا جس کا استعمال ٹی وی پر دانتوں کی سلامتی کے لیے لازم ملزوم قرار دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہی ان کی دانتوں کی سلامتی کا راز ہو۔ جب کہ آج کل ایسے بہت سے نوجوان نظر آتے ہیں جن کے دانتوں نے عین عالمِ شباب میں ان کے مسوڑھوں سے طلاق لے لی اور تو اور بعض ورزشی جسم کے مالک نوجوان حجلۂ عروسی میں اپنی دلہن کے پیارے بھرے ہاتھوں سے ایک لڈو کھا کر دانت کے درد سے کراہ اٹھتے ہیں اور یہ تاریخی رات دو لمحے بادشاہ کی آہ و کراہ کی وجہ دوسری تاریخ کو ملتوی ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ عالمِ بزرگی میں بتیسی کی تعداد کا درجہ بدرجہ کم ہونا ذہنوں کو گوارا ہے لیکن عالمِ شباب میں اس تعداد میں کمی زوالِ شباب کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے شباب کی برقراری کا احساس دلانے کے لیے مصنوعی بتیسی کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا صدا بہار شباب ایک ایسا قصرِ لازوال ہے جس کے بتیس ستون صحیح سلامت ہیں۔ حقیقی اور مصنوعی بتیسی میں بہ ظاہر دیکھنے والے کو فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مالک بتیسی اپنے مقابل کو احمق سمجھتا ہے۔ پھر بھی زندگی کے راستے پر کہیں نہ کہیں یہ مصنوعی پن دھوکہ دہی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے ہمارے ایک شاعر دوست ہیں جن کے اشعار کی طرح ان کی بتیسی بھی مصنوعی ہے۔ چونکہ مصنوعی بتیسی سے اردو الفاظ کا حقیقی تلفظ ممکن نہیں، لوگ ان کے سنجیدہ اشعار کو بھی مزاحیہ اشعار سمجھ کر انہیں ہندوستان ہی نہیں خلیجی ممالک کے مشاعروں میں بھی مدعو کر لیتے ہیں ایک مشاعرہ سے قبل منسٹر صاحب نے ہمیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ منسٹروں کا ڈنر جسے عرفِ عام میں بفے کہا جاتا ہے ایک انتہائی غیر مہذب عشائیہ ہے۔ جس میں شرکاء کو اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے کشتی لڑنا پڑتی ہے اچھی خاصی ورزش کے بعد جب ہم اپنے حصے کا رزق حاصل کرنے کے لیے میز تک پہنچے تو شاعر موصوف کو میز کے نیچے بیٹھا ہوا پایا۔ وجہ بس یہی تھی کہ دھکم دھکے میں شاعر صاحب کی مصنوعی بتیسی میز کے نیچے جا گری اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے میز کے نیچے پہنچ گئے لیکن واپسی کا راستہ نہ ملا تو مجبوراً تمام لوگوں کے کھانا کھا چکنے تک میز کے نیچے ہی بیٹھے رہے۔ بعض اوقات وہ اپنے ترنم کو منظر امام اسٹائیل عطا کرنے کی کوشش میں ڈائس پر بھی اپنی بتیسی گرا بیٹھتے ہیں۔

ہماری انفرادی رائے تو یہی ہے کہ غیر ضروری مصنوعی بتیسی کے سہارے زوال یافتہ جوانی کی واپسی کی اداکاری کی بجائے حقیقی صورتِ حال میں موجودگی ہی عوام و خواص کی ہمدردی حاصل کر سکتی ہے۔ ایک واقعہ کے ہم چشم دید گواہ ہیں کہ دسترخوان پر ایک بزرگ کو عالمِ پریشانی میں دیکھ کر ان کے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان نے اندازہ لگا لیا کہ موصوف اپنی بتیسی گھر پر بھول آئے ہیں۔ اس نے جھٹ سے اپنا بیگ کھولا اور ایک مصنوعی بتیسی بزرگ کے حوالے کرتے ہوئے بولا "یہ آزمائیے سائز صحیح ہو تو کام چلائیے"۔ بزرگ نے آزمایا سائز غلط تھا۔ مایوس ہو گئے۔ نوجوان نے دوسرا جوڑا دیا۔ وہ بھی غلط سائز کا نکلا۔ پھر بیگ سے تیسری بتیسی نکالی۔ بالکل صحیح سائز پر تھی۔ بزرگ خوش ہو گئے۔ دسترخوان پر موجود ہڈی بوٹی چبا چبا کر گزشتہ مایوسی سے انتقام لینے اور حالیہ خوشی کا استقبال کرنے کے بعد نوجوان کو اس کی عطا کردہ بتیسی واپس لوٹاتے ہوئے دعائیں دیں شکریہ ادا کیا اور پوچھا "میاں کیا آپ دندان ساز ہیں؟" "دندان ساز نہیں جی نہیں قبلہ! میں مُردوں کو نہلانے والا غسّال ہوں؟"

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہ ہو تو انسان سماج کی ہمدردی کا

مستحق بن جاتا ہے۔ مصنوعی بتیسی لوگ کیلشیم ہی سے بنواتے ہیں تاکہ ان پر اصلیت کا خول چڑھا رہے جب کہ بعض اُمراء و رؤساء چاندی اور سونے کے دانت لگواکر اپنی امیری اور رئیسی کی دھاک جماتے ہیں۔ ان حضرات کو مزاحیہ مشاعروں سے کہیں زیادہ سنجیدہ مشاعروں حتیٰ کہ تعزیتی جلسوں اور جلوسِ جنازہ میں بھی ہنستے ہوئے دیکھا جاتا ہے تاکہ لوگ ان کی نقرئی بتیسی سے ان کی امارت کا اندازہ لگا سکیں۔

ہم دست بہ دعا ہیں کہ خالقِ بتیسی ہر مالکِ بتیسی کو ہمہ قسم اہرِ دندان اور دندان سازوں کی حکمت عملی سے محفوظ رکھے۔ بالخصوص قارئینِ شگوفہ کو امراضِ بتیسی سے دُور رکھے۔ آمین! کیوں کہ یہی وہ زندہ دل قوم ہے جو ہمیشہ مسکراتی ہنستی ــــ اپنی بتیسی دکھاتی رہتی ہے۔ ■■■□

منہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

بیوی جس روز گھر نہیں ہوتی — دوپہر، دوپہر نہیں ہوتی
چلے سکنڈ کلاس میں جب سے — وہ شریک سفر نہیں ہوتی
پاگلوں کو نوازتا ہے خدا — شاعر و ہنر نظر نہیں ہوتی
آفتاب آفتاب ہوتا ہے — جگنوؤں سے سحر نہیں ہوتی
خلد کا حال عیاں مگر گھر کی — مولوی کو خبر نہیں ہوتی
ہوگیا بیاہ ایروں غیروں کا — میری شادی مگر نہیں ہوتی
ہڈیاں توڑ ہے یہ مہنگائی — سیدھی اپنی کمر نہیں ہوتی

منہ پھٹ اس نازنیں کی فرمائش
ہے وہ چوٹی جو سر نہیں ہوتی

○

دیتے نہیں ہیں عطیہ کبھی اپنے گھر سے ہم — مسجد بنا رہے ہیں مگر کرّوفر سے ہم
غیروں کے آگے سر کو جھکایا نہیں کبھی — یہ اور بات بچ نہ سکے بار بر سے ہم
نابلد ہے صبح و شام زمانہ کا دم بہ دم — واقف اگر نہیں تو طلوع سحر سے ہم
مرنے کے بعد ہم کو رکھیں میوزیم میں لوگ — جائیں گے قبر میں نہ فرشتوں کے ڈر سے ہم
موٹر سے ایکسیڈنٹ ہوا اور بچ گئے — لیکن جناب مارے گئے چارہ گر سے ہم
اولاد کی امید ہے اک بانجھ سے ہمیں — سایہ بھی چاہتے ہیں تو سوکھے شجر سے ہم
سہرا ہو یا کفن ہو، برابر ہیں آج کل — اب کچھ نہ کچھ تو باندھ کے بیٹھے ہیں سر سے ہم
جب سے ہمارے چشمے کا نمبر اتر گیا — دنیا کو دیکھتے ہیں کسی کی نظر سے ہم
ملنا کسی کا گیس سلنڈر سے کم نہیں — نمبر لگا کے بیٹھے تو ہیں سال بھر سے ہم

منہ پھٹ ہمارے شعر و سخن میں نہیں ہے دم
مضموں چرا رہے ہیں اِدھر اور اُدھر سے ہم

تمنّا مُظفّرپُوری
(گیا)

بارے کچھ جوتے کا بیاں ہوجائے

جوتا ـــــ چمڑے، کپڑے، سوت اور کیل کانٹوں سے بنا ایک شئے ہے۔ جو پیر کے ڈھکنے کے کام آتا ہے اور گرد و غُبار سے پیروں کو بچاتا ہے، ساتھ ہی تلووں کی حفاظت کرتا ہے۔

جوتا ـــــ تہذیبی ارتقاء کی ایک پہچان ہی نہیں بلکہ معاشرے میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ جوتا مذکر ہے اور اس کی تانیث جوتی کہلاتی ہے۔ قانون فطرت کے مطابق اگر نر اور مادہ دونوں موجود ہوں تو ان کی نسل کا بڑھنا بھی ضروری ہے لہٰذا ان کی اولادوں میں چپل، سینڈل، سلیپر وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔

ہاں یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ پہلے جوتا بنایا جوتی۔ مگر انسانی پیدائش کی تاریخ کے حوالے سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم کی طرح پہلے جوتا ہی بنا ہوگا۔ پھر اس کے پُرانے ہونے پہ مرمت کرتے وقت کچھ حصے میں کمی کرکے اس کی صورت بدلی گئی ہو اور جو نیا روپ سامنے آیا اسے جوتی کا نام دیا گیا ہو۔ اس ایجاد کے متعلق اکبر الٰہ آبادی نے اپنے شعر میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا مضمون پھیل نہیں سکا۔ پھیلتا بھی کیسے اگر جوتا کی جگہ جوتی یا سینڈل کا ذکر کرتے تو شاید لوگ توجہ دیتے۔ اُن کا شعر ہے: ؎

بوٹ ڈاسن نے بنایا اور میں نے ایک مضمون لکھا ؛ ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

انھیں مضمون پھیلانے کی کوشش سے زیادہ پہلے اچھی طرح تحقیق کرلینی چاہیئے تھی کہ ڈاسن نے پہلے جوتا بنایا یا جوتی؟ صرف اتنا کہہ دینا کہ بوٹ ڈاسن نے بنایا تحقیق مکمل نہیں ہوئی۔ یہ تو صرف ڈاسن کے جوتے کے زور پر مضمون کے پھیلانے کی کوشش ہے۔

جوتا انسان کے لیے ایک ضروری شئے ہے۔ اگر اسے ڈاسن نے نہیں بنایا ہوتا تو آج انسان کی شخصیت مکمل نہیں ہوتی اور ہری کوٹا یا پونا کے بھابھا انسٹیٹوٹ میں اسے بنانے کا کام چل رہا ہوتا۔

جوتے اور انسان میں کئی معاملے میں بڑی مماثلت ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ انسان کی طرح اس کے بھی الگ الگ رنگ، روپ اور سائز ہوتے ہیں۔ انسان کی طرح جوتے کا رنگ بھی کالا۔ لال۔ سفید۔ براؤن وغیرہ ہوتا ہے سائز میں موٹا اور پتلا۔ چھوٹا اور بڑا ہوتا ہے۔ آپ جوتے کی کسی بڑی دکان میں جاکر دیکھ لیجیے۔ مگر ٹھہریئے۔ وہاں سنبھل کر جایئے گا کیوں کہ جوتے بیچنے والے بڑے باتونی اور چالاک ہوتے ہیں۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے

الفاظ بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ہمارے دوست آزاد کا پرانا جوتا بھرے بازار میں جب مفارقت دے گیا تو انہیں جوتے کی ایک دکان میں گھسنا پڑا۔

"آپ کے پاس اچھا جوتا ہو تو دیجیے"۔ آزاد صاحب نے کہا۔

"ہاں ہاں! آئیے تشریف رکھیے سر!" دکاندار نے آزاد صاحب کو بٹھاتے ہوئے اپنے ملازم کو مخاطب ہوا اور بولا سر کو جوتا دکھلاؤ"۔

دکاندار کا جملہ سن کر آزاد صاحب کا ماتھا ٹھنکا اور کچھ شرمندہ ہو کر جوتا پسند کرنے لگے جب بہت جوتوں میں انہیں کوئی پسند نہیں آیا تو ملازم تھک کر مالک کی طرف دیکھنے لگا۔ مالک فوراً آزاد صاحب کے اور بولا۔ "اتنے جوتے پڑے ہیں پھر بھی سر آپ ..... اچھا ٹھہریئے"۔ اس نے ملازم سے کہا "سر کو اور جوتے دو"۔

دکان کے اوپر کے ایک حصے سے سیڑھی لگا کر نوکر نے چند جوڑے جوتے اتارے اور مالک کی طرف بڑھا دیئے۔ کئی جوڑے جوتے دیکھنے کے بعد آزاد صاحب نے ایک جوتا پسند کیا۔ اسے پہنا اور دو چار قدم چل کر دیکھا۔ اب بھاؤ تاؤ کے سلسلے میں بحث چھڑ گئی۔ بحث کے وقت آزاد صاحب جو جوتا پسند کر کے پہنے ہوئے تھے ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔

"اچھا آپ دیتے ہیں یا اُتاروں جوتا"؟

آزاد صاحب کے اس جملے پر دکاندار چونکا اور سمجھ گیا کہ گاہک ذہین ہے نہلے پر دہلا لگایا گیا ہے۔ قیمت کم کرنے پر راضی ہو گیا اور آزاد صاحب جوتا خرید کر گھر لوٹ آئے۔

ہمارے ایک دوست ہیں جوتوں کے بڑے شوقین جب کبھی بازار جاتے ہیں جوتوں کی دکان میں داخل ہو جاتے ہیں اور جوتے خرید لاتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس جوتوں کا انبار لگ گیا ہے۔ اس طرح انہوں نے جوتوں کا ایک میوزیم بنا رکھا ہے جسے وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو ضرور دکھلاتے ہیں۔ اس کی تاریخ خریداری میک (MAKE) اور مقام خریداری سے لے کر اس کی قیمت اور خوبیاں بیان کرتے نہیں تھکتے۔ اب ان کے پاگل پن کا کیا علاج ۔؟!

جوتا دو طرح سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک تو دکان سے خرید کر اور دوسرا طریقہ ہے مسجد یا مندر کے دروازے سے اُٹھا کر۔ پہلے طریقے میں روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے طریقے میں ہمت اور ... کی۔ اگر نئے اور قیمتی جوتے کی چاہت ہو تو عید، بقرعید، دسہرہ، دیوالی اور کسی خاص تہوار کا انتظار کریں۔ جمعہ اور ... کو بھی جوتا حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن بالکل نئے جوتے کی امید کم ہے۔ کبھی کبھی ہی ایسا خوش قسمت اتوار آتا ہے جب کسی کو نیا جوتا حاصل ہوتا ہے۔

جوتے کی چوری کا منظر بھی بڑا دلکش ہوتا ہے۔ اِدھر آپ مسجد میں داخل ہوئے اور سجدے میں گئے اُدھر آپ کا جوتا غائب! اس طرح مندر میں ادھر دیوی دیوتا کے قدم لوسی کے لیے جھکے اور ادھر جوتا اپنی جگہ سے ٹرانسفر اسی لیے ہمارے دوست آزاد کا کہنا ہے کہ نیا جوتا پہن کر مسجد یا عیدگاہ نہیں جانا چاہیئے اس سے نماز نہیں ہوتی۔ مَیں نے اعتراض بھی کیا کہ یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں جواباً انہوں نے فرمایا کہ نیا جوتا یا چپل پہن کر آنے والے کا دل ہر لمحہ اپنے جوتے چپل میں لگا رہتا ہے پھر بھلا وہ خشوع و خضوع کے ساتھ سجدہ کس طرح کر سکتا ہے۔

جوتا چوری ہونے کی ایک اور جگہ ہے سسرال! جب نوشہ عورتوں کے درمیان شادی کی رسم ادا کرتا ہوتا ہے تو سالیاں جوتا چرا لیتی ہیں اور بہانگ دہل چراتی ہیں اسے ہی کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری۔ ان کی اس چوری پر انہیں سزا بھی نہیں ملتی بلکہ انعام سے نوازا جاتا ہے اور منہ مانگی رقم نوشہ ادا کرتے ہیں۔

چرائے گئے جوتے یا پُرانے جوتے کی ایک الگ دکان ہوتی ہے۔ جہاں ہر رنگ ہر سائز کے قیمتی سے قیمتی اور معمولی سے معمولی جوتے چپل ملتے ہیں۔ جہاں سے کم آمدنی والے لوگ اپنی پسند کے جوتے خرید کر قیمتی جوتے پہننے کا خواب پورا کر لیتے ہیں۔ ایک بار ایسی ہی مارکیٹ میں ایک شاندار کار سے اترتے ہوئے ایک شخص کو دیکھا تو مجھے تعجب ہوا کہ اتنا امیر آدمی پرانے جوتے کی دکان پر کیا کرنے آیا ہے۔ ان کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جو پُرانے جوتے خریدے گا پھر دیکھا کہ اس نے جتنے معمولی اور خراب جوتے چپل تھے سب کے سب خرید کر کار کی ڈکی میں رکھوا لیا۔ میں آگے بڑھ کر ان سے ملا اور پوچھا۔

"یہ پُرانے اور ردی جوتے چپل آپ کیا کریں گے؟"

انہوں نے جواب دیا "سپلائی کرنا ہے۔ میں کنٹراکٹر ہوں نا لہٰذا جس چیز کا ٹھیکہ لیتا ہوں اسے پورا کرنا پڑتا ہے۔"

مَیں نے مزید پوچھا "لیکن ان پُرانے اور ردی جوتے چپل کا مصرف؟!"

بولے "جب کسی نیتا کی تقریر ہوتی ہے تو جلسے میں مخالفین کی طرف سے جوتے چپل کی بارش ہوتی ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک نیتا کی طرف سے پُرانے جوتے چپل سپلائی کا آرڈر ملا ہے۔"

مَیں نے تعجب سے کہا "اچھا!" کہنے لگے ہاں۔ کبھی کبھی ایسے نیتا کی طرف سے بھی آرڈر ملتا ہے جنہیں جلسے میں تقریر کرنی ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں"؟ انہوں نے بتایا "اس لیے کہ پُرانے اور ردی جوتے چپل بازار میں نہیں ہوتے۔ مخالفین لائیں گے کہاں سے"؟ معاف کیجیے گا۔ میں صرف جوتے کی بات کئے جا رہا ہوں اس کی تانیث کو بھول رہا ہوں! اسی بھول کے لیے مجھے ہوم منسٹری کے سامنے جوابدہ ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا آگے جوتی کے بیان میں کچھ سُن لیجئے:- دراصل جوتی دال بانٹنے کے کام آتی ہے۔ پتہ نہیں یہ جوتی میں دال بانٹنے کا شوق کس محترمہ کو ہوا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ شوق ہے بڑا شاندار لیکن ایک بات ضرور ہے کہ شاید اسی جوتی میں دال کھانے کی وجہ سے محفلوں میں جوتی کھانا کافی پسند کیا جاتا ہے ویسے تو مشہور افسانہ نگار واجدہ تبسم بھی لوٹ چاٹ دکھانے کی خواہش میں گھر کے جوتے کاٹ کر پلاؤ پکا چکی ہیں۔

اقبال ہاشمی حیدرآباد

ہمارے حضرتِ طالب

مزاح و طنز کے دادا ہمارے حضرت طالب
فنِ تعمیر کے نانا ہمارے حضرت طالب

خدا نے ان کو ہر اک وجاہت سے نوازا ہے
حسینوں کے حسیں چاچا ہمارے حضرتِ طالب

کوئی کہتا ہے غالب ہیں کوئی کہتا ہے مخافی ہیں
نہ جانے اور بھی کیا کیا ہمارے حضرتِ طالب

ادھر مسجد بناتے ہیں ادھر جنت کی جھلکیاں
جما لیتے ہیں قصہ ہمارے حضرت طالب

بہت سنجیدگی سے بیٹھے گدگداتے ہیں
قلم تھامے ہوئے اپنا ہمارے حضرت طالب

سخن کے پردے میں سارا غبارِ دل اترتا ہے
نشیلا رکھتے ہیں لہجہ ہمارے حضرت طالب

ذہانت کیا سلاست کیا متانت کیا ظرافت کیا
اک میدان میں یکتا ہمارے حضرتِ طالب

چھوٹوں میں جو خود کو بھی چھوٹا سمجھتے ہیں
وہ تو ہیں بڑے بابا ہمارے حضرت طالب

ریا دنیا کی سننے میں انھیں اپنی سنانے میں
نہیں رکھتے کوئی پردہ ہمارے حضرت طالب

ہدایت مشکلی دوسرے خطے ہیں اک مشکلات کے
ہی کا تیسرا حصہ ہمارے حضرت طالب

مال مشکل کہتے ہیں جس کو وہ شگوفہ ہے
شگفتہ ہے بدن، چہرہ ہمارے حضرت طالب

شگفتہ ہے بدن، چہرہ ہمارے حضرت طالب
ہنسانے کو لوگ ہنسی سے رب نے نکالا ہے

یوں کرتے کبھی غصہ ہمارے حضرت طالب
سخاوت میں بہت مشہور حاتم طائی تھا لیکن

بتاتے ہیں کہ تھا سکہ ہمارے حضرت طالب
ماں سے ہاشمی سمجھو مرا قائل ہیں سب راہیں

لکھتے ہیں سنوارستہ ہمارے حضرت طالب

نذرِ طالب خوندمیری

غالبِ طنز و تبسم ہیں جنابِ طالب
مل نہیں سکتا دکن میں تو جوابِ طالب

ضعفِ طالب کو چھپاتا ہے شبابِ طالب
کتنا پکا ہے مرے یار خضابِ طالب

حال پُرکیف ہو، مخمور فضائے طالب
شاعری کی جو میسر ہو شرابِ طالب

بات پردے میں سخن کے وہ کیا کرتے ہیں
طنز کا ایک سمندر ہے کتابِ طالب

ہے جوانوں میں جواں اور ضعیفوں میں ضعیف
منفرد سا ہے نقابوں میں نقابِ طالب

آرکیٹکٹ بھی ناظم بھی ہیں شاعر بھی ہیں
کھول کے پڑھیے گا ابواب ہیں بابِ طالب

دیکھنا یہ کسی مضراب کا محتاج نہیں
بجنے لگتا ہے خود اپنے سے ربابِ طالب

تجاهری ہی پہ نہیں صرف عبور اُن کو رحیم
چھونے والا بھی دلوں کو ہے خطابِ طالب

رؤف رحیم
حیدرآباد

فیض انصاری (اکولہ)

خراٹے

خراٹوں سے کون واقف نہیں گو کہ خراٹے نیند لگ جانے کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ ان خراٹوں کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہوئی ہے۔ چند خراٹے چھوٹے پیمانے کے ہوتے ہیں اور کچھ خراٹے بڑے پیمانے کے اور کچھ تو زیادہ ہی پُر زور اور طاقتور ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم ان کو آواز کے اعتبار سے تین درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا نچلا درجہ کا خراٹا اور دوسرا وسطی درجہ کا خراٹا اور تیسرا انتہائی بلند درجہ کا خراٹا ـــ نچلے درجہ کا خراٹا چھوٹی آواز میں اور آہستہ چلتا ہے۔ جس سے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی ـــ وسطی خراٹا درمیانہ آواز میں اور تیزی سے (قدم بڑھاتا ہے۔ جس سے سونے والوں کی نیند میں خلل آتا ہے۔ تیسرے درجہ کا خراٹا نہایت بلند آواز میں چلتا ہے جسے ہم "پاورفل" کہہ سکتے ہیں۔ اور دہشتناک بھی! جس کی گھن گرج سے سونے والوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں ـــ یہاں تک کہ دوسرے کمرے میں سونے والے بھی ان خراٹوں سے متاثر ہوتے ہیں ـــ اور بچے تو ڈر کے مارے بُری طرح چیخ پڑتے ہیں۔ اور جن گھروں میں یہ خراٹے موجود ہوں وہاں کی بیگمات کتنی پریشان رہتی ہوں گی اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں ـ ان تمام خراٹوں سے بڑھ کر ایک اور خراٹا ہے ـــ یہ وہ خراٹا ہے جو کسی بھی وقت چلتا ہے۔ یعنی نیند لگی ہے لیکن اچانک اس خراٹے کی آواز بلند ہوتی ہے اور دفعتاً بند ہو جاتی ہے ـ یہ خراٹا نیند لگ جانے کے بعد ایک لمحے کے لیے رونما ہوتا ہے اور جھٹکا دیتا ہے۔ ایسے خراٹوں کا کوئی بھروسہ نہیں ـــ کب اور کس وقت وقوع پذیر ہو جائے ـ ایسے خراٹے کو ہم خفیہ خراٹا بھی کہہ سکتے ہیں۔ یا پھر چور خراٹا کہہ لیجئے ـــ کہیں شادی کی بارات آئی ہو اور تمام باراتی میٹھی نیند مخمور ہے ہوں اور یہ خراٹا زناٹے بھرتا چل پڑے اور پھر فوراً بند ہو جائے اور اسی کی آواز سے کسی باراتی کی آنکھ کھل جائے اور وہ پتہ لگانے کی کوشش کرے کہ یہ کس کا خراٹا تھا تو اسے ہرگز خراٹے کے مالک کا پتہ نہیں چل سکتا اس لحاظ سے اس خراٹے کو دھوکے باز خراٹا بھی کہہ سکتے ہیں ـــ" اور جب تک یہ دنیا زندہ ہے یہ خراٹے بھی زندہ ہیں ہم اگر ان تمام خراٹوں کے خلاف آواز بھی اٹھائیں تو ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ـــ نہ کوئی انہیں دبا سکتا ہے۔

"ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں"

خراٹے لینے والا خود تو مست سوتا ہے مگر دوسروں کی نیند خراب کر کے رکھ دیتا ہے ـ خراٹے کیوں آتے ہیں؟ اس کی کیا وجہ ہے ـــ خراٹے کیا مرض ہے؟ اور ان کا کیا علاج ہے۔ اور علاج ہے بھی یا نہیں! اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ـ ہمیں تو لگتا ہے کہ یہ لا علاج ہیں ـــ

ایک مرتبہ ہمارے محلے میں ایک شادی کی بارات آئی گرمی کا موسم تھا تمام باراتی باہر پنڈال میں سو رہے تھے کہ انتہائی بلند خراٹوں کی آواز نے چند لوگوں کو جگا دیا۔ ہم نے بھی دوسری جانب کروٹ لی اور سو گئے۔ لیکن کسی نے جو صاحب خطرناک خراٹے لے رہے تھے ان کے سینے پر مائیک رکھ دیا۔ لاوڈ اسپیکر میں خراٹے ایسے گونجے کہ باراتی ڈر کے مارے اُٹھ بیٹھے۔ گھروں میں عورتوں کا شور سنائی دینے لگا۔ بچے ڈر کے مارے اپنی ماؤں کو لپٹ گئے۔ کچھ عورتوں نے ڈر کے مارے بجائے آیتہ الکرسی کے دعائے قنوت پڑھنا شروع کر دیا۔

ایک حضرت جن کی عمر تقریباً ۵۵ سال تھی دن میں زیادہ وقت بچوں میں رہ کر اپنا اور بچوں کا دل بہلاتے تھے۔ "یعنی عمر ۵۵ کی اور دل بچپن کا" ان کے خراٹے بڑے زبردست تھے اس لیے خراٹے والے نانا کے نام سے مشہور تھے۔ جب رات میں سوتے تو انتہائی بلند آواز میں خراٹے بھرتے تھے۔ گھر میں سوتے تو بیوی بچوں کی نیند خراب کر دیتے اور جب باہر گلی میں سوتے تو لوگوں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دیتے تھے۔ اور خود بڑی مست نیند سوتے ان کے طاقتور خراٹے سن کر بہت سے لوگ اپنے اپنے سینے پکڑ کر اُٹھ بیٹھتے تھے۔ اور پسینے پسینے ہو جاتے تھے اور بعضے تو غش کھا کر چارپائی سے نیچے گر پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے خراٹوں کا اثر پرندوں اور جانوروں پر بھی ہوتا تھا۔ بکریاں بُری طرح بھاگ کھڑی ہوتیں اور دُور جا کر حسرت بھری نگاہوں سے ان کی چارپائی کی طرف دیکھتیں۔ مرغیاں اور بطخیں ڈربے میں ایسی دبک کر بیٹھی رہتیں گویا ان پر قیامت آ گئی ہو۔ ایک مرتبہ تو ڈربے میں ایک مُردہ مرغی بھی پائی گئی۔ اور تو اور ان کے طوفانی خراٹوں نے کتوں کو ایسے لاپتہ کیا تھا کہ کمبخت ہمارا محلہ ہی بھول گئے تھے۔ کئی مرتبہ لوگوں نے انہیں جگایا اور کہا۔ بھائی تم دھیرے سے خراٹے نہیں لے سکتے ہو وہ جواب دیتے میں نیند میں کیا کرتا ہوں مجھے خود پتہ نہیں رہتا۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو تو ان خراٹوں کا علاج بتاؤ۔ بس اتنا کہہ کر وہ پھر سو جاتے اور وہی خراٹے بلند کرنا شروع کر دیتے۔ چند دن بعد لوگوں کو ان "HORROR" خراٹوں میں سونے کی عادت ہو گئی۔ اور وہ ان دہشتناک خراٹوں کے باوجود بھی سو جاتے اور انھیں نیند لگ جاتی۔ لیکن جیسے ہی وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو محلے میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔ لیکن یہ کیا ماجرا ہوا لوگوں میں پھر وہی بے چینی پھیل گئی۔ رات میں لوگ پھر سو نہیں پا رہے ہیں۔ پوچھا گیا کہ اب تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم لوگوں کو خراٹوں کی آواز میں سونے کی عادت ہو گئی تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا:

کمبخت آیا تھا تو خود میٹھی نیند سوتا تھا اور ہماری نیند حرام کر دی تھی اور اب گیا تو بھی
خود آرام کی نیند سو رہا ہے اور ہماری نیند خراب کر کے رکھ دی ہے۔

تخلیقات صاف خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھے جائیں۔
قلمی معاونین مسودات پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھیں۔

نعیم زبیری
حیدرآباد

(خاکہ)

مزدور شاعر ـــــ برق یوسفی

برسوں سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک اچھے فنکار کی حیثیت بھی اسکوٹر کے ایک عمدہ اور پائیدار ٹیوب کی طرح ہوتی ہے جو اُس وقت تک عمدگی کے ساتھ رہ کر سامنے نہیں آتا جب تک کہ اس میں ہوا نہ بھری جائے۔ اور ہوا بھروانے کے لیے ایک پمپ کا وجود ضروری ہے۔

برق بھی ایسا ہی ایک عمدہ ٹیوب ہے جو برسوں سے ادب کے شوکیس میں پڑا ہے، پچکا ہوا۔ بے ہوا۔ اشارۃً ظاہر ہے کہ اس کے جسم کی طرف انہیں فن کی طرف ہے۔

حیدرآباد میں بدقسمتی سے ادبی پمپوں کی بڑی کمی ہے۔ پمپ ہیں ضرور، لیکن وہ بعض بڑے بے جان قسم کے ٹیوبس میں پنکچر ٹھیک ٹھاک کر کے ہوا بھرنے کے کام میں آتے رہے ہیں۔

فنکار کے لیے تھوڑا سا اداکار ہونا بھی ضروری ہے۔ سڑک پہ شاعر دکھائی دے جاتے تو آپ اس کے حُلیے کو دیکھ کر فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ فلاں عظیم شاعر کی پیروڈی چلی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں اڑے ہٹے رنگ کی شیروانی پہن کر اس کے بٹن کھلے رکھنے اور پیشانی پر بال بکھیرے رکھنے کا رواج تھا۔ اس ظاہری حلیے کے ساتھ کچھ داخلی طور پر بھی اپنے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا کہ شاعر مخمور لوری طرح اُبھر کے آگئے۔ برق نے کبھی اپنے ظاہر کو شاعرانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ نِرا مزدور ہی رہا جسے دیکھ کے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ابھی ابھی اپنا پھاوڑا کہیں رکھ کے آیا ہے۔ ویسے داخلی طور پر اس نے بہت کچھ کیا ـــ اچھی شاعری بھی کی اور دوسرے شاعرانہ لوازمات کا بھی خیال رکھا۔

لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد کے شاعرے حاضرین کی تعداد کے اعتبار سے اتنے کامیاب کیوں ہوتے ہیں۔ بیس ہزار پچیس چالیس ہزار حاضرین ایک میدان میں جمع کیسے ہو جاتے ہیں۔ راز کی بات یہ ہے کہ یہ محض حاضرین ہوتے ہیں۔ سامعین نہیں۔ مشاعرے کے ان حاضرین میں زیادہ تعداد نوجوانوں پر مشتمل ہوتی ہے جو سال سال بھر بور ہوتے ہیں کہ ان کی سپاٹ زندگیوں میں کوئی ہلچل ہوتی ہی نہیں ہے ـــ دہی کھمبوں کے نیچے ہم خیالوں کے ساتھ جمع ہو کر گپ چھانٹنا ـــ وہی کل والی باتیں دُہرانا ـــ اور اسی طرح ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ مار کے ہنسنے کی اداکاری کرنا۔ ذرا سی ہلچل کبھی ہوتی ہے تو امتحان

کے موقع پر چیٹنگ کے نئے نئے طریقے ڈھونڈھ کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ اور پھر ان نوجوانوں کی زندگی میں اگر کوئی موقع کھل کے لطف اندوز ہونے کا آتا ہے تو وہ ہے سالانہ مشاعروں کا ۔ ہزاروں کی تعداد میں وہ سارے دل جلے ۔ جنھیں اگر اکیلا لے جا کے فلڈ لائٹس کی زد میں کسی اسٹیج پر چھوڑ دیا جائے تو کونے ڈھونڈھتے پھریں ایک میدان میں جمع ہو جاتے ہیں ۔ اور اپنی آوازوں سے کئی کئی گھنٹے محظوظ ہو کے مطمئن گھر جاتے ہیں۔ یہاں ایسے بہت سے ٹیوب جن میں ہوا بھری جاتی ہے اسٹیج پر آتے ہیں اور شاعرے کو اپنی ادا میں لوٹتے ہیں ۔ ان مشاعروں میں داد کم فریاد زیادہ ہوتی ہے اپنی اپنی زبانوں کو سال بھر صیقل کرنے کے بعد حاضرین چبھتے ہوئے جملے شاعروں کے دلوں میں چبھو چبھو کر لطف لیتے ہیں۔ ایسے میں صرف وہی شاعر ٹک سکتا ہے جو حلیے سے شاعر لگتا ہو ۔ چرب زبان ہو ۔ اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ ایک چرب زبان کمپیئر کا انتظام کیا جانے لگا ہے جو مظلوم ہوٹنگ زدہ شاعر کی جان بخشی کرواتا ہے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ برق یوسفی جب اپنے ڈیل ڈول کے ساتھ عجیب سی غیر شاعرانہ چال چلتے ہوئے اسٹیج کے ایک کونے سے مائک سے ہم آغوش ہونے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو حاضرین جلسہ کی نام نہاد ظرافت کا بٹن آن ہو جاتا ہے ۔

یہاں میں ایک بات کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ ایک زمانہ تھا کہ برق یوسفی کو بھی حیدرآباد کے مشاعروں میں بڑے ذوق و شوق سے سنا جاتا تھا یہ وہ دور تھا جب مشاعروں میں سامعین کی تعداد زیادہ ہوتی تھی ۔ ان دنوں ہوٹنگ بھی ایسی سلیقہ کی ہوتی تھی کہ بے اختیار مکرر ارشاد کہنے کو جی چاہے ۔ یہ مخدوم کا دور تھا جب کہ سامع اور شاعر کے درمیان عقیدت اور محبت کا ایک رشتہ سا قائم ہو گیا تھا ۔ خوش قسمت ہے برق کہ اس کی شاعری نے اس مقدس ماحول میں جنم لیا ۔ ان دنوں لوگ چال سے زیادہ شاعری پر توجہ دیتے تھے کیفی اعظمی کی عورت ۔ ساحر کی پرچھائیاں دھاک جماتا ، جوش اور فراق کی بھاری بھرکم شاعری و آواز شاذ کی شاعری کا انبساط ۔ اریب کا مخصوص ترنم قیصی کی شاعری کا وزن ۔ کچھ اس انداز سے سامعین کو اپنی گرفت میں لیے رہتا تھا کہ اس ماحول سے آزاد ہو کے ہوٹنگ کے فن کو آزمانا مشکل تھا ۔ ان دنوں برق بھی حیدرآباد کے مشاعروں کا ایک کامیاب شاعر تھا ۔ وہ نہایت سادگی سے اپنی وہی اشتعال انگیز چال چلتے ہوئے مائک پر آتا اور "مکرر" کی آوازوں کے بیچ بھی پاتا جو شاید ایک شاعر کے لیے سب سے بڑا انعام ہوتا ہے ۔

ڈر ہے کہ ماضی کی یادوں کے اس جنگل میں میں کہیں برق کو نہ کھو بیٹھوں اس لیے آئیے برق کی کچھ بات کریں :

مجھے وہ دن وہ لمحہ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں ہے جب برق سے میں پہلی مرتبہ ملا تھا ۔ بہر حال اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شہر میں ادبی انجمنوں کا دور دورہ تھا ۔ چاروں طرف قسم قسم کی انجمنیں اگ رہی تھیں ۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے بعد انجمن عوامی مصنفین سے نئے آنے والے کچھ خوفزدہ سے رہتے تھے ۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس انجمن میں نہایت سینئر اور پائے کے ادیب شاعر اور نقاد ۔ پیچھے نہیں ڈاکٹر زینت

ہوئے تھے۔ اُن دنوں ذرا سی محنت کے بعد ڈاکٹر بننے کا رواج تھا۔ چنانچہ وہاں کمزور لوگوں کی دال نہیں گلتی تھی۔ اور بقول ایک دل جلے ادیب کے انہیں کمرۂ امتحان سے اُٹھا کے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔ اور اس طرح پھینکے ہوئے لوگ پھر ایک جگہ جمع ہوکر ہم خیالوں کی انجمنیں بنا لیتے تھے۔ ایسی ہی ایک انجمن تھی انجمن ارتقائے ادب۔ جس کے جلسے بڑی باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ یہ جلسے کبھی نہایت کامیابی سے لائٹ کے کھمبوں کے نیچے بھی کر لیے جاتے تھے۔ اور اپنی انجمن کے اس عوامی پن سے سارے اراکین جنھیں شامل اور کبھی کبھی "ممبران" کہا جاتا ہے بڑے مسرور رہتے تھے۔ اور ان مسرور رہنے والوں میں میں اور برق بھی تھے۔ بس یہیں سے ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی تھی۔

یہ بات کوئی چالیس برس پُرانی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم میں سے اکثر کے سروں پر گھنے اور اوریجنل کالے بال۔ اور منہ میں اوریجنل سفید دانت تھے۔ ہاتھوں پیروں میں طاقت تھی دل میں "کچھ تو کیا کر" والا حوصلہ تھا۔ لہٰذا ہم لوگ جی جان سے ادب کی خدمت میں جُٹے ہوئے تھے۔ اور ادب کی زمین کو کھودنے والا سب سے اہم مزدور برق یوسفی تھا۔ ہم ایک غول کی صورت میں ملے پلی میں ایک ادبی انجمن کے جلسے میں شرکت کے فوراً بعد پُرانے شہر میں ہونے والے کسی جلسے میں شرکت کے لیے پیدل روانہ ہو جاتے تھے۔ انجمن ارتقائے ادب کا سب سے اہم شاعر برق ہی تھا۔ جو ہم سب کے وقار کی علامت تھا اور شاعرے لوٹنے کے فرائض انجام دیتا تھا۔

ان دنوں یہ لوگ۔ یعنی میں۔ برق یوسفی میرے چھوٹے بھائی شمیم تہوری مرحوم۔ اور نسیم زُبیری ایک چھوٹے سے کمرے میں ملے پلی میں رہتے تھے۔ انجمن ارتقائے ادب میں جناب صدر کی ریکروٹنگ کا کام میرے سپرد تھا۔ میں یہ فرض بحسن و خوبی یوں انجام دے لیتا تھا کہ میں عوامی مصنفین کا رُخ کرتا تھا اور ایک نہ ایک دانشور کو ساتھ لے آتا اور کرسیٔ صدارت پر بٹھا لیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان دنوں کرسیوں کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ عوض سعید، شاذ تمکنت اور عزیز قیسی وغیرہ سے بھی میری دوستی انہی دنوں پروان چڑھی تھی۔ یہ سب ہمارے جناب صدر کے پینل میں شریک تھے۔ ہمارے ایک جلسے کی صدارت پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے بھی کی تھی۔

میری برق یوسفی سے دوستی کے ابتدائی دور میں وہ ایسے ہی عاشق مزاج تھے جیسا کہ شاید ایک شاعر کو ہونا چاہیئے اپنی معشوقاؤں کو خط لکھنا بھی ان کی ہابی تھی ایسی معشوقاؤں کو بھی جن سے وہ بارہا ملتے تھے اور گھنٹوں باتیں بھی کرتے تھے وہ خط ضرور لکھتے تھے۔ پتہ نہیں وہ عجیب و غریب معشوقائیں ان کے خط کس سے پڑھواتی تھیں بہر حال یہ شاعر فطرت۔ عجیب و غریب ویران کھنڈروں میں بھی حسن تلاش کر لیا کرتا تھا ... میں نے ان کے کئی عشقوں میں دخل اندازی کر کے انہیں درہم و برہم کیا ہے اور اس طرح ایک ویلن کا رول ادا کیا ہے۔ میرے غیر رومانی رویہ سے وہ ہمیشہ شاکی رہے۔ برق کی خوش مزاجی اور انکساری اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔ گزشتہ چالیس برسوں میں میں نے اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا۔ غم کی کہانی اور لطیفے دونوں کا ردِعمل اس کے پاس ایک ہی ہوتا ہے مسکراہٹ اور ایک مخصوص ہنسی۔ وہ ایک نہایت ہی پرخلوص شخص ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں اس میں بھی اس کی کمائی کا دخل ہے کیونکہ پاجی پن الاسد بنانے کے لیے بھی آدمی کو چست اور پھرتیلا ہونا پڑتا ہے۔

■■

بابو آر کے (ایلچپوری)

سفرنامہ

اودھ کی شام سرسوں کے نام

اودھ کی شام اس کی رنگینی، شہر لکھنؤ کی خوب صورتی، اہل لکھنؤ کی نزاکتیں اور ان کی نازک مزاجیوں کو قریب سے دیکھنے کا ارمان ایک مدت سے ہمارے دل میں تھا۔ خدا کا کرم ہوا۔ اس مرتبہ گلابی جاڑوں کے دوران لکھنؤ جانے کا پروگرام بن ہی گیا۔ ہمارے اس سفر کی تیاری کے لیے ہم سے پہلے بیگم سرگرم عمل ہو گئیں۔ انھوں نے گھر کے گوشے گوشے اور چپے چپے سے گرم کپڑوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور گھر میں موجود ہر اونی کپڑے کو رختِ سفر کا درجہ دے کر ہمارے حوالہ کیا۔ سفر کے لیے گھر سے نکلتے وقت اہل خانہ ہم سے ہاتھ ملاتے جاتے تھے اور ہمارے ہاتھ میں اپنی فرمائشوں کی لسٹ تھماتے جاتے تھے۔ بعد ازاں بیگم بھی امام ضامن ہاتھ میں لیے دوڑی دوڑی آئیں اور ہمارے بازو پہ باندھتے ہوئے بولیں، جائیے۔ خدا حافظ ویسے تو امام ضامن کی ضرورت تھی بھی نہیں کیوں کہ آپ خود، امام باڑوں کے شہر لکھنؤ جا رہے ہیں۔ اس لیے امام تو آپ کے ضامن ہو گئے ہیں ۔ ۔ ۔ لیکن چوں کہ مجھے اپنی ساڑی کے کلر کا میچنگ بلاؤز پیس یہاں ملا نہیں اس لیے اسی کی امام ضامن تیار کر لی۔ بس اسی کلر کا بلاؤز پیس لیتے آئیے، جائیے فی امان اللہ۔

اب صاحب لکھنؤ کے لیے ملی بس اچلپور سے چل کر ایڈووکیٹ شوکت علی اور ہم بیتول پہنچے۔ پروگرام کے مطابق بیتول پہنچ کر ہمیں حیدر بیابانی کو ساتھ لینا تھا۔ اس لیے دبلے پاؤں شیر کے پنجوں کو مستعار لیے ہم ان کے ٹھکانے پر پہنچے۔ پہنچنے کے بعد علم ہوا کہ یہ صاحب صاف جل دے گئے اور کل رات ہی ایلچ پور کے لیے سدھارے۔ بہرکیف اسی دن شام میں چار بجے اٹارسی کے لیے گونڈوانہ ایکسپریس میں سوار ہوئے۔ کمپارٹمنٹ میں زندگی پوری رعنائی اور دلکشی کے ساتھ موجزن تھی۔ تیکھے نقوش

نش قدوخال سے اٹھتی ہوئی مہکاروں اور تیز نوبلی اور عامی زندگی کی چہکاروں میں رچے بسے ایک خوب صورت
ی جوڑے کے برابر والی نشست سے ہم جڑ گئے۔ گویا پنجابی حسن اور مہاراشٹرا کی حسن پرستی باہم محو سفر
تھے۔ دوران سفر پنجابی حسن نے ساحر کی "پرچھائیاں"، "تلخیاں" اور قتیل کی گھر کے اشعار ہم سے دہرا لیے۔
رض اسی شعری کیفیت کے ساتھ ہم اٹارسی پہنچے۔ ٹرین کے اسٹیشن پر رکتے ہی کسی کے پیروں میں سر جھکا کر
نے جوتوں کے تسمے باندھے۔ یعنی بارگاہ حسن میں جذبۂ عشق سجدہ ریز ہوا۔ بہر حال ہم اپنا سامان اٹھائے
ارٹمنٹ سے نیچے اتر گئے۔ پھر پشپک اکسپریس کے ذریعہ شام میں ۷ بجے لکھنؤ کے لیے محو سفر ہوئے۔ پشپک
جھٹکوں، مسافروں کے دھکوں اور سردی کی لپیٹوں نے کم از کم میری آنکھوں سے نیند اچک لی تھی
ہ ایسے ماحول میں بھی میاں شوکت اپنی قوم کی نمائندگی فرما رہے تھے یعنی اونے پونے داموں پر گھوڑے بیچ
خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ جیسے جیسے رات کی تاریکی اپنے اندھیروں کو سمیٹنے لگی ویسے ویسے
لکھنؤ سے قریب ہونے لگے۔ ادھر ہمارے دل میں لکھنوی تہذیب اور شام اودھ کے مزے لوٹنے کے
ن انگڑائیاں لینے لگے ادھر ہمارے ساتھ دوڑتے بھاگتے کھیتوں میں سرسوں کے پھول بھی کھلکھلا کر
ہنستے، مسکراتے ہمیں خوش آمدید کہنے لگے اور پھر صبح ۹ بجے ہمارے پیروں کا لمس سرزمین لکھنؤ کو چوم رہا تھا۔
یشن سے باہر آتے ہی سردی کی لپیٹیں بلائیں لینے دوڑ پڑیں اور یا دل گلاب پاش کی طرح ننھے ننھے شیتل
روں کا SPRAY کرنے میں جٹ گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کہرے کی گہری چادر نے دن کے اجالے
رات کی سیاہی میں بدل دیا۔ قدرت کی اس کرم فرمائی پر ہم خوش ہوئے اور سوچنے لگے کہ واقعی قدرت
رسا ہے۔

وہ لکھنؤ ہماری آمد کا مقصد جانتی ہے اس لیے صبح ہی سے شام اودھ کا اہتمام کرنے لگی ہے۔ الغرض
ھنؤ کی یہ پہلی پہلی صبح ہی ہمیں شام اودھ کا مزہ دینے لگی اور شام اودھ دیکھنے کے ہمارے ارمان کچھ اس طرح
ئے کہ لکھنؤ میں دو روزہ قیام کے دوران ہمیں دن میسر نہیں آیا بلکہ شام ہی شام سے سابقہ پڑا۔ بہر حال
سی طرح کہرے کی چادر چیر کر ہم رکشہ پر سوار ہوئے۔ ہم سمجھتے ہیں لکھنوی تہذیب کی باقاعدہ شروعات
از کم ہمارے لیے، تو اسی رکشہ سے ہو چکی تھی۔ یہاں کے رکشے انتہائی ہلکے پھلکے سمٹے سمٹائے اور اردو شاعری
معشوق کی کمر کی طرح نازک ہوا کرتے ہیں۔ ان رکشوں میں سوار ہوتے ہی سواری انسان سے سیال مائع
بدل جاتی ہے اور بہنے لگتی ہے۔ ہم بھی بہے۔ رکشوں کی طرح ہی رکشہ چالک کی ہر ادا ہر بات سے لکھنوی
ہذیب کی بو باس آنے لگتی ہے۔ رکشہ چلاتے وقت یہ میٹھی آواز مترنم لہجہ میں اتنی لے اور تال کے ساتھ بات
رتا ہے گویا یہ رکشہ نہیں بلکہ شیریں کلامی اور خوش بیانی کی کلاسیں چلا رہا ہو۔ لکھنؤ کے بازاروں دو کانوں
یہوٹلوں میں ہم نے ملائم سنگھ اور کانشی رام کے اتحاد کے چرچے سنے اور جہاں لوگوں کے چہروں پر اس اتحاد
تمازت دیکھی وہیں بھاجپا کی پسپائی کی الم ناک داستان سہمے سہمے چہروں پہ لکھی دیکھی۔ ابھی ہم بازاروں میں
گھوم ہی رہے تھے کہ پان کی للک نے ہمیں بے چین کیا۔ ہم ایک اچھے سے پان فروش کی دکان پر گئے۔ یہاں بھی
ھنوی نزاکت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری منتظر تھی۔ انتہائی چھوٹے چھوٹے پان کے ٹکڑے تراش
[illegible]

ان کومل ننھے منے پان کے ٹکڑوں پر کتھے چونے کی آمیزش، یہ پان فروش اس طرح رکھ رکھا وَ سے کرنے لگا جیسے تاج محل پر رنگ و روغن کر رہا ہو۔ کتھے، چونے کے بعد اب صاحب سپاری کا مرحلہ سامنے تھا۔ ہم نے دیکھا کہ سپاری کی چھوٹی چھوٹی ہم شکل ڈلیاں ایک خوب صورت برتن میں پانی کے اندر اپنی کرختگی دور کرنے کے عمل میں مصروف تھیں۔ کہیے صاحب کیسا پان چاہیے؟ پان فروش کے استفسار پر ہم نے کہا، ہم براری ہیں۔ اس لیے، ایک یا دو نہیں پورے آدھا درجن پان کھائیں گے۔ الغرض ایک ہی وقت میں ہم نے چھ سات پان منہ میں بھر لیے اور وہ پان فروش ہمارا منہ تکتا رہ گیا۔ اس دوران یخ بستہ ماحول میں ہم اپنے جسم و وجود کو گرم رکھنے کے لیے حرارت و حدت کے متلاشی تھے۔ بازاروں میں جا بجا گرم کپڑوں میں روپوش ہونے کے باوجود اگر بوڑھے جسم سردی سے ٹھٹھر رہے تھے ...... تو جوان حسین جسم ادنی کپڑوں میں انگیٹھیوں کی طرح دھک بھی رہے تھے لیکن گرمی کے شہدائے سوئٹروں، شالوں، دستانوں اور موزوں کے باعث ہمیں گرما نہیں سکے۔

بالآخر ہم نے بجائے دل و نظر کو گرمانے کے پھیپھڑوں کو گرمایا، چارمینار سگریٹ ہونٹوں سے لگایا۔ آٹھ دس کش لینے کے بعد ہم نے شوکت میاں اور اپنے ساتھ کی گرہیں کھولتے ہوئے کہا، ہمارا اور آپ کا ساتھ بس یہیں تک تھا۔ آپ شوق سے اجلیور جائیے اور ہم ...... تو اب یہیں کے ہو رہے۔ ہماری اس بے وفائی پر میاں شوکت حیران تھے۔ ہم نے کہا، سگریٹ کے آٹھ دس کشوں نے گلے سے پھیپھڑوں تک آنگار بجھا دی۔ جلن کی سیج پر چھالے سج گئے یعنی سالم لکھنوی نزاکت ہم میں سرایت کر گئی اس لیے اتنی نازک مزاجی لے کر کس منہ سے ہم گھر لوٹیں اور لکھنو چھوڑیں، نہیں نہیں آپ کا اور ہمارا کوئی میل نہیں۔ آپ اجلیوری اور ہم لکھنوی۔ خیر۔ صاحب، اسی اثنا میں بھوک کی شدت نے کھانے کی ایک عمدہ سی ہوٹل میں ہمیں پہنچا دیا۔ ہاتھ منہ دھو کر، ویل ڈیکوریٹ ڈنر ٹیبل پر ہم بیٹھ گئے۔ کھانے کا آرڈر دے دیا۔ اس دوران ہوٹل کے اندر ایک عجیب قسم کی بو باس نے قوتِ شامہ پر دھاوا بول دیا۔ ہم نے ٹوہ لینے کے لیے جمناسٹک کی تمام Exercise اپنی ناک سے کروائی ..... اور ادھر میاں شوکت، اشوک کی لاٹھ کی طرح ساکت، ناک اپنے چہرے پر لیے بیٹھے رہے۔ ویسے میاں شوکت کے تعلق سے ہمیں خبر تھی کہ Smell functioning کے معاملے میں ان کی ناک کی کوئی ساکھ نہیں اور ناک ان کے یہاں چشمہ کے اسٹینڈ کے فرائض انجام دیتی ہے یا محض خاندانی وقار کا Symbol ہے۔

بہرحال ہم ناک پر ہاتھ رکھ کر بولے، یار ہوٹل ویل ڈیکوریٹ ہے۔ عالی شان ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جسمانی صاف صفائی کے معاملے میں ہوٹل کا اسٹاف ہوٹل کے معیار کے ساتھ نہیں چل رہا ہے۔ ہماری بات کی تائید میں میاں شوکت بولے ...... اتنا سرد ماحول اس پہ لکھنوی نزاکت ... اس لیے بیرے حضرات غسل کم کم اور تیمم زیادہ کرتے ہوں گے۔ خیر صاحب اسی ادھیڑبن میں کھانا ٹیبل پر سج گیا۔ ہم نے ناک سکوڑ کر کھانا Serve کرنے والے بیرے کو گھورا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائے ... کم بخت نے ہفتہ میں ایک مرتبہ ہی غسل فرما لیا ہوتا تو اس وقت ہم کھانا ..... تو اطمینان سے کھا رہے ہوتے اور پھر بادلِ ناخواستہ ہم نے بریانی کا لقمہ منہ میں ڈالا۔ اسی مخصوص باس نے لقمہ کو حلق سے نیچے اترنے نہ

گیا۔ ابکائیاں آنے لگیں۔ ہم نے بیرے کو بلایا وہ آیا کہنے لگا۔ جی فرمائیے۔ ہم نے کہا، میاں غسل فرمالیا کرو، صفائی اچھی چیز ہے۔ بیرا اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا، بھائی جان، صفائی تو نصف ایمان ہے، آپ بھی مسلمان ہم بھی مسلمان پھر بھلا آپ سے یہ کس نے فرمایا کہ ہم غسل نہیں فرماتے۔ ہم نے فوراً میاں شوکت کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ یہ ایڈوکیٹ ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں فرماتے۔ یہ سنتے ہی بیرا اپنی قرأت طبع کا ثبوت دینے کے لیے مسکرانے لگا۔ ہم بیرے سے ملتجی ہو کر بولے، میاں، ہم بہت پریشان ہیں، ایک مخصوص قسم کی بو باس کھانے سے ہی نہیں ہوٹل سے بھی آتی ہے۔ اور آپ خود بھی اسی باس کے spray بنے ہوتے ہیں۔ یہ سن کر بیرے نے چونک کر کہا، اچھا اچھا تو اب میں سمجھا آپ لوگ اتر پردیش کے نہیں ہیں ہم نے کہا ہم مہاراشٹرین ہیں۔ جواب میں بیرا مسکرایا اور بولا، صاحب آپ لوگ کھانے میں سرسوں کا تیل استعمال نہیں کرتے۔ جب کہ یہاں سرسوں کا تیل استعمال ہوتا ہے۔ شاید آپ، سرسوں کے تیل کی بو باس کی بات کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا ہمارے علاقے میں سرسوں کا تیل کھایا نہیں جاتا، لگایا جاتا ہے اور پھر بیٹھے بیٹھے ہم نے اپنی شادیوں میں دولہنوں کو سرسوں کا تیل چڑھاتے وقت خواتین کے ذریعہ گائے جانے والے گیت کا مکھڑا سنایا:

اری سونا لاگے، ماں بری سونا لاگے
سرسوں کا تیلا چڑھا ئیو

اس طرح ہوٹل سے ہم بجائے ڈکاروں کے ابکائیاں لیتے سرسوں پر لعنت ملامت کرتے ہوئے باہر نکلے۔ الغرض لکھنؤ میں اپنے مختصر قیام کے دوران ہم بجائے کھانے کے کھچڑی، گلاب جامن کا ناشتہ کرتے رہے جس کے باعث ہم میں لکھنوی نزاکت کے ساتھ ساتھ بنگالی نقاہت بھی آگئی۔ اس پوزیشن میں ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور گھر کے تیکھے چٹخارے دار دسترخوان کی طرف کوچ کیا . . .

اقبال انصاری
(دہلی)

ایک بیہودہ مخلوق

دنیا میں نہ ہمارے مہربانوں کی کمی ہے نہ مہربانی کا فقدان مثلاً آل انڈیا ریڈیو کے وہ جو محمد علی موج ہیں یوں تو ہمیشہ ہم سے عجیب و غریب بلکہ صرف عجیب و غریب موضوعات پر ٹاک "لکھواتے" رہتے ہیں مگر ایک بار تو انھوں نے حد ہی کر دی۔ آفر بھیجا۔ "بلبل اور کوئل پر دس منٹ کی ایک ٹاک بھیجیے" پھر بیس منٹ تک فون پر دھمکاتے رہے کہ ٹاک تو دینی ہی پڑے گی۔ نہ ہمارا انکار سنا نہ احتجاج۔ مجبوراً ہم پسپا ہو گئے۔ کتب خانوں سے لے کر جنگلوں تک کی خاک سے خود کو پندرہ دن تک مسلسل چھنوایا تب اس قابل ہو سکے کہ ساڑھے سات منٹ تک کچھ عرض کر سکیں۔ اب ایک رسالے کے مدیر صاحب کا اصرار ہے کہ ہم مرغ پر ایک مضمون بھیجیں۔ مرغ پر لعنت تو بھیجی جا سکتی ہے۔ مگر مضمون! رسی تڑانے کی ساری کوششیں کر ڈالیں ـــــ مگر نہیں ـــــ "مضمون تو آپ کو لکھنا ہی پڑے گا۔" وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ لاحول ولا قوت۔ کیا بیہودہ محاورہ استعمال کر گئے۔ البتہ معاف کرے۔

اب بتائیے مرغ پر کیا لکھا جائے۔ جب ہم چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے تو ایک بار پنڈت جمنا دین مصرا جی نے ہندی میں گائے پر ایک نبندھ لکھوایا تھا۔

ہم نے لکھا تھا، اور پنڈت جی نے نبندھ کی بڑی تعریف کی تھی۔ شکر ہے کہ انھوں نے مرغ پر نہیں لکھوایا تھا۔ ورنہ ہم آج بھی چھٹی جماعت میں اٹکے ہوتے اور پنڈت جی کا کوئی ناتی یا پوتا ہماری گوشمالی کر رہا ہوتا۔ یقین کیجیے گائے پر ہم آج بھی مضمون لکھ سکتے ہیں۔ مگر اس ناہنجار مرغ پر کیا لکھیں ـــــ نہ سینگ نہ تھن، نہ دودھ کا نہ گوبر کا۔ ارے صاحب انڈا تک دینے کا اہل نہیں۔ اتنا سا کام بھی بیگم مرغ کے سپرد کر رکھا ہے۔ دراصل مرغی کی شرافت کی وجہ سے ہی مرغ کا دماغ ہمہ وقت آسمان پر رہتا ہے۔ بے چاری عمر سے جھیلتی ہے۔ نخرے اٹھاتی ہے، بدمزاجیاں سہتی ہے۔ بد عنوانیاں برداشت کرتی ہے مگر ہم نے آج تک غریب کے منہ سے اف تک نہیں سنی انڈے دے تو مرغی دے، کڑک ہو تو مرغی ہو، انڈوں پر بیٹھے تو مرغی بیٹھے، چوزے پالے تو مرغی پالے

مرغ صاحب کو اپنی اکڑ سے ہی فرصت نہیں۔ بتایئے لکھیں تو کیا لکھیں! موصوف میں کوئی وصف ہو تو بیان کیا جائے
س ہر طرف چوکنا ہیں لیکن ہر وقت چوکنا رہنا تو مغل زہوئی بعد الطہارت ہے۔ کہ کبھی نیت بھرتی ہے نہ پیٹ۔ بدشعار اتنے کہ
زبے کے باہر کی دنیا بھی جناب کا عشرت کدہ ٹھہری۔ کھلا چھوڑ دیجیے تو گھر کا ہر گوشہ گوشہ لوم ٹلٹ۔ بد ذ
وق اتنے کہ مرغی چاہے جتنی رومانی نظروں سے جناب کی طرف دیکھے، جناب کے چہرے پہ تو ایسی اجنبیت
ظلموں کی ریگستانیت ہی طاری رہے گی۔ مانا کہ مرغی کے "اے جی" ہوتے ہیں مگر آتا بھی کیا "اے جی" ہونا
نہ اٹھ دس پڑوس تک جملہ مرغیوں کو "میں نے کہا سنتی ہو" بنا کر رکھ دیں۔

کھانے میں حضرت کی لاتیں معقول ہوتی ہیں مگر بجالت ملاحظہ فرمائیے کہ صرف دو ہوتی ہیں اور مجال
ہے جو پلیٹ میں دو منٹ سے زیادہ قیام کریں!

عجیب نامعقول جانور، ہمارا مطلب ہے عجب نامعقول جانوری پرندہ ہوتا ہے۔ مرغیوں کی رفاقت
بھلا کبھی مہمان کی ضیافت کے علاوہ آخر ہے کس مصرف کا؟ نہ گھوڑے کی طرح بگھی میں ٹانکے جانے کے
نہ بیل کی طرح ہل میں اٹکائے جانے کے قابل۔ نہ گدھے کی طرح صابر نہ کتے کی طرح شاکر، نہ مینا کی
رح سُر میں نہ فاختہ کی طرح تال میں؟ نہ الو کی طرح سنجیدہ نہ بگلے کی طرح متین، نہ کوے کی طرح کسی
ے کا آنے کی خبر لانے کا نہ کبوتر کی طرح پیغام رسانی کی اہلیت۔ بلی نظر آجائے تو دم اس حد تک نکل جائے
ہ چھری کے لائق بھی نہ رہے۔ آواز ایسی کرخت کہ آدم زاد صبح کی گہری نیند سے بھی جاگ جائے، انداز ایسا
یک کہ جمالیاتی حس دُم دبا کر بھاگ کھڑی ہو۔

اوپر ہم غلطی سے "مرغے کی ایک ٹانگ" استعمال کر گئے تھے۔ یہ محاورہ واقعاتی اعتبار قطعی غلط
ر تہذیبی اعتبار سے انتہائی بیہودہ ہے۔ واقعاتی اعتبار سے غلط یوں کہ مرغ کی ایک ٹانگ کب ہوتی ہے؟
ر تہذیبی اعتبار سے بیہودہ یوں کہ ـــــ مرغی کے پیچھے ایک ٹانگ سے اُچکتا ہوا کس قدر چھچھورا نظر
تا ہے!

بہر حال مرغ کے بارے میں ہم اتنا تو جانتے ہیں کہ مرغ کئی قسم کے ہوتے ہیں ـ مثلاً کڑک، روسٹ، بگر
ین، دیسی، جنگلی، تالابی، پہاڑی وغیرہ وغیرہ لیکن تندوری، مسلّم، اور بھونا۔ سب سے عمدہ قسمیں ہیں۔
قسموں کی معقولیت کی قسم بھی آسانی سے کھائی جاسکتی ہے۔

کھال اترنے کے بعد مرغ کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ ویسے شرافت کے
ر مرغ میں کھال اترنے کے بعد ہی نمودار ہوتے ہیں، ورنہ بغیر چھلے عالم میں تو ہمہ وقت بد اسلوب ہی
آتا ہے۔ خوش طبعی کا اظہار بھی اس طرح کرتا ہے جیسے پشتینی دشمنی نکال رہا ہے۔

لیکن صاحب ہم ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مخلوق یعنی مرغ کو ہم انتہائی بیہودہ اور
تی سمجھتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی ہمیں انکار نہیں کہ مرغ اگر نہ ہوتا تو مرغی کو سخت صدمہ پہنچا اور
ا بھی۔

ضمیر ساجد (آکولہ)

"جنونِ عشق مجھے ڈاکٹر بنا ہی گیا"

اے پھلاری گلی میں باکڑوں پر بیٹھ کر چائے پینے والے معزز لوگو!

آخر آج وہ مبارک گھڑی آ ہی گئی جب میں اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا دُم چھلا لگا سکتا ہوں ان لوگوں کا ڈاکٹر ہونا خود میرے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے روئے سخن اس صنف نازک کی طرف موڑنا پڑا۔ میں آپ کو بھی مبارک باد دیتا ہوں کہ اچھا ہوا میں یم بی بی یس ڈاکٹر نہیں ہوا، ہوا تو صرف فلسفہ کا، ورنہ یہ قوم جو ۴۷ سال پہلے صرف ۱/۲ ۳ کروڑ تھی اور آج تقریباً ۱۵ کروڑ ہے واپس اپنے مبدا کے طرف چلنا شروع کرسکتی تھی۔ پیشے کے لحاظ سے میں ایک مدرس ہوں انسانوں پر مشقِ ستم کرنے کی بجائے ادب پر کچھ احسان کردوں، اس خیال کے تحت میں نے اس میدان میں ایک قدم اور اُٹھایا ہے۔ یعنی اب میں ادب کی خدمت اور بھی اچھے انداز میں کرسکتا ہوں کیوں کہ اب پی ایچ ڈی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ لوگ میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کہ میں بھی "ادب" کی کوئی خدمت کرسکتا ہوں۔ میں یہاں اُن لوگوں سے مخاطب نہیں ہوں جو میری پچھلی ہسٹری جانتے ہیں بلکہ ان لوگوں سے کہہ رہا ہوں جو میرے پی ایچ ڈی ہونے پر خوشیاں منا رہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس قوم میں بھی ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی طرح ایک اور ڈاکٹر کا ظہور ہوا ہے۔ جو اپنی قوم کے لیے صرف اور صرف "ادبی" اعتبار سے کچھ کرسکتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹریٹ کے لیے میرا مضمون تھا "میری قوم آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد" میں اس سلسلے میں ہمارے آج کے قائد اعظم کے سیاسی ارشادات کا مشکور ہوں جسے میں نے اپنے تھیسس میں مولانا محمد علی جوہر کے ارشادات گرامی کے نام سے لکھا تھا۔ (یا کسی اور سے لکھوایا تھا)۔

یہ بات شاید آپ جان ہی گئے ہوں گے (حاسدوں کی دُعا سے) کہ مجھے یونیورسٹی کی طرف سے جناب کھا سگانوی کی خدمات عنایت کی گئی تھیں۔ انہوں نے جس طرح اپنا گراں قدر تعاون دیا یہ بیاں نہیں ہوسکتا۔ ہاں شاید کچھ دنوں بعد وہ خود ہی بتادیں۔ میرے پی ایچ ڈی کرنے میں جو راز پنہاں تھا وہ آج میں آپ لوگوں کو بتا ہی دوں، مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ لوگ میرے پوسٹ گریجویٹ ہونے کے بارے میں کچھ شبہات میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں قوم کے نونہالوں کو اپنے طریقۂ تعلیم سے اوپر اٹھا نہیں سکوں گا تو صاحبان آپ میری لگن دیکھئے، میرا حوصلہ دیکھئے جب میں اور اوپر اٹھ سکتا ہوں، مطلب ڈاکٹر ہوسکتا ہوں تو کیا اسٹوڈنٹس کو اوپر نہیں اٹھا سکتا۔ ہر آدمی سے حسد کرنے والے "آدمی" ہی ہوتے ہیں۔ میری ادبی خدمات ان حاسدوں کو اسی طرح

نہیں بھاتیں جس طرح فیملی پلاننگ مسلمانوں کو ۔ اور بہت سی باتیں ہیں جو مجھے آپ سے کرنی ہیں مگر میں اگلے جلسے تک کے لیے اسے ملتوی کرتا ہوں تاکہ آپ لوگ اگلا پروگرام جلد منعقد کر داسکیں ۔ اور اس کے ساتھ میں اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے یہ پیغام دیتا ہوں کہ " اگر ترقی کرنا ہو تو کیری طرح کا غذی ترقی کرو کہ آپ لوگ عملی ترقی کے متحمل نہیں ہو سکتے ۔"

شاعر کا اغوا

افتخار وصی (چیارٹی)

اغوا کاروں نے دکھائی ہے عجب کرتب یہاں — دیکھ کر جس کو دل شاعر سے اٹھتا ہے دھواں
عقل حیراں ہے کہ آخر کیسے ایسا ہو گیا — شہر کے اک نامور شاعر کا اغوا ہو گیا
غزلیں لکھ کر بیچنا تھا مشغلہ موصوف کا — اس کے گھر کی دال روٹی کا یہی تھا آسرا
اس کے اغوا ہونے کی منحوس ساعت الاماں — سر پہ بیوی بچوں کے ٹوٹی قیامت الاماں
اس کے آگے ٹیکتے تھے جس جس نے زانوئے ادب — گم ہوئے گدھے کے سر پر سینگ کی مانند سب
اب تو اہل خانہ کا کوئی نہیں تھا پرسانِ حال — بھوک کی شدت سے بچے ہو رہے تھے کل نڈھال
چھ دنوں تک سلسلہ یونہی رہا شاعر کے گھر — کوئی بھی آیا نہیں موصوف کی لے کر خبر
آخرش علامہ کی زوجہ نے باصد احترام — بیچ ڈالیں اس کی تخلیقات سب کوڑی کے دام
تاکہ بھر کے بچوں کو اک وقت کی روٹی ملے — چھ دنوں سے نذرِ فاقہ ہو رہے تھے دل جلے
بسکہ جس دن یہ حماقت اس سے سرزد ہو گئی — ایک دستی خط لیے گھر آیا کوئی اجنبی
خط میں یہ تحریر تھا میں خیریت سے ہوں یہاں — جاں بری ہو جاؤں گا دو چار دن میں ہے گماں
یہ کوئی ڈاکو نہیں ہیں جن کو دولت چاہیے — یہ تو متشاعر ہیں ان کو جھوٹی شہرت چاہیے
پاس ان کا شعر کہنا چاہتا تو ہے مگر — شاعری کی شین سے بندہ ہے بالکل بے خبر
لیکن اس کی ضد ہے کہ شاعر کی صف میں آئے وہ — صاحبِ دیوان بھی عمر میں کہلائے وہ
اور اسی اک ضد کی خاطر وہ بنا ہے اغوا کار — اللہ بخشے میں بنا ہوں اس کی وحشت کا شکار
شرط اس نے رکھی ہے میری رہائی کے لیے — دو دنوں میں لکھ کے اک دیوان مجھ کو دیجیے
ورنہ ہرگز آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا میں — ہڈیاں تو ہڈیاں ہیں کھوپڑی توڑوں گا میں
ایسی ایسی دھمکیوں کے درمیاں نظم و غزل — ایک دن میں آٹھ دس میں کہہ رہا ہوں آج کل
شعر کہتے کہتے میری جان پر بن آئی ہے — اور ادھر متشاعروں کی حوصلہ افزائی ہے
دو دنوں میں کس طرح ہوگا مکمل اک دیوان — کیسے بچ پائے گی ان متشاعروں سے میری جان
میری خاطر کام یہ لانا ہے جوئے شیر کا — فیصلہ اللہ کے ہاتھوں میں ہے تقدیر کا
سوچتا ہوں غیر مطبوعہ جو تخلیقات ہیں — ان کو کر دوں اس نئے دیوان سے منسوب میں
اس لیے رقعہ دہندہ کے ہمرہ کل کاغذات — بھیج دو فی الفور میرے پاس تا بن جائے بات
تاکہ دو دن میں مکمل کر کے دے دوں اک دیوان — اور بے ادبوں کے چنگل سے بچا لوں اپنی جان
پڑھ کے خط شاعر کی بیگم کو پسینہ آ گیا — منجمد خوں ہو گیا آنکھوں پہ نزلہ چھا گیا
بولیں لے اللہ دیکھو تو بھرم سرتاج کا — کافی مہنگا ہو گیا بچوں کا کھانا آج کا
اب کہاں سے لا کے دوں میں ان کو وہ غزلیں تمام — جو کہ میں بیچ ڈالیں آج کوڑی کے دام

دے کے خط

(مراسلے)

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتی "

بھاشا کی بیٹی اور ہندی کی بہن اردو نے جب کتم عدم سے منصۂ عالم شہود پہ قدم رکھا تو شمس ولی اللہ ولی نے آگے بڑھ کر اس کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا اور جب لڑکھڑا لڑکھڑا کر چلنے لگی تو میر اور سودا نے کھلائی بن کر اپنی دایۂ شفقت و محبت کی گود میں اس کو کھلایا اور بڑے ناز و نعم سے پروان چڑھایا پھر غوں غاں۔ غوں غاں۔ کر کے توتلی زبان میں گھونگرد بجانے لگی تو انشاء اللہ خاں انشا، اور خواجہ آتش نے مصری کی ڈلیاں دودھ میں گھول کر اس کو پلائیں۔

پھر کچھ زمانہ گزرا۔ اس بھولی بھالی۔ سلونی بچی نے بڑھ کر گلستانِ بہار میں قدم رکھا اور اٹھکیلیاں کرنے لگی تو اس نوبہار ناز کی زبان کو محاوروں کی چاشنی سے خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق نے لذت مہرو انگبیں عطا کی۔ پھر حکیم مومن خاں مومن اور میرزا نوشہ نے شوکت الفاظ و معنی آفرینی کی سحر طرازیوں سے اس کی رعنائیوں میں چار چاند لگا دیئے اور رشک زہرہ و قمر بنا دیا۔ ابوالکلام آزاد اور شبیر حسین خاں جوش نے طنطنہ و بے دماغی کے مصالحہ سے اس کی چتونوں میں تمکنت اور بانکپن اور آنکھوں میں شوخیوں کی جوت جلا دی۔

لیلیٰ نو ستو کر سج دھج کر جب یہ غیرت ناہید آگے بڑھی تو محمد حسین آزاد نے اس کو آب حیات کا ایک پیالہ پلا کر عمر دوام بخشی اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر سامنے ... [illegible]

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

اس بلبلِ ہزار داستاں کی خوش نوائیوں اور دل فریفتگیوں کے پس منظر میں اب ذرا آئیے۔ یہ دیکھیں کہ ان عالی مقام اسلاف کی جانب سے سونپی گئی اس انمول امانت کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے؟ اس میں ایسی کونسی خامی رہ گئی تھی کہ اپنی بوالعجبیوں اور احساس ہائے کمتری و مجبوریوں کے ہاتھوں ہم اس کے سولہ سنگھار کو اجاڑ کر پیڑ تلے بیٹھے ہیں اور ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لے کر اوروں کی دیوڑھیوں پر صدا لگا رہے ہیں۔ ہوش و خرد کی یہ محرومی۔ حیف صد حیف!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس کی تذکیر کو تانیث اور تانیث کو تذکیر سے بے محابہ بدلا جا رہا ہے مگر بزعم خود گمان یہ غالب ہے کہ اس رشک حور بہشتی کے گیسوئے پرپیچ و خم کے خم نکال کر آراستہ کیا جا رہا ہے۔ ہائے رے تمہاری دوستی۔ اب آسمان سے دشمنی کی شکایت کیا کیجیے؟ بلکہ الٹا ہو یہ رہا ہے کہ ہماری ان کارستانیوں کی بدولت اس نوبہار ناز کا چہرۂ گلگوں جو فردوسِ غمزے سے گلستان بنا ہوا تھا۔ اپنی رعنائیوں سے محروم ہو چلا ہے۔

آئیے۔ فی الوقت اس کے محاوروں کے ساتھ جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اور تذکیر و تانیث کے تعلق سے مجرمانہ غفلت برتی جا رہی ہے۔ اس کا جائزہ لیا جائے۔ دنیا کی ہر زبان کا ایک کلیہ ہے کہ اس کے محاوروں کو زیر و زبر کے فرق سے بھی نہیں بدلا جا سکتا اور نہ اس کی تصحیح کی جا سکتی ہے نہ دوسری زبان میں۔ اگر ایسا کیا گیا تو بات ہی ختم ہو جائے گی اور زبان کا زیاں ہوگا اور بقول محمد حسین ... [illegible]

رہی ہو تو انگریزی کہیں کہتے ہیں Raining cats and dogs" اس محاورے کا ذرا اردو میں ترجمہ کیجیے اور دیکھیے کہ کیا بن جاتا ہے۔ اسی طرح انگریزی میں کوئی بات کہنی ہو یا کوئی اعلان کرنا ہو تو اس طرح بولا جاتا ہے۔ "I am going to tell you" یعنی میں آپ سے کہوں گا یا کہنے والا ہوں اور اگر اس کا ترجمہ کر دیا جائے تو وہ یوں ہوگا "میں آپ سے کہنے جا رہا ہوں"۔ یہ انگریزی زبان کا محاورہ ہے جس کا اظہار اس طرح ہوگا۔ لیکن ہم بلا سوچے سمجھے جوں کا توں ترجمہ کر ڈالیں تو صورتِ حال بڑی مضحکہ خیز ہو جائے گی۔

یہاں کی دوسری زبان والوں نے بلا تکلف اس کو ہضم کر لیا اور دھڑلے سے ٹی وی، اور ریڈیو، اور جلسوں، سبھاؤں میں ڈکاریں لے رہے ہیں۔ اس بات سے ہم کو کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔؟

مجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

لیکن آپ پر ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے کہ خود بھی اس کڑوی گولی کو بڑے بڑے منہ بنا کر اپنے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش میں لگے ہی ہیں پھنسا بیٹھے۔

زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ٹی۔وی پر ایک مشاعرہ پیش کیا جا رہا تھا جس کی نظامت اردو کے ایک قابل استاد (پروفیسر) کر رہے تھے۔ وقفہ وقفہ سے شعرا کو پیش کرنے کا ان کا یہ انداز ملاحظہ فرمائیے!

"اب جس شاعر کو میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے جا رہا ہوں" اور "اب میں جس کو دعوتِ سخن دینے جا رہا ہوں" یا للعجب!؟ نہ کہیں جا رہے ہیں آپ اور نہ کہیں آئیں گے اپنی جگہ پر موجود رہنے کے باوجود اپنے آنے اور جانے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے کیا دوسروں کے سکے کی کھوٹ گئی ہیں؟ اور ہم نہیں دیکھ سکتے کہ قطب اپنی جگہ سے تل برابر بھی نہیں سرکا مگر دعویٰ اپنے جنبش کا کر رہا ہے تم ہی انصاف کرو اور خدا لگتی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ سیدھی سادی بات تھی۔ اب جس شاعر کو میں دعوتِ سخن دے رہا ہوں یا دینے والا ہوں" کہا جاتا تو قیامت نہ آ جاتی اور نہ سر پر آسمان ٹوٹ پڑتا۔ نہیں۔ وہ جلال ٹوپی والوں کی سنت کی اتباع میں دہلی کو دہلی، حیدرآباد کو حیدرآباد اور ناشتے کو نشتہ، عشائیہ کو ڈنر کہتے ہی میں اپنی عافیت محفوظ معلوم ہوتی ہے تو اس کا کیا علاج؟

ہائے رے ہمارے ذہن کی غلامی اور اس کی غلام زبان۔ انگریز تو چلے گئے مگر ان کی سنت کمبل بن کر اب تک ہم سے لپٹی ہوئی ہے۔ دیکھیے ہم خود بھی کب اپنے آپ کو اس کمبل سے چھڑانا چاہتے ہیں۔

بات وہ جو پائیں میں چھپے

محاوروں کو تبدیل نہ کیے جانے کے کلیہ کے تعلق سے اپنا ایک دلچسپ تجربہ بطور واقعہ آپ کو سناتا ہوں ایک مرتبہ پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی (مرحوم) میرے بزرگ دوست میرے پاس تشریف رکھتے تھے۔ دو تین احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے اور آغا صاحب کی قلعہ معلیٰ والی بیگماتی زبان کی گل افشانیوں سے محظوظ ہو رہے تھے کہ ایک موقع پر دورانِ گفتگو میں ایک محاورہ کا استعمال یوں کیا۔

"سب گڑھے میں یا فصیل پر" جس کو سن کر آغا صاحب چونک اٹھے اور ہاتھ اٹھا کر اپنے مخصوص دل فریب انداز میں یوں گویا ہوئے۔

"نہ بیٹا نہ" یوں نہ کہہ۔ تجھے کون حق حاصل ہے کہ زبان کو لنگڑا کرے اور اس کے محاوروں پر یوں ڈاکہ ڈالے۔ وہ بات یوں ہے "سب گڑھے میں یا سفیل پر" اگر بجائے سفیل کے تو نے فصیل کہہ دیا تو محاورہ ختم اور جامع مسجد والی سیڑھیوں کی بولی کا لطف غارت ہو گیا۔

نجھے فرمانے لگے، ایک اور محاورے کی تصحیح کرکے لوگ
رح بولتے ہیں۔ تمھارے منہ پر لعنت کے توے
ں رہے ہیں۔ یہاں "لعنت" درست نہیں ہے یہ
ردو قلعہ کی مغلانیوں کی ایجاد کردہ ہے جو اس کو
ادا کیا کرتی تھیں۔ "تمھارے منہ پر نالت کے توے
ں رہے ہیں۔"

اردو خواندگی کے اس قحطِ عظیم میں اب صرف
ا رات اور رسائل ہی ایک سب سے موثر ذریعہ رہ
ۓ ہیں، کہ ان کو پڑھ کر لوگ اپنی زبان کی نوک پلک
ست کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی آوے کا آوا ہی ٹیڑھا
یا ہے۔ تذکیر و تانیث کے فرق کو اکثر و بیشتر نظر انداز
یا جاتا ہے "کا" کی بجائے "کی" اور "کی" کے بجائے
غلبن، تو صداانے کے باوجود عام ہو گیا ہے۔ مثلاً
ر مذکر ہے مگر بلا تکلف اس کو بالالتزام ہمیشہ مونث
لکھا جاتا ہے۔ جیسے کل فلاں بزرگ "کی مزار پر
رگل چڑھائی گئی۔ یا پھر یہ فلاں صاحب کی مزار
۔ اگر اخبارات اور رسائل ہی ایسی زبان سکھلانے
ں تو پھر نتیجہ معلوم.....!

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

واقعی مزار مونث ہے تو پھر غالب اپنی بات یوں بیان
تے:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں "مزار" ہوتی

میزان میں جو حرف آخر ہے۔ اپنی بات کو تول لیجیے
اوقات عیاں ہو جائے گی۔ ہاں اگر مزار کے بجائے
ہو تو بات درست ہو گی

اس طرح "عوام" کے ساتھ بھی یہ ظلم ہوتا ہے۔
اس کو مونث یوں لکھا جاتا ہے مثلاً ہندوستان کی عوام
مقابلتاً باشعور ہیں"۔ اور "فلاں ملک کی عوام نے حکومت کا
تختہ الٹ دیا۔ حالاں کہ یہاں "کی" کے بجائے "کے"
کا محل ہے۔ کہاں تک اس بوالعجبی ہائے بدعت کو گنوایا
جائے۔ حالاں کہ یہاں "کی" کے بجائے "کے" کا محل
ہے۔ کہاں تک اس بوالعجبی ہائے بدعت کو گنوایا جائے۔
اس طرح تو اچھی خاصی ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔
اور آپ پڑھتے پڑھتے تھک کر چیخ اٹھیں گے۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

اخبارات اور رسائل والوں سے یہ التماس ہے کہ وہ ان باتوں
کی جانب بطورِ خاص اپنی توجہ مبذول کریں اور اس عروسِ
نو بہارِ اردو کے رشکِ ماہ و انجم حسن کو داغ داغ ہونے
سے بچائیں۔

رات اور زلف کا یہ افسانہ
قصہ کوتہ، بڑی کہانی ہے

طالب حسین مہدی، ناگپور

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد

ایک شمارہ ــــــ بہ یاد شوکت تھانوی

جلد: ۲۸
شمارہ: ۷
جولائی ۱۹۹۵ء

سرورق: تصویر شوکت تھانوی
کتابت: محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

قیمت فی پرچہ: ۹ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد
فون آفس: 595716 ★ فون رہائش: 521064

شوکتِ نظر (فہرست)


شوکت تھانوی

(آپ بیتی)

شوکت تھانوی

ولادت : ۲ر فروری ۱۹۰۴ء
وفات : ۴ر مئی ۱۹۶۳ء

ائے پیدائش :

کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانے میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب
رایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی قطب
ستا ہے تو دوسرا احمق۔ ذرا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مراری اور کہاں ایک ادبی مداری۔
نہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی ہے۔ کرشن کا استھان بندرابن ضلع متھرا جنم بھومی بنتا ہے کس
؟ .... شوکت تھانوی کی۔

یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے۔ بندرابن کے کوتوال صاحب منشی صدیق
مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی۔
نے ارمان کی تکمیل کے لیے پھر چار سال تک بے چارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲ر فروری ۱۹۰۴ء
صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی اور اولاد نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود پُر ہو
ا۔ سپاہیوں نے گولے داغے، بھانڈوں نے ڈھول بجائے۔ نٹوں نے کرتب دکھائے۔ ایک ہفتہ
۔ چہل پہل رہی۔ عقیقہ کے دن نام رکھا گیا۔ محمد عمر اور تاریخی نام نکلا تسمیر احمد۔ یہ ان ہی حضرت کا نام ہے
با نام ہے۔ جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے۔ تھانوی اس لیے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بندرابن کے
نہ میں ہوئی بلکہ اس لیے کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اس خاندان کا وطن ہے۔

بے ہوشی کی باتیں :

پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچہ ہوش نہ سنبھالے دراصل اس کی ذاتی
گی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہوتی ہے جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا

جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔ سنتا ہے کہ میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گزرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہو جاتی تھی۔ مال حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا۔ ضعفِ معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ شاعری اور فاقہ مستی میں چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کارفرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو:

نہ دانہ نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں اب کیا کروں

ہوش کی باتیں:

میں نے ہوش کی آنکھیں یعنی بھوپال کے ایک عالی شان مکان میں کھولیں۔ بڑے لاڑ پیار میں زندگی کے دن گزر رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہیے اور آخر کار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے۔ معلوم ہوتا تھا بندر کا تماشا شروع کریں گے۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹنا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والد صاحب نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر صاحب آئے جو چوتھے دن اس لیے نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ اب ایک اور ماسٹر آئے جن کا اسم مبارک میر امجد علی تھا۔ چھوٹا سا قد ناک کی پھنگی پر رو پہلی عینک، منہ میں کچھ دانت اور باقی پان، جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا ہوا قطب نما۔ عالم یہ تھا ہمارے ان ماسٹر صاحب کا کہ تشریف لائے، اندر سے ان کے لیے چائے آ گئی، وہ نوش فرمائی، پان آ گئے، وہ منہ میں رکھ لیے اور پھر کتاب سامنے رکھ کر ہم لگے جھومنے اور وہ لگے اونگھنے۔ کبھی کبھی اونگھتے اونگھتے ایک نعرہ بلند کیا آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا اور پھر اونگھ گئے۔ اگر وہ بالکل سو گئے تو ہم نے ان کے چہرے پر روشنائی سے گل بوٹے بنا دیئے اور اگر وہ جاگتے رہے تو ہم سلیٹ پر مرغے کی تصویر بناتے رہے اور منہ سے بکتے رہے آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ مگر فلک کج رفتار کو ہمارا یہ سوراخ پسند نہ آیا اور ایک دن والد صاحب نے نہایت حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ صاحب زادے اپنے ماسٹر سے آنکھ مچولی دھپ کھیل رہے ہیں۔ چناں چہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن ہٹا دیئے گئے۔

الگزنڈرا ہائی اسکول:

والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے میں آ کر آخر ہمارا داخلہ الگزنڈرا ہائی اسکول کے جماعت اطفال میں کرا دیا اب ہم سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے ساتھ الیگزنڈرا ہائی اسکول جانے لگے۔ دوپہر کو ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا تھا اور ہم پڑھتے کیا تھے اسکول میں بھی گڑیاں کھیلتے تھے مگر ترقی زبردستی ہمارے سر منڈھی گئی اور ہم کو درجۂ اول میں جانا پڑا۔۔ الگزنڈرا ہائی اسکول میں ہمارا بہت کم زمانہ گزرا۔ اس لیے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے (۱۹۱۴ء) میں بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنؤ آ گئے۔ البتہ اتنا ہم کو اب بھی یاد ہے کہ اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ

ٹیوشنوں کی تمام جدوجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو ہو رہی تھی۔ بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار 'پھول' منگوانا شروع کر دیا اور یہ اخبار ہماری تمام اسکول کی کتابوں سے زیادہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا مضمون نگار ہو گئے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔ دراصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے۔

لکھنؤ: لکھنؤ بھی ہم دراصل اس وقت آئے جب ہوش تو آ چکا تھا مگر آدمیت سرے سے غائب تھی اور اگر سچ پوچھیے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس سلسلہ میں بلا کے بے پروا، والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی لاکھ چاہا کہ لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں مگر بس کا تھا ہی چلا کہ حضرت مولانا عین القضاۃؒ کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا جہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی مگر پڑھائی سے زیادہ بڑے لڑکوں کی بُری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کیے۔

ماسٹر پیارے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیویٹ ٹیوٹر تھے۔ بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ بہر صورت ان بے چارے نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طرح ختم کرا ہی دی اور حساب وغیرہ میں اپنے نزدیک ہم کو چالو کر دیا۔ باقی مضامین بھی ضمنی طور پر ہمارے مطالعہ سے وہ بے چارے گزارتے رہے لیکن یہ امید ان کو بھی غالباً نہ ہو سکی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔

آمد نامہ:

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آکر یا یوں ہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لیے آمد نامہ خریدا گیا۔ اور گھر کے باہر میدان میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ آمد۔ آمدند۔ آمدی۔ آمدید۔ آمدم۔ آمدیم کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا۔ پہلا دن۔ پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت ہی پہلی ہی منزل پر استقبال کے لیے آئی ہوئی ہے۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا۔ اس پہلے سبق کو سننے کے لیے اور یہاں آثار یہ تھے کہ صاحبزادے کورے کے کورے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں۔ آخر طوفان اٹھا۔ برق و رعد۔ زلزلہ۔ انہدام۔ چیخیں۔ گرجے۔ حقے کی چلم الٹ گئی۔ آمد نامے کے پرزے فضا میں ایمان کی آزادی کے پرچم اڑانے لگے۔ اور ہم ہندوستان کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منتظر سرنگوں بیٹھے تھے کہ یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجوڑا ہے تو تہذیب کا کرتہ مع بنیان ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا گریبان ہمارے برہنہ جسم پر۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پاکر ممانی صاحبہ گھر سے باہر نکل آئیں۔ والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے ٹھہر سے گئے۔

اور گھٹنے نے دم ہلانا چھوڑ دی۔ ماموں صاحب نے آکر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچایا۔

مولانا عبدالرحیم کلیم:

آمد نامہ کے سلسلے میں جو عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی والد صاحب کو اطمینان نہ ہوا اور آپ نے عذاب کے ایک مستقل فرشتے یعنی مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا کریں۔ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کیا۔ کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دل نشین تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لیے چند ہی دنوں میں آسان ہو گئی۔

خالو مدّن اور ان کا لال اسکول: محض فارسی کے بل بوتے پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی۔ والدہ صاحبہ کو سب سے زیادہ فکر تو یہ تھی کہ صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر ان کے کام ان کی ایک بہن آئیں جن کے شوہر ایک مڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا سید محمد رضا اور کہلاتے تھے مدّن۔ ہمارے ان خالو مدن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا۔ کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا جائزہ لیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "فش" یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمارا داخلہ ان کے اسکول میں کر دیا جائے۔ ان کے اسکول کا نام لال اسکول تھا۔ ہم باوجود نالائق محض ہونے کے چھٹے درجے میں لے لیے گئے اور پہلے ہی سال نہ جانے کیونکر چوتھا درجہ پاس کر کے پانچویں میں آگئے۔ تیسرے سال چھٹا درجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا۔ اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں ہوا۔ پڑھنا وڑھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا۔ البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے۔ والد صاحب کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو گھر ہی پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بے بی آسٹن قسم کے بزرگ تشریف لائے۔ پتہ چلا کہ یہ حضرت ہمارے اتالیق مقرر ہوئے ہیں۔ جونپور کے رہنے والے ہیں۔ اسم مبارک بخشش احمد ہے، غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے اور چوبیس گھنٹے ہم پر نازل رہیں گے۔ چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور ہماری تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا ذہین ہے (ہم) کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا۔ ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی اس دکھتی ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا اور اب وہ بے پرواہ طالب علم جو تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھتا تھا۔ تعلیم کو اپنا دل چسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا۔

پہلی غزل:

اب ایک بات پیدا ہو گئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دل چسپی اور موزونیت کا احساس خود ہم کو ہونے لگا تھا۔ ایک آدھ مصرع کبھی کبھی خود موزوں کر لیتے تھے مگر وہ ہوتا تھا ایسا تھرڈ کلاس کہ اس کو سنانے یا کہنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ہمارے شاعر ہونے کی اطلاع ہمارے ہم جماعتوں کو بھی ہو چکی تھی اور ہم ان کو اپنا ہی کلام جھوم جھوم کر

نہایت خوش آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور ان پر اپنا رعب جماتے تھے۔ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسی زمانے میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لائے اور ان کو ہمارے اتالیق ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان کو کسی طرح یقین نہ آیا۔ آپ نے امتحان لینے کے لیے ہم کو ایک مصرع دیا:

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

اور فرمایا کہ اس پر مصرع لگاؤ۔ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرع تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرع پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا:

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غم ناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا تو ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی بھی اتنا خوش نہ ہوا تھا اور خود بھی خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ دن بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر لکھنؤ کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیجی کہ اس کو چھاپ دیا جائے۔ اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحیتیں ایک مرتبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے اور اپنے غزلوں کے "ترچھی نظر" کا دفتر پاٹ دیا۔ غزلیں کہنے کے علاوہ ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چناں چہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر ترچھی نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من و عن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ پہلے شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے اور ہماری ادبی زندگی کا یہ بچپن نہایت طوفان خیز امنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔

شادی کا ذکر: تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔ اماں بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو اور ہمارے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجیے۔ لڑکی کو رخصت نہ کیجیے گا۔ تاوقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جائے یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کر لے اور اس کے علاوہ ان پر ایسا زور ڈالا کہ وہ بے چارے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی کے عقد پر راضی ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۴ء کا ہے۔ چناں چہ دن تاریخ سب طے ہو جانے کے بعد نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ رحمت منزل احاطہ خان فقیر محمد خاں پہنچے اور ہمارے خسر صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔

علی گڑھ جوبلی: اسی زمانے میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے۔ چناں چہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آ جاؤ اور جوبلی کے جشن کی سیر کرو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ جوبلی میں اچھے بہت دوست مل گئے۔ امین سلونوی، وصل بلگرامی، پیرزادہ فدا حسین، ساغر نظامی اور مولانا سیماب وغیرہ۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس خرید لیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ سال بھر تک گھر پر ہی پوری تیاری کی

کے بعد ایک دم علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ جب ہم پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے تو یکایک بیمار پڑ گئے۔ بخار آیا اور جم کر رہ گیا۔ تقریباً پچیس تیس انجکشن ہوئے ہوں گے کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ سال خراب ہو گیا۔

پہلا مزاحیہ مضمون: تعلیم تو گویا اب ختم ہو چکی تھی اور اب ہم بالکل ہوم ممبر تھے۔ خالص انشاپرداز اس زمانے میں رسالہ "ترچھی نظر" جو امین سلونوی کی ادارت میں آکر رسالہ "نظر" بن چکا تھا اور اس کا ترچھاپن نکالا جا چکا تھا ہمارے انسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" کے نام سے لکھ دیا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا حالاں کہ تھا بڑا عوام پسند قسم کا سطحی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اسی طرز کے لیے اپنے قلم کو مخصوص کر دو۔

رسالہ حسنِ ادب: اب تک ہم صرف رسالہ ترچھی نظر اور اس کے بعد اسی کی اصلاحی شکل رسالہ نظر واقف تھے مگر ایک دن پاٹا نالہ کے بازار سے گزر رہے تھے کہ دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا رسالہ حسنِ ادب لکھنؤ اور سامنے ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ کرتا اتارے پاجامہ پہنے، سر منڈا ہوا اور کانوں میں اکھاڑے کی مٹی لگی ہوئی ہے۔ صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی ہیں پہلوان قسم کے۔ آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے، خود ہی مدیر تھے، خود ہی کاتب تھے، خود ہی پریس مین اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا۔ اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی۔ یہ ملک التحریر اس لیے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پر ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گزر چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنے لیے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور اخبار سرپنچ کی کتابت فرماتے ہیں۔

رخصتی: ۱۹۲۶ء کے اوائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی تھی کہ کسی طرح رخصتی کی رسم پوری کر دی جائے اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس آجائیں مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ یہ تقریب عمل میں آئے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا اور جب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو مارے عقل مندی کے ہم نے نہ معلوم ان کو خط میں کیا لکھ دیا کہ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ آخر ہم نے پھر ایک نہایت مہذب قسم کا معذرت نامہ لکھا۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصتی کی تاریخ طے ہو گئی اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے مین پوری گئے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی اور ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے۔

اب ہم خود اپنی نظر میں کچھ وقیع، کچھ بھاری بھرکم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے تھے حالاں کہ غیر ذمہ داریوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں آ چکی تھی اور ہم محض رئیس تھے۔ نہ کمانے کی فکر نہ کچھ مستقبل کی تدبیر۔

لیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو تھی کہ معلوم نہیں خرچ کیوں کر چلتا ہے۔ والد صاحب کی معمولی
شن کے علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی جو روپیہ جمع تھا وہ بھی خرچ ہو چکا تھا مگر ان میں سے کوئی بات
ں ہمارے ذہن میں نہ آسکی۔ ہم تو اپنے شوہرانہ ٹھاٹھ میں تھے کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا
تھا جس میں معطر معطر ایک دلہن شام کو پھولوں سے لدی اور دن کو بھیگے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملا
کرتی تھی۔

ہاڑ ٹوٹ پڑا: ہم ان ہی رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے
ں گورکھپور کا مشاعرہ۔ آج یہ اردو کانفرنس ہے تو کل وہ مناظرہ۔ آج یہاں نظم پڑھنا ہے تو کل وہاں پیپر
سننا ہے کہ یکایک والد صاحب پھر بیمار پڑے۔ پھر آپریشن ہوا۔ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور
ل جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر ہی پر کیپٹن نگم سے آپریشن کرایا مگر مرض کسی طرح قابو میں نہ آسکا۔ وقت آچکا
تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۸ء کو روح پرواز کر گئی۔ اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام عیش یہ تمام بے فکریاں اور رنگینیاں
ب دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

کرِ معاش: والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت
کے ساتھ ہوا۔ ہم نے ماموں صاحب سے کہا کہ مجھ کو خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے
س لے کر چلیے۔ وہ ہم لوگوں کے عزیز بھی ہیں اور آج کل روزنامہ "ہمدم" کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ وہ اگر
ھ کو ہمدم کے عملہ میں لے لیں گے تو میں معمولی سے معمولی تنخواہ پر بھی کام شروع کر دوں گا۔ ماموں صاحب
ں باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کے پاس گئے۔ سید
حب نے پوری عزیزدارانہ ہمدردی فرمائی اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر
سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے۔ فی الحال تنخواہ ۴۰ روپیہ
ہوا رہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔

دوسرے دن ہم روزنامہ ہمدم کے دفتر پہنچے۔ سید جالب دہلوی کا پتہ پوچھ کر ایک کمرے میں
نچے۔ جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اور ایک پانچویں بزرگ ایک
ہدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر تقریباً جھکے ہوئے نہایت تیزی سے
لکھنے میں مصروف تھے۔ ہم دیر تک آپ کی توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ
کے بعد زیر قلم صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک نعرہ بلند کیا۔ "لے جاؤ" اور دزدیدہ نظروں سے اس خاکسار کو دیکھا
نے خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کا خط پیش کیا جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو پہلے تو بیٹھنے کا
اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنا دی۔
یا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ سید صاحب نے اپنی تقریر ختم کرکے کچھ لکھا اور آواز دی "لے جاؤ"۔
تر کا ایک ملازم آیا تو اس کو وہ پرچہ دے کر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔

قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی آپ نے بغیر کچھ دریافت کیے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لیے ایک علیحدہ میز لگا دی۔ ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کیے اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا۔ خبروں کے ترجمے میں تو کوئی خاص بات نہ تھی مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیج دیے جاتے تھے اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔ شروع شروع میں حال یہ تھا کہ ہمارے شذرات کا شاید ہی کوئی لفظ سید صاحب کی سرخ روشنائی سے بچتا ہو مگر رفتہ رفتہ قلل حام کم ہوتا گیا۔

سید صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی لکھا کیجیے۔ لہٰذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلے میں بڑے خوش نصیب ثابت ہوئے کہ سید صاحب جن کے متعلق تمام عملہ کو شکایت تھی کہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے! "دو دو باتیں" دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

سودیشی ریل:

ابھی ہم ہمدم ہی میں تھے اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے۔ مختلف رسالوں کے لیے لکھا کرتے تھے اور زیادہ تر فکاہی چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ خیال لاہور کے سالنامہ ۱۹۳۲ء کے لیے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ "سودیشی ریل" کے نام سے لکھا۔ شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھیے وہی ہم کو خط لکھ رہا ہے۔ بہت سے مقامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے اس کو نقل کیا۔ ہندی، گجراتی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شفیع صاحب کوئی بزرگ ہیں۔ انھوں نے اس کا انگریزی ترجمہ ولایت کے گلوب نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانے نے ہم کو مزاح نگاروں میں باقاعدہ طریقہ پر شامل کر دیا بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ شوکت تھانوی کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ان کا افسانہ سودیشی ریل ہے۔

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھیے وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھ دو اور تو اور خود ایڈیٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصہ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی، مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا کہ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے بلکہ اس کے آگے کچھ اور مانگ رہے ہیں۔

اودھ اخبار:

ہمدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ہم کو اطلاع ملی کہ روزنامہ "اودھ" اخبار کے لیے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔

ہم اودھ اخبار کے دفتر پہنچے اور سید نورالحسن صاحب سے ملے۔ اسی دن ہم اس اخبار کے باوا آدم کے عملہ
رت میں آگئے۔

اخبار سرپنچ کا اجرا: نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زنانہ رسالہ حریم کے نام
نکال رہے تھے۔ اس رسالہ کے عملۂ ادارت میں شوکت دلہن کا نام بھی تھا اور رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ
لکھتے رہتے تھے۔ نسیم صاحب سے جو تعلقات قائم ہو چکے تھے وہ کسی طرح برادرانہ تعلقات سے کم نہ تھے
دیا ہمارے دوستوں میں امین سلونوی اور نسیم انہونوی ہی دو ایسے تھے جن پر ہر طرح پورا بھروسہ ہو سکتا
۔ ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ ہم نے
ر کا نام "سرپنچ" تجویز کر دیا اور تھوڑی ہی دیر میں امین آباد پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری
تیار ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہم ارباب ثلاثہ کا اخبار سرپنچ نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوب صورت
ورق کے ساتھ نکلا۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا نام تھا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی اور
نٹ پروپرائٹر نسیم انہونوی۔ کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔

رفیع احمد خاں: ان حضرات کو اکثر مشاعروں میں صفِ سامعین کی زینت بنے ہم پہلے ہی دیکھ
تھے۔ اس کے علاوہ امین سلونوی صاحب کے رسالہ نظر کے ایڈیٹوریل بورڈ میں آپ کا نام نامی'' گرامی
ز اب تک آپ سے براہ راست ملاقات نہ تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک مشاعرے سے
وجہ طویل ہو چلا جا رہا تھا دو تین آدمی چپکے سے فرار ہوئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد
صاحب تھے۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سواری مل جائے تو گھر تک پہنچ جائیں۔ اس
عرے کی صدارت متین الدین صاحب ایڈووکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ یکایک خاں صاحب نے دیکھا
ن کار غالباً ان کو واپس لے جانے کے لیے آ رہی تھی۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔
ر نے کار روک لی تو آپ نے پوچھا "متین صاحب کی گاڑی ہے نا۔ اس نے کہا" جی ہاں" کہنے لگے"
چلو امین آباد" اور ہم سے کہا۔ متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل
ے گی" ڈرائیور نے اب کوئی [illegible] بھی سوال نہ کیا اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خان صاحب
نہیں کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ڈرائیور سے کہا۔ اچھا اب جاؤ [illegible] دکان بند تھی۔ ڈرائیور [illegible] چلا گیا۔
ن صاحب تو ہنسی سے بے قرار ہو کر کہنے لگے " یہ آخری [illegible] قسم خدا کی حاصل مشاعرہ ہے کہ کہہ دینا
ن بند تھی" اس وقت چار بجے رات کو دکان کے بند ہونے کی وہ لاجواب رہی ہے کہ متین صاحب بھی داد
دیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شرارت کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوا
دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ قطعاً مہمل ہے اور اس وقت تک کہ [illegible] ساتھ پیش
ا۔ ہر چند کہ خان صاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہم کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی
مگر خاں صاحب چاہتے تھے کہ ان کے وہ مشاغل بھی تمک نہ ہوں اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔
کے لیے شام کے وقت چوک جانا دفتر کی حاضری سے کسی طرح کم ضروری نہ تھا اور تقاضا یہ تھا کہ تم بھی
ہم ان کے ساتھ بلا ناغہ چوک جانے لگے۔

تاش و بازیاں: رفیع احمد خاں صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپیے لگاکر تاش کھیلا کرتے تھے ایک دن خان صاحب ہم کو بھی تاش کھلانے میں کامیاب ہوگئے۔ قاعدہ ہے کہ نیا جواری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چناں چہ پہلے ہی دن دو روپیے کا سرمایہ لگاکر ہم نے ۲۴ روپیے جیتے۔ اب کیا تھا چسکا پڑگیا۔ روز خان صاحب کے ہاں پہنچ رہے ہیں اور روز کھیل رہے ہیں۔ جب عادت اچھی طرح پڑچکی تو اب ہار شروع ہوئی اور ہار بھی ایسا کہ طبیعت ہری ہوگئی۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کرکے اٹھتے تھے مالی نقصان، بیوی سے خراب تعلقات، اخلاقی خسارہ ان سب پر اس وقت نظر جاتی تھی اور ہم گویا عہد کرلیتے تھے کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے مگر دوسرے ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا داجہ تل نے کان پکڑ لیے اور ہم کو وہیں پہنچادیا جہاں نہ جانے کا عزم فیصلہ کرچکے تھے۔

روزنامہ ہند:

اخبار سرپنچ بھی نکل رہا تھا۔ اودھ اخبار میں ہم ملازم بھی تھے اور تاشوں کی یہ قیامت خیز مصروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ تیج دہلی کے ایڈیٹر سکام لال ورما نے لکھنؤ آکر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کی اور ہند کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لیے ڈیکلریشن داخل کردیا۔ ورما صاحب نے امین سلونوی کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے عملہ میں آجانے کی دعوت دی۔ تنخواہ بھی اودھ اخبار سے زیادہ تھی۔ ہم نے روزنامہ ہند کی دعوت کو منظور کرلیا۔ اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف ہوگئے۔ ہم کو اخبار کا نائٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کے نو بجے دفتر جاتے تھے۔ صبح چار پانچ بجے تک کام کرتے تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے دن کو تھوڑی دیر کے لیے دفتر جانا پڑتا تھا مگر یہ تھوڑی دیر اکثر اس قدر طول کھینچ جاتی تھی کہ چوبیس گھنٹے کی مسلسل ڈیوٹی کی نوبت آجاتی مگر اب ہم کو اطمینان تھا ایک تو یہ کہ تاشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے یہ اطمینان ہوچلا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا کہ کہیں اس قدر شدید محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑجائے۔ اخبار واقعی شاندار تھا اور انتظامات اس قدر ٹھاٹھ کے تھے کہ ہم کو اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کررہے ہیں اور اخبار نویسی جس کو کہتے ہیں وہ دراصل اب شروع ہوئی ہے۔ مگر لمیٹڈ کمپنی تو تھی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی۔ اس کا چوراہے پر ٹوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصہ کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند۔ تنخواہ غائب اور ہم گھر پر۔

بک ڈپو:

اپنی بک ڈپو قائم کرنے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل چکی تھیں۔ موج تبسم اور بحر تبسم، نسیم انہونوی صاحب نے چھاپی تھیں۔ سیلاب تبسم، صدیق بک ڈپو نے۔ لہٰذا چوتھا مجموعہ طوفان تبسم اور گہرستان ہم نے خود چھاپے۔ ان کی اشاعت کے بعد اگر ہم آدمیت سے کام لیتے تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہوسکتا تھا اور اب تک جو پچیس تیس کتابیں دوسرے ناشروں نے چھاپی ہیں وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لیے کوئی مستقل سامان کردیتے مگر یہاں تو مقولہ یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ شرافت اسی وقت تک

تھی جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا اور جہاں جیب میں کچھ آیا بس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو۔ گر جائے۔ کوئی چرا لے، کوئی مانگ لے مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے۔

پھر وہی تاش اور وہی ہم:

ہم کوئی بے کار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے۔ مقصد تو روپیہ لگانے سے تھا۔ اور منافع کمانے سے لہٰذا ہم نے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا۔ اس کاروبار کا نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے یعنی یا تو دام نیا رے ورنہ ہارے تو بھاگے نا نیارے۔

روزنامہ حق:

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا۔ "حق" عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادر محترم علی اختر صاحب عباسی ہمارے لیے اجنبی نہ تھے۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا کہ اپنے اخبار کو روزنامہ بنا دیں۔ اخبار کی پوری اسکیم سننے کے بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کر لیا کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان ہمیں نے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا تھا۔ لکھ دیا کریں گے۔ تنخواہ طے ہو ہی چکی تھی۔ ہم حق کے دفتر پہنچ گئے اور ملازمت قبول کر لی۔ خبروں کا ترجمہ۔ حق و باطل کا لکھنا اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہوا۔ اس کے علاوہ ہر روز ایک قطعہ شاعر حق کے نام لکھا کرتے تھے۔

رسالہ کائنات:

عبدالرؤف صاحب عباسی نے کچھ دن بعد طے کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے اور اس کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے۔ اس کا نام کائنات تجویز ہوا۔ پہلا نمبر اس قدر شاندار تھا کہ جو دیکھتا تھا داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ پانچ یا چھ نمبروں کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔

طوفان:

۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۸ء کو ہم نے طوفان کا نمونہ کا پرچہ نکالا اور اعلان کر دیا کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہوگی۔ بیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے، خریدار فراہم کرنے ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے اور یکم جون کو باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی۔ طوفان نے زمین داروں کی ہر ممکن وکالت کی مگر اس کا کوئی سلطنت کو طوفان، طوفان بن کر آیا اور طوفان بن کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم پھر گھر کے رئیس تھے۔

لکھنؤ: اس بے کاری کے زمانے میں ریڈیو کی وجہ سے نہایت باکار رہنا پڑتا تھا۔ برادرم ملک حبیب احمد صاحب اسٹیشن ڈائرکٹر پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم ہی سے گانا بھی گواتے۔ وہ تو کہیے کہ خیریت گزری کہ ہم موسیقی کے سلسلہ میں نہایت نااہل نکلے۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ اور تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن میں پاٹ دیا گیا۔ ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا کہ آخر تنخواہ کی کیا ضرورت ہے مگر ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہی روشنی مطلع ہمارے لیے بلا بننے والی ہے۔ چنانچہ ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے غالباً یہ اندازہ کیا ہوگا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت روپیہ گھسیٹ لے جائے گا کیوں نہ اس کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو ریڈیو اسٹیشن ملازمت کا حکم آ گیا ہے اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو۔ یوں تو ہر روز ریڈیو ہی میں وقت بسر ہوتا تھا۔ اب گویا پابندی تھی۔ جو تفریح تھی وہ روزی بن گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو یہیں سے خیرباد کہا اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتدا گا بجا کر شروع کر دی۔ (ملخصہ)

فیملی پلاننگ

اے مرے بچّے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو
یاد رکھ پچھتائے گا تو میرے گھر پیدا نہ ہو
تجھ کو پیدائش کا حق تو ہے مگر پیدا نہ ہو
میں ترا احساں مانوں گا اگر پیدا نہ ہو
اے مرے بچّے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

ہم نے یہ مانا کہ پیدا ہو گیا کھائے گا کیا
گھر میں دانے ہی نہ پائے گا تو بھنوائے گا کیا
اس نکھٹو باپ سے مانگے گا کیا پائے گا کیا
دیکھ کہنا مان لے جانِ پدر پیدا نہ ہو
اے مرے بچّے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

یوں ہی تیرے بھائی بہنوں کی ہے گھر میں ریل پیل
بلبلاتے پھر رہے ہیں ہر طرف جو بے نکیل
میرے گھر کے ان چراغوں کو میسّر کب ہے تیل
بجھ کے رہ جائے گا تو بھی بھول کر پیدا نہ ہو
اے مرے بچّے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

پالتے ہیں ناز سے کچھ لوگ کتّے بلّیاں
دودھ وہ جتنا پئیں اور کھائیں جتنی روٹیاں
یہ فراغت اے مرے بچے تجھے حاصل کہاں
اُن کے گھر پیدا ہو اور بن کر بشر پیدا نہ ہو
اے مرے بچّے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

یوں ہی میں کپتان ہوں اولاد کی پوری ہے ٹیم
مفلسی میں ہو رہی ہے اور بھی حالت سقیم
اپنے زندہ باپ کا کہلائے گا تو بھی یتیم
بخش دے مجھ کو مرے نورِ نظر پیدا نہ ہو
اے مرے بچّے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو

شوکت تھانوی

ب

اب میں کیا کہوں ان پنڈت جی کو جنھوں نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ "ب" کا حرف تمھارے لیے نہایت نحس ہے۔ تمھاری موت کا خواہ کوئی بھی سبب ہو مگر وہ سبب ہوگا "ب" سے لہٰذا ہر اس چیز سے بچو جس کا نام "ب" سے شروع ہوتا ہے بظاہر تو یہ ایک حرف تھا مگر جب احتیاط شروع کی تو پتہ چلا کہ یہ "ب" اس قدر عالم گیر ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بجلی خواہ وہ بادل میں چمکے یا گھریلو روشنی کی صورت میں ہو، خوف ناک بن گئی۔ بندوق، بارود، بندر، بن مانس، بچھو وغیرہ تو خیر ویسی ہی بیہودہ چیزیں مگر بہن، بھائی اور بیوی تک سے جو شخص مطمئن نہ رہ سکے، بھتیجوں اور بھانجوں سے جس کو ہر وقت اندیشہ ہو، برفی ایسی مٹھائی نہ کھا سکے۔ گرمیوں میں برف سے پرہیز کرے۔ بھوپال اور بمبئی کے نام سے گھبرا کے اور کراچی پہنچ کر جس کو یہ خیال ستائے کہ یہ بھی تو بندرگاہ ہے۔ بائیسکل دیکھ کر جس کا خون خشک ہو جایا کرے اور سوتے سوتے جو شخص بستر الٹ کر کھرّی چارپائی پر لیٹنے کو ترجیح دے۔ [illegible] ایسے دوست اور بخاری ایسے کرم فرما سے الجھن ہو، بچوں کو دیکھ کر جسے وحشت ہونے لگے اور بالکونی جسے ترک کر دینا پڑے اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ دل کو جیسے یقین سا تھا کہ تاریخ وفات کسی سال میں بھی ہو مگر یہ طے ہے کہ دسمبر کی بارہ یا بیس یا بائیس ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ ہر سال کا بارھواں مہینہ ضرور ہوتا ہے اور ہر مہینے میں یہ تین تاریخیں ایسی ہوتی ہیں جو "ب" سے ہوں۔ سنہ باون لگے شروع ہوتے ہی صدقہ خیرات شروع ہوا اور یہ احتیاط رکھی گئی کہ صدقہ کے لیے بکرا نہ آئے مینڈھا آئے تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ دنبہ آجائے۔ اگر یہ صدقے قبول ہو گئے اور سنہ باون کا بارھواں مہینہ اور اس کی بارہ، بیس اور بائیس تین تاریخیں خیریت سے گزر گئیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ سنہ باسٹھ تک کی تو گویا مہلت مل

ہی جائے گی۔ مگر مہلت کیا خاک مل جائے گی۔ ہجری سنہ کے بارھویں مہینے میں بھی یہ تین تاریخیں تو پڑتی ہی رہتی ہیں اور بکرمی سمت کی تو ہر تاریخ خطرناک ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اس "ب" سے بچ کر کہاں جائے۔ اب آپ کو یقین نہ آئے گا۔ ہر سال عید تو خیر عید ہوتی ہے مزے سے گزر جاتی ہے مگر بقرعید قیامت بن کر آتی ہے۔ خدا خدا کر کے جب یہ تہوار گزرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پھر سے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر مگر اس "ب" سے بعض اوقات ایسی مڈبھیڑ ہوتی ہے کہ اب کیا عرض کیا جائے مثلاً حال ہی میں جو واقعہ ہوا ہے وہ ذرا ملاحظہ فرمایئے یہ تو میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ سنہ بارہ مجھ پہ بھاری ہے۔

دسمبر یعنی اس سال کا بارھواں مہینہ تو خیر ابھی دور ہے مگر میں ہر مہینے بارہ بیس اور بائیس تاریخ کو روزہ رکھ لیتا ہوں، احتیاطاً اور ذرا نماز بھی علی الحساب پڑھنے لگتا ہوں۔ اس کے علاوہ ہر دن اور ہر رات کے بارہ بجے ذرا ہوشیار سا ہو جایا کرتا ہوں۔ گزشتہ اپریل میں یوم اقبال اطراف ملک میں منایا گیا۔ خیریت یہ ہے کہ یوم اقبال اکیس تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ یعنی دو خطرناک تاریخوں کے بیچ بیچ، بہرحال مجھ کو اکیس تاریخ پر ذاتی طور پر خاص اعتراض نہیں ہے مگر چوں کہ تمام اطراف ملک کے لیے ایک ہی تاریخ ناکافی ہے۔ لہذا تصادم کے خوف سے لوگ مختلف تاریخوں میں بھی یوم اقبال منایا کرتے ہیں۔ چناں چہ کچھ نوجوان دعوتی رقعے لے کر میرے پاس آئے معلوم ہوا کہ بزم ادب بادامی باغ کے کارکن ہیں۔ جس کے زیر اہتمام بیس اپریل کو یوم اقبال کے سلسلے میں مشاعرہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ دعوت نامہ دیکھ کر خون ہی تو خشک ہو گیا "ب" کی بھرمار بھی، بزم ادب میں "ب" بادامی میں "ب" باغ "ب" پھر بیس تاریخ۔ دل نے کہا برخوردار یہ موت کا پروانہ ہے۔ گئے رہنیں کہ قصہ پاک ہوا سینکڑوں بہانے کر کے ان کو ٹال دیا۔ بائیس اپریل کو بھی ایک مشاعرہ تھا۔ اس سے بھی نجات حاصل کر کے مگر چوبیس تاریخ کو ایک تقریب محفوظ نظر آئی۔ چناں چہ شرکت کا وعدہ کر لیا تعلیم کے باہر جانا تھا کہ تاریخ چونکہ محفوظ قسم کی تھی لہذا روانگی کے انتظامات مکمل کر لیے۔ ایک معمولی سی احتیاط ضرور کی کہ جو صاحب مدعو کرنے آئے تھے جب وہ لینے کو آئے تو ان سے عرض کر دیا کہ صاحب میں اصولاً بس میں سفر نہیں کرتا یا موٹر کا انتظام کر لیجیے۔ یا ریل سے چلیں گے۔ وہ ریل کے چلنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اب یہ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ریل کا وقت بارہ بج کر بیس منٹ تھا۔ ظاہر ہے یہ ریل بھی ایک قسم کی بس ہی ہوئی۔ موٹر کی ان کے بجٹ میں گنجائش نہ تھی اور نہ یہ بات آسانی سے ان کو سمجھائی جاتی تھی کہ بارہ بج کر بیس منٹ پر روانہ ہونے والی ٹرین سیدھی عدم آباد جاتی ہے۔ سوال یہ تھا کہ اب آخر کریں تو کیا کریں۔ ارادہ کیا کہ اختلاج قلب کا ایک شدید دورہ فوراً تصنیف کیا جائے تاکہ یہ صاحب خود ہی نہ لے جائیں مگر دورہ شروع ہی ہوا تھا کہ وہ صاحب حکیم بن گئے۔ ایک نعرہ بلند کیا، ارے بھائی کوئی ہے فوراً بید مشک اور برف کا انتظام کیا جائے۔ لیجیے یک نہ شد، دو شد بید مشک اور برف۔ زہر اور وہ بھی آتشہ نسخے کے دونوں اجزا میں "ب"۔ فوراً اس دورے کو ملتوی کرنا پڑا اور ان سے عرض کیا کہ میں ٹھیک ہو گیا ہوں مگر اس حالت میں فوراً سفر پہ روانہ ہونا

مناسب نہیں ہے وہ بھی آدمی معقول نکلے۔ ٹائم ٹیبل دیکھ کر بولے مناسب ہے۔ دوسری گاڑی دو بج کر پندرہ منٹ پر جاتی ہے۔ لہٰذا اس ٹرین سے روانہ ہو گئے اور جب گاڑی چل دی تو وہ ٹریجڈی شروع ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اب تک تو کچھ رسمی تکلفات کی وجہ سے کچھ اختلاج کے دورے کی وجہ سے ان حضرت سے تفصیلی گفتگو ہی نہ ہوئی تھی۔ اب جو ٹرین میں اطمینان سے بیٹھے تو .... ان حضرت سے کہا:

معاف کیجیے گا۔ میں نے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ جناب کا اسم مبارک کیا ہے؛

وہ کھیسیں نکال کر بولے "بندے کو بشیر بیگ کہتے ہیں"۔

ایک دم جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ بشیر اور پھر بیگ۔ سفر میں ایک چھوڑ دو "ب" ساتھ ہیں یہاں یہ احتیاط کہ بیگ یا بکس یا بستر تک ساتھ نہیں لیا تھا کیا معلوم تھا کہ بستر اور بیگ کے بجائے بشیر بیگ مل جائیں گے۔ گھبرا کر پوچھا اور تخلص کیا فرماتے ہیں جناب" خیال آیا کہ تخلص ہی کے سہارے یہ سفر طے کر لیں گے۔ ان حضرت نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا "بسمل کہتے ہیں خاکسار کو"۔

جی چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچ لیں یعنی بدتمیزی ملاحظہ ہو کر تخلص تک آپ کو "ب" کے علاوہ کوئی نہ ملا بے وقوف کہیں کا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ضرور سفر آخرت ہے اور یہ شخص جس کے ایک ہی نام میں تین "ب" موجود ہیں یقیناً ملک الموت ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بقر عید کے دن ہر مہینے کی بارہ، بیس اور بائیس تاریخوں کو یا ہر روز کے بارہ بجے اور ہر رات کے بارہ بجے طاری ہوا کرتی ہے۔ ان حضرت کو میرے محسوسات کی کیا خبر آپ نے میری دلچسپی کے لیے اپنے بیگ سے تاش نکال کر میرے سامنے رکھ دیے اور نہایت بے تکلفی سے بولے "رمی جانتے ہیں آپ"

اب میں ان سے کیا کہتا کہ تاش کا شوق پنڈت جی نے جس دن سے دیکھا ہے ایسا چھوٹا ہے جیسے کبھی تاش کھیلتے ہی نہ تھے۔ اب یہ بادل پتوں والا خوف ناک کھیل کون کھیلے۔ میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے ان کو دوسری باتوں میں لگانا چاہا "آپ غالباً اس طرف کے رہنے والے تو نہیں ہیں"۔

وہ تاش کے پتے پھیراتے ہوئے بولے "جی نہیں میں تو پاکستان بننے کے بعد حاضر ہوا ہوں ورنہ غریب خانہ تو بانس بریلی ہے"۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ غریب خانہ بھی اس بے ہودہ نے چھانٹ کر وہاں کا رکھا ہے۔ جہاں ایک چھوڑ دو "ب" ہوں یہ شخص ضرور آج کوئی حادثہ کرائے گا۔ ارادہ کیا کہ اب کافر ہو جو اس سے بات بھی کرے مگر اس کا کیا علاج کہ وہ حضرت خود ہی بولے۔

ویسے زیادہ تر رہنے کا اتفاق ہوا ہے بسواں"۔

گھبرا کر عرض کیا "یہاں جناب کا کیا شغل ہے؟"

نہایت مسکین صورت بنا کر کہا "بے کاری"۔

دیکھیے کتنا محفوظ سوال تھا مگر کس قدر تشویش انگیز جواب دیا ہے۔ اس نامراد نے مشاغل میں بہت کم ایسے ہوں گے جو "ب" سے شروع ہوتے ہوں تاوقتیکہ آدمی بدمعاشی، بندر والا۔ بندوقچی۔ بہروپیہ۔ بساطی۔ بکر قصاب، برق اندازہ وغیرہ ہو یا پھر بیرسٹر ہو "ب" والا پیشہ ڈھونڈ کر بتانا آسان

کام نہیں ہے۔ اب تو یہ بھی پوچھنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ ہجرت سے پہلے جناب کیا شوق فرماتے تھے کہ پیچھے وہ کہہ دیں کہ ہیڈ ماسٹر تھا میں، تو میں ان کا کیا کرلوں گا۔ میں نے دراصل ان سے ڈر کر اپنی توجہ باہر کے مناظر کی طرف مبذول کردی اور کھڑکی سے باہر منہ نکال کر ان حضرت سے اپنے نزدیک محفوظ اب وہ لاکھ کچھ کہیں میں ہوں)۔ ہوں ہاں۔ نہیں میں مختصر جواب دیتا اور ان کو ٹالتا رہا۔ آخر وہ نہایت ... سے میری ہی سیٹ پر آکر بولے:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

بدمعاشی دیکھی آپ نے غالب کا شعر بھی وہ چھانٹا ہے جو "ب" سے شروع ہوتا ہے جیسے اس شخص نے چوڑھ مقرر کرلی ہے۔ میں نے ان حضرت سے کہا بات یہ ہے کہ میں کچھ شعر کہنا چاہتا ہوں آپ کے مشاعرے کی طرح میں۔"

کہنے لگے: صاحب طرح تو بہت شگفتہ ہے ع

میں نے دامن جسے سمجھا تھا گریباں نکلا

مگر اس زمین کو تو غالب ختم کرگیا۔ یہ شعر کہہ کر کہا:

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پھر "ب" والا شعر، شعر اچھا ہے تو ہوا کرے۔ کس کام کا وہ شعر جو "ب" سے شروع ہوا ہے۔ کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح سے طبیعت اچاٹ ہوکر رہ گئی اور میں نے گھبرا کر کہا "دوسری طرح بھی تو ہے"
وہ کہنے لگے جی ہاں دوسرا مصرعہ ہے (۲)

"ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے"

اور میرا دل دھک سے رہ گیا اب یہ غالب کا شعر پڑھتے ہیں کہ:

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

مگر شکر ہے کہ ان کو یہ شعر پھر پڑھنے کا موقع نہ ملا اور ایک اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہی ہوئی تھی کہ وہ بولے: "یہاں کی بالائی بہت مشہور ہے دیکھیے ابھی کھلاتا ہوں"

حالاں کہ اس نامعقول کو واقعی کھلانا ہوتی تو "ملائی" کہتا "بالائی" نہ کہتا۔ میں اس کو یہ تو نہ کہ میں نے ہمیشہ "بالائی" کو ملائی سمجھ کر کھایا ہے مگر وہ ملائی کو بالائی کہہ کر میرے لیے خطرناک بنا بہر حال میں نے عذر کر دیا کہ میں یہ چیز نہیں کھاتا اور وہ خود نہایت بدتمیزی سے سچ مچ کی "ملائی" کھا اور محض مجھ سے بچانے کے لیے اس کو "بالائی" کہتا جا رہا تھا مگر جب اس نے دام دیتے ہوئے بارہ آنے دیے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بالائی نہ سہی تھی تو بارہ آنے کی یہ تو بالائی تھی جس شخص نے باپ خدا سمجھا ہو۔ بیٹے اور بیٹی کو ہمیشہ لڑکا اور لڑکی مانا ہو وہ ذرا سی بالائی پر اپنے اس دیرینہ اعتبار کو کیوں

زبان کر دیتا۔ بہر حال خدا خدا کر کے اس اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہو رہی تھی کہ یہ حضرت ایک انگلی اٹھا کر
جیسے وہ دیکھیے بارہ سنگھا کاش ان کو معلوم ہوتا کہ وہ خود بھی مجھے بارہ سنگھے ہی نظر آ رہے تھے۔ خیر یہاں
تک تو سب کچھ برداشت کیا مگر ہوش تو اس وقت اڑے ہیں جب ان حضرت نے بر سبیل تذکرہ فرمایا اس مشاعرے
کے لیے بارہ دری سے بہتر مقام مشکل ہی سے مل سکتا تھا اور بارگاہ سجائی گئی ہے کہ باید و شاید۔ ایک تو بارہ دری
میں مشاعرے دوسرے اس میں بارگاہ سجائی گئی ہے اور وہ بھی ایسی کہ باید و شاید، نہیں صاحب یہ مشاعرہ
زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ جہنم میں گیا مشاعرہ اور لعنت ہے اس شاعری کے شوق پر جان ہے تو جہان ہے شکر
ہے کہ راہ فرار بھی مل گئی۔ اگلے ہی اسٹیشن پر لاہور آنے والی گاڑی سے میل ہوتا تھا کر میں ٹہلنے کو نکلا۔ دور تک
نکل گیا۔ اس گاڑی تک آ گیا جو لاہور کے لیے رینگ رہی تھی اور جست کر کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ کھڑکی
سے گردن نکال کر دیکھا کہ بارہ سنگھا اس ٹرین کی طرف دوڑ رہا تھا چند کہیں کا۔

اگر میں وزیر ہوتا

شوکت تھانوی

لوگو مجھے سلام کرو میں وزیر ہوں
گردن کے ساتھ خود بھی جھکو میں وزیر ہوں

گردن میں ہار ڈال دو میں جھک سکوں اگر
نعرے بھی کچھ بلند کرو میں وزیر ہوں

تم ہاتھوں ہاتھ لو مجھے دورے پہ آؤں جب
موٹر کے ساتھ ساتھ چلو میں وزیر ہوں

لکھے ہیں شاعروں نے قصائد مرے لیے
ایک آدھ نظم تم بھی کہو میں وزیر ہوں

جو مجھ سے کہنے آؤ خبردار مت کہو
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سنو میں وزیر ہوں

معذور ہوں میں اپنی وزارت سے بے طرح
تم طرح دار مجھ کو کہو میں وزیر ہوں

بے شک ہے برہمی سی مری گفتگو کے بیچ
لیکن اسے ادب سے سنو میں وزیر ہوں

میں وہ نہیں کہ یوسف بے کارواں پھروں
میرا جلوس لے کے چلو میں وزیر ہوں

اخبار والو سوچ سمجھ کر کرو سوال
"بھلا شیشہ میرے منھ نہ لگو" میں وزیر ہوں

مجھ سے قرابتوں کو بس اب بھول جاؤ تم
اے میرے بھائی بند گدھو میں وزیر ہوں

مجھ کو تو مل گئی ہے وزارت کی زندگی
مرتے ہو تم تو جاؤ مرو میں وزیر ہوں

چنانچہ

میں ہوں ان کا، ہوں ان کے در پہ چنار
ہے دشمن مرا ان کا گھر بھر چنار

نگاہِ کرم غیر پر اب ہے ان
میں اب گول کرتا ہوں بستر چنار

جو بدلی وزارت تو پھر کیا کروں
میں بنتا نہیں ہوں منسٹر چنان

جھکا دی تھی گردن یونہی میں نے ر
وہ سچ مچ اٹھا لائے خنجر چنان

وہ تھا سنگدل اس کو سمجھا نہ میں
پڑے عقل پر میری پتھر چنان

شوکت تھانوی

سودیشی ریل

دن بھر کے تھکے ماندے بھی تھے اور رات کو سفر بھی درپیش تھا مگر "بندے ماترم" کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کو بھی ضد ہے کہ خدا چاہے جو بھی حال ہو، بیمار ہوں، کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں یا اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ بھائی "ابھی آتے ہیں" اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ، داڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے ہوئے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بینڈ کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا، اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف، اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف تھے یا سامنے اس لیے مشکل تھا کہ ان کو خود قرار نہیں تھا۔ وہ تخت جس پر کھڑے ہوئے وہ گھوم رہے تھے مجمع کے وسط میں تھا اور تمام مجمع کا رُخ تخت کی طرف۔ کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی کی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح اور کبھی بالکل نہیں، ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے، ہاں ایک بات یہ بھی تھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچاتے ہیں اتر دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملہ میں ذرا گھاٹے میں تھے۔ پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں، کبھی نثر میں، کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر، کبھی اِدھر مڑ کر کبھی اُدھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے۔

"بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں — تجاویز منظور ہوں اور شرمندہ عمل نہ بنیں — سرگرمیاں — اب تیار ہو جاؤ — ہوشیار رہو — کہ تم کو — ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینا ہے — اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ہے — (دوسری طرف گھوم گئے) خواب غفلت سے بیداری کا وقت —

دو گھنٹے میں۔ ہم نے صرف یہی سُنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اِس سے زیادہ انھوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی ہو تو ہم کیا کریں ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ر دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو ڈھکیلتے خود دھکّے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے دکان پر سے حقّے کا نیچا لیا اور خیال اُٹھے پر لادیں اور گھر پہنچ گئے، اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقّہ بھرا، آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاطاً شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لکچر کا خیال اور ۳۱ر دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ر دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے اگر آج ۳۱ر دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے۔ نہ بدیشی گارڈ ہوتا، نہ فارن ڈرائیور نہ اینگلو انڈین کا علٰحدہ درجہ ہوتا ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے چاہے تھرڈ میں بیٹھتے چاہے فرسٹ میں، ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے ـــــ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایک دم سے کان میں پھر وہی "بندے ماترم" کی آواز آئی اور ہم ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں جھنڈیوں اور گلیوں سے سجا ہوا "بندے ماترم" کے نعروں سے آسمان اور زمین کو ٹکراتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا "بھائی یہ کیا ہے؟" جواب ملا کہ کیا سو رہے تھے۔ "خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟" ہم نے پھر بڑا سا منہ کھول کر کہا سوراج جواب ملا ہاں سوراج سمجھ لیجیے کہ دلیں ہی تھا واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو، ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔" پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑی ہیں، ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر والله کمال ہوا کہ سوراج مل گیا ہوگا۔ حالانکہ ابھی تک جلوس نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے۔ لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوشخبری سنائی تو شک دُور ہوا اور ایک آزادانہ خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے دس بجا دیئے یعنی ہم کو خود اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں اور ہم نے ہی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا :۔

"بابوجی! کانپور کا سکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے۔"

بابوجی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر نہایت اطمینان سے فرمانے لگے۔ "ایک بات کہہ دیں یا مول تول؟"

میں سمجھا بابوجی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابوجی نے پھر کہا۔ "جناب سُنئیے۔ تین روپے ہوں گے لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجیے۔"

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا:

"جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنہ تو کرایہ ہے آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیئے ہے، کانپور کا سکنڈ کلاس۔"

بابوجی نے ذرا ترش رو ہوکر جواب دیا:۔

"جناب والا! میں بہرہ نہیں ہوں۔ سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیئے مگر ای کے تین روپے ہوئے کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجیئے ورنہ جانے دیجیئے۔"

میں:۔ "مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا۔؟"

بابو! "کل کی بات کل کے ساتھ آج دیش ہمارا ہے۔ ہم کو سوراج مل گیا ہے"۔

میں:۔ یہ کہیئے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجیئے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

بابو:۔ "لائیے روپے۔ اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجیئے اور ٹکٹ لے لیجیئے"۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آرہی تھی اور کچھ غصہ آرہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی۔ ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا۔ آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا۔ مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی:

"سنیئے تو جناب، ٹھہریئے تو جناب، دیکھیئے تو جناب، اچھا دو روپے دے دیجیئے، آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ آنہ دیجیئے۔ اب وہ بھی نہ دیجیئے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے، لائیے ڈیڑھ روپیہ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کر سکتے، ہمارا نقصان ہو رہا ہے"۔

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا گردن ترچھی کرکے وہیں سے کہہ دیا۔ "ایک روپیہ دیں گے، ایک روپیہ کو دینا ہو تو دے دو"۔

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا انہوں نے کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے۔ "لائیے صاحب لائیے، لوہنی کا وقت ہے۔ آپ ہی کے ہاتھوں لوہنی کرنا ہے"۔

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کچھ چھپا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر "درجہ دوم کانپور" لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی جو غالباً ان کے دستخط تھے ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے۔ ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے۔

جناب والا رات کو سوراجیہ ملا ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب، آپ تو سفر کیجیئے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیئے"۔

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ نہ فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ سمجھ کر کہ یا تو یہ روپیہ گیا۔

یا ہم تیرہ آنہ کے نفع میں رہے، اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔
اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجو یہ معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے اسٹیشن کو قلا بازی کھلا دی ہے یا الٹا باندھ کر ٹانگ دیا ہے۔ وہی گھڑی تھی وہی مگر دس بجنے میں ہنوز پچیس منٹ باقی تھے۔ حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا۔ اسباب کے ٹھیلے پر پان اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ قلیوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچ بمشکل تمام ایک قلی ملا لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب اٹھانے کو کہا اس نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب د
"اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟"
"معاف کیجئے گا غلطی ہوئی" کہہ کر لوپ ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب ک پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ "یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے، پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر صورت کے اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہوگا؟ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اور دو مرتبہ کر کے سکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے اسبا سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیئے کہ یہی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ پیلہ۔ تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے۔ لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا ہمسانا ہیں مالوم" یہ خالص سودیشی ریل کے سکنڈ کلاس کے معزز پسنجر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہیں تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک اندازہ لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف ہم نے گھبرا کر پوچھا:
"لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا"؟
جواب ملا کہ جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے"۔
ہم نے پھر پوچھا: لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا"؟
جواب ملا کہ ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کیا خالی ریل
اب ہم بالکل راضی بہ رضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ دعا تھی، اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہو غرض کہ کبھی اپنے ڈبہ میں بیٹھ کر کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حد نظر تک کر کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہٹی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، صرف ہم ٹہلتے رہے۔
خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بہ آواز بلند چیخنا شروع کیا: بیٹھنے والے مسافروں بیٹھو گاڑی چھ
ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈھا پھر مغرب کی طرف مگر دونوں طرف انجن نہ
اور ہماری بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا

کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی غیر ذمہ دار شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر صاحب تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے۔ بہرحال بغیر کچھ سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجہ میں گھس آئے، ان سے ہم نے لاکھ کہا "ارے سکنڈ کلاس ہے، اماں سکنڈ کلاس ہے بھائی سکنڈ کلاس ہے، مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے، ہم ٹکس لیا ہے، خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہیں مگر گارڈ طرار نظر نہ آیا مجبوراً انہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر سے عرض کر دیا جس کا جواب انہوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا۔ "بیٹھئے جناب سب ہندوستانی برابر ہیں، سب بھائی ہیں، سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں، کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس کے فرق کو بھول جائیے، سب کو برابر کا سمجھئے، جائیے تشریف رکھیئے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی۔" ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجہ میں آ گئے جہاں ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہوگا یا غسل خانے میں جگہ ملے گی مجبوراً اپنا ٹرنک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے بھی ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا۔ گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے۔ لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا معلوم ہوا کہ ابھی سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے۔ وہ کانپور جائیں گے! انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا، گاڑی چھوٹتی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی۔ معلوم نہیں وہ کون سا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی۔ اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا اس لیے کہ کفرانِ نعمت کا الزام بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے "بندے ماترم" کے فلک شگاف نعرے سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی تشریف لے آئے! ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنھوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا، اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سکریٹری ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سُن سُن کرنے لگا۔ ایک کھدر پوش زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیئے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کُرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سُرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سُرخ جھنڈی ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ گھنٹہ بھر سے سیٹی بجا رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے۔

ڈرائیور نے بھی ان کے بے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا۔ "جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں۔ میرا کیا قصور ہے دو گھنٹے سے للّو فائرمین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پل سے لے آنا۔ دو چار پیسے کم زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مر رہا۔ اب بتایئے میرا کیا قصور ہے"؟

گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بُری بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بیچارہ تو تھوڑی بھوسا بھی چل سکتا ہے مگر یہ اتنا بھی کام نہیں دے سکتا۔ اب بتایئے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سکریٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا۔ مگر ایک کوئلہ کے نہ ہونے سے سب کا ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹے بعد للّو فائرمین کوئلہ کی گٹھڑی لیے یہ کہتا ہوا آ پہنچا:

"آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ لو آنہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں، راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ دن سے منگا لیا کرو"۔

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی گاڑی چلی ہی تھی کہ ایک شور مچ گیا۔ "روکو، روکو، گارڈ صاحب رہ گئے۔ گاڑی رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہوگی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے ڈرائیور سے چلّا چلّا کر پوچھنا شروع کیا۔ "ارے لائن کلیر بھی لیا تھا۔۔۔ لائن کلیر"۔ ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا۔ "لے لیا تھا۔ لے لیا تھا۔۔۔ گارڈ صاحب نے جب اپنی طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا۔ "اچھا تو چھوڑو گاڑی میں سیٹی بجاتا ہوں"۔ گاڑی پھر چلی۔ اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لیے کہ اس سے زیادہ تیز شاید خود چل لیتے اور اگر ابھی شرط باندھ کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہونچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر نہ رہا گیا اور اپنے ایک شریک سفر سے پوچھا "کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس"۔ وہ پہلے ہی سے کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے، غصہ ہم پر اتارا، اور جھڑک کر فرمانے لگے۔ "میاں خدا کا شکر کرو کہ یہ گاڑی ہی ہے، تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو"۔ ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی۔ مگر سیر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستے کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے جاتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی اسی رفتار سے چل کر گاڑی اسوہی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہو گیا کہ اسٹیشن ماسٹر اسوہی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ :۔

"جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن گاڑی لانے کا حق کون سا تھا۔؟"

ڈرائیور : "جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا۔!"

اسٹیشن ماسٹر :۔ ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا۔ دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا۔

مجھ سے گستاخی کی۔
اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر آتی۔

ڈرائیور :۔ دیکھیے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجیے۔ لوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے یہاں سے نکالنے والے، جیسے ہم انہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے، خوب کیا تم گاڑی لائے۔ اب اس ضد پر تو ہزار مرتبہ لائیں گے، دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر :۔ "دیکھیے گارڈ صاحب منع کر لیجیے اس کو، کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے! افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں۔ میں چھاتی پر چڑھ کر خون پی لیتا ہوں۔"

گارڈ :۔ جانے بھی دو اماں جانے بھی دو، ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو، اماں تم ہی ہٹ جاؤ، بھائی تم ہی ہٹ جاؤ۔ ارے ارے چھوڑو بھی، ہٹو بھی، سنو تو سہی، ارے یار سنو تو۔"

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے، لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنا شروع کر دیئے اور تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھتے کھڑے ہو گئے۔ بہ مشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بے چارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:۔

"گارڈ صاحب، اے گارڈ صاحب! اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹری پر آ رہی ہے غضب ہو گیا!"

گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کیا:۔

مسافر جلدی اترو جلدی اترو، گاڑی لڑتی ہے، گاڑی لڑتی ہے جلدی اترو!"

سب مسافر گڑبڑا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پر آ پڑا میں ایک دم سے چونک پڑا۔ حقہ کی نے میرے منہ پر آ کر گری تھی۔ حقہ جل چکا تھا آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس لیے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

مدوجزرِ صحافت

شوکت تھانوی

مسدس

گھٹا سر پہ اخبار کی چھا رہی ہے
صحافت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
کتابت پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آرہی ہے
ابھی اور لکھیں حضور ایک کالم
ابھی سے نہ گائیں کہ آجائے بالم

کہیں زلزلہ کوئی آیا ہی ہوگا
کسی نے کوئی شور اٹھایا ہی ہوگا
کسی نے تو زور آزمایا ہی ہوگا
کسی نے کسی کو ستایا ہی ہوگا
دکھا دیں اسی میں فسانہ ط
اسی کو تو کہتے ہیں اخبار

ابھی سے نہ اپنے کو لوری سنائیں
ابھی اور خبریں ذرا اتر جائیں
پئیں چائے خود اور سب کو پلائیں
کہ سب مل کے اک دوسرے کو جگائیں
نمٹنے کا جلدی اگر ہے ارادہ
تو خبریں ہوں کم سرخیاں ہوں زیادہ

کہیں کوئی ہنگامہ برپا ہوا ہو
مشاہیر عالم میں کوئی مرا ہو
کسی رہ نما نے بیاں کچھ دیا ہو
ہے مطلب تو اس سے ہمارا بھلا ہو
کسی بات کا ہم بتنگڑ
اور اک موٹی تازی سی سرخی

خبر ڈھونڈھیے وہ جو چھ کالمی ہو
کہیں جنگ تھوڑی بہت چھڑ گئی ہو
کہیں ریل گاڑی کی ٹکر ہوئی ہو
ہے مطلب کہ تھوڑی بہت سنسنی ہو
صحافت کا اعجاز کچھ تو دکھا دیں
کسی رائی کو آپ پربت بنا دیں

روانی قلم کی ذرا تو دکھائیں
کہ ہو ختم کام اور کاپی لگائیں
بڑی رات آئی ہے اب گھر کو جائیں
کہ جو سو چکے ہیں انھیں بھی جگائیں
گریں اپنے بستر پہ بے ہوش
خبر سب کو دیں خود فراموش

شوکت تھانوی

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم ؟

ماشاءاللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا لیکن ریاض کا یہ حال تھا نہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا تا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تُل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز یں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں مل کر دی جاتی ہے۔ اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولاد کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا۔ لیکن سوال ہے کہ ریاض بے چارے اپنے لیے لد کا انتظام کیوں کر کرتے۔ ان کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں غم سے وہ واقف نہ تھے اس لیے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ چکی تھیں اور سال کو ان ہی کے ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا۔ لہٰذا کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سے جدا دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لیے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا ہی لیکن سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لیے کہ بہ حیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے ں تعزیت کے لیے جانا تھا ان سے اظہار ہمدردی کرنا تھا جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ ۔ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت ں آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق ییں۔ بہرحال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ متعدد مرتبہ لوگ

ہمارے پاس تعزیت کے لیے آچکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگرچہ کچھ کچھ جھجک تھی تو صرف اس لیے کہ خود ہم نے بہ نفس نفیس آج تک یہ رسم ادا کی تھی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جاتا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ لہٰذا ہم نے اللہ کا نام۔ لے کر اپنے ارادہ کو پختہ کرلیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دے کر یک جا کرنے شروع کردیئے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارا ہے .... صبر کیجیے .... جس کی چیز تھی اس نے لے لی۔
...... دنیا کا یہی دستور ہے .... مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے ....
کیا علیل ہوئے تھے .... ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے ...... آج وہ کل ہماری باری ہے
...... خدا بخشے عجیب، انسان تھے ..... دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہوگئے ......
کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے ....

"ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد ...... مگر صبر کیجیے ...... اب رونے سے کیا ہوتا ہے ..... ہر ایک پر یہ دن آنے والا ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا۔ ہر ایک خوش... کبھی نماز قضا نہیں کی ..... خدا نعم البدل دے گا ...... اپنے سینے کو سنبھالیے ...... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ...... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے .... بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں ..... ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن الٰہی عاقبت محمود گرداں ..... چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان نہ کرلے اس کے لیے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہر حال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کرلیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "اکسپرٹ" ہوگئے تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لیے جا رہے ہیں۔ راستے بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخر کار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہوگئی۔

"مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی واللہ دل کو یقین نہیں آتا۔ عجیب سانحہ ہے۔ عجیب حادثہ ہے خدا کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، نماز بھی قضا نہیں کی۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجیے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا ..... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جس کی چیز تھی اس نے لے لی۔ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد ..... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ روحیں آزاد نہ ہوں، جسم جو برباد نہ ہوں، ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن۔ مریں گے تو سانچے میں ڈھل جائیں گے ...... وہ تو جنت کے اک پھول تھے ..... حوروں کی گود میں پھول گئے، نمازی، پرہیز گار، خوش وضع، خوش اخلاق دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے لائق۔ پڑھے لکھے۔ فرخ خاندان

مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے۔ مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا، مٹی دینے میں شرکت کرتا۔ نماز جنازہ میں شریک ہو جاتا مگر افسوس کہ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ چلیے، اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔

ریاض کے دروازے پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خط لے جائیے" کی آواز دیں۔ لیکن یاد آگیا کہ موقع غم کا ہے۔ فوراً اپنا چہرہ اداس بنالیا اور مری ہوئی آواز سے پکارا۔ "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم"

انھوں نے اسی کے جواب میں "والے کم۔ اس سالام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا ہم تعزیت کے لیے آئے تھے لہذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جارہے تھے۔ لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے، جب اسی میں بڑی دیر ہوگئی تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ تو دو رو رہے جانے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں، مجبوراً ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہوگا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے ہیں بس بات شروع ہونے کی دیر تھی۔ لہذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ لہذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آکر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لیے آئے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بت بنے بیٹھے ہیں۔ لہذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سر نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"آپ کے والد ۔ ۔ ۔ ۔ پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آگیا تو عرض کیا۔

آپ کے والد ۔ ۔ ۔ ۔" ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ۔

"آپ کے والد ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے والد ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے والد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے کم بخت گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو۔ لہذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر ہم نے ہی سنائی ہے میں پھر خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیے۔ لہذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

"آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے، آپ کے والد مرحوم، مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے صبر کیجیے، اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد ..... آپ کے والد ..... آپ کے والد .... آپ کے والد ..... جس پہ گزری ہو یہ وہی جانے مگر اب نہ روئیے ..... جانے بھی دیجیے .... ہٹائیے بھی اس قصہ کو ..... آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا اور گردن جھکائے بیٹھا خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سن رہا تھا بلکہ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرے منہ کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:

"باپ بھی دنیا میں عجیب نعمت ہے۔ بہت سے بے چارے اس ارمان میں مرے جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا اور اس نے آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرہ پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو آ نہیں سکتے، مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچانا یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی، آج وہ کل ہماری باری ہے، ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ آتا اور بفرض محال یعنی کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی، نماز جنازہ تو ضرور ہوئی ہوگی۔"

ریاض نے منحنی آواز میں جواب دیا۔

جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔

میں۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دے گا اور قبر کا کیا ہوا ہوگا۔

ریاض: عیش باغ کے نئے پرچمن میں مناسب جگہ لے لی تھی۔

میں۔ ہاں واقعی اور تم بے چارے کیا کرتے تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہوں گے۔ دنیا سرائے فانی۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا اور بیماری کیا تھی؟

ریاض: ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے۔

میں۔ ہاں بڑی مہلک بیماری ہے، خدا سب کو محفوظ رکھے۔ ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا۔ کم بخت اب تو عالم گیر ہوتی جاتی ہے، غم کا پہاڑ پھٹ پڑا۔ بہت آگے گئے باقی جو بیٹھے ہیں۔ اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی!

ریاض: ایک تو میں ہی ہوں۔

میں: (جلدی سے) تم تو خیر ہو ہی مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں ارے ہاں کیا تعجب ہے؟

ریاض: جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے
میں: وہی مطلب ہے میرا۔ اور ان کی بیوہ کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟
ریاض: جی ہاں۔ میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش کے وقت ہی انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔
میں: ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ، صبر کیجیے۔ اور آپ کے والد ماجد کی ماشاءاللہ کیا عمر تھی؟
ریاض: سو سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے۔
میں: افسوس صد افسوس۔ ع حسرت ان غنچوں پہ ہے۔
ریاض نے مجھ کو کچھ اس نظر سے دیکھا جیسے میں دنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے مگر میں نے موثر انداز میں کہا۔
"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے۔
ریاض: جی ہاں اُن کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔
میں: ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے، ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی، ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن۔ خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟
ریاض: جی ہاں، اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔
میں: گھبرایئے نہیں، جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے، وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ عجب ذاتِ شریف تھے، مرحوم کبھی نماز قضا نہیں کی خود ان ہی کی قضا آگئی۔ ع
این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد
دنیا کا یہی دستور ہے، دنیا سرائے فانی ہے، ایک آتا ہے ایک جاتا ہے اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟
ریاض: جی ابھی تو نہیں ہوئی۔
میں: (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔
ریاض: اس کا یہ کون سا موقع ہے بھلا۔
میں: تو اب اور کون سا موقع آئے گا؟
ریاض: اب خوش ہونے والا کون ہے، جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہو گی شادی۔
میں: ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ تو ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے جس کی چیز تھی اس نے لے لی مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔
اگر مدد نہ تو اندیشہ تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ : ع

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بے چارے آخر کیا بیمار تھے یہی نا کہ بس قضا آگئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے ؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مر جائیں گے ! مگر خدا کی مصلحت اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے اب تم کو کون اس طرح چاہے گا، تمہارا محبت کرنے والا اٹھ گیا، تم یتیم ہو گئے۔ تم پر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا : ع

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں، تمام الفاظ ختم ہو چکے، کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں لیکن اگر انھوں نے بعد میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا کہ بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ مگر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑ دینا ہم نے کہا۔

"بھائی رونے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاءاللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیے۔

ریاض کی ہچکیاں سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ "اچھا بھائی اب اجازت دو۔"

ریاض کے یہاں سے اگر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیے تعزیت کے لیے روز چلا جایا کروں۔

افسانہ ما

شوکت تھانوی

میرے باسی افسانے پڑھنے والے میرے تازہ افسانے کا اکثر تقاضا کرتے رہتے ہیں تاکہ اس تازہ افسانے کو بھی باسی بنا کر اپنے تقاضے کو تازہ رکھیں اور میں ہمیشہ ان سے اس طرح کتراتا رہوں گویا میں ان کا مقروض ہوں اور واقعی مجھ کو بالکل اس طرح منہ چھپانا پڑتا ہے جیسے میں سچ مچ مقروض ہوں اور یہ سب تقاضا کرنے والے کابلی پٹھان ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ قرض اور مقروض اور تقاضے کا تصوّر میرے ذہن میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ ان تقاضا کرنے والوں سے میں بہانے، حیلے اور عذر بھی بالکل اسی طرح کرتا ہوں جس طرح مقروض شرفا تقاضا کرنے والے پٹھانوں سے عذر اور عذر لنگ کرتے ہیں کہ ان صاحبان میں سے کوئی صاحب نازل ہوئے اور مجھ کو دروازے کے باہر عین اس وقت گرفتار کیا جب میں ترکاری والے سے مٹر کی پھلیوں کی گرانی پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا تو ظاہر ہے کہ ان کو کمرہ کھول کر بٹھانا پڑتا ہے۔ سگریٹ کی ڈبیا کھول کر چولھے پر سے دیا سلائی کی ڈبیا لانا پڑتی ہے۔ گرمی ہو تو پانی کے لیے پوچھنا پڑتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے کم سے کم لیمونیڈ اور زیادہ سے زیادہ لیمن اسکوائش اور جاڑے کا موسم ہو تو چائے کے لیے نہ پوچھنا ایک افسانہ نگار کی وہ بد اخلاقی ہے کہ اس کے ادیب اور انشاپرداز ہونے پر شبہ ہو سکتا ہے۔ بہرحال ان تمام تمہیدی مدارج کے بعد وہ نوبت آتی ہے جس سے میرے نزدیک موت کا آنا زیادہ بہتر ہے۔ یعنی وہ حضرت فرماتے ہیں کہ "ہاں صاحب کوئی تازہ افسانہ؟" اور اب اِدھر سے وہ تمام معذرتیں پیش ہوتی ہیں جو صرف ایک مقروض اس خوفناک پٹھان کے سامنے پیش کر سکتا ہے جس سے اس نے قرض لیا ہو، کہ صاحب کیسا فسانہ اور کہاں کی فسانہ نگاری حال یہ ہے کہ سارا گھر اسپتال بنا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ کو آپ جانتے ہی ہیں قلب کی پرانی مریض ہیں آج کل تو خیر ہالٹوں کے رس کی بدولت دل ذرا ٹھہرا رہتا ہے مگر حال یہ ہے کہ گھڑی میں ماشہ گھڑی میں رتی۔ بڑی بچی کے عقل داڑھ نکل رہی ہے جس نے والدین کی عقل ٹھکانے نہیں چھوڑی ہے، سارا منہ سوج کر رہ گیا ہے اور درد کی وجہ سے ایک بیج زمین ہے تو ایک آسمان۔ کل ڈاکٹر شگاف دے گا تو عقل برآمد ہوگی ورنہ ڈاڑھ کی صورت ہے۔ منجھلا بچہ پتنگ اڑاتے میں کوٹھے سے گر کر زندہ بچ گیا ہے اور مارے ڈالتا ہے ہم لوگوں کو۔ ان بیماروں کو دیکھنے کے لیے دور اور قریب کے ایسے ایسے عزیز جوق در جوق چلے آ رہے ہیں کہ کل رات تو میں خود مجبوراً اپنی لکھنے کی میز پر سویا۔ ان حالات میں کون افسانہ لکھ سکتا ہے۔ اس ساری رام کہانی کے جواب میں اُدھر سے ایک دلربا تبسم اور پھر ایک نہایت غیر متعلق سی بات "قصہ یہ تھا قبلہ کہ چار مہینے کی غیر حاضری کے بعد اب کی ارادہ ہے کہ رسالے کا خاص نمبر نکال دیا جائے اور آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ کا افسانہ

اس میں نہ ہوا تو پھر وہ خاص نمبر کیا ہوا۔ آپ کے لیے یہ معمولی سی بات ہے کہ بس قلم لے کر بیٹھ جائیے اور گھسیٹ ایک چھوٹا سا افسانہ"

یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بڑے سے بڑا جرم بھی کر سکتا ہے اور اگر ضبط سے کام لے تو دماغ پر ناگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ یہ جو اطرافِ ملک میں جا بجا پاگل خانے ہیں ان میں زیادہ تر وہی لوگ جو ضبط کرتے کرتے آخر خود ضبط ہو کر رہ گئے ہیں اور بعض اوقات جب میں جیل روڈ کی طرف سے گزرتا ہوں تو کی چہار دیواری پر بڑی مانوس سی نگاہیں ڈالتا ہوں کہ شاید میرے تازہ افسانے مجھے یہاں تک لے آئیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ آخر یہ ایسی کونسی بات ہے جس کا میں نے خواہ مخواہ بتنگڑ بنا رکھا ہے۔ صاف کہ کوئی تازہ افسانے کا تقاضا کر رہا ہے تو کہہ دیجئے کہ نہیں ہے یا اگر ہے تو دے دیجئے۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ میں کتنا انسان واقع ہوا ہوں اور ان فرمائشوں اور تقاضوں کو رد کرنا میرے لیے کس حد تک ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ا کے علاوہ میرا ایک اور کام بھی ہے کہ میں بال بچوں کے لیے قلم کی چکی چلا کر کچھ حاصل کروں، ان کا پیٹ بھروں اور تن ـــــ اور یہ تقاضا کرنے والے زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا رسالہ یا اخبار فی الحال ابتدائی مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے صرف ادب کی خدمت کے شوق میں گھر پھونک تماشہ دیکھنے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کی تمام گفت گو کا حاصل صرف یہ کہ اگر معاوضہ پیش کرنے کی کبھی حیثیت ہوئی تو سب سے پہلے آپ کی خدمت کی جائے گی مگر فی الحال آپ ادب کی مثل اس کے کہ ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

بہ مشکل تمام افسانے کے ان قرق امینوں کو ایک تازہ غزل دے کر اس طرح ٹالا جاتا ہے جیسے تقاضا کرنے والے اصل کے بجائے سود دے کر رخصت کیا جاتا ہے اور خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے کہ ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

رہ گئے وہ تازہ افسانہ مانگنے والے جو افسانہ نگار کو بھی سڑک کا نل نہیں بلکہ اپنی ضروریات میں مبتلا ایک سمجھتے ہیں اور اس کی محنت کا معاوضہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے ان کے لیے تو دیدہ و دل فرشِ راہ رہا کرتا ہے کہ اس معاوضے کا پورا حق ادا کر دیا جائے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ہر وہ بات نہیں ہوا کرتی جس کے لیے انسان خصوصاً مجھے اپنا اندازہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر میرے حالات عموماً کچھ ناساز گار ہو ہی جاتے ہیں۔ وجہ کیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شاید میں نے کبھی کسی درویش منش کی در منظور کر دی ہے اور اس کے دل سے یہ بددعا نکل گئی ہے کہ جا بچہ تو بھی کبھی سکون سے افسانے نہ لکھ سکے گا

اس بددعا کا اثر دیکھ لیجیے کہ کل ہی ایک رسالے کے نہایت باحوصلہ مالک افسانہ مانگنے تشریف لائے افسانہ مانگنے سے پہلے ہی چیک بک نکال کر چیک کاٹ دیا کہ یہ حاضر ہے مگر افسانہ ہم کو جلدی چاہیئے۔ بس آ رنگ کا شاہکار ہو۔ جی چاہا کہ اس شریف اور واقعی نجیب الطرفین انسان کو اٹھا کر کلیجہ سے لگا لیں۔ مگر ان کی خود ان کے سلیقے کو بہت دور کر رکھا تھا۔ دوسرے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حضرت اس خلوص اور عقیدت سے یہ نہ کر سکے دھانوں پانی پڑا ہے، لہٰذا جذبات کو بمشکل دبا کر نہایت بے اعتنائی سے چیک میز پر گویا ڈال دیا۔ ا

وعدہ کرلیا کہ پرسوں تک افسانہ منگا لیجیے گا۔

آپ کو معلوم ہے چیک کے کیش کرانے اور کیش کرانے کے بعد کے واقعات میں کم سے کم ایک دن تو لگ ہی جاتا ہے اور جب تک چیک کیش نہ ہو دماغ میں افسانے کے پلاٹ کے لیے جگہ نہیں نکلتی۔ ضروریات کی فکر سے دماغ کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دن تو بنک اور بازار کے چکر میں نکل گیا۔ دوسرے دن کی ابتدا کچھ نحس ہوئی، گھر کی نہایت پرانی ملازمہ نے آکر جگایا اور ان کی صورت دیکھتے ہی کلیجہ دھک سے ہوگیا کہ خدا ہی خیر کرے۔ ان کی زیارت کے بعد دن بھر جو کچھ ہوسکتا ہے اس کا بارہا تجربہ کرچکے ہیں۔ ایک مرتبہ ان محترمہ کی صورت دیکھی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اسی دن والد صاحب کا انتقال ہوا اور زندگی بھر کے لیے یتیم بن گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان محترمہ نے پھر جگایا اور یقین جانیے کہ اسی دن دفتر کے ایک افسرِ اعلیٰ سے وہ تو تو میں میں ہوتی ہے کہ اگر وہ افسر واقعی شریف نہ ہوتا تو ملازمت ہی گئی تھی ہاتھ سے، مگر دو سال کے لیے ترقی بند ہوگئی۔ تیسری مرتبہ کا تجربہ یہ ہے کہ صبح اٹھ کر ان کا دیدار ہوگیا تھا، راستہ میں بائیسکل کا اگلا پہیہ ایسا نکلا ہے کہ اسپتال میں اس وقت ہوش آیا جب ایک نرس دوسری نرس کو سمجھا رہی تھی کہ یہ سرکس کا آدمی ہے۔ ایک پہیے کی بائیسکل پر کرتب دکھا رہا تھا کہ لاری سے ٹکرا گیا۔ مختصر یہ کہ آج ان محترمہ نے پھر جگایا کہ اٹھیے سرکار، یا لو آیا ہے وہ کہتا ہے کہ آغا جانی کی ساس کا انتقال ہوگیا ہے۔ یہ خبر بجائے خود کچھ کم نہ تھی ایک زندہ آدمی کے لیے اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کو کسی کے جنازے میں شرکت کرنے کی دھمکی صبح صبح دی گئی ہو۔ مگر ان محترمہ کو دیکھ کر دل کو کچھ یقین سا ہوگیا کہ شاید خود اپنے انتقال کے لیے بھی آج ہی کا دن مقرر ہو۔ اب ذرا اس دن کی روداد سن لیجیے آغا جانی کی ساس کی میت میں شرکت کی۔ قبرستان میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے اندر اوندھے منہ گرے اور چشمہ قبر کے اندر ہی رہ گیا۔ خدا غریقِ رحمت کرے بہت دنوں کا ساتھی تھا یہ چشمہ بھی۔ قبرستان سے واپسی پر تانگہ وہ ملا جس کا گھوڑا سودا کے گھوڑے کا بھائی تھا اور اپنے ماموں جان کی وضع کا سختی سے پابند۔ آدھ گھنٹے کا راستہ جب اس نام نہاد گھوڑے نے دو گھنٹے میں طے کیا اور گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ پر قلب کا ایک دورہ پڑ چکا ہے اور دوسرے کا شدید انتظار ہے۔ ان بیچاری کے قلب کی حالت واقعی یہ ہے کہ آغا جانی کی ساس کیا معنی کسی کی ساس بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہیں ان کے دل کی حالت دگرگوں ہوجاتی ہے۔ البتہ شکر یہ ہے کہ خود اپنی ساس کے انتقال کے وقت ذرا افاقہ رہا تھا۔ بہرحال اب دوڑنا پڑا مالٹوں کے لیے اور کچھ دوسری مفرح قلب معجونوں اور مربوں کے لیے۔ رات گئے تک مالٹوں کے رس نکالے گئے۔ بید مشک کے شربت بنائے گئے اور جب خدا خدا کرکے وہ بارہ بجے سو گئیں تو میز پر آئے۔ کاغذ نکالا، قلم میں روشنائی بھری، ٹیبل لیمپ یا غسل خانے کا بلب نکال کر لگایا اور اس کا پلگ لگا ہی رہے تھے کہ بھک سے ایک آواز آئی ؎

ایک شعلہ سا گرا شیشے سے پیمانے میں
وہ کرن پھوٹی اندھیرا ہوا میخانے میں

فیوز اڑ گیا۔ اب بتائیے کیا کیا جائے۔ یہ بھی تو پتہ نہیں کہ دیا سلائی کی ڈبیا کہاں رکھی ہے نیوز جوڑنے کا تار کہاں ہے! اختلاجی بیوی کو جگانا اور قیامت کو بیدار کرنا ایک ہی بات ہے۔ خود ہی دبے پاؤں ٹٹولتے ہوئے باورچی خانے میں پہنچے اور اندھیرے میں ٹٹول ہی رہے تھے کہ ایک چیخ فضا میں گونجی "ارے کون؟" لاحول ولاقوۃ یہ وہی مبارک و مسعود ملازمہ تھیں۔

جلدی سے کہا۔ "لا رہا ہوں۔ میں دیا سلائی کی ڈبیا ڈھونڈھ رہا ہوں۔" اوران محترمہ نے جرح شروع کر
لو اور سنو دیا سلائی کی ڈبیا جیسے میرے پلنگ ہی پر تو رکھی ہے۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ خود ہی ایک ہاتھ بڑھا کر
یں دیا سلائی کی ڈبیا بجا دی۔ میں بدستور صفائی پیش کر رہا تھا۔ "فیوز اُڑ گیا ہے نا" اندھیرے میں د
کی ڈبیا ڈھونڈھنا بھی تو مشکل ہے بغیر دیا سلائی کے۔ لاؤ مجھے دو"۔ اوران محترمہ نے ہاتھ بڑھا کر
ہی میں دیا سلائی کی ڈبیا میری ناک کو سنگھا دی۔ دیا سلائی کی تیلیاں جلا جلا کر فیوز کا تار ڈھونڈھا اور ایک
جلا کر اس کی روشنی میں فیوز جوڑا ہی تھا کہ گھڑی نے ساڑھے بارہ کا آدھا بجا دیا۔ پھر بھی میز پر آنا پڑا۔ اس ل
صبح وہ آنے والے تھے افسانہ لینے جن کے دیئے ہوئے چیک میں سے اب صرف چھ آنے باقی رہ گئے۔
مگر میز پر ٹیبل لیمپ لگانے میں پھر فیوز اُڑ جانے کا اندیشہ تھا لہٰذا طے یہ کیا کہ میز کو گھسیٹ کر چھت سے
ہوئے بلب کے نیچے لے جاؤں اور لکھنا شروع کر دوں۔ میز کو گھسیٹا ہی تھا کہ آواز آئی "کون"؟ یہ بھی اسد
یہ بیوی صاحبہ کی آواز تھی جو بمشکل سوئی تھیں۔ جلدی سے جواب دیا میں ہوں، میز گھسیٹ رہا ہوں۔ جوا
"دوڑیئے جلدی"، اب جو جا کر بتی جلاتے ہیں تو وہ پسینے میں شرابور پھٹی پھٹی آنکھیں لیے نہایت وحشت
گھور رہی ہیں اور گھبرا گھبرا کر کہہ رہی ہیں "پانی ——— اختلاج ——— ہائے میرا دل ———" اس قسم کے موق
پر میرے جیسا آدمی خود اختلاج میں مبتلا ہو جاتا ہے اور گھبرا گھبرا کر عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے
پانی کے بجائے سرہانی اٹھائی میز سے اس کو رکھا تو جلدی سے لپ اسٹک لے کر دوڑے اوز
سمجھ میں آیا کہ یہ بھی غلط ہے۔ آخری چیز صحیح ہوا کرتی ہے تھرموس سے پانی انڈیلا اور اپنے سہ
ان کو بٹھا کر پانی پلایا، جلدی سے مالٹا نوچ کر اس کی ایک آدھ قاش دی اور جب ذرا دل ٹھہرا
ہوا کہ وہ سمجھی تھیں کہ چور ہے اور ٹرنک گھسیٹ رہا ہے جس میں ان کی چھوٹی بہن کے جہیز کے جوڑے
ہیں۔ ان سے نہایت خندہ پیشانی سے باتیں کیں، ان کا دل بہلایا اور ان کو سونے کی ترغیب دی۔
وہ سوئی ہوں گی کہ گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے گویا ڈیڑھ گھنٹے تک یہ تیمارداری کی گئی اور اب پھ
آئے اس لیے کہ صبح وہ افسانہ لینے والے ضرور آئیں گے۔ ڈبیا سے نکال کر گلوری کھائی، سر پر ہاتھ پھ
گویا یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کی اور ایک کاغذ پر لکھا ۷۸۶ میں ہمیشہ بسم اللہ کے اعداد برکت
لیے لکھ دیا کرتا ہوں۔ عنوان کی جگہ چھوڑی اور افسانہ شروع کر دیا۔

نسیم اپنے باپ کا بیٹا تھا———

اور ایک دم قلم رک گیا۔ یہ کیا واہیات بات ہوئی۔ نسیم، کلیم، شمیم اپنے اپنے باپوں کے۔
ہیں اور اس میں ندرتِ خیال کیا ہے۔ اگر اس کو اس طرح لکھا جاتا کہ "شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا"
گویا ایک اپج اور ایک شوخ قسم کا اندازِ بیان ہو جاتا۔ لہٰذا یہ کاغذ الگ کر دیا اور دوسرے کاغذ پر
لکھ کر عنوان کی جگہ چھوڑی اور افسانہ شروع کر دیا:

شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا———

اور ایک دم رات کے سناٹے میں آواز گونجی "ابا——— آ——— آ"

شمیم نہیں بلکہ میں اپنے بیٹے کا باپ مزور تھا جو مجھ کو پکار رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ بیگم صاحبہ کا اختلاج پھر نہ جاگ اٹھے۔ دوڑا ہوا آگیا اور بستر پر دیکھا کہ صاحبزادے سہمے ہوئے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔ ان کو لٹا کر تھپکا۔ لوری کے طور پر ڈاکٹر اقبال کا شکوہ سنایا اور جب وہ سو گئے تو پھر چوروں کی طرح میز پر آئے مگر اب یہ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ فرض کر لیجئے کہ تھا بھی تو ہم سے کیا، ہوگا۔ ہماری بلا سے۔ اس کاغذ کو بھی ایک طرف کھسکا دیا اور ایک تیسرے کاغذ پر ۷۸۶ کے بعد عنوان کے لیے جگہ چھوڑ کر کچھ لکھا۔ لکھ کر غور کیا۔ کاغذ بدلا۔ پھر لکھا۔ پھر غور کیا۔ کاغذ بدلا۔ پھر لکھا۔ پھر غور کیا۔ پھر کاغذ بدلا۔ اور اب جو بڑی بچی نے آکر شانے پر ہاتھ رکھا ہے تو آنکھیں کھول کر دن چڑھا ہوا دیکھا۔ بے شمار ۷۸۶ لکھے ہوئے کاغذات میز پر بکھرے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نصف سطر تھی۔ کسی میں نسیم اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ کسی میں شمیم اپنے بیٹے نسیم کا باپ تھا۔ کسی میں نسیم یتیم تھا اور کسی میں شمیم لاولد تھا اور وہ افسانہ لینے والے بس آنے ہی والے تھے۔ لاحول پڑھ کر میز سے اٹھے اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا تو افسانے کا عنوان نظر آیا۔ دوڑ کر میز والے کمرے میں آئے۔ دروازہ بند کیا۔ میز پر آکر کاغذ اٹھایا ۷۸۶ لکھا اور عنوان لکھ دیا "افسانۂ ما" اس عنوان کے تحت وہ سب کچھ عرض کر گئے جو بیتی تھی ۔۔۔ اب خدا جانے یہ افسانہ بنا یا نہیں۔۔!

سہرا

(مشہور کرکٹ کھلاڑی حنیف محمد کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر)

باؤنڈری مار کے بندھواتے تھے سر پر سہرا
اب چلے گا یہ پتہ بندھتا ہے کیوں کر سہرا

رن بنانے کے لیے دوڑ نہ جائیں یہ کہیں
باندھیے سر پہ اسی شخص کے کس کر سہرا

سینچری بیٹ تو بے شک ہے ہمارا دولھا
اب نئے کھیل کے دیکھے گا یہ جوہر سہرا

چھکے چھوٹے نہ کہیں چھکے لگائے تو بہت
سونپ دے تم کو نہ اولاد کا لشکر سہرا

یہ کرکٹ کی نہیں شادی کی پچ ہے حضرت
اب ذرا باندھیے اس پہ بھی تو جم کر سہرا

اب بندھے بیٹھے ہیں سسرال میں سہرے سے حنیف
اور اسکور میں ہے آپ کے گز بھر سہرا

اپنی ہر ایک سہیلی سے یہ کہتی ہے عروس
کھینچ کر لاؤ کہ باندھیں مرے شوہر سہرا

سیکڑوں رن ہیں وہی مہر میں لکھوا دیں گے
اور خود اپنا بنا لیں گے مقدر سہرا

داد دی میں نے بھی دولھا کو جو دیکھا شوکت
ویلڈن باندھ لیا تو نے بھی سر پہ سہرا

اندلیب ساہب کے نام

خاور کے دو پرچے ملے ۔ دیکھ کر تبیعت خوش ہوئی اور کچھ لکھنے کی تہریک تو پیدا ہوئی۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھنا چاہیے جسے پڑھنے والے پڑھیں بھی ۔ دوسرے نمبر میں سفہا انتالیس پر آپ کا مزمون دادِ فکر دیکھ کر تے کیا کہ وہ لکھوں جو آسانی سے پڑھا نہ جا سکے' آپ نے رسم الخط کی بہس چھیڑی ہے اور بہت آسان ترقیہ نکالا ہے کہ اردو کا رسم الخط تو اربی ہی رکھا جائے البتہ اربی کے علاوہ بہت سے ہروف جن کا تلفز اردو میں یکساں ہے اردو سے نکال دیئے جائیں اور صرف ایک ہرف رکھ لیا جائے۔ مسلن (ت) اور (ط) میں جب کوئی فرق ہی نہیں اور دونوں کی آواز اردو میں ایک ہی ہے تو دونوں کی کیا زرورت ہے صرف (ت) کافی ہے اور (ا) اور (ع) کی آواز بھی یکساں ہے تو (ا) کو رہنے دیجیے (ع) کو رخصت کیجیے۔ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ ڈاکٹر مولوی ابدالہق ناراز ہو جائیں گے تو ان کو اربی میں لکھنے دیجیے۔ آپ کیوں نہ اردو میں اردو لکھیں ۔ (س) (ص) اور (ث) میں سے صرف (س) کافی ہے (ذ) (ز) (ض) اور (ظ) میں سرف (ز) کو رہنے دیجیے اور ساہب یہ (ح) اور (ہ) والا قسہ تو بہت ہی واہیات ہے۔ یہ جو چھوٹی (ہ) کہلاتی ہے یہی ہمارے لیے بڑی چیز ہے۔ مختسر یہ کہ جب (ا) اور (ع) . . .

. . . . (ت) اور (ط) ، (ح) اور (ہ) ث، س، ص، (ذ) ز، ض - ظ کی آواز ایک ہی ہے، تو ایک حرف کے بجائے اتنے ہروف کی آخر کیا زرورت ہے۔ آپ نے اس تفصیل میں جو خلاسہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ املا کا دارومدار سوت یا آواز پر ہے اور جب اردو میں ان مختلف ہروف کی ایک ہی آواز ہے تو املا کی غلطیوں کا امکان نہیں ہو سکتا ۔ اور اردو خواہ مخواہ اردو ہوتے ہوئے بھی اردو نہیں بن پاتی ۔ اربی بنی ہوئی ہے میری سمجھ میں تو اس تالبِ الم کا قصور نہیں آتا جس نے اونٹ کو محز اس خیال سے (عونٹ) لکھا تھا کہ اونٹ ہر حال ادب کا جانور ہے اس لیے (ا) سے تو ہو ہی نہیں سکتا ۔ ع سے ہوگا۔ اور چوں کہ اربی میں (ٹ) نہیں ہے۔

لہذا (ٹ) کی جگہ (ت) لکھنا چاہیے۔ اگر ممتحن صاحب زرا بھی ذہین ہوتے تو اس تالب الم کو بنچ پر کھڑا کرنے کی جگہ خود میز پر کھڑا کرنے کی جگہ خود میز پر کھڑے ہوکر اس کی تاریف میں آپ سے ایک بات اور ارز کرتا ہوں اندلیب ساہب کو اس ترہ نہ سرف اردو کا رسم الخت آسان ہو جائے گا بلکہ ہمارے لکھنے والے مشکل ابارت آرائی بھی۔ شاید چھوڑ دیں (ع - ط - غ - ص - ث - ذ - ض - ظ) کی وجہ سے اردو کا مزاج خواہ مخواہ عربی بنا ہوا ہے۔ یہ ہروف جب آپ کے رسم الخط سے نکل جائیں گے تو اردو کو آسان ہروف لکھنے کے لیے آسان زبان بھی اختیار کی جا سکے گی۔ مسلن اس نمبر میں آپ ہی کے دو شیر ہیں ایک سفحہ سولا پر:

دیکھتا ہوں رات کو جب دو ستارے آس پاس
جانے کیوں اس وقت ہو جاتا ہے میرا دل اداس

اسی شیر میں کسی تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر دوسرا شیر جو سفحہ انسٹھ پر ردہ انتخاب کے زیر انوان ہے چونکہ اردو کا شیر نہیں ہے لہذا اس کو اردو بنانے کے لیے یوں لکھنا پڑے گا:

آئی تھیں ہم کو بھی یاد خوشی کی بھی سدا آتیں
اب وہ تزام گردش دنیا میں نہیں رہا

ہو گا یہ کہ یا تو آپ ساہبان ان دونوں شیروں کو یوں کہیں گے . . . . یا کہیں گے تو اس ترہ لکھیں گے کہ ان کے اپنی الفاظ بھی اردو ہروف میں آکر مشرف بہ اردو ہو کر کچھ کے کچھ نزر آئیں گے مگر ان کا مفہوم و مانی میں کوئی فرق پیدا نہ ہو گا۔

اندلیب ساہب مجھ کو اعتراف ہے کہ آپ کے مجوزہ رسم الخط میں یہ ایدیا کس مشکل سے تہریر کیا ہے۔ قدم قدم پر املا کی غلتی کا خوف مجھ پر تاری رہا مگر آپ کو نہیں مالوم کہ آج تیس سال کے بعد میں نے آپ کا سہارا لے کر کتنا بڑا انتقام والد مرحوم مولوی سدیق احمد (محمد گومیں) نے احمد اس لیے نہیں لکھا کہ آپ نے رائے دی ہے کہ احمد و محمد کو احمد و محمد اور سوہم و مفتوہ ہی لکھنا چاہیے۔ ایسے الفاظ کی تاداد دو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہو گی۔ اور ان کو کلیے کا استثنا سمجھنا چاہیے۔ ساہب مرحوم و مغفور کی روح سے لیا ہے۔ ساہب سرف اس زرا سی غلتی پر نہیں ... ایک مرتبہ احمد لکھ دیا تھا جو ان کے نزدیک (عمدہ) ہونا چاہیے تھا۔ کہ کافی مار کھائی تھی اور جب اس مار کے بعد دوسری مرتبہ انجیری دروازے کو (کچہری دروازہ) لکھا ہے تو کافی سے بھی زیادہ تو اضع ہوئی تھی میری۔ کاش آپ والد مرحوم کے ہم اسروں میں ہوتے اور یہ مفید تجویز میری مرمت سے پہلے ہی پیش کر چکے ہوتے۔ اس کا فائدہ تو اب میری اولاد کو تو خاطر خواہ پہونچ جائے گا۔ مگر میرے والد کی مجھ خاکسار والد کو محض آپ کی اس تاخیر کی وجہ سے نہ پہونچ سکا۔

اندلیب ساہب ندا کرے آپ کی یہ تجویز قبول ہو۔ آم ہو ... ادام آپ کی اس نیک سلاہ کو شرف قبول ماناکریں۔ اور کے ... اور بہت سی آسانیاں پیدا ہونے کی سورتیں نکل آئیں گی۔ مسلن (ی) بھی بڑی نامراد چیز ہے ساہب اس کو تو خدا کے واسطے اپنے رسم الخط سے اٹھائیے۔ اس کی جگہ بھی الف کو استعمال میں لائیے۔ مسلن (آئیے) کو (آ...) ہم آ... ... ... (آؤ) کو ... ... اس ترہ

کچھ لکھنے لگیں۔ مالوم نہیں کیوں میں زاتی تور پر اس تحرزے سے بہت گھبراتا ہوں اور اسی قسم کی بے شمار چیزیں ہیں
ن کے نکل جانے کے ، یاد بڑی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی پھر تو ہم یہ جوڑ لکھنے کی لانت بھی ختم کر دیں گے۔
سے انگریزوں کی طرح لکھا کریں گے۔ ج ن اب - ان دل ی ب - ش اد ان ی - کتنا خوب صورت
ہو جائے گا - ہمارا ٹائپ رائٹر، بہرحال میں ادھر اس تجویز پر غور کر رہا ہوں آپ ادھر غور فرمایئے - کوئی نہ
کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

مکرر آں کہ اس ہمزہ کے معاملے کو ما مولی سمجھ کر نزر انداز نہ فرمایئے گا۔ مکرمی ہفیز ساہب ہوشیار
ری آداب ارز کرتے ہیں اور فرست کی تلاش میں ہیں کہ آپ کو کوئی تازہ غزل جلد سے جلد بھیجیں۔

(احقر الاباد شوکت تھانوی)



قاعدہ بے قاعدہ

شوکت تھانوی

شین

بچو! دیکھنا ذرا یہ شوکت تھانوی ہیں۔
ان کا خیال ہے کہ یہ مزاح نگار ہیں، اگر تم کو ان کے اس خیال پر ہنسی آ گئی تو بھی یہ اس کو اپنی مزاح نگاری کی کرامت ہی سمجھیں گے۔

بچو! یہ شاعر بھی ہیں۔ جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو ہنسی آتی ہے۔ جب مزاحیہ کلام سناتے ہیں تو لوگ عبرت پکڑتے ہیں، حالاں کہ خود ان کو پکڑ لینا چاہیے۔

بچو! خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر جشنِ نجات مناؤ۔ یہ بہت بدآواز ہیں مگر گا کر شعر سنانے سے باز نہیں آتے۔ دعا کرو۔ ان کی آواز خود ان کے کان میں بھی پہنچ جایا کرے بلکہ اگر صرف ان ہی کے کان میں پہنچا کرے تو بہت اچھا ہے۔

بچو! ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر اگر تم کو ہنسی نہ آئے تو اپنے کو سمجھدار سمجھنا اور اگر ہنسی آجائے تو کسی فقیر سے اپنے لیے تعویذ لکھوانے کی کوشش کرنا۔

بچو! تم کو نہیں معلوم۔ بات یہ ہے کہ شوکت تھانوی جی ہیں کہ باقاعدہ پڑھ نہ سکے، لہٰذا لکھنا شروع کر دیا۔ مگر تم لکھنے کی کوشش نہ کرنا صرف پڑھنے کی کوشش کیے جاؤ تاکہ شوکت تھانوی بننے سے خدا تم کو محفوظ رکھے۔

بچو! جب تم بڑے ہو کر قانون ساز مجلسوں کے ممبر بننا تو اس قسم کا قانون ضرور بنوانا کہ شوکت تھانوی قسم کے لوگ " محمد فاضل" بنے نہ پھریں۔ اس قسم کی جرأت کرنے والوں کے لیے عبرت انگیز سزائیں رکھوانا۔

بچو! بعض لوگ شوکت تھانوی کو مزاح نگار کہتے ہیں۔ اور بعض لوگ طنز نگار اور اس قسم کے لوگ بہت کم ہیں جو طنز اور مزاح کا فرق سمجھ سکیں۔ فرق سمجھتے ہوتے تو نہ طنز نگار کہتے نہ مزاح نگار۔ خود ان کی ذات کو طنز اور مزاح کہتے۔ نگار کی تہمت نہ لگاتے۔

بچو! ان کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھو اور یاد رکھو ش۔ شوکت تھانوی۔

(خاکہ)

شوکت تھانوی

سیّد جالب دہلوی

استاذی میر بشارت علی جالب دہلوی روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے اڈیٹر تھے اور ہمدم کے ڈائرکٹر خان بہادر سید احمد حسین رضوی ایم بی ای نے مجھے ہمدم کے دفتر بھیجا تھا کہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کروں۔

ترکی ٹوپی پہنے جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا اور پھندنے کے آگے سفید بالوں کا گچھا ٹوپی سے پناہ مانگ کر نکلا بھاگتا تھا۔ پریشان سی سفید داڑھی، ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں قلم، میز سے کچھ ہی اٹھا ہوا سر اس سج دھج سے ایک بزرگ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے گویا اونگھ رہے ہیں۔ میرے آنے کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ لکھتے رہے برابر لکھتے رہے۔ نہ کچھ سوچنا نہ غور کرنا بس لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً کاتب کے آجانے سے گردن اوپر اٹھی۔ موقع دیکھ کر میں نے عرض کیا "السّلام علیکم"

نہایت کرخت آواز میں جواب ملا۔ "وعلیکم السلام" خان بہادر صاحب کا خط چپکے سے دے دیا۔ پڑھ کر دُزدیدہ نگاہوں سے پہلے تو دیکھا۔ اس کے بعد میرا شجرہ شروع کر دیا۔

آپ کے چچا صاحب قبلہ نے دہلی سے روزنامہ اخبار نکالا تھا میں اس میں کام کر چکا ہوں۔ بلکہ وہ میرے ایک قسم کے استاد ہی ہیں اور آپ کے ایک بڑے چچا لندن تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے پھر واپس تشریف ہی نہ لائے آپ کے والد صاحب بھوپال میں تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو میرے ہی متعلق نہیں ہر ایک کے متعلق عام طور پر معلوم ہوا کرتا تھا کہ وہ کون ہے کیا ہے۔ اس کا خاندان کہاں سے متعلق ہے۔ اس کی دادی کے کتنی مرتبہ آپریشن ہوا تھا۔ اس کی نانی کی موت کس مرض میں واقع ہوئی اور اس کے ایک خالو کو کس جرم میں حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ یہ مقدمہ کن کن عدالتوں میں رہا۔ کس کس وکیل نے

کیا کیا جرح کی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں ہم آپ سب سنا کرتے تھے۔ مگر یاد نہیں رکھتے۔ میر صاحب کے دماغ میں بلکہ کان میں ایک مرتبہ کوئی بات پڑ جائے۔ پھر کیا مجال کہ وہ اسے بھول جائیں وہ بات دماغ سے نکلنے کے لیے پھڑ پھڑائے گی مگر میر صاحب کا دماغ یادداشت کا ایسا پنجرہ تھا جس میں کوئی صید ایک مرتبہ آ کر پھر کبھی رہا نہیں ہوا۔

مختصر یہ کہ ہمدم میں ملازم ہو گئے۔ میر صاحب نے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ ہمارے سیاہ حروف کی عبارت پر ان کی سرخ رنگ کی اصلاح ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو سیاہ عبارت تمام کی تمام قلمزد ہو جاتی تھی اور اس کی جگہ میر صاحب کی سرخ عبارت ہماری نالائقی پر خون کے آنسو بہاتی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد سیاہ و سرخ عبارت کا تناسب ایسا ہو گیا کہ گویا قتل عام تو ہوا تھا مگر کچھ ہندوستانی بچ گئے تھے غالباً سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ رفتہ رفتہ خون کی ایک آدھ چھینٹ اور پھر خال خال سرخ رنگ کی چمک مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز بغیر اصلاح کے رہ گئی ہو۔ ترجمہ ہو۔ شذرہ ہو مزاحیہ کالم ہو۔ ہر جگہ اصلاح موجود۔ اکثر تو اصلاح ہی پر غصہ آتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ ہمت کر کے لڑ بیٹھے۔ ہم نے لکھا تھا۔ ایک جگہ "نقطۂ نگاہ" آپ نے اس کو لکھ دیا "زاویۂ نگاہ" چلبلاتے ہوئے وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچے۔

"آپ نے نقطۂ نگاہ کاٹ کر زاویۂ نگاہ بنا دیا ہے۔ اس میں کیا فرق پیدا ہو گیا"

سر جھکائے ہوئے بولے "بہت بڑا فرق ہے۔ دونوں میں نقطۂ نگاہ تیقن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ گویا نگاہ پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور زاویۂ نگاہ میں شک کا احتمال باقی رہتا ہے۔ گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ دریافت نہیں کیا ہے۔ جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں زاویۂ نگاہ زیادہ سجتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سائنس کمیشن کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں زاویۂ نگاہ لکھ دیجیے تو پھر آپ پر نتیجہ کی ذمہ داری نہیں رہتی۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائنس کمیشن کا مقصد اپنے نتیجہ پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہو۔ اس وقت ... بالفرض زاویۂ نگاہ غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے مگر نقطۂ نگاہ کا پہنچنا ایک صحافی کی موت کا سامنا ہے کہ چلے آئے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی اصلاح کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ میر صاحب کو زندہ انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا تھا۔ کسی موضوع پر گفتگو کیجیے۔ بات کریں گے۔ بات کی جڑ بتائیں گے یہاں تک کہ بیخ کنی بھی بتا جائیں گے۔ حلوا سوہن۔ خمیرہ۔ سرطان، مثنوی مولانا روم۔ خاندان پہلوی۔ گاماں پہلوان۔ پلاؤ کی بحث۔ غرض تو کیا کوئی موضوع لیجیے۔ گھنٹوں تقریر کریں گے اور اس وثوق سے موضوع کے ہر پہلو کو نمایاں کریں گے گویا یہ آپ کا سبجکٹ رہا ہے۔ میر صاحب کو شوق صرف دو تھے۔ افیون اور کتابیں، افیون کھانے کو رندی کہتے تھے۔ اور جہاں تک ہوتا تھا اس کھلی ہوئی حقیقت کو راز میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے کے سلسلے میں ہر تکلیف گوارا تھی۔ اتوار کے دن نخاس میں لب سڑک کسی کباڑیے کی دوکان پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اور پرانی کتابوں میں دیمک کی طرح لگے ہیں۔ کیا مجال کہ پھر کوئی ہنگامہ ان کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ کاش تقریر کرنے میں کبھی کبھی سانس لے لیا کرتے۔

کھانے کے شوقین تھے اور فطرتاً میٹھی چیز دل سے خاص رغبت تھی۔ دعوتوں میں جہاں تک ہوتا تھا:

ہی جاتے تھے۔ اسٹاف کے کسی اور رکن کو تکلیف دینا پسند نہ کرتے تھے۔

مشکل ہی سے کوئی دعوت ایسی ہوتی ہوگی جس میں شیروانی کا کالر اور سب سے پہلا بٹن لگانے کے بعد باقی سب کو کھلا چھوڑ کر۔ جوتے کی ٹھوڑی سڑک پر لوٹتی ہوئی، ترکی ٹوپی کا پھندنا پیشانی پر جھومتا ہوا ایک ہاتھ میں چھڑی اور رومال اور دوسری مٹھی میں سگریٹ لیے آپ تشریف نہ لائے ہوں۔ آتے ہی "السلام علیکم" کی جھنکار دار آواز محفل میں گونج جاتی تھی۔ پھر لوگ گھیر لیتے تھے اور کوئی نہ کوئی موضوع چھڑ ہی جاتا تھا۔ ایک محفل کے لیے صرف ایک موضوع کافی ہوا کرتا تھا۔

ہمدم کے بعد خود ہمت کر کے اپنا روزنامہ نکالا۔ "ہمت" نام رکھا۔ اور اسی ہمت کو زندہ چھوڑ کر خود ختم ہو گئے معلوم نہیں کتب خانے کا کیا حشر ہوا۔ عجیب عجیب نایاب کتابوں کا نہایت قیمتی ذخیرہ تھا۔ جس کا اب کوئی پتہ نہیں۔"

●●

طنز و مزاح

شوکت تھانوی

اردو کی مختلف اصناف میں سے آپ صرف مزاحیہ ادب کے متعلق یہ بتائیے کہ وہ روبہ زوال ہے کہ نہیں اگر ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں اور نہیں ہے تو اس کے دلائل کیا ہیں؟

کتنا مختصر سا سوال ہے مگر کتنا تفصیلی جواب چاہتا ہے۔ حالانکہ اس سوال کا بذریعہ تار بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ۔ ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

مگر اس جواب کے بعد اس کی شرح لکھنے کو کہا جائے گا۔ لہٰذا میں اس دوگونہ عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی سے یہ شرح کیوں نہ لکھ بھیجوں ——

اردو ادب میں مزاح کا عنصر ترقی اور تنزل کے بجائے ناپ تول کا متقاضی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ ترقی اور تنزل کے بجائے آمد و خرچ کے پیمانوں سے ناپنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس لیے کہ اس سوال پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اردو کا مزاحیہ ادب ترقی یا تنزل کے بجائے آمد و خرچ کے غیر متوازن ہونے کا شکار رہا ہے۔ مزاح نگار پیدا کم ہو رہے ہیں اور مر زیادہ رہے ہیں۔ اور جو باوجود کوشش کے نہ اب تک مر سکے ہیں نہ خودکشی کر سکے ان کو تنقید نگار مار ڈالنے کی مساعی جمیلہ میں اس لیے مبتلا نظر آتے ہیں کہ جب وہ مر جائیں تو ان کی لاشوں سے زندہ نگاروں کو ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش کرتے رہیں۔ یہ تنقید نگار جو مردہ ادب کے مجاور اور زندہ ادب کے جلاد ہوتے ہیں مدتوں سے اس شغل میں مبتلا ہیں کہ جو زندہ ہیں ان کو مار ڈالیں تاکہ ان کو دفن کر کے ان کے مزاروں پر قوالیاں کرا کر صاحبان حال سے نذرانے وصول کریں۔ یہ حضرات ادب کو تو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں مگر ادیب کو نہیں۔

معاف کیجئے گا یہ تو میں کچھ اور عرض کرنے لگا۔ سوال یہ ہے کہ مزاحیہ ادب ترقی کر رہا ہے یا نہیں۔ اس کا سیدھا جواب صرف یہ ہے کہ مزاحیہ ادیب جس ذوق و شوق کے ساتھ مر رہے ہیں اس ولولے کے ساتھ پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔ اس اعتبار سے مستقبل یقیناً تاریک نظر آ رہا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے یعنی اودھ پنچ والے دور عروج کے رو بہ زوال ہونے کے بعد ایک طویل سناٹا چھایا رہا۔ مگر وہ دن گزرے ابھی زیادہ مدت نہیں ہوئی ہے جب مزاحیہ ادب کے بڑے چرچے شروع ہو گئے تھے اور بیک وقت بہت سے مزاح نگار بساط ادب پر نظر آنے لگے تھے مگر اللہ جانے کس سنجیدہ بزرگ کی نظر لگی کہ یہ محفل برہم ہونا شروع ہو گئی۔ فرحت اللہ بیگ گئے۔ عظیم بیگ چغتائی گئے۔ ملا رموزی بھی بہر حال جیسے کچھ بھی تھے۔ گئے۔ اور یہ بیت جھڑ اب تک جاری ہے جس کے تازہ شکار پطرس اور عبدالمجید سالک ہیں۔ جانے والوں کی اس طویل فہرست کے بعد یہاں آنے والے دروازے سے کوئی بھی داخل ہوتا نظر نہیں آیا۔ چند نئے مزاح لکھنے والے اِدھر اُدھر نظر ضرور آئے ہیں مگر ان کو جانے والوں کا جانشین نہیں کہا جا سکتا۔ اس اعتبار سے خود فریبی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ فلاں کا انتقال ہو گیا یا فلاں کی رحلت ہو گئی، فلاں نے داعی اجل کو لبیک کہا، باقی سب خیریت ہے۔ آمد و خرچ کے اس غیر متوازن ہونے کا اثر یقیناً مزاحیہ ادب پر پڑ رہا ہے۔ ویسے تو ہنسنا اور رونا دونوں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ دعا کیجئے کہ اس کا عمل و توازن بدلنے نہ پائے۔

احمد جمال پاشا

شوکت تھانوی بہ حیثیت کالم نگار

کالم نویس طنزیہ مزاحیہ صحافت کے آئینے میں روزمرّہ کی رواں دواں، بیہم جہاں، زندگی کے معمولی حادثے سے لے کر عظیم ترین واقعہ کے نازک پہلوؤں تک کو اس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے کہ تبسم زیرلب یا بے اختیار قہقہے کے ساتھ ہی قاری کو اپنی خامی اور کھوکھلے پن کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس کی مسکراہٹ یا ہنسی، سنجیدہ فکر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ناہمواری اور اپنی خوش فہمیوں پر نظرثانی کرنے کی اس کوشش اور جذبہ کی جس قدر بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

اردو کی مزاحیہ صحافت کا آغاز ۱۸۴۵ء میں رام پور کے رسالہ "مذاق" سے ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی بنارس پنچ، فرحت الاخبار، مدراس پنچ اور روہیلکھنڈ گزٹ بھی اسی روش پر چل نکلے۔

مگر باقاعدہ ابتدا، کا سہرا منشی سجاد حسین کے سر بندھتا ہے۔ منشی صاحب نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "لندن پنچ" کے خطوط پر "اودھ پنچ" کا اجرا کیا۔

"اودھ پنچ" ہماری صحافت کا سنہری دور ہے "اودھ پنچ" کے شہ سواروں کے توپ خانے کی زد سے سیاست، معاشرت، تہذیب، اخلاق، ادب اور زندگی کی کوئی بھی بے ضابطگی اور بدعنوانی نہ بچ سکی۔ زوال آمادہ معاشرت کی غلامانہ ذہنیت نوکر شاہی، اودھ کی لٹی ہوئی نوابی، لیموں نچوڑ مصاحب مآب خدمت برطانوی سامراج، بانکے، طوائفیں، عیاشی، نسلی امتیاز اور گورا شاہی کے خلاف بڑی جرأت بے باکی اور فرزانگی کے ساتھ ساتھ اودھ پنچ آتش فشانی کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی یہ خدمت جذبہ قومی ادب کا ایک اہم جزو ہے۔

اودھ پنچ کے نکلتے ہی اس کی تقلید میں ملک کے گوشے گوشے سے بے شمار پنچ نکل پڑے جن میں

لاہور پنچ، جالندھر پنچ، پنجاب پنچ، سرپنچ، بنگال پنچ، دہلی پنچ، راجپوتانہ پنچ، بنارس پنچ، کرناٹک پنچ، الپنچ، کھیت پنچ، کرنال پنچ، دکن پنچ، قنوج پنچ، آگرہ پنچ، فتح گڑھ پنچ، فیروز پور پنچ اور مرار پنچ، بادا آدم پنچ، منڈی پنچ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اودھ پنچ اور اس کے معاصر پنچوں کی مقبولیت نے رفتہ رفتہ سنجیدہ اخباروں کے دامن میں پناہ لی اور مزاحیہ کالم کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔

کالم نویسی کی روایت منشی سجاد حسین، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا عبدالماجد دریابادی اور چراغ حسن حسرت سے ہوتی ہوئی شوکت تھانوی تک پہنچی ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک کا زمیں دار لاہور میں "افکار و حوادث" مستقل کالم نویسی کی طرف پہلا فنی اقدام تھا اور "ہمدم" و "اودھ اخبار" لکھنؤ میں شوکت تھانوی کی "دو دو باتیں" اور جنگ کراچی وراولپنڈی میں "وغیرہ وغیرہ" اور "تہہ پاٹ تلے" اس ابتدا کی انتہا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ شوکت تھانوی کا مزاحیہ کالم صرف اس وجہ سے مقبول تھا کہ دوسرے مزاح نگار نہ تھے یا کالم اور کالم نویس نہ تھے .... شوکت تھانوی کا دور مزاحیہ ادب نہیں بلکہ مزاحیہ صحافت کا دور ہے۔ اردو کے مشہور اخباری کالم ہمیشہ ممتاز مزاح نگاروں ہی نے لکھے ہیں۔ شوکت تھانوی سے قبل منشی سجاد حسین، مولانا محمد علی جوہر اور ان کے زمانے میں خواجہ حسن نظامی، ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے جلیل القدر صحافیوں کے علاوہ بھی ان کے بے شمار معاصرین ان گنت کالم لکھ رہے تھے جس میں "وغیرہ وغیرہ" سچی باتیں "پیاز کے چھلکے" "گلوریاں" "حرف و حکایت" "حوادث و افکار" "بت شکن" "سر راہے" "سنگ وخشت" "گر تو برا نہ مانے" "شیشہ و تیشہ" "تیر و نشتر" "نمکدان" "موج در موج" "نقش و نگار" باغ و بہار، ادھر ادھر، برسبیل تذکرہ، جام بکف، کہنے کی بات، آج کی باتیں، تلخ و شیریں، قیل و قال، آنکھیں میری باقی ان کا، پھلجھڑیاں، دل ناداں، نیک و بد، بیرنے کہا، تازیانے، کف گلفروش، تعفن برطرف، نکات، مطائبات، دام خیال، چٹکیاں، گدگدیاں، کرنیں اور سائے، ذکر و فکر، جام جہاں نما، چھیڑ چھاڑ اور ہماری باتیں جیسے بے شمار اخبارات اور رسائل کے کالم بلند و پست ظرافت و کثافت سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ غرض بیش تر مزاح نگار اپنے فن کا اظہار کالم نگاری کے پردے میں کر رہے ہیں۔ مگر ان میں سے چند کے سوا شوکت تھانوی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا بلکہ بیشتر ان کے کالم کی ہمیشہ خوشہ چینی ہی کرتے رہے۔

ان کی اس مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ کالم نویسی میں وہی مزاح نگار کامیاب ہو سکتا ہے جس میں طباعی اور حاضر دماغی کے ساتھ ساتھ مسائل کا ادراک، وقت زمانے اور قوم کے مزاج سے واقفیت ہو وسیع علمی معلومات اور پاکیزہ مذاق رکھتا ہو تاکہ ہنسی ہنسی میں بات کہہ اور منوا سکے۔ شوکت تھانوی کی حاضر

دماغی، طباعی، خوش مزاجی اور مزاج دانی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، شوکت تھانوی محض کالم نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے نہیں آتے بلکہ ان کی پہلودار شخصیت میں بڑی ہی ہمہ گیری اور تنوع ہے۔ وہ بیک وقت کالم نگار، مزاح نگار، طنز نگار، ظریف، لطیفہ گو، بزلہ سنج، مضمون نگار، افسانہ نگار، پیروڈی گو شاعر، مزاحیہ شاعر، ڈرامہ نویس، صحافی، ریڈیو آرٹسٹ، فلم آرٹسٹ اور ایک باغ و بہار انسان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

شوکت تھانوی بہار بے خزاں کا ایک ایسا لہکتا اور مہکتا ہوا پھول ہیں جس میں ہر رنگ اور خوشبو ہے۔ وہ ایک ایسے ہنسوڑ ہیں جو گھر کی چار دیواری اور ڈرائنگ روم سے کسی قیمت پر باہر نہیں آتے۔ ان کے خانہ زاد قصے، لطیفے، چٹکلے، قہقہے اور باتیں ہمیں زمانے کی فکروں سے دم بھر کے لیے آزاد کر دیتی ہیں۔ جس سے گھریلو زندگی اور بزم بے تکلف کی کشش ہمارے لیے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

سودیشی ریل، تعزیت، ۱۹۵۷ء کا مشاعرہ، پرابلم، کرکٹ یونہی میں ایسٹ، بابو، وکیل اور کنبہ، میار جیسے مضامین، شیش محل کے نام کے تعبیر طلب اور افسانہ نما وغیرہ جیسے افسانے، ما بدولت اور شوکتیات کچھ یادیں کچھ باتیں جیسی خودنوشت سوانح، بڑھبس خدانخواستہ اور سسرال جیسی ناولیں تصنیف کرنے اور قاضی جی اور منشی جی جیسے لازوال مزاحیہ کردار تخلیق کرنے والا قلم جب کالم نگاری پر آتا ہے تو اپنے عہد کے مقبول ترین کالموں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ شوکت تھانوی کی بے پناہ فطری صلاحیتیں، ظرافت، شگفتگی، بے ساختگی، ندرت بیان، شوخی زبان ان کے کالم کی مقبولیت کا باعث ہیں۔ ان کی کوثر و تسنیم میں دھلی دھلائی، رواں دواں نثر، الفاظ اور خیالات پر قدرت اور ہر بات میں نکتہ فہمی کی مثال نہیں ملتی۔

شوکت تھانوی کی زعفران زار ظرافت کے پردے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی واقعہ، مسئلہ، حادثہ یا بات ہوتی ہے جس کے پردے میں اخلاقی، سیاسی یا سماجی بدعنوانی پر طنز ہوتا ہے۔

شوکت تھانوی کے کالموں کے چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے:

"انگریزی سیاست، مسلم لیگ، کانگریس، خاکسار، خدائی فوج دار، ملکۂ حسن، بیگم صاحبہ، مٹھو بیٹے، نخاس، محرم، لکھنؤ، نوابین اودھ، مصاحبین، ایم جی، شاعر، مشاعرے، دوست، پڑوسی، ٹیڈی ازم، بشیر ساربان، چین، نیرنگی زمانہ، نیا زمانہ، مہاجر، گرانی، چور بازاری، رشوت، مکانوں کی قلت" لیڈری، وزارتیں، افواہیں، لسانی مسائل، سفید پوشی، تعصب، عیاشی، دفتری گورکھ دھندے، سڑکوں کے نام، سیاح، غذائی آمیزش، آزاد شاعری، نصابی مسائل، ریلوں کے حادثے، اردو تیز گام، بلیں، تاریخی عمارتیں، سڑکیں، انجمن سازی، خوشامد، شیخی، جاہ پرستی، بے انصافی، عدم مساوات، ٹریفک کے حادثے، کاروبار شعر و ادب، بین الاقوامی سیاست، گداگری، اقتدار کی ہوس، مذہبیات، منصوبہ بندی، کارپوریشن، خبروں کے حاشیے، بال کی کھال، فحش ادب، سودے بازی، ننگے سیار، انجمن اقوام، عالم گیر مسائل، تہوار، امتحانات اور یوم مئی وغیرہ۔ ان عنوانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی سطح میں بہت وسعت اور معلومات میں تنوع ہے۔ زبان کی ادبیت اور شیرینی، سلاست و لطافت

کی مدد سے اپنے مخصوص طرز کے ذریعہ قاری کے اچھے جذبات بیدار کرنے میں پوری طور پر کامیاب رہتے ہیں۔
شوکت تھانوی "ہمدم" "تحریک" اودھ اخبار" سرپنچ" "طوفان" "ہند" "حق" اور "جنگ" میں مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

شوکت تھانوی کی کالم نگاری کا آغاز روزنامہ "ہمدم" سے ہوتا ہے جس میں وہ "دو دو باتیں" لکھتے تھے۔ یہی سلسلہ اودھ اخبار "سرپنچ" "طوفان" اور "ہند" میں بھی انھوں نے جاری رکھا۔

"دو دو باتیں" کا یادگار معرکہ سیماب اکبرآبادی کے "تاج" ہفتہ وار سے ہوا تھا۔ جس میں سیماب نے اپنے شاگرد خواجہ ستار الحسن جمیل مدیر "فرشتہ" ہفتہ وار کو بھی شہ دے کر آگے بڑھا دیا۔ شوکت تھانوی نے "فرشتہ" کے لیے لکھا کہ

"فرشتہ" تو فرشتہ اس کے معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر نہیں ہے کہ "ہمدم" روزانہ اخبار ہے اور یہ گنڈے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار اس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ایک ہفتہ میں ایک بار جواب بھی دے سکیں تو بھی ہفتہ کے باقی دن سہلاتے گزر جایا کریں گے۔"

بات یہاں تک بڑھی کہ سیماب نے تلملا کر شوکت تھانوی کو باتونی اور شیطان کی اولاد قرار دیا اور شوکت تھانوی نے ان کے مصرعہ کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ع:

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

ان کو "فطرت کا تمسخر" تسلیم کر کے بحث ختم کر دی۔ دوسرا یادگار معرکہ "بوڑھے" اودھ پنچ اور "نوجوان" سرپنچ میں ہوا۔ اس میں بھی شوکت تھانوی غالب رہے اس معرکہ سے لطف اٹھانے کے لیے اودھ پنچ اور سرپنچ کی پرانی فائیلوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ سرپنچ میں شوکت تھانوی کے قلم کی دھاک سے میدان صحافت کے بڑے بڑے سورما چوکنا رہنے لگے کہ معلوم نہیں کب کس کی خبر لے لی جائے۔

روزنامہ "تحریک" میں شوکت تھانوی نے "لالہ زار" کے نام سے فکاہی کالم لکھنا شروع کیا، اس کا ایک تاریخی فقرہ آپ بھی سنیے اور لطف اٹھایئے۔

"مولانا شوکت علی اپنے چھوٹے بھائی محمد علی کا شاہکار ہیں۔" روزنامہ "حق" میں شوکت تھانوی "حق و باطل" کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

بعد میں شوکت تھانوی نے "جنگ" میں "وغیرہ وغیرہ" اور اس کے بعد "بہاڑ تلے" کا کالم سنبھالا۔

"وغیرہ وغیرہ" میں "تیز گام" پر لکھتے ہیں ...... "تیز گام" بے طعام، خدا اس ٹرین سے سفر کی اپنے ہر نیک بندے کو توفیق عطا فرمائے مگر ان نیک بندوں کے ان اعمال کو بخش دے۔ جن کی پاداش میں انھیں کھانا کھانا پڑتا ہے۔ اس عذاب خوردنی سے وہ عاقبت اندیش بچ جاتے ہیں۔ جو ناشتہ ساتھ لے کر چلتے ہیں...... ورنہ...... چائے کا پہلا ہی گھونٹ پی کر یہ محسوس ہوا کہ حقّے کے پانی میں کالی مرچیں حل کرنے کے بعد دودھ اور شکر ملا دی گئی ہے...... بیرے سے لاکھ لاکھ پوچھا کہ یہ کس جڑی بوٹی کی چائے ہے اور کن امراض

یہ مفید ہے مگر وہ اس خاندانی نسخہ کا بھید کھولنے کو تیار نہ ہوا۔ اس لیے کہ اس قسم کے نسخے لوگ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔۔۔ سب سے پہلے میرے سامنے سوپ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کتے کے پانی پر چونے کی کچھ چھینٹیں پڑی ہیں۔ اعتراض اس لیے نہ کیا کہ بیرا گنوار نہ سمجھے، سوپ کا پہلا ہی چمچہ پی کر معلوم ہوا کہ یہ دراصل کتے کا تھا بلکہ جس پانی میں گوشت دھویا گیا ہے۔ اسی کو گرم کرلیا گیا ہے۔ بہ مشکل اس گھونٹ کو حلق سے اتار کر ہٹا دیا۔ اس کے بعد مرغی کے کچھ ٹکڑے گاجر کے چند قتلوں اور آلو کی چند قاشوں کے ساتھ بیرا کی کی کرتے ہوئے سامنے آئے۔۔۔ مرغی کے ٹکڑے اس قدر سخت تھے کہ چھری جواب دے گئی۔ دانت بے کار ہوئے۔۔۔۔ بہر حال ہم نے یہ بوٹیاں اپنے پسماندگان کے لیے چھوڑ دیں۔ مچھلی آئی تو اس قدر باسی یقین ہو گیا کہ یہ طوفانِ نوح کے موقع پر پکڑی گئی تھی اور آج ہمارے معدے کو تاریخی اہمیت دینے کے لیے سامنے پیش ہوئی ہے۔"

"بہار تیلے" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور اجازت دیجیے :

ایک صاحب اپنے ایک دوست کی وفات حسرت آیات کی خبر سن کر رو پیٹ کر صبر کر چکے اور ان کے دعائے مغفرت کر چکے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک دن وہی مرحوم بیٹھے تھے، زندہ سلامت چلے آرہے ہیں اور حسب جوشِ محبت سے ان کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان صاحب نے چار قدم پیچھے ہٹ کر جلدی آیات پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا، ان دوست کے پیروں پر نظر ڈالی کہ پنجے آگے کی طرف ہیں یا ایڑی آگے اور بیچ بچاؤ۔ ان کی آواز پر غور سے کان دھرے کہ یہ حضرت ناک سے تو نہیں بول رہے ہیں اور جب ہر سے اطمینان کر لیا تو خود ان سے دریافت کیا کہ شاید آپ کا تو انتقال ہو چکا تھا پھر کیسے زحمت فرمائی؟

پھر ملیں گے......

" سپریم کورٹ کے جج جسٹس صغیر احمد صاحب سے ایک حالیہ ملاقات میں اردو طنز و مزاح کی صورت حال پر تفصیلی گفتگو ہوئی، شوکت تھانوی کے ایک مضمون "ب" کا انھوں نے خاص طور سے ذکر کیا اور فرمایا کہ شوکت تھانوی کے ادبی کارناموں سے نئی نسل کو واقف کرانا ضروری ہے۔ ہم نے فوری طے کر لیا کہ ایک شمارہ شوکت تھانوی کے لیے وقف کر دیں۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ شمارہ شوکت تھانوی کے فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتا خصوصاً مزاحیہ ناول نگار کی حیثیت سے جو منفرد مقام انھوں نے حاصل کیا تھا ان کے بے مثال کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ تاہم اس شمارہ کے ذریعہ شوکت تھانوی کی یاد کا سلسلہ قائم رکھنے کی حقیر سی کوشش کی گئی ہے۔

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/C سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ، عابد روڈ۔ حیدرآباد 500001

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات (2) اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25٪ کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار (6000/-) روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20٪ کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح 6½٪ سود پر دیا جاتا ہے ـــــ کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت مارچ 94ء تک 51935 افراد میں 19,02,13,000 روپے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 74,22,05,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2644 افراد میں 1,83,56 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 584.44 لاکھ روپے ہوتی ہے، جاری کر چکا ہے اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985ء سے اب تک 54579 افراد میں 1125.69 لاکھ روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 4906.49 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو، اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 12 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (32) ہنر سکھانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپ رائٹنگ، 10 کو لائٹ ڈرائیونگ 11 افراد کو لیاب ٹیکنیشن، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن، 9 کو ٹیلرنگ، 13 کو ویڈیو گرافی، 15 کو فیبریکیشن، 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ، 5 کو ہیرے تراشنا 6 کو کارپنٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 218، نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس طرح اس سال جملہ 1180 اُمیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔ خواہشمند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علیخاں (مینجنگ ڈائرکٹر)

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ **شگوفہ** حیدرآباد

جلد : ۲۸ شمارہ : ۸ اگست ۱۹۹۵ء

بت : محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف
عت : دائرہ پریس۔ حیدرآباد

ت فی پرچہ : ۹ روپے
خریداری : ۹۰ روپے
ونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :۔
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔ ۱
فون آفس : 595716 رہائش : 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

بال کی کھال (تبصرہ)

* * *

قطعۂ تاریخ:

* * *

چورن (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4.1.825/C سکنڈ فلور، لکشمی اسٹیٹ، عابد روڈ حیدرآباد 500001

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کاروبار وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو بیس 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ما باقی بینک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار (/6000) روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، بزنس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح 6½% سود پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ (2) اسکیموں کے تحت مارچ 94ء تک 51935 افراد میں 10,02,13,000 روپے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 43,22,05,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2644 افراد میں 1,25,56 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 584.44 لاکھ روپے ہوتی ہے، جاری کر چکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985ء سے اب تک 54579 افراد میں 1125.69 لاکھ روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 4906.49 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزنوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کیے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (13) ہنر سکھانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپ رائٹنگ، 100 کو لائٹ ڈرائیونگ، 11 افراد کو لیاب ٹیکنیشین، 7 کو بیوٹیشن، 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن، 5 کو ٹیلرنگ، 13 کو ویڈیوگرافی، 15 کو فیبریکیشن، 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ، 5 کو ہیرے تراشنا، 6 کو کارپینٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 218 نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔

خواہشمند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علیخان

(مینجنگ ڈائرکٹر)

مجتبیٰ حسین

جرم جمہوریت اور سیاست

پچھلے دنوں ہم کناٹ پلیس سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ ایک بس کے اندر سے لوگوں نے ایک نوجوان کو کھینچ کر باہر نکالا اور لگے اس کی پٹائی کرنے۔ پتہ چلا کہ اس نوجوان نے کسی کی جیب کاٹ لی ہے۔ پٹائی کے دوران ایک صاحب نے اس سے پوچھا "یہ بتا تیرا تعلق کس پارٹی سے ہے۔" نوجوان نے کہا "میں اکیلا ہی یہ کام کرتا ہوں اور میرا تعلق کسی گروہ یا پارٹی سے نہیں ہے۔" ان صاحب نے کہا "میں یہ نہیں پوچھ رہا ہوں کہ تیرا تعلق جیب کتروں کی کس ٹولی سے ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تیرا تعلق کس سیاسی پارٹی سے ہے۔ جنتا دل، بی جے پی سے یا کس سے ہے؟" نوجوان نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "صاحب جی! میں خالص جیب کترا ہوں اور میرا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے۔" مگر لوگ کسی قیمت پر یہ جاننے کو تیار نہیں تھے کہ یہ نوجوان جیب کترا ہے لیکن اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے۔ بعد میں اس جیب کترے کو پولس کے حوالے کیا گیا تو ایک اور صاحب نے کہا "آپ لوگوں نے یہ غلط کیا کہ اسے پولس کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے سیاسی آقا کا فون آ جائے گا اور یہ چھوٹ جائے گا۔" اگرچہ سارے لوگ اس کے مخالف تھے لیکن ہمیں نہ جانے کیوں اس نوجوان پر ترس آ رہا تھا۔ اس نے جس طرح اقبال جرم کیا تھا اس سے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ اس نوجوان کا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر تعلق ہوتا تو وہ یوں آسانی سے اقبال جرم نہ کرتا۔ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ سوشلزم کا نام لے کر لوگوں کی جیب کاٹ سکے یا ملک کی سالمیت اور اس کی تہذیب کی بقا کا حوالہ دے کر لوگوں کو دھوکا دے سکے۔ وہ تو سراسر جیب کترا تھا اور جیب کترے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ برے کام کا کوئی اچھا سا عنوان کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

جب سے ملک کی سیاست میں جرائم پیشہ افراد کے شامل ہونے کی اطلاعات ملنے لگی ہیں تب سے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ سیاست دان کون ہے اور مجرم کون ہے۔ جرم کہاں ختم ہوتا ہے اور سیاست کہاں شروع ہوتی ہے۔ اب سے کچھ ہی دن بعد ہم اپنی آزادی کی ۴۸ ویں سالگرہ منانے والے ہیں۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے آزادی کے بعد جب جمہوریت کو اپنایا تھا تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ہماری قوم جمہوریت کا یہ حشر کرے گی۔ پچھلے دنوں چیف الیکشن کمشنر ٹی این سیشن نے کہا تھا کہ اتر پردیش اسمبلی کے جملہ ۴۲۵ ارکان میں سے ۱۸۰ ارکان جرائم کا باضابطہ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ اور ان کا تعلق مختلف سیاسی جماعتوں سے ہے گویا جرائم کا ریکارڈ رکھنے والے مزید چالیس پچاس ارکان اسمبلی منتخب ہو جائیں تو نہ صرف خود اپنی ایک الگ پارٹی بنا سکتے ہیں بلکہ اپنی اکثریت کی بنیاد پر اپنی حکومت بھی تشکیل دے سکتے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ملک کی جو صورت حال ہے اس کے پیش نظر اب سیاسی جماعتیں سماجی فلاح و بہبود اور ملک کی خوشحالی کے بلند بانگ دعوے نہ کریں بلکہ جرائم کو ہی بنیادی انتخابات کا موضوع بنائیں اور اپنے منشور میں اسی طرح کی سہولتوں کا اعلان کریں کہ ہر رائے دہندہ کو سال میں صرف دو وارداتیں کرنے، دس ڈاکے ڈالنے، پانچ افراد کو اغوا کرنے کی سہولت حاصل رہے گی۔ جیب کاٹنے کی کھلی آزادی رہے گی۔ فسادات کرانے والوں سے کوئی بازپرس نہیں کی جائے گی۔ ڈاکوؤں اور نقب زنوں کی سہولت کے لیے عوام کو پابند کیا جائے گا کہ وہ اپنے گھروں کو مضبوط تالوں سے بند نہ کیا کریں بلکہ ملک میں تالے بنانے کے کاروبار پر بھی پابندی عائد کر دی جائے گی جو کوئی تالہ بناتے ہوئے پکڑا جائے گا اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا جائے گا۔ جب عملی سیاست میں جرم کو ہی کلیدی اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے تو ہماری یہ تجویز بھی ہے کہ کیوں نہ اسکولوں کے نصاب میں جرائم کی باضابطہ تعلیم شریک کی جائے۔ بہت زیادہ تعلیم سے جرائم کی شدت مجروح ہوتی ہے اور بلا وجہ سوز و گداز پیدا ہوتا ہے جس سے آدمی میں انسانی جذبات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ آدمی کو اب انسانی جذبات کی نہیں حیوانی جذبات کی ضرورت ہے۔ پچھلے ہفتے جب سیاست میں جرائم پیشہ افراد کے غلبہ کا سانحہ ملک میں چرچا ہونے لگا تو برسر اقتدار پارٹی کے ایک اہم لیڈر نے کہا کہ غنڈے، بدمعاش اور غیر سماجی عناصر صرف حکمران پارٹی میں ہی نہیں بلکہ ملک کی ساری جماعتیں ایسے عناصر ...... سے بھری پڑی ہیں۔ کسی ایک پارٹی کو دوش دینا مناسب نہیں ہے۔ اس بیان میں بے بسی کے ساتھ ساتھ جس بے حسی کا اظہار کیا گیا ہے اس سے ہمیں سخت کوفت ہو رہی ہے۔ اب حالت یہ ہو جائے گی کہ کوئی ڈاکہ پڑے تو لوگ پولیس اسٹیشن جانے کے بجائے سیدھے سیاسی جماعتوں کے دفتروں پر جائیں گے کہ بھیا ڈاکو اگر آپ کی پارٹی میں موجود ہوں تو ان سے کہہ کر ہمارا مال واپس کرائیں۔ کچھ مال پارٹی فنڈ میں رکھ بھی لیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اسی پر ہمیں سندھ کے مشہور صوفی شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ایک واقعہ یاد آگیا وہ جس شہر میں رہتے تھے وہاں کوئی زبردست ڈاکہ پڑا تو کوتوال شہر نے اعلان کیا کہ جو کوئی ان ڈاکوؤں کو پکڑے گا اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ لوگ ڈاکوؤں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی اپنے حجرے سے غائب ہو گئے۔ مریدوں نے بہت ڈھونڈا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک دن کسی نے آکر اطلاع دی کہ شاہ صاحب تو شہر کے قبرستان میں بیٹھے ہوئے ہیں سارے مریدان کے پاس پہنچے اور ان سے قبرستان میں گوشہ نشین ہونے کا سبب دریافت کیا۔ اس پر شاہ

صاحب نے کہا "میں تو ڈاکوؤں کو بخشنے کے ارادہ سے یہاں مقیم ہوگیا۔ مریدوں نے کہا "ڈاکو آپ کو یہاں کہاں ملیں گے انھیں جنگل بیابانوں میں ڈھونڈیئے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ ڈاکو چاہے کہیں بھی چلے جائیں آخر کار انھیں آنا تو یہیں ہے۔ میں تو ایسی جگہ بیٹھا ہوں جہاں سے وہ بچ کر نہیں جاسکتے۔ ہمارے ملک میں بھی مجرمین جرم کر کے کہیں بھی چلے جائیں آخر کو وہ پارٹی کے دفتر میں آئیں گے ہی۔"

اصل میں ہمارے ملک میں جمہوریت کی بنیاد مصنوعی باتوں پر رکھی جا رہی ہے۔ عقیدہ نظریہ سب ذیلی چیزیں ہیں۔ ہمارے ہاں مختلف سیاسی جماعتوں کی ریلیاں ہوتی ہیں جن میں عوام کو بسوں میں بھر بھر کر لایا جاتا ہے ان بیچاروں کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ کس پارٹی کی طرف سے آتے ہیں کیوں آتے ہیں اور ان کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ ایک بار ہم نے ایک ریلی میں حصہ لینے والے ایک نوجوان سے پوچھا تھا۔ "میاں تم کس پارٹی کی ریلی میں آئے ہو؟" معصومیت سے جواب دیا "حضور مجھے کیا معلوم ہمارے ٹھیکیدار سے پوچھیے۔ اب تک میں ہر سیاسی پارٹی کی ریلی میں شرکت کر چکا ہوں۔ اس بار جلدی میں نکلنا ہوا۔ ٹھیکیدار نے ہمیں نہیں بتایا کہ ہمیں کون سے نعرے لگانے ہیں اور کیا کرنا ہے۔"

لوگوں کو جمع کرنا بھی اب ایک پیشہ بن گیا ہے۔ پرانی دہلی میں ایک صاحب ہیں جو دو گھنٹوں کی نوٹس پر جلسوں اور ریلیوں میں عوام کو فراہم کرنے کا بندوبست کرتے ہیں۔ فی کس پندرہ روپے چارج کرتے ہیں۔ بسوں اور لاریوں کا کرایہ اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ ہمارے ایک مالدار دوست ہر سال اردو کا ایک مشاعرہ کرتے ہیں جس میں بڑی بڑی شخصیتوں کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کرتے ہیں۔ ایک سال انھوں نے ایک ممتاز شخصیت کو بطور مہمان خصوصی مدعو کر لیا۔ پھر سوچا کہ اگر مشاعرہ میں سامعین زیادہ آئیں تو مہمان خصوصی کو مایوسی ہوگی۔ ہم سے مشورہ کیا تو ہم نے یونہی پرانی دلی کے ان ٹھیکیدار صاحب کا حوالہ دے دیا۔ غرض انھوں نے پانچ سو افراد کو مشاعرہ میں بٹھانے کا معاہدہ کر لیا اور پیشگی رقم بھی دے دی۔ مشاعرہ میں سامعین آنے لگے تو دیکھا کہ اچانک دو تین بسوں میں بھر کر کئی سادھو چلے آرہے ہیں۔ ہمارے دوست نے ٹھیکیدار سے کہا کہ مشاعرہ میں ان سادھوؤں کا کیا کام۔ دست بستہ بولے "حضور ایک غلطی ہوگئی۔ مجھے بیک وقت ایک مذہبی تقریب اور آپ کے مشاعرہ کے لیے سامعین کو فراہم کرنا تھا۔ مشاعرہ کے سامعین تو غلطی سے مذہبی تقریب میں چلے گئے اور مجھے مجبوراً مذہبی تقریب کے سامعین کو مشاعرہ میں لانا پڑا۔ آپ فکر نہ کریں یہ ہر شعر پر ایسی داد دیں گے کہ آپ ان کی سخن فہمی کے قائل ہو جائیں گے"

چنانچہ جب مشاعرہ شروع ہوا تو دیکھا کہ ان سامعین نے آداب مشاعرہ کا اتنا پاس و لحاظ رکھا کہ ہر شاعر سے اس کا ہر شعر دو دو بار پڑھوایا۔ ابھی شعر ختم بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ سامعین مکرر ارشاد کا شور بلند کر دیتے تھے۔ نتیجہ میں جس مشاعرہ کو رات میں گیارہ بجے ختم ہونا تھا وہ رات کے دو بجے تک جاری رہا۔

اصل میں ہمارے سماج کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ جب اقدار نام کی کوئی چیز ہی باقی نہیں رہی تو آپ کو اس سے کیا مطلب کہ سیاست داں جرم کر رہے ہیں یا جرائم پیشہ افراد سیاست میں شامل ہیں۔

قلمی معاونین

اپنے مسودات صاف ستھرے خط میں سیاہی سے لکھ کر روانہ کریں

خواہ مخواہ (بمبئی)

غزل ہوتی ہے

مال و دولت کی چمک ہو تو غزل ہوتی ہے
سونے چاندی کی دمک ہو تو غزل ہوتی ہے

دل میں میٹھی سی کسک ہو تو غزل ہوتی ہے
اب تو سکوں کی کھنک ہو تو غزل ہوتی ہے

شاعری پہلے عبادت کی طرح ہوتی تھی
اب شراب کی مہک ہو تو غزل ہوتی ہے

یا کسی ناچتی گاتی ہوئی رقاصہ کے
گھنگھروؤں کی بھی چھنک ہو تو غزل ہوتی ہے

کل غزل لکھنے محبت کا نشہ کافی تھا
آج سوڈے میں نمک ہو تو غزل ہوتی ہے

شاعری میں کبھی ملحوظ ادب رہتا تھا
اب کسی کی بھی ہتک ہو تو غزل ہوتی ہے

کہکشاں کی طرح اشعار تھے روشن روشن
اب اندھیرے کی دھنک ہو تو غزل ہوتی ہے

خواہ مخواہ ذہن میں اشعار نہیں آسکتے
نقد روپے ہوں یا چیک ہو تو غزل ہوتی ہے

قطعات

خواہ مخواہ (بمبئی)

لوگ اب جب بھی ملا جیسا ملا کھانے لگے
دین چھوڑا اور دنیا کی طرف جانے لگے
میرے گھر قرآن خوانی تھی ولیمہ تھا ادھر
آتے آتے اس طرف، سب اس طرف جانے لگے

○

خیال اچھے نہیں آتے تو خالی کھوپڑی اچھی
دکھاوے کے اجالے سے اندھیری کوٹھری اچھی
سکوں سے خواہ مخواہ دن میں بھی جس میں نیند آتی ہے
کرائے کے محل سے ایسی ذاتی جھونپڑی اچھی

○

دل میں جو درد جوانی کا نہاں ہوتا ہے
بعد شادی کے وہی سب پہ عیاں ہوتا ہے
خواہ مخواہ درد ضعیفی کا نہ پوچھو مجھ سے
اک جگہ ہو تو بتاؤں کہ یہاں ہوتا ہے

○

ٹھکانہ ہی نہیں نام و نشاں تبدیل کر ڈالو
زمیں کی بات کیا ہے آسماں تبدیل کر ڈالو
کسی کو گھر بلا کر خواہ مخواہ حیران کرنا ہو
پتہ اپنا وہی رکھو مکاں تبدیل کر ڈالو

پرویز ید اللہ مہدی
(شارجہ)

ذکر ایک سمینار کا (۱)

کچھ عرصہ پہلے ایک سمینار میں زبردستی شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا ۔ زبردستی کا لفظ ہم نے یہاں اس لیے استعمال کیا ہے کہ سمیناروں میں شرکت سے ہم بالعموم احتراز کرتے ہیں۔ تاہم اس احتراز اور احتیاط سے بخدا یہ مت سمجھیے گا کہ ہم سمیناروں میں شرکت کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ اصل میں ہم خود کو سمیناروں کا اہل نہیں سمجھتے کیوں کہ سمیناروں میں عموماً جو کچھ کہا سنا اور پیش کیا جاتا ہے، جو قراردادیں منظور کی جاتی ہیں ان کا سمیناروں کے اصل موضوع سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے سمیناروں میں شریک ہو کر نہ صرف یہ کہ اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا بلکہ بے سر پیر کی باتوں پر داد دینا بڑے دل گردے اور پتے کا کام ہے جبکہ ہم ایسے سمینار ہضم "دل گردے اور پتے" سے کلیتاً محروم ہیں، دوسرے ہمارے سمیناروں کی یہ روایت رہی ہے کہ ان میں بنفس نفیس شرکت فرمانے والے خصوصی مہمانوں اور صدور حضرات کا کورم ..... اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں کوئی نہ کوئی چلتا پرزہ لیڈر مع اپنے جھوٹے وعدوں اور منہ زبانی یقین دہانیوں کے شامل نہ ہو بلکہ نامور عالموں، فاضلوں، اسکالروں پر انگوٹھا چھاپ لیڈروں کو ترجیح دینے کی لعنت ہم اردو والوں میں بدعت کی طرح عام ہو گئی ہے۔ ہمیں اقبال صدی تقاریب کے سلسلے کا وہ سمینار کبھی نہیں بھولتا جس کی صدارت ایسے ہی انگوٹھا چھاپ دل بدلو نیتا نے فرمائی تھی۔ جن کی جہالت کے چرچے لوں تو چار دانگ عالم میں پہلے ہی مشہور تھے اس پر جو صدارتی تقریر موصوف نے مذکورہ سمینار میں فرمائی تھی وہ ان کی جہالت کے تابوت میں آخری کیل کے مماثل تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے موصوف کی صدارتی تقریر کا ایک ایک لفظ ہمیں آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ جب سمینار کے تمام مقررین علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے تو صدر موصوف بمشکل طمطراق سے ڈائس پر تشریف لے آئے اور یوں اپنی گل افشانی کے جوہر دکھلانے شروع کیے "بھائیو!

بہنو اور بھائیو! اس سے پہلے کہ میں اپنی صدارتی تقریر کا باقاعدہ آغاز کروں مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج کے سمینار کے سارے کے سارے فاضل مقررین سے ایک فاش غلطی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اقبال صاحب کے تعلق سے سبھی نے صیغۂ ماضی استعمال کیا جبکہ سچائی یہ ہے کہ اقبال صاحب الحمدللہ ابھی حیات ہیں اور میں اس بات کا چشم دید گواہ ہوں بلکہ آپ نے بھی تو آتے جاتے انھیں نکڑ والے پبلک ٹیلی فون بوتھ پر بیٹھے ہوئے بارہا دیکھا ہوگا۔ اب آپ سے کیا چھپانا، اقبال صاحب کو پبلک ٹیلی فون میں نے ہی معذوروں کے کوٹے سے دلوایا ہے اس سلسلے میں اقبال صاحب نے میرے پارٹی آفس کے کئی چکر لگائے تھے لیکن کبھی اپنے بارے میں اپنے منہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ آج اگر میں اس سمینار کی صدارت نہ کر رہا ہوتا تو مجھے کبھی یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ پبلک ٹیلیفون بوتھ والے اقبال صاحب اس قدر چھپے رستم ہیں، اتنی اچھی شاعری کرتے ہیں، "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" جیسا قومی گیت انھوں نے ہی لکھا ہے "شکوہ"، "جواب شکوہ" انہی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔"

مذکورہ صدارتی ارشادات کے اقتباس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم اگر اس قماش کے سمیناروں میں شرکت سے احتراز کرتے ہیں تو کچھ غلط نہیں کرتے۔ اب رہی اس سمینار کی بات جس میں ہم زبردستی اپنی شرکت کا اعتراف شروع میں ہی کر چکے ہیں۔ اس کے تعلق سے تھوڑی سی وضاحت کیے دیتے ہیں کہ اس سمینار کا تعلق ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں کیا گیا تھا جہاں ہم اپنے ایک رشتہ دار سے ملنے گئے تھے جو کبھی ہمارے قریبی رشتہ دار ہوا کرتے تھے لیکن جب سے انھوں نے امریکہ آباد کر لیا تھا دور کے رشتے دار بلکہ دور کے ڈھول ہو چکے تھے۔ برسوں بعد اچانک وطن کی یاد انھیں واپس کھینچ لائی لیکن اس دوران میں چونکہ امریکہ کے ماحول نے انھیں گھٹیا کام اور فائیو اسٹار آرام کا عادی بنا دیا تھا لہٰذا کسی دیسی رشتہ دار کے ہاں قیام کرنے کے بجائے فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب فرمایا جس وقت ہم ان سے ملنے ہوٹل پہنچے وہ پوری طرح بنے ٹھنے نو دولتیوں کی طرح اپنی شان امارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے کہیں جانے کو پر تولتے دکھائی دیئے نقشہ ہو بہو وہی تھا

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں وہ نکلتا تھا کہ ہم پہنچے

ہم نے شکایتی لہجے میں کہا "یہ کیا حضور والا ہم آپ سے ملنے آئے ہیں اور آپ کہیں اور تشریف لے جا رہے ہیں، یہ تو وہی بات ہوئی کہ میں چاہوں تمھیں اور تم چاہو جنگل کے جھاڑوں کو۔"

بولے۔ "دل چھوٹا مت کرو، میں جنگل کی طرف نہیں جا رہا ہوں یہیں اس ہوٹل کی لابی میں ایک بہت بڑا سمینار ہو رہا ہے اسی میں "گیسٹ آف آنر" کی حیثیت سے شریک ہونے جا رہا ہوں۔" ہم نے طنزیہ لہجے میں کہا "گویا آپ اتنی دور سے محض اس سمینار میں شرکت فرمانے تشریف لائے ہیں۔"

بولے اصل بات یہ ہے کہ میری شہرت اکثر مجھ سے پہلے پہنچ جاتی ہے منتظمین سمینار کو جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ ایک معماری گرین کارڈ ہولڈر اتفاق سے اس ہوٹل میں قیام پذیر ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور دوڑے دوڑے میرے پاس پہنچے۔ پہلے اپنے سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی پھر گڑگڑا کر استدعا کی۔ ان کے سمینار میں کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے مغربی بنگال تک ہر علاقے سے بے شمار مندوبین شرکت فرما کر اپنے اپنے

...عرب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ایسے میں اگر میں ان کی دعوت قبول کر لوں تو امریکہ کی بھی نمائندگی ہو جائے گی اور ان کا سیمینار بھی نیشنل سے انٹرنیشنل ہو جائے گا۔ لہٰذا میں نے ان کے سیمینار کو محض انٹرنیشنل رتبہ عطا کرنے کی نیت سے دعوت قبول کر لی سا تنا کہہ کر موصوف نے فوراً ہمارا ہاتھ پکڑا اور ہمارے لاکھ انکار کے باوجود زبردستی ہمیں سیمینار میں گھسیٹ لے گئے۔!

(۲)

جس وقت ہم نے جائے واردات یعنی مقام سیمینار پر قدم دھرا ایک انبوہ کثیر وہاں پہلے ہی موجود تھا۔ منتظمین سیمینار نے توقع کے مطابق ہمارے امریکی رشتہ دار کو ہاتھوں ہاتھ شہ نشین کی طرف اور ہمیں سامعین کی پچھلی صفوں کی جانب ہنکا دیا۔ جب ہم نے شرکائے سیمینار کے جم غفیر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو حیرت کی انتہا نہ رہی، شہر کے تقریباً سارے ہی مشہور و نامور مطلقہ حضرات و خواتین کو ایک ہی جگہ ایک ہی چھت کے نیچے یکجا پا یا ایسا لگ رہا تھا جیسے شہر کے تمام طلاق یافتہ مرد وزن کا میلہ لگا ہو یا ان کی نمائش ہو رہی ہو مطلقہ افراد کے اس حیرت انگیز اجتماع کی وجہ تسمیہ کا سبب جاننے کے لیے ہم اپنی متلاشی نظریں ادھر ادھر دوڑا رہے تھے کہ اچانک نظر سیمینار کے جھولتے ہوئے بینر سے ٹکرائی جس پر سیمینار کا موضوع جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا: "آج کل کی شادیوں میں ناکامی کے اسباب" سیمینار کے موضوع نے ہماری یہ حیرت خود بخود دفع کر دی اور اس کے ساتھ منتظمین سیمینار کے نظر انتخاب کی داد دینے کو بھی جی چاہا کیونکہ گیسٹ آف آنر عرف مہمان خصوصی کی حیثیت سے ہمارے جن امریکی رشتہ دار کا انھوں نے انتخاب فرمایا تھا۔ وہ بجائے خود موضوع سیمینار کا چلتا پھرتا اشتہار تھے کیونکہ امریکہ سدھارتے ہوئے اپنے پیچھے ایک عدد منکوحہ وطن مالوف میں چھوڑ گئے تھے جو بے چاری نیک پروین کی طرح تادم تحریر ہر نماز میں اپنے سہاگ کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی ہے . . . . اس کا سہاگ امریکہ میں نہ جانے کتنے روزے بخشوا چکا ہے اس کا مکمل و مفصل حساب کتاب موصوف ہی جانیں یا پھر کاتب تقدیر یہ تو ہوا مہمان خصوصی کا شادیوں کے موہیے پیرنا کامیوں کا رلکارڈ، صدر سیمینار بھی اتفاق سے کچھ کم نہیں تھے کہ دو مرتبہ رنڈوے ہونے کا ریکارڈ تو رکھتے ہی تھے اس کے علاوہ موصوف کی حالیہ شریک حیات کے حال ہی میں کسی غیر ملکی کے ساتھ بھاگ جانے کی افواہ بھی ان دنوں شہر میں گرم تھی گویا سیمینار کے صدر اور مہمان خصوصی کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر بلکہ چھان پھٹک کے بعد کیا گیا تھا۔ بعد ازاں جب سیمینار شروع ہوا تو دیگر شرکائے سیمینار نے بھی اپنے قول و فعل اور حرکات و سکنات سے یہ ثابت کر دیا کہ اس معاملے میں وہ بھی صدر اور مہمان خصوصی سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ ایک شعلہ بدن، شعلہ بیان خاتون مقرر نے فرمایا" آج زمانہ چاند پر پہنچ گیا ہے مریخ و دیگر سیارے ہماری پہنچ سے دور نہیں لیکن افسوس دنیا کی اس حیرت انگیز ترقی کے باوجود ہندوستانی مردوں کی اکثریت کی سوچ وہی پتھر کے زمانے والی ہے کہ اکثر ہندوستانی شوہر آج بھی بیوی کو اپنے پاؤں کی جوتی اور خود کو بیوی کا سرتاج سمجھتے ہیں، بیوی اگر اپنے دفتر کے کسی مرد ساتھی کے ساتھ ہنس کر بات کر لیتی ہے تو شوہر نامدار کے دل میں شک کا شعلہ بھڑکنے لگتا ہے۔ میری نظر میں شک کے اس شعلے کو ٹھنڈا کرنے کا ایک ہی علاج ہے۔ تیکھی میاں کے منہ پر طلاق کا ایک زوردار طمانچہ!"

جبکہ بیوی کا طمانچہ کھائے ہوئے ایک مطلقہ مقرر نے یوں اپنی بپتا سنائی" مردوں کو شکی کہنے والی خواتین

یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ شکی فطرت ہوتی ہیں۔ میں نے اگرچہ اندر زندگی کی قید بامشقت صرف ایک برس ہی کاٹی ہے لیکن جب وہ دن یاد کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے حبسِ دوام عرف عمر قید کاٹی ہو، میری سابقہ بیوی کے شک کا عالم یہ تھا کہ میں جب بھی کسی سرکاری دورے پر جاتا اس پر یہی دورا پڑتا کہ میں دورے پر نہیں گیا بلکہ اپنی سکریٹری کے ساتھ ہنی مون پر گیا ہوں۔ اس کے اس خیالی ہنی مون نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس کے بے بنیاد شک کا کسی طرح علاج کروں لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور ہوتا بھی کیسے؟ شک اور عورت تو ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں: کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ اے عورت تیرا دوسرا نام ہے شک!

قصہ مختصر یہ کہ ہر مقالہ نگار نے جی بھر کے اپنے جلے پھپھولے پھوڑے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیر کا یہ سمینار کی ازدواجی زندگی کی طرح سمینار بھی بڑی کامیابی کے ساتھ ناکام ہو گیا۔

البتہ جب گھر لوٹ کر ہم نے اس تلخ موضوع پر کافی غور و خوض کیا تو اس کی سب سے بڑی اور اور بنیادی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اصل میں آج کل کی شادیوں میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ بیوی کے حد سے زیادہ دوست اور میاں کی بے حساب سہیلیاں ویسے اس میں آج کے میاں بیوی کا بھی اتنا قصور نہیں۔ آج کل ہمارے سماج کا ڈھانچہ ہی کچھ اس کروٹ بیٹھ چلا ہے کہ جس بیوی کے دوست اور جس میاں کی سہیلیاں نہیں ہوتیں ایسے میاں بیوی دقیانوسی کہلائے جاتے ہیں۔ نتیجتاً سوسائٹی میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے بلکہ انھیں "غدر" کے زمانے کا نمونہ سمجھ کر ان کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ کسی نئی روشنی کے دلدادہ شاعر نے کہا ہے:

جس بیوی کے دوست نہیں
وہ بیوی دقیانوسی ہے
جس شوہر کے نہیں سہیلی
وہ میاں جالینوسی ہے

عابد معز
(ریاض)

لَو لیٹر

ایک سہانی صبح میں چائے کی چسکیوں کے ساتھ "رابطہ" پڑھتے ہوئے آرام دہ کرسی پر نیم دراز تھا۔ بیگم سامنے مونڈھے پر بیٹھی ترکاری بنا رہی تھیں۔ موسم گرما ختم ہوا چاہتا تھا۔ آسمان پہ ہلکے ہلکے بادلوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی اور خوش گوار موسم سونی ہوائیں پودوں کو جھومنے پر مجبور کر رہی تھیں ماحول کا اثر تھا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اچانک بیگم نے شکایت کی۔

"آپ نے مجھے کبھی لولیٹر نہیں لکھا"

مجھے بیگم سے اس قسم کی شکایت کی توقع نہ تھی۔ بیگم کو مجھ سے ہزارہا گلے شکوے ہیں۔ میرے خیال میں یہ قدرتی بات ہے۔ بیوی کی ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر شوہر کا دم نکلتا ہے۔ خواہشوں کے ساتھ بیوی کو شوہر نامدار کی جان بھی عزیز تر ہوتی ہے۔ نتیجتاً وقت کے ساتھ بیوی کی خواہشیں اور ارمان شکایتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بیگم کی خلافِ توقع شکایت پر یقین نہ آیا۔ میں نے استفسار کیا۔

"کون سا لیٹر؟"

"لولیٹر" بیگم نے "لَو" پر زور دیتے ہوئے تفسیر کی۔ "لولیٹر" یعنی محبت نامہ۔ پریم پتر"

عجیب و غریب بات پہلے کبھی پلے نہ پڑی تو میں ہکلایا۔

"یعنی میں ـــــ آپ کو ـــــ لولیٹر ـــــ"

بیگم نے تیوری چڑھائی۔ آنکھیں نکالیں اور ہاتھ میں موجود چاقو کو لہراتے ہوئے آواز اونچی کر کے بولیں۔ "اور کون لکھے گا۔ شادی ہوئے دس سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں کیا آپ نے مجھے کوئی لولیٹر لکھا؟"

میں بیگم کو سمجھانے لگا۔ "کبھی موقع ہی نہ ملا کہ میں آپ کو لولیٹر لکھتا۔ لولیٹر کے لیے محبت کرنا اور محبت کی طوفانی اور وجدانی کیفیت سے گزر کر زمانے کی رسموں اور ریتوں سے بغاوت کرنا ضروری ہے۔ ہم اس

نعمت بلکہ زحمت سے محروم رہے ہے۔ میں اور آپ "نیک سیرت، صالح اور فرماں بردار نوجوان تھے۔ والدین نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے پسند کیا اور شادی کی۔ لولیٹر لکھنے کا موقع ہی ہاتھ نہ آیا۔"

بیگم نے لولیٹر نہ لکھنے کے سبب کا الٹا نتیجہ اخذ کیا "صاف لفظوں میں کہیے نا مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ بزرگوں نے شادی کی، سو نباہے جا رہا ہوں۔"

میں اپنا سر پیٹ لینا چاہتا تھا لیکن باز رہا۔ کہیں بیگم اس فعل کا کوئی اور مطلب نہ نکالیں۔ صفائی پیش کی "بیگم دس سال کے دوران ہزارہا مرتبہ اپنی الوٹ اور بے پناہ محبت کا یقین دلا چکا ہوں۔ کئی مرتبہ "پتی پرکشا" سے گزر چکا ہوں لیکن خط کبھی لکھا نہیں" دو چار پیار بھرے کلمات ہی لکھ دیتے" یہ بات کاٹی۔

"چلیے آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دیتے ہیں" میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا:

"کاغذ قلم لائیے حلفیہ لکھ دیتا ہوں یا وکیل بلائیے وصیت تحریر کر دیتا ہوں۔"

"آپ خواہ مخواہ ناراض ہونے لگے۔ لوگ محبت میں صحرا کی خاک چھانتے ہیں۔ آسمان سے تارے توڑ لاتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر نہر نکالتے ہیں۔ شاندار سی عمارتیں بنواتے ہیں۔ میں نے ایسی کوئی بے جا خواہش کا اظہار تو نہیں کیا۔ صرف لولیٹر کی فرمائش کی ہے۔"

ٹھیک ہے میں آپ کو لولیٹر لکھوں گا۔" میں نے ہتھیار ڈال دیئے تو بیگم جھٹ پوچھ بیٹھیں:

"کب؟"

"موقع میسر آتے ہی!"

"یعنی؟"

جب جدائی کے سبب خط لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کہتے ہیں فاصلہ محبت کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔"

بیگم آنکھیں چراتے ہوئے بولیں "میں اس وقت کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔"

بچوں کے اسکول میں چھٹیاں ہوئیں۔ بیگم نے میکے جانے کا پروگرام بنایا۔ مجھے دفتر سے رخصت سے منع کر دیا کہ بار بار چھٹی لینے سے سروس ریکارڈ خراب ہوگا۔ بیگم اور بچے خوشی خوشی سفر کی تیاری کرنے لگے۔ مجھے ہدایات دی گئیں کہ ان کی غیر حاضری میں کیسے رہوں۔ چائے اور سینڈوچ بنانے کا طریقہ بتلایا گیا۔ گھر کی کنجیاں حوالے کرتے ہوئے بیگم نے کہا:

"اپنا خیال رکھیے اور خیر خیریت کی اطلاع پابندی سے دیتے رہیے گا"

"جی میں فون کر لیا کروں گا" میں نے فرماں برداری سے جواب دیا۔

"فون کرنے سے پیسے ضائع ہوں گے۔ خط لکھتے رہیے گا۔"

خط لکھنے کی بات پر میں نے چونک کر بیگم کی جانب دیکھا تو انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "حضور اپنا وعدہ پورا کیجیے گا۔ آپ کو لولیٹر لکھنا ہے۔"

میں نے گردن ہلا کر اور پلکیں جھپکا کر وعدہ پورا کرنے کا اقرار کیا۔ بیگم اور بچے چلے گئے۔ مجھے لو لیٹر کی خاطر بیگم کی پلاننگ کا اندازہ ہوا۔

بیگم اور بچوں کے جانے کے بعد دو چار دن تو میں نے تنہائی کے مزے لوٹے۔ رات گئے تک سڑک گشتی کرتا رہا اور گھر آ کر چادر تان کر سو گیا۔ جلد ہی دل تنہائی سے بھر گیا۔ خالی گھر عجیب سا لگنے لگا اور در و دیوار ڈرانے لگے۔ گھر والی سے گھر بنتا ہے اور گھر ہوتا بھی اسی کا ہے۔ مرد کے لیے سارا جہان پڑا ہے۔ نیلی چھت کے نیچے محنت مشقت اور دوڑ دھوپ کرتا ہے اور سستانے کے لیے کسی مسافر کی طرح گھر کا رخ کرتا ہے۔ اب گھر والی کی مرضی، چاہے آرام کرنے دے یا آرام حرام کر دے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے، لیکن یہ بات متفقہ طور پر شوہروں نے مان لی ہے کہ گھر والی کے بغیر گھر بے معنی ہے۔

تنہائی پریشان کرنے لگی اور اس پر لو لیٹر کا مطالبہ غضب ڈھانے لگا۔ میں نے کاغذ اور قلم لے کر لو لیٹر لکھنے کا ارادہ کیا۔ سوچتا رہا کہ خط کیسے کر شروع کروں۔ القاب کیا ہوں، کیا انھیں ہمدم، ہمراز، جانِ من لکھوں یا مختصراً "سویٹ ہارٹ" کہہ کر مخاطب کروں۔ انھیں ڈارلنگ لکھوں یا "جان سے عزیز" لکھ کر اپنی جان چھڑاؤں۔ دیر تک سر کھپاتا رہا۔ آخر خط لکھنا ملتوی ٹھہرا۔ دوسری اور تیسری کوشش بھی ناکام رہی سوائے تاریخ اور دن کے ضبطِ تحریر میں کچھ نہ آیا۔ جھنجھلا کر قلم کو خیالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ لو لیٹر مکمل تھا۔

"زبیدہ۔ امید ہے کہ آپ لوگ خیریت سے گھر پہنچ گئے ہوں گے۔ امی، ابا کو دیکھ کر سفر کی تکلیف زائل ہو گئی ہو گی۔ اب دونوں کی صحت کیسی ہے؟ امی کی شکر اور ابا کا بلڈ پریشر قابو میں ہو گا۔ انھیں میرا سلام کہیے۔ بچے کیسے ہیں؟ انھیں سفر میں لطف آیا ہو گا۔ آپ کو تنگ تو نہیں کر رہے ہیں۔ ان سے کہیے کہ اپنی شرارتیں کم کریں ورنہ ابو ناراض ہوں گے۔

اپنے بارے میں کیا لکھوں گزر بسر ہو رہی ہے۔ آپ کے بنائے کھانوں سے فرج خالی ہو چکا ہے۔ کل سے نکڑ والے ہوٹل سے دانا پانی مقرر کر لیا ہے۔ دعا کیجیے کہ صحت قائم رہے۔ برتن دھونے کی کوشش میں چند برتن پھوڑ ڈالے۔ گھر کی صفائی کرنا شروع کی تو گلدان اور ٹیبل لیمپ توڑ ڈالے۔ اب برتن صاف کرتا ہوں اور نہ گھر میں جھاڑو پونچھا لگاتا ہوں۔ جھوٹے برتنوں کا انبار لگ چکا ہے اور گھر کباڑ خانہ لگنے لگا ہے۔ کپڑے میلے ہوئے تو لانڈری سے دھلوا لیے ہیں۔

بچوں کے اسکول کی فیس ادا کر دی گئی ہے۔ بجلی اور پانی کا بل بھی بھر دیا گیا ہے۔ دودھ والا اور ترکاری والا دو تین دن میں آ کر پوچھ جاتے ہیں کہ آپ کب آ رہی ہیں۔

ارادہ ہے کہ کسی ویک اینڈ پر آپ لوگوں کو واپس لینے آؤں۔ آپ کا کیا پروگرام ہے۔ کب آنے کا ارادہ ہے مطلع کریں تاکہ دفتر میں رخصت کی درخواست دے سکوں۔

حسبِ مراتب سلام، دعا اور پیار مرسل ہے ــــ فقط۔"

خط پوسٹ کر کے اطمینان اور چین کا سانس لینے بھی نہ پایا تھا کہ بیگم کا جواب موصول ہوا:

"آپ کے خط نے مایوس کیا۔ افسوس کہ وعدہ ایفا نہ ہوا۔ آپ نے جو کارنامے انجام دیے وہ خلاف توقع نہیں ہیں۔ میری واپسی کے پروگرام کا انحصار لو لیٹر پر ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیجیے۔ تب ہی ہمیں لینے آئیے گا۔

اطلاعاً عرض ہے کہ امی، ابا اور بچے خیریت سے ہیں۔ فقط ۔

مختصر تحریر سے بیگم کی برہمی اور ناراضگی کا اندازہ ہوا۔ وہ سامنے ہوتیں تو میں انھیں کسی طرح سمجھا لیتا اور منالیتا کہ شادی کے بعد لولیٹر نہیں لکھا جاسکتا۔ لولیٹر کی جگہ شوہر روزنامچہ لکھتا ہے۔ بیوی آٹے دال کے بھاؤ اور گرانی کا رونا روتی ہے۔ اشاروں اور کنایوں میں کچھ باتیں بین السطور کہہ دینا الگ بات ہے لیکن صاف الاعلان "آئی لو یو" کہنا ممکن نہیں ہے۔ مشکل یہ تھی کہ بیگم سامنے نہیں تھیں بلکہ لولیٹر کے بغیر واپس آنے کے لیے تیار بھی نہیں تھیں۔ بیگم کو راضی کرنے اور انھیں واپس بلانے کے لیے "لولیٹر لکھنا ضروری ہوگیا۔

پہلی کوشش ناکام ہونے کے بعد میں سنجیدگی سے لولیٹر اور اس کی ہیئت ترکیبی پر غور کرنے لگا۔ لولیٹر کیا ہوتا ہے۔ کیسے اور کیوں کر لکھا جاتا ہے۔ تین گھنٹے سر کھپانے کے بعد تھک ہار کر اپنے دوست راشد سے مشورہ کیا۔ اس نے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیوں میاں کہاں عشق لڑا رہے ہو؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "میری ایسی قسمت کہاں۔ آپ کی بھابی نے لولیٹر کی فرمائش کی۔"

راشد کو یقین نہ آیا: "شادی کے بعد لولیٹر کی ضرورت رہتی ہے اور نہ اہمیت مجھے نہ بناؤ۔ تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں "انجمن حقوقِ زوجگان" کا صدر ہوں بھابی پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے تمھارے ساتھ زیادتی کیوں نہ ہوجائے۔"

"تم مجھے اپنی انجمن کا نائب صدر سمجھو اور خاطر جمع رکھو۔ مجھے اپنی بیوی کو لولیٹر لکھنا ہے۔"

"سر دست میں یقین کرلیتا ہوں۔ اس لیے کہ بعض اوقات بیگمات عجیب و غریب فرمائشیں کرتی ہیں۔ پچھلے ہفتہ میں تمھاری بھابی کے ساتھ چاندنی رات میں چہل قدمی کررہا تھا تو انھوں نے مجھ سے گانا گانے کے لیے کہا تھا۔"

ہم نے سر جوڑ کر لولیٹر پلان کیا۔ محبوبہ کے حسن، نزاکت اور اداؤں کی تعریف کے بعد محبت کا بار، اقرار ہوگا۔ محبت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے مردانہ وار مقابلے کا اعلان اور آخر میں وصل کی خواہش کا اظہار ہوگا۔ خط لکھنے کے لیے اشعار کی مدد لی جائے گی، سو ہم نے چند دیوان کھنگالے۔ ایسے ایسے اشعار ہاتھ لگے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ بہت لطف آیا۔ بعض اشعار پر ہمیں لطیفوں کا گمان گزرا۔ مجموعۂ کلام سے فراغت پانے اور چند اشعار نوٹ کرنے کے بعد ہم نے نثر نگاری کے لیے افسانوی ادب کی طرف رجوع کیا۔ مایوسی نہیں ہوئی۔ دو ایک مرتبہ معشوق کی لفظی خوب صورتی پر راشد بھی دل و جان سے فدا ہوگئے۔ رہی سہی کمی پوری کرنے کے لیے، ہم نے فلمیں دیکھیں۔ دورِ حاضر کی فلموں میں محبت کا یوں عملی اظہار ہونے لگا کہ آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہوئے۔ پرانی فلمیں پسند آئیں۔ "آپ کے خوب صورت پیر دیکھے۔ انھیں زمین پر نہ رکھیے" اظہارِ محبت کا انوکھا طریقہ دریافت ہوا۔

قصہ مختصر، عرق ریزی اور دماغ پاشی کے بعد ہم نے لولیٹر کا مسودہ تیار کیا۔ لیٹر پیڈ کے لیے بازار کا رخ کیا۔ اور ایک معطر رومان پرور پیڈ خریدا۔ جس کے ایک کونے پر دل میں تیر پیوست تھا تو دوسرے پر دو محبت کے پرندے (لو برڈس) چونچ لڑا رہے تھے۔ غلطیاں ہونے پر چار چھ کاغذ پھاڑ پھینکنے پڑے۔ آخر احتیاط سے سنبھل سنبھل کر میں نے لولیٹر سپردِ قلم کیا:

میں آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو
تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

سلام محبت:

تم سے بچھڑے کچھ ہی عرصہ گزرا ہے لیکن محسوس یوں ہوتا ہے جیسے صدیاں بیت گئیں ہوں۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی پر بھاری لگتا ہے۔

تم سے بچھڑے تو سمجھ میں آیا ؎ لوگ مر کر بھی جیا کرتے ہیں

نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو آرام ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ آفس برائے نام جاتا ہوں نہ کھانے میں لطف آتا ہے نہ بھوک لگتی ہے۔ جب تمہاری یاد کی شدت بڑھ جاتی ہے اور جدائی کا احساس تڑپانے لگتا ہے تو بے مقصد سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہوں۔ تھک ہار کر لوٹ آتا ہوں تو اکیلا پن ڈسنے کو آتا ہے۔ فلیٹ کی بالکنی میں بیٹھا آسمان کو تکتا رہتا ہوں۔ چاند میں تاروں اور ستاروں میں، ثریا و کہکشاں میں جدھر نظر جاتی ہے تمہارا ہی چہرہ نظر آتا ہے۔

آنکھیں بند کرتا ہوں تو تمہاری تصویر ابھر آتی ہے اور تمہارے ہاتھوں کا لمس اپنے شانوں پر محسوس کرتا ہوں۔ چونک کر آنکھیں کھولتا ہوں تمہیں اپنے سامنے پاتا ہوں۔ غضب ڈھاتی گیسوؤں کی گھٹائیں نرگسی آنکھیں جن کی جھیل سی گہرائیوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ چودھویں کے چاند سا روشن چہرہ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک لبوں کی اوٹ دمکتے موتی جیسے دانت، ستواں ناک، صراحی دار گردن مخروطی انگلیاں، صندلی باہیں، سرو قد مہک، خراماں چال، مجسم شوخی و شباب اور جب تم مسکراتی ہو تو تمہارے داہنے گال میں جو خفیف سا گڑھا پیدا ہوتا ہے وہ تمہارے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

آسماں کے چاند تارے خوب صورت ہیں مگر ؎ دلکشی تیری گرائے روئے جاناں اور ہے

میں بات کرنے اور چھونے تمہاری جانب بڑھتا ہوں تو دیوار سے ٹکرا کر جدائی کے درد میں مبتلا ہوتا ہوں۔ تمہارے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی چھائی ہے۔ بال پریشان حال اڑی رنگت آنکھیں بھرائی ہوئی ہیں اور تھرتھراتے لب۔ تم سے جدائی کا بوجھ اٹھا۔ یہ نہیں اٹھتا۔ میری جان اداس نہ رہنا پریشان ہو کر ہلکان نہ ہونا، انتظار کرنا۔ صرف چند دن انتظار، میں راہ میں بچھے کانٹوں کو چن لوں گا۔ ہر مشکل دور کر دوں گا ہماری راہ میں رکاوٹیں حائل ہیں تو کیا ہوا۔ ہم محبت کرنے والے کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ انتظار رشہ جانے تم نے ایک مرتبہ گھنے پیڑ کی چھاؤں میں میرے ہاتھوں پر اپنے قیمتی آنسو ٹپکا کر کہا تھا کہ انتظار محبت ہے اور محبت انتظار ہے۔

ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میری جان عزیز کہ میں تمہیں بے حد چاہتا ہوں۔ دل و جان سے تم پر مرتا ہوں اس کل کائنات میں اگر کوئی شے مجھے محبوب ہے تو وہ تم اور صرف تم ہو۔ بس میرا انتظار کرنا ـــــ تمہارا اور صرف

تمہارا آئینا۔"

لولیٹر پڑھا۔ خود مجھے ہنسی آئی اور خط پوسٹ کرنے میں تکلف ہونے لگا۔ شرم بھی محسوس ہوئی۔ میں نے خط اٹھا کر الماری میں محفوظ کر دیا کہ دو دن بعد سوچ سمجھ کر ڈاک کے حوالے کروں گا۔ شام میں بیگم بچوں سمیت واپس آگئیں۔ میں حیران اور خوش ہوا: "آپ کیسے؟"

"کیا میں اپنے گھر نہیں آسکتی؟" بیگم نے الٹا سوال کیا۔

"گھر آپ کا، گھر میں جو ہے سو وہ آپ کا بلکہ میں بھی مکمل آپ ہی کا۔ لیکن —— وہ لولیٹر ——"

بیگم نے بات کاٹی: "چند دن گھر سے دور رہی تو اپنی نادانی کا احساس ہوا۔ میں نے بے جا لولیٹر کی فرمائش کی۔ ندامت بھی ہوئی۔ خدارا اب اس موئے لولیٹر کا نام نہ لیجیے۔ تکلیف ہوتی ہے۔" میں خوشی سے اچھل پڑا: "کچے دھاگے میں بندھی چلی آئیں سرکار۔ یہی میری محبت ہے۔" اور پھر میں نے ہنستے ہوئے کہا: "آئی لو یو پپو کی ممی۔"

بیگم نے شرما کر نظریں نیچے کر لیں۔

چار دن آرام سے گزرے۔ بیگم نے ضرورت سے زائد میرا خیال رکھا۔ خوب کھلایا پلایا کہ ان کی غیر موجودگی میں میری صحت متاثر ہوئی ہے۔ انھیں میری چاہت کا یقین ہو چلا تھا لیکن ایک شام جب میں دفتر سے آیا تو بیگم کو غصہ میں ٹہلتا ہوا پایا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں: "مل آئے اپنی جانِ آرزو سے؟ پڑ گئی کلیجے میں چودھویں کے چاند کی ٹھنڈک؟"

میں حیران ہوا: "کیا کہہ رہی ہو۔ کس سے مل آیا؟"

"اسی جل ککڑی سے جو میرا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔ جس کی وجہ سے جناب کو دن میں چین نہ رات کو آرام ملتا ہے۔ کھانے میں لطف آتا ہے نہ بھوک لگتی ہے۔ جس کی دل کشی کے آگے چاند تارے ماند اور جس کی آنکھوں کی جھیل سی گہرائیوں میں جناب کا ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں ڈوب مرو کسی جھیل، تالاب میں یا پھر مجھے ہی جھونک آؤ۔"

میں ہکلایا: "میں سمجھا نہیں۔"

"نا سمجھ تو میں ہوں۔ کیسے بھولے بنتے ہیں۔ مجھے چار حرف لکھے نہیں جاتے۔ کبھی بھولے سے ایک مصرع بھی نہ کہا میرے لیے۔ اس کے لیے صفحوں کے صفحے کالے ہو رہے ہیں، شاعری ہو رہی ہے۔ صورت چاند ستاروں میں ثریا و کہکشاں میں نظر آ رہی ہے۔ جدائی پریشان کرتی ہے۔ وہ آپ کا اور آپ ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیوں انتظار محبت ہے۔ دبا دیجیے میرا گلا۔ بچوں کو بھگا دیجیے۔ ہم سب سے نجات مل جائے گی۔ راستے کی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ بھر لے آیئے اس حسینہ کو۔" بیگم باقاعدہ رونے لگیں۔

میں کچھ دیر ہنستا رہا اور پھر معاملہ کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی: "بیگم وہ خط تمہارے لیے تمہارے کہنے پر لکھا تھا۔ میری قسم —— تمہاری قسم۔"

یقین نہ کرتے ہوئے بیگم نے سوال کیا:

" بتلائیے کیا میرا قد سرو جیسا ہے ؟ (بیگم کا قد دو میاں سے کچھ کم ہے) کیا میرے بال گھٹاؤں کی طرح ہیں ؟ بیگم پابندی سے گیسو ترشاتی ہیں) اور میری طرف غور سے دیکھ کر بتلائیے کہ مسکرانے پر کون سے گال میں گڑھا پیدا ہوتا ہے ؟ کس پیڑ کے نیچے کب اور کہاں میں نے آپ کے ہاتھوں میں آنسو ٹپکائے ہیں ۔ ہائے میری قسمت پھوٹ گئی ۔" بیگم کا رونا جاری رہا ۔

مشترکہ کوشش ۔ سے ہم تو لیٹر لکھ تو گئے ، اب اندازہ ہوا کہ ہم نے کیا کیا آئیں بائیں شائیں لکھ ڈالا ۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں سر لیے سوچنے لگا کہ اس غلط فہمی کا علاج کیوں کر ہو ۔ ابھی ابھی راشد کو فون کیا ہے کہ وہ فوراً آئے اور گواہی دے کہ میں نے تو لیٹر اپنی بیگم کو لکھا ہے ، صرف اپنی منکوحہ بیگم ہی کو اور اپنی بیگم کے علاوہ کسی اور کو نہیں ـــــ !

۰۰

بلبل کاشمیری (لندن)

غزل

میں سو رہا تھا قبر میں پاؤں پسار کے
اک بم پھٹا کہ اُٹھ گئے تختے مزار کے

دونوں جہاں کی دولتیں دنیا میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

چیچک کے داغ ہیں کہ ہیں دانے انار کے
یا لالہ زار کھل گئے رخسارِ یار کے

آلو بخارے کھائے تھے شاید اسی لیے
حملے ہوئے ہیں پے بہ پے ان پہ بخار کے

عریاں تو کوئی بات کبھی ہم نے کی نہیں
لڑنے کو آ گئے ہیں وہ کپڑے اتار کے

شیخی تو میکدہ میں کبھی بھی نہ چل سکی
کھائے جنابِ شیخ نے جوتے ادھار کے

ایٹم کے دور میں بھی لوہا نہیں مرا
راکٹ کے بازوؤں میں ہیں بازو لوہار کے

عاشق کی جائیداد ہے گھر میں فقط یہی
برتن کمہار کے ہیں تو جوتے چمار کے

بلبل کو مرغِ آب سمجھ کر کیا حلال
ہم بھی شکار ہو گئے ان کے شکار کے

غزل

ڈاکٹر محبوب راہی (بارسی ٹاکلی)

محبت کی صنم کی ایسی تیسی
میں خوش ہوں رنج و غم کی ایسی تیسی

میں رستہ اپنا چن لوں گا اے رہبر
ترے نقشِ قدم کی ایسی تیسی

کبھی اسکو نبھایا بھی ہے تو نے
ترے قول و قسم کی ایسی تیسی

مجھے کیا تو نے سمجھا ہے بھکاری
ترے لطف و کرم کی ایسی تیسی

تو صاحب بعد میں ہے یار پہلے
ابے جا! محترم کی ایسی تیسی

ہمارے حوصلوں نے کی ہے اکثر
ہر اک جور و ستم کی ایسی تیسی

ہماری راہ بیگم روکتی ہے
تمھاری چشمِ نم کی ایسی تیسی

ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے
ترے جاہ و حشم کی ایسی تیسی

کسی دن دیکھ رکھ دوں گا کرکے
تری زلفوں کے خم کی ایسی تیسی

جو کی، دیر و حرم والوں نے کی ہے
سدا دیر و حرم کی ایسی تیسی

جو سچ لکھنے میں کانپے، لڑکھڑائے
اے راہی اس قلم کی ایسی تیسی

سید غیاث الدین ممتاز (جدّہ)

امتحان میں کامیابی

اِشتہار بازی کے نئے انداز!

ریاستِ آندھرا پردیش میں ایس ایس سی اور اِنٹرمیڈیٹ کے نتائج کے اعلان کے بعد سے اخبارات میں تقریباً روزانہ مسلم طلباء وطالبات کی کامیابیوں کے اشتہارات تصاویر کے ساتھ دھڑا دھڑ چھپ رہے ہیں۔ ہم آج تک اس بات پر شرمندہ رہتے تھے کہ ہماری کمیونٹی میں تعلیمی پسماندگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے لیکن ہمارے ہونہاروں کے ان علمی کارناموں کو پڑھ کر سینہ فخر سے پھول گیا۔ اِن رہبرانِ قوم پر بھی غصہ آیا جو آئے دِن اپنی تقاریر اور مضامین کے ذریعہ مسلم طبقے میں تعلیمی انحطاط کا ذکر کرنا فیشن سمجھتے ہیں اور تو اور اب تو ہمارے رہنما مسلمانوں کو پچھڑے ہوئے طبقے میں شامل کرکے ان کے لیے خصوصی مراعات اور تحفظات کی بھی مانگ کر رہے ہیں۔ ایسے تمام رہبرانِ قوم کو میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہمارے طلباء وطالبات نے اُن کے اندیشوں کو کس طرح غلط ثابت کیا ہے!

ایک دن میں فخر و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اخبار میں شائع شدہ تعلیمی کارناموں کا جائزہ لے رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے شوشہ چھوڑا۔

”یہ صحیح ہے کہ ہمارے چند لڑکوں اور لڑکیوں نے کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن ایس ایس سی اور انٹرمیڈیٹ میں کامیاب ایسے امیدواروں کی تصاویر بھی شجرے کے ساتھ چھپ رہی ہیں جو درجہ دوّم میں کامیاب ہوئے ہیں آج کا دَور سخت مسابقت کا دور ہے جس میں نشانات کا فی صد ۹۶ کے ہندسہ تک جاتا ہے۔“

میں نے جل کر جواب دیا ”تم جیسے لوگوں میں کسی کی صلاحیتوں کو سراہنے کا جذبہ سرے سے نہیں ہوتا۔ ہمیں نونہالوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ ہمارے اکثر طلباء وطالبات نے درجہ اول اور درجہ دوم میں امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔“ میرے دوست ابھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ کہنے لگے ”تم کو پتہ ہے کہ ایس ایس سی میں ریاست بھر میں اس مرتبہ سب سے پہلا مقام حاصل کرنے والے طالب علم کے نشانات کا اوسط کیا ہے؟“ میرے لاعلمی ظاہر کرنے پر وہ بولے۔ ”پہلا مقام اس طالب علم کو حاصل ہوا ہے جس نے جملہ 600 کے 566 یعنی 94 فی صد نشانات حاصل کیے ہیں۔“

ابھی یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ کسی نے دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ میرے پڑوس کا ایک لڑکا پھولوں سے لدا اپنے باپ کے ساتھ کھڑا ہے۔ مارے خوشی کے باپ کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ بشاش آواز میں بولے ”میرے اس لڑکے نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں کامیاب کیا ہے۔“

میں نے باپ اور بیٹے دونوں کو دلی مبارکباد دی۔ باپ جاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے "آج رات بچے کی کامیابی کی خوشی میں گھر پر دعوت کا انتظام کیا گیا ہے۔ آپ ضرور آئیں۔ خاندان کے تمام لوگ اور محلے والے بھی شریک ہوں گے۔ انشاءاللہ مترنم مشاعرہ بھی ہوگا۔"

میرے دوست اپنی عادت سے مجبور ہو کر پھر کڑھنے لگے "اس دعوت پر ہزاروں روپے خرچ ہوں گے۔ کئی دنوں تک گھر میں جشن منایا جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان صاحبزادے کی پرفارمنس ایسی ہے کہ اسے کسی اچھے کالج میں داخلہ بھی نہیں مل سکتا۔ آج کے دور میں درجہ اول میں 60 تا 70 فی صد نشانات حاصل کرنا کوئی کارنامہ نہیں۔ یقین کرو کہ 85 تا 95 فی صد نشانات حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے۔ ایسے سخت مقابلے میں ہمارے بچے کہاں فٹ ہوتے ہیں"؟!

"بس بھی کرو یار" میں نے کہا۔ "تمہاری طبیعت میں رجائیت نام کی ...." میری بات کو درمیان سے کاٹ کر وہ پھر لوں تلخی بکھیرنے لگے۔ "ہماری قوم کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ معمولی کامیابیوں پر اس طرح آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جیسے انھیں سب کچھ حاصل ہو گیا ہو۔ بچے جب کامیاب ہوتے ہیں تو کئی دنوں تک گھروں میں ہنگامہ برپا رہتا ہے اخبارات میں تصویریں چھپتی ہیں جب کسی مسلمان کو وزیر، وائس چانسلر یا جج بنایا جاتا ہے تو مہینوں تک تہنیتی جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے مسلمانوں کے برے دن ختم ہوئے اور گنتی کے یہ دو چار لوگ مسائل کو چٹکی بجاتے حل کرلیں گے۔"

"بھئی خدا کے لیے چپ ہو جاؤ" میں نے کہا "بات امتحانات کی ہو رہی تھی تم وزیروں اور ججوں کو درمیان میں کیوں گھسیٹ لائے"؟

"بات سے بات نکلی تو رو میں کہہ گیا۔ خیر آمدم برسر مطلب۔ اب "ایمسیٹ" کے نتائج دیکھ لو۔ سب جانتے ہیں کہ یہ وہ امتحان ہے جس کی کامیابی پر بچوں کے شاندار مستقبل کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔ میڈیسن اور انجنیئرنگ میں ابتدائی دس RANKS میں اس بار بھی کسی مسلم امیدوار کا نام نہیں"۔

شاید تم کو علم نہیں کہ اقلیتی امیدواروں کی ایک علحدہ فہرست بلحاظ میرٹ جاری کی جاتی ہے۔ اس میں دیکھ لینا ضرور مسلم اقلیتی امیدواروں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہوگی"۔ میں نے ان کو امید دلائی۔

"وہ بھی دیکھ لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی ان کی کامیابی کا تناسب ہمیں مایوسی و شرمندگی سے دوچار کرے گا۔" پھر فلسفیانہ انداز میں کہنے لگے "دراصل ہمیں ابھی تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ کون کون سے CHALLENGES ہمیں درپیش ہیں اور ان سے کس طرح نبٹنا چاہیئے اس کا احساس تک ہم میں سے اکثر کو نہیں ہے۔ نہایت معمولی کامیابیوں پر ہم پھولے نہیں سماتے۔ اگر انتخابات میں کسی مسلم سیاسی پارٹی کو ساری ریاست میں صرف ایک سیٹ اسمبلی میں ملتی ہے تو چراغاں کیئے جاتے ہیں۔ آتش بازی ہوتی ہے۔ جیتنے والے کا اونٹ یا ہاتھی پر جلوس نکالا جاتا ہے۔ جگہ جگہ جلسے جلوس ...."

"تم پھر موضوع سے ہٹ رہے ہو۔ بات تعلیم اور امتحانات کی ہو رہی ہے" میں انھیں ٹوکا "معاف کرنا!

دراصل .... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم تعلیمی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی بہت پسماندہ ہیں۔ اب اسی اشتہار کو دیکھ لو؟" انھوں نے اخبار میں چھپے ایک اشتہار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
"اس میں لکھا ہے کہ مسماۃ زہرہ جبیں نے ساتویں جماعت کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا ہے۔ تصویر بھی موجود ہے۔ میں نے کسی تلگو یا انگریزی یا ہندی اخبار میں کبھی دیگر فرقہ کے طلباء و طالبات کو کامیابی کا اس طرح ڈھنڈورا پیٹتے نہیں دیکھا۔"

"اس میں ایک فائدہ بھی ہے"، میں نے کہا "وہ یہ کہ کامیاب امیدوار کی تصویر و نام کے ساتھ باپ، نانی، نانا، دادا اور دادی کے نام بھی شائع ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست کو اس کی وجہ سے اس کی مفقود الخبر پھوپی کا پتہ مل گیا۔ وہ اس طرح کہ اخبار میں اشتہار چھپا کہ احمد خاں ولد جابر خاں نے دسویں کا امتحان اللہ کے فضل و کرم سے درجہ دوم میں کامیاب کیا ہے۔ یہ رضیہ بیگم زوجہ سلطان خاں مرحوم کے نواسے ہیں۔ میرے دوست نے اخبار کے دفتر سے اپنی پھوپی کا پتہ حاصل کیا اور اس طرح برسوں کے بچھڑے پھوپی بھتیجے گلے مل کر دیر تک روتے رہے۔"

"اب تو تم مذاق پر اُتر آئے۔" انھوں نے کہا "لیکن ایک بات ہے تشویش ناک گریجویشن میں کامیاب لڑکیوں کی تصاویر بھی اخبارات میں چھپ رہی ہے۔ یہ لڑکیاں تو شادی کے قابل ہوتی ہیں! شرعی نقطۂ نظر سے یہ نہایت قابل اعتراض بات ہے۔"

"ہوسکتا ہے اس میں ایک پنتھ دو کاج والی بات ہو" میں بولا

"کیا مطلب"؟

میں نے وضاحت کی "گریجویشن میں کامیاب لڑکیوں کی تصاویر دیکھ کر (اگر پسند آجائیں) لڑکے والوں کے پیام آسکتے ہیں۔ آج کل ماں باپ اپنی لڑکیوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں حیران، پریشان و سرگرداں رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے انھیں اپنی لڑکیوں کے لیے گھر بیٹھے اچھے داماد مل جائیں۔"

"مقصد کچھ بھی ہو بہرحال اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ بات مناسب نہیں کہ جوان لڑکیوں کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوں۔"

میں بگڑ کر بولا "تم کس دنیا میں رہتے ہو؟ آج کے اس راکٹوں کے دور میں تم گھٹنوں کے بل چلنے کی بات کررہے ہو۔ اب ہر شعبۂ حیات میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کا لوہا منوا رہی ہیں۔ ایک تصویر کے چھپنے پر آخر کیا قیامت آگئی؟"

"غصے میں مت آؤ"، وہ اطمینان سے بولے "دراصل میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آج محض انٹرمیڈیٹ یا ایس ایس سی کامیاب کرنا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ اس کی باضابطہ تشہیر کی جائے۔ ہر سال گریجویٹس کی ایک بھاری فوج کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈھل کر نکلتی ہے۔ ہاں اگر کسی نے ریاست بھر میں کسی امتحان میں پہلا یا دوسرا رینک حاصل کیا ہے یا کسی مسابقتی امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے"

"تم اس بات کا ماتم کررہے ہو کہ ہمارے بچوں کی کارکردگی ہائی اسکول اور کالج کی سطح پر مایوس

ممکن ہے۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ہمارے طلباء بفضل تعالیٰ پی ایچ ڈی / ایم فل کی ڈگریاں بھی حاصل کر
میں نے معاملے کو سنبھالتے ہوئے کہا "میرا منہ مت کھلواؤ" وہ اور زیادہ تیز لہجے میں بولے "جب
سے پی ایچ ڈی / ایم فل میں کامیاب امیدواروں کی فہرست جاری ہوتی ہے تو اہم مضامین جیسے ریاضی،
کیمسٹری وغیرہ میں دور دور تک کسی مسلم امیدوار کا نام نظر نہیں آتا البتہ اردو اور عربی میں ان کے نام ز
ہیں۔ ایک دفعہ میں نے محلے کے ایک نوجوان سے پوچھا "تم نے اردو میں پی ایچ ڈی کیوں کیا؟" کہنے لگا "بی۔
کرنے کے بعد دو سال تک بیروزگار رہا۔ پھر خیال آیا کہ بیکار رہنے سے تو بہتر ہے کہ اردو میں ایم اے
صدر شعبہ کی مہربانی سے پی ایچ ڈی میں بھی موقع مل گیا"۔
میں نے اس سے پوچھا "آج کل کیا مصروفیت ہے"؟ کہنے لگا "یاقوت پورہ کے ایک خانگی انگلش
میں اردو پڑھا رہا ہوں"۔

اس بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے مایوس کن لہجے میں کہا "میں اس صاحبزادے کا پی
مقالہ پڑھ چکا ہوں جو خیر سے چھپ بھی چکا ہے۔ اس نے بے ہوش فریدآبادی کی خود نوشت سوانح "خرافات یادیں"
کی ہے یقین کرو اس تحقیقی مقالے کا تین چوتھائی حصہ اسی کتاب کے اقتباسات پر مشتمل ہے، باقی ایک چوتھا
وہ تمام آراء جمع کردی گئی ہیں جو چند نقادوں اور پروفیسروں نے اس کتاب پر دی ہیں"۔
میں نے مداخلت کی "تم کچھ مبالغہ سے کام لے رہے ہو۔ آخر اس ریسرچ اسکالر کا بھی تو CONTRIBUTION ہوگ
بڑی محنت سے پیش لفظ لکھا ہے"۔ انھوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

دوست کی اس طویل تقریر پر نرم پڑتے ہوئے میں بولا "میرے برادرِ عزیز! دراصل تم نے اپنے آپ کو
دَور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ آج تم جوان العمر لڑکیوں کی تصاویر کی اشاعت کو غیر اخلاقی حرکت تصور کر
بھائی! آج کے دَور میں اخلاقی اقدار کی بات کرنا خود اپنی ہنسی اُڑانا ہے آج سے تقریباً پچاس برس پہلے
ملک کے ایک ادیب وڈ! انشور نے فرانس کے شہرۂ آفاق فلسفی سارتر سے یورپ میں اخلاقی اقدار کے
کیا تو اس نے طنزاً کہا تھا: "آپ کن اخلاقی اقدار کی بات کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں ان سے اہم کپڑے
مشین ہے"۔ اب یہی صورتِ حال ہمارے معاشرے میں بھی پیدا ہورہی ہے۔ یہ ڈش انٹینا کلچر کا دور۔
وہ چونک کر بولے: "ارے ہاں! ڈش انٹینا پر یاد آیا! ٹیلی ویژن تو ایک سائنسی اعجاز ہے لیکن اس کے
ناطے اور قرابت دارہاں بھی متاثر ہورہی ہیں۔ میری ہی مثال لے لو۔ میں ایک لمبی مدت کے بعد اپنے ماموں۔
کے گھر گیا۔ پتہ چلا تھا کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ ماموں سمیت سارا کنبہ ٹی وی پر
فلم یا سیریل دیکھنے میں منہمک ہے! انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر میرے سلام کا سرسری انداز میں جواب دی
موجودگی کو ہی نظر انداز کر گئے۔ یہ سرد مہری اور بے تعلقی ڈش انٹینا کلچر کی دین ہے"۔
"تم پھر پٹری سے اُترنے لگے ہو" میں نے انھیں چوتھی بار ٹوکا۔۔۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور رخصت
کہنے لگے "زیادہ کچھ کہنا جی کو جلانا ہے۔ صرف یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فکر عطا کرے۔ نمودو
خرچیوں اور جھوٹی شان سے محفوظ رکھے۔ اچھا چلتے ہیں۔ خدا حافظ۔

نُصرت ظہیر
دہلی

تکیۂ کلام

تکیہ کلام جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے اس تکیہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کلام کیا جاسکے یا جس سے کلام میں مدد ملتی ہو۔ اسپتالوں میں دیکھا گیا ہے کہ کئی مریض جب بور ہو جاتے ہیں تو بستر پر لیٹے لیٹے تکیہ پر کہنی ٹکا کر، یا بیٹھنے کے بعد تکیہ کو زانو پر رکھ کر دوسرے مریضوں سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسے بھی تکیہ کلام کہتے ہیں لیکن عام طور پر تکیہ کلام سے وہ لفظ مُراد لئے جاتے ہیں جو دوران گفتگو بار بار استعمال ہوتے ہیں مگر جن کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ پورے جملے کو مفہوم بخشتے ہیں مگر خود بے مفہوم رہتے ہیں عمارت بنانے والے اس مزدور کی طرح جو دوسروں کے لیے گھر بناتا رہتا ہے مگر خود بے گھر رہ جاتا ہے۔

تکیہ کلام کو ایک کمزوری بھی سمجھا جاتا ہے جن لوگوں کو اپنی زبان پر مکمل عبور نہیں ہوتا یا جن کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہوتا ہے مگر لفظ بہت کم ہوتے ہیں۔ تاش کے جوکر کی طرح کسی بھی لفظ کو ضرورت پڑنے پر ہر اس جگہ ترپ کا پتّہ بنا لیتے ہیں جہاں ان کا ذہن کسی خاص مفہوم کی ادائیگی کے لیے کوئی موزوں لفظ نہیں ڈھونڈ پاتا۔

لیکن سچ بات یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کا کوئی تکیہ کلام نہ ہو۔ ضروری نہیں یہ لفظ کی ہی صورت میں ہو۔ تکیہ کلام حرکات و سکنات کی شکل میں بھی ہو سکتا۔ بعض لوگ جب گفتگو کرتے ہیں تو ان کا پورا جسم آگے پیچھے یا دائیں بائیں ایک مخصوص فریکوئنسی میں ہلتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر کوئی کندھے سے پکڑ کر ساکت کردے تو یقینی طور ہکلانا شروع کردیں گے۔ اسے ماہرین کی زبان میں "قد آدم تکیہ کلام" کہتے ہیں اسی طرح آنکھیں جھپکنا، ناک کو بار بار ہاتھ سے پکڑنا، ناک اور ہونٹ کے بیچ انگلی پھرانا، کنپٹی کے پاس سر کھجانا، ہاتھ یا ٹانگ ہلانا بھی ایسی حرکتیں ہیں جو کئی لوگوں میں آپ کو صرف دوران گفتگو نظر آئیں گی لیکن واضح اور نمایاں تکیہ کلام وہی ہوتا ہے جو بولے میں آتا ہے! اسی طرح ہم تکیہ کلاموں کو دو حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک "جسمانی" اور دوسرے "صوتی" تکیہ کلام بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک سوالیہ دوسرے غیر سوالیہ پہلی قسم کا تکیہ کلام بظاہر سوال کی صورت میں ہوتا ہے لیکن دراصل وہ ایک قسم کا پڑاؤ ہوتا ہے۔ جہاں چند ثانیوں کے لیے رک کر متکلم اپنی بات آگے بڑھاتا ہے۔ مثلاً "کیا سمجھے جناب"؟ "کیا کہتے ہو جناب"؟ یا "کیا کہتے ہیں"؟ کئی بار نا واقف سامع اس طرح کے تکیہ کلام کو سچ مچ کا سوال سمجھ کر اس کا جواب دینے لگتا ہے۔ ایسے میں صاحب تکیہ کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔ یا تو اس کی سٹی پٹی گم ہو جاتی ہے یا پھر وہ اور بھی جوش و خروش سے بولنے لگتا ہے۔

غیر سوالیہ تکیہ کلاموں میں "قسم ہے پروردگار کی"، "آپ کے بچّے جئیں" "خدا آپ کا بھلا کرے" "آنجناب عالی کی

خیر ہو، بس جناب بھر گیا تھا، وغیرہ بے حد عام قسم کے تکیے ہیں مگر کچھ بڑے مخصوص اور طبع زاد نوعیت کے بھی ہوتے ہیں جو کہیں اور سننے میں نہیں آتے مثلاً "آپ کے منہ میں"۔ یا قسم ہے ڈھولی کھال کی ایک صاحب کا تکیہ تھا اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں! اتنا بڑا تکیہ کلام جسے تکیہ نہیں بلکہ گاؤ تکیۂ کلام کہنا چاہیئے۔ ابھی تک ہمارے سننے میں نہیں آیا ہے اور ہمیں کامل یقین ہے کہ آپ نے بھی نہیں سنا ہوگا۔ اس قدر طویل تکیہ کلام کو وہ صاحب اتنی روانی اور فصاحت سے استعمال کرتے تھے کہ سننے والا منہ دیکھتا رہ جائے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس دوران تکیہ کلام کو الٹتے پلٹتے بھی رہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

"ارے صاحب کیا بتاؤں۔ آج تو میں بال بال بچ گیا۔ گھر کی طرف جا رہا تھا کہ سڑک پر ایک پاگل بیل سامنے آگیا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا وہ بھی میری طرف آنے لگا میں اور آگے بڑھا تو اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں۔ اور فوراً ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ مگر صاحب بیل نے پیڑ کے تنے میں اتنے زور کی ٹکر ماری کہ میری تو چیخ ہی نکل گئی پھر اس نے ایک اور ٹکر ماری تو میں نے کہا اچھا اس نے کہا ہاں، اور تیسری ٹکر اس زور سے ماری کہ پیڑ کے دو ٹکڑے ہوگئے اور جو میں شاخ سے گرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بیل کے اوپر چڑھ گیا ہوں بس صاحب بھر گیا تھا۔ اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں اور بیل نے ایسی چھلانگ لگائی کہ میں اس کی پیٹھ سے اچھل کر دوسری سڑک پر جاتے ہوئے ایک خالی رکشہ میں جا گرا۔ رکشہ والا مجھے دیکھتے ہی گھبرا گیا میں نے کہا بھئی گھبراؤ نہیں مجھے ذرا گھنٹہ گھر لے چلو۔ اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں مگر صاحب وہ تو رکشہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ادھر بیل بھی ابھی پیچھے پڑا تھا۔ مجھے رکشہ میں دیکھتے ہی اس نے کہا اچھا میں نے کہا ہاں اور کسی طرح رکشہ کو خود ہی چلا کر بھاگ پڑا مگر راستے میں وہ برا حال ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ لوگوں نے رکشہ والا سمجھ کر روک لیا اور کئی سواریاں ڈھونی پڑیں تب جا کر دو گھنٹے بعد گھنٹہ گھر پہونچ سکا۔"!

تکیۂ کلام عموماً مستقل نوعیت کا ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ زبان سے چپکا رہتا ہے۔ مگر کچھ سیزنل بھی ہوتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ سہارنپور میں ہمارے ایک دوست ہیں الیاس صاحب فقیر منش آدمی ہیں اس لیے اپنا تخلص "تیاگی" رکھ چھوڑا ہے ایسا ذات نما تخلص ہم نے ابھی تک کہیں اور نہیں سنا ہے۔ الیاس تیاگی صاحب کی شخصیت کا اچھا پہلو تو یہ ہے کہ انہوں نے تخلص رکھنے کے باوجود شاعری کبھی نہیں کی۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ اپنا تکیہ کلام بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کا کوئی ایک تکیہ کلام نہیں بلکہ پورا بستر کلام ہے۔ وہ بڑے سلیقے سے ایک تکیہ کلام منتخب کرتے ہیں پھر اسے اتنے ہی سلیقہ سے استعمال کرتے ہیں اور جیسے ہی وہ فیشن بن کر دوسروں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے جھٹ دوسرا تکیہ کلام گھڑ لیتے ہیں اس طرح وہ شعر نہیں تکیہ کلام کہتے ہیں اور اتنا کہتے ہیں کہ سہارنپور میں کچھ دوست ان کے تکیہ ہائے کلام کا مجموعہ شائع کرانے پر غور کر رہے ہیں۔

"بس ختم ہے"! ان کا ایک ایسا ہی معرکتہ آلارا تکیۂ کلام ہے جو ریلیز ہوتے ہی ایسا ہٹ ہوا کہ بعض حلقوں میں ڈائمنڈ اور پلاٹینم جوبلی منانے کے بعد بھی چل رہا ہے۔ یہ تکیۂ کلام وہ کسی بھی چیز کی حد سے زیادہ تعریف یا برائی کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اگر کسی حسینہ کی تعریف کرنا ہو تب بھی "بس ختم ہے" اور

کسی دکاندار کے عیب گنوانے ہو تب بھی صرف "بس ختم ہے" کہہ کر آگے بڑھ جاتے اور دکاندار دیکھتا رہ جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کام ان کی توقع کے مطابق بڑے سلیقے اور عمدگی سے شروع ہو رہا ہو تب بھی ان کے منہ سے "بس ختم ہے" ہی نکلتا تھا۔!

"اے شخص" اور "اے شخص بے پناہ" بھی ایسا ہی تکیہ کلام تھا جو وہ ہر ملاقات پر ملنے والے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ملنے والے ایک سے زائد ہوں تو وہ ان سے "اے اشخاص" یا کبھی کبھی زیادہ موڈ میں ہوتے تو "اے خشخاش" کہہ کر بھی ملتے تھے ان کی شخصیت سے جڑی ہوئی متعدد دلچسپ داستانیں اگر موقع ملا تو ہم پھر کسی دوسرے مضمون میں بیان کریں گے۔

کچھ تکیہ ہائے کلام بے حد مختصر ہوتے ہیں مثلاً "ہائے" جو اہل اردو کے علاوہ اکثر اہل فارسی کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ موخرالذکر حضرات جب بھی کسی چیز کو ایک سے زیادہ تعداد میں دیکھتے ہیں تو اس کے ساتھ ہائے ضرور لگا دیتے ہیں۔ جیسے "مرد ہائے جواں"، "دوشیزہ ہائے رواں" وغیرہ وغیرہ۔ رہی اہل اردو کی بات تو ان بے چاروں کے آگے سے اگر محض ایک دوشیزہ بھی گزر جائے تب بھی ان کے منہ سے ہائے نکل جاتی ہے۔

"یہ"، "وہ"، "آپ"، "تو" جیسے مختصر الفاظ بھی تکیہ کلام بن جاتے ہیں جو بظاہر تو بڑے بے ضرر ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی بڑی الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔

ہمارے ایک عالم فاضل دوست جو عالم کم فاضل زیادہ ہیں۔ اپنی گفتگو میں ہر اسم کے لیے "یہ" استعمال کر کے ہمیں اکثر بہت پریشان کر دیتے ہیں۔ جب بھی وہ ملتے ہیں تو اس قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔

ہم: کہیئے بھائی عبدالقدوس کیسے مزاج ہیں؟ وہ: ٹھیک ہیں۔ آپ سنایئے۔ بوفورس کی تازہ یہ کیا ہے۔؟

ہم: یہ؟ یہ کیا؟

وہ: ارے بھئی خبر! تم اخبار والوں سے خبر ہی پوچھیں گے اخروٹ کا یہ تھوڑا ہی پوچھیں

ہم: اخروٹ کا یہ کیا؟

وہ: بھاؤ۔ اور کیا؟ سنا ہے جنرل ضیاء نے جونیجو کو ہٹا دیا ہے۔ اور ۹۰ دن بعد پاکستان میں یہ کرانے کا وعدہ کیا ہے۔

ہم: یہ کیا؟۔ چناؤ؟

وہ: ہاں چناؤ۔ سنا ہے اس چناؤ میں ضیاء صاحب سیاسی پارٹیوں کو بھی اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا یہ دیں گے؟

ہم: یہ؟ یعنی اجازت؟

وہ: ہاں بھئی ہاں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ دفاعی بجٹ کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کا یہ بگڑ گیا ہے؟

ہم: یہ کیا؟

وہ: اوفوہ یہ کمال ہے۔ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے بھٹہ بھائی بھٹہ۔ بھٹہ بیٹھنا محاورہ ہے۔ ذرا غور سے بات سنا کرو۔ یار بار یہ کیا یہ کیا کی رٹ کیا لگا رکھی ہے؟ کیا یہ تمہارا تکیہ کلام ہے؟

ہم: یہ؟ نہیں تو!

وہ: پھر یہ کیا ہے؟

ہم: یہ کیا؟

ہمیں مشینوں سے بڑی رغبت رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہم بچپن ہی سے مشینوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ چنانچہ گھر میں گراموفون، ریڈیو، سائیکل اور گھڑی سے لیکر سلائی مشین تک یا مشین نما چیز ایسی نہیں جو ہماری دست برد سے محفوظ رہی ہو اور جس نے اپنا آخری سانس ہماری آغوش میں نہ لیا ہو۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب کا ریڈیو خراب ہوگیا۔ درجہ پانچ میں ہم ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ چنانچہ اس تاریخی تعلق کا فائدہ اٹھانے کے لیے وہ اپنا ریڈیو ٹھیک کرانے ہمارے پاس لے آئے برسوں بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کی ہم نے خوب آؤ بھگت کی تاہم اس بات سے ہم بے خبر ہی تھے کہ حال ہی میں وہ ایک تکیہ کلام بھی اختیار کرچکے تھے۔ خیر۔ انھوں نے اپنا باوا آدم کے زمانے کا جغادری ریڈیو ہماری بیسوی صدی کی ناتواں میز پر رکھا اور دعا سلام کے بعد کہنے لگے۔

"صاحب میں تو آپ سے عاجز آگیا ہوں عرصہ سے آپ نے بولنا ہی بند کردیا ہے۔ پہلے ایک آدھ ہاتھ آپ کو رسید کردیتے تھے تو اپنے آپ کچھ بول پڑتے تھے۔ اب تو کتنا ہی ماریں آپ پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگیا ہے آپ کو۔؟"

"جی؟ ہیں؟" ہم وحشت سے چلا اٹھے "ارے صاحب آپ سنئے تو سہی۔ آپ پر میں اب تک سینکڑوں روپے خرچ کرچکا ہوں اور آپ ہیں کہ چپ سادھے پڑے ہیں۔

"الٰہی خیر" اس مرتبہ ہم ہانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے جہاں تک ہمیں یاد آتا ہے بچپن میں آپ نے ابرا کے پل (سہارنپور کا ایک قدیم پل) پر ایک آنے کا شربت ضرور پلا یا تھا۔ جس کی وجہ سے کئی دن تک ہمارا گلا خراب رہا اور والد کی مار پڑی سو الگ۔ اس دن کے ایک آنے کو آپ سینکڑوں روپے کہہ رہے ہیں۔ خدا سے ڈریئے جناب۔

"مم۔ مگر میں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" انہوں نے کچھ کہنا چاہا مگر ہمارا غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اور ہاں یہ مارنے کی بات آپ نے کہاں سے نکال لی۔ ماسٹر صاحب کی ایک گھڑکی سے آپ کے کپڑے گیلے ہوجاتے تھے۔ اور آپ ہم پر ہاتھ اٹھانے کی بات کر رہے ہیں۔"؟

"مم۔ مگر سنئے تو سہی صاحب: وہ بولے" میں تو آپ کی بات کر رہا تھا۔ کسی سے بھی پوچھ لیجئے۔ آپ کی وجہ سے میرا دیوالہ نکلا جارہا ہے۔ آپ یقین کیجئے اب تک میں درجنوں لوگوں کے پاس جا چکا ہوں اور اب تک میرے آپ کے اوپر تقریباً ایک ہزار روپے خرچ ہوچکے ہیں"؟

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں"۔ ہمارے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا۔

"قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا۔ چاہیں تو میری بیوی سے پوچھ لیجئے۔ اس کے پاس ایک ایک پیسے کا حساب ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے"...

"شرم نہیں آتی آپ کو"، ہم اتنی زور سے بولے کہ چھت کا پلاسٹر ایک جگہ سے اکھڑ گیا اور گلی میں ایک کتا زور سے بھونکنے لگا۔ "صرف ایک آنے کے لیے آپ اپنی بیوی کو بیچ میں لا رہے ہیں۔ لعنت ہے آپ پر۔ نکل جائیے میرے گھر سے"۔

وہ سہم کر کھڑے ہو گئے ایک ہاتھ سے ریڈیو اور دوسرے سے اپنی پتلون سنبھالنے لگے۔

"ممم معاف کیجئے۔ میں آپ کو۔ نن۔ ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر آپ کو میری بات ناگوار لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ کسی اور سے ٹھیک کرا لوں گا آپ کو"۔

وہ ریڈیو پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ آخری جملہ سنتے ہی ایک بجلی سی ہمارے دماغ میں کوند گئی اور تب ہم سمجھ پائے کہ "آپ" ان کا تکیہ کلام تھا اور یہ لفظ وہ کبھی ہمارے اور کبھی ریڈیو کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

اس کے بعد کافی دیر تک ہم ان سے شرمندہ ہوتے رہے اور وہ ہم سے ہاتھ روم کا راستہ پوچھتے رہے!

غزل

(جنابِ مضطر مجاز سے معذرت کے ساتھ)

اقبال شانہ (تبوک سعودی عرب)

ہم اپنے آپ ہی یارو رواداری میں گرے
جناب اِتنی بلندی سے کس خوشی میں گرے

وہ اور لوگ ہیں اٹکے ہیں جو کھجوروں میں
ہم آسمان سے ٹپکے تری گلی میں گرے

یہ اور بات ہے ٹوٹی ہیں پسلیاں لیکن
ہمیں ہے ناز کہ ہم تیری عاشقی میں گرے

ہمارے شعر جو بھیجے گئے اشاعت کو
نہ جانے کیسے وہ ردّی کی ٹوکری میں گرے

نصیب نے ہمیں پھینکا ہے دُور دُور بہت
میں "بمبئی" میں گرا ہوں وہ "جرمنی" میں گرے

کھڑے ہیں آج الکشن میں پھر وہی لیڈر
بُری طرح جو کئی بار لیڈری میں گرے

گرا ہوں میں تو اندھیرے میں ٹھوکریں کھا کر
مگر جناب تو سورج کی روشنی میں گرے

ہرا سکا نہ ہمیں کوئی پہلوانی میں
مزے کی بات ہے شانہ تو شاعری میں گرے

ہچکیاں

○

رفتہ رفتہ آ رہی ہیں ہچکیاں
دل مرا بہلا رہی ہیں ہچکیاں

سامنے اس ماہ وش کو دیکھ کر
جانے کیوں شرما رہی ہیں ہچکیاں

جیسے جھٹکے کار کھاتی ہے میاں
ایسے جھٹکے کھا رہی ہیں ہچکیاں

ہچکیاں ہیں وزن میں اب دوستو!
شاعری فرما رہی ہیں ہچکیاں

یاد کرتا ہے مجھے کم بخت کون
کیوں مجھے تڑپا رہی ہیں ہچکیاں

اہلیہ ہے سامنے میرے کھڑی
ڈرتے ڈرتے آ رہی ہیں ہچکیاں

جسم رہ رہ کر اچھلتا ہے مرا
دل مرا دھڑکا رہی ہیں ہچکیاں

کون شانہ یاد کرتا ہے تجھے؟
دل ترا بہلا رہی ہیں ہچکیاں

اقبال شانہ
(تبوک سعودی عرب)

سلیم مقصود (جدہ)

شاہین (خاکہ)

ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کے اعزاز میں جناب مہتاب قدر نے اپنے گھر پر ضیافت ومشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ شاعر مذکور ایسے چڑچڑے اور جھکی تھے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جدہ کے معروف و غیر معروف شعرا کا تعارف ان سے کروایا جا رہا تھا اور ہر تعارف کے بعد وہ اپنے سیاہ و سفید بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہر تعارف کے بعد ان کی چند صبا کے بال بے ترتیب کر دیئے گئے ہوں۔ ایک چھوٹی سی لڑکی دور کھڑی بہت دیر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے مہتاب صاحب کے قریب آکر ان شاعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "بابا! یہ کون ہیں؟" مہتاب صاحب نے جواب دیا۔ "یہ مشہور شاعر ہیں۔" لڑکی نے بے یقینی سے کہا: "نہیں! پاگل ہیں۔" اس حقیقت فشانی پر شاعر محترم پر تو بجلی سی گر پڑی مگر حاضرین محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ مہتاب صاحب نے گھبرا کر شاعر صاحب سے معافی مانگی اور اس (۶) سالہ لڑکی کا تعارف یوں کرایا۔ "یہ میری چھوٹی لڑکی شاہین ہے۔ ذہنی طور پر کسی قدر معذور ہے۔" شاہین سے میری یہ پہلی جان پہچان تھی۔ شاہین کی عمر اب تقریباً (۱۱) سال ہوگی۔ اس کے ذہنی ارتقا کا تو پتہ نہیں لیکن ایک بات طے ہے کہ شاہین نارمل بچوں کی طرح احساسات سے معمور ہے لیکن اس کے ذہن کا احتسابی نظام (censorial system) بے روک ہے ایسے نظام کے حامل بچے جذباتی طور پر مخلص ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان بچوں کی جذباتی سچائی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم سب انسانوں کی گرفت شعور پہ سخت نہ ہوتی تو ہم ایک دوسرے سے چھوٹے جذبات کا اظہار نہ کرتے کیوں کہ میں نے کبھی کسی پاگل کو دوسرے پاگل سے یہ کہتے نہیں سنا: "اتنے دن کہاں رہ گئے؟ میں تو تمھیں ہر دن یاد کیا کرتا تھا۔ تفصیل سے ملاقات ہوگی۔ آج

تھوڑا مصروف ہوں، خدا حافظ۔

میں شاہین کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ شاہین ہفتوں نظر نہیں آتی۔ میں گھر بھی جاتا ہوں تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے قطعاً نہیں جانتی۔ میں اس کے لیے بالکل اجنبی ہوں اور کسی دن اچانک صبح یا شام کسی بھی وقت میرے گھر کے دروازے پر اس کی آمد کا صور بجنے لگتا ہے۔ پڑوسی اپنے گھروں کا دروازہ کھول کر میرے دروازے کے سامنے اکٹھا ہو جاتے ہیں اور عجیب عجیب اندیشوں کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی شاہین احتجاجاً دروازے اور کھڑکی پر سنگ باری کرنا شروع کر دیتی ہے اگر میں اس کا بھی نوٹس نہیں لیتا ہوں تو راہ چلتے شریر بچوں کو شامل سنگ باری ہونے کی دعوت دیتی ہے اس پر بھی اگر بند دروازہ نہ کھلے تو پھر راہگیروں سے قابلِ دست اندازیٔ پولیس" قسم کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتی ہے۔ نقصِ امن کے خوف سے میں دروازہ کھول دیتا ہوں اور یہ کسی فاتح کی طرح گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ قرینے سے رکھی ہوئی تمام چیزوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی ہے ہے اور سوچتی ہے کہ گھر کے نظام کو کتنی دیر میں درہم برہم کیا جا سکتا ہے اور اس کی شروعات کس جانب سے مناسب ہو گی اور جب تک کہ اسے کمرے سے جبراً نکالا جاتا گھر لاتور کے زلزلے کا نقشہ پیش کرتا ہے اور شاہین دھکے کھا کر نہایت اطمینان سے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ شاہین کا تکیہ کلام ہے "پاگل" لیکن یہ اچانک کسی کو پاگل نہیں کہتی بلکہ کہنے سے پہلے کچھ دیر آنکھیں جھکائے سوچتی رہتی ہے کہ "مقابل" اس کا متحمل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جب اس بات کا اطمینان ہو جاتا ہے تب وہ فیصلہ کن انداز میں اعلان کر دیتی ہے کہ "آپ پاگل ہیں"! اگر آپ یہی بات شاہین سے کہیں گے تو وہ برا مان جائے گی۔ ایک دن شاہین نے میری تصویر بنائی عجیب و غریب ایسی مخلوق کی شکل جو ابھی پیدا نہیں ہوئی یا پیدا ہو گی تو ابھی کسی سیارے میں ہو گی اور زمین پر اترنے کا ریہرسل کر رہی ہو گی۔ ڈارون نے بنی نوع انسان کے ابتدا کی کشید کی اور شاہین نے اس کے بھیانک انجام کی تصویر کشی کی۔ میں نے تصویر دیکھ کر پوچھا۔ "آنکھیں کہاں ہیں؟" کہنے لگی۔ "پاگل! عینک سے تو دیکھتے ہیں۔" میں نے اس کے معصوم جملے سے سمجھ لیا کہ ہم واقعی چیزوں کو آنکھوں سے کہاں کسی نہ کسی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

ایک دن ایک فہیم شحیم صاحب شاہین کے ابو سے ملنے آئے۔ انھیں ڈرائنگ روم میں صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ صوفے پر بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگے۔ شاہین کی ان پر نظر پڑ گئی۔ وہ حیران اندر جا کر اپنے ڈیڈی سے پوچھنے لگی "جس کی سونڈ ہوتی ہے اس کو کیا کہتے ہیں؟" اس کے ڈیڈی نے بتلایا۔ "ہاتھی" پھر اس نے سوال کیا۔ "جس کی پیشانی پر ایک سینگ ہوتا ہے اس کو کیا بولتے ہیں؟" اس کے ڈیڈی نے جواب دیا۔ "گینڈا" وہ ہاتھ پکڑ کر اپنے والد کو ڈرائنگ روم میں لے آئی اور صوفے پر دراز چنگھاڑتے ہوئے وجود کی طرف خوف زدہ انداز میں اشارہ کر کے کہنے لگی۔ اسے کیا کہتے ہیں؟" اس کے ابو نے بتلایا "بے بی ایلی فینٹ (BABY - ELEPHANT)

اس واقعہ کے بعد سے ان صاحب کا نام ہی "طفل فیل" پڑ گیا۔

ایک بار چند ادیب مہتاب صاحب کے گھر آئے۔ چائے نوشی ہوئی اس کے بعد گپ شپ ہونے لگی۔ اچانک

شاہین وہاں آگئی۔ آتے ہی اس نے ایک صاحب سے پوچھا "آنٹی کہاں ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "گھر پر ہیں۔" اس کے بعد اس نے دوسرے صاحب سے یہی بات پوچھی۔ یہ صاحب غیر شادی شدہ تھے۔ انھوں نے کہا "ابھی ہم نے شادی نہیں کی۔" حالانکہ ان کی عمر شادی کی حدوں کو پھلانگ کر بیوگی (اگر ان کی کوئی بیوی ہوتی) کی حد کو چھو رہی تھی۔ شاہین نے معصومیت سے پوچھا۔ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟

ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انھوں نے چڑھ کر جواب دیا "۔ اس ڈر سے کہ کہیں آپ کے جیسے بچے پیدا نہ ہوں۔" شاہین نے فوراً جواب دیا انکل اگر آپ کے ڈیڈی بھی ایسا ہی سوچتے تو؟

ایک دفعہ شاہین نے مجھے بہت ستایا۔ میں نے اسے بے دردی سے گھر سے نکال دیا۔ شام میں اس کے ڈیڈی سے ملاقات ہوئی۔ ہم لوگ گھر کے سامنے کھڑے گفتگو کرنے لگے۔ شاہین بھی ان کے ساتھ تھی۔ اچانک ایک بلی کہیں سے نکل آئی اور منڈیر سے میرے گھر میں جھانک کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ شاہین نے چیخ کر کہا "بلی! بھاگ جا! وہ ماسٹر صاحب کا مکان ہے۔ ورنہ وہ تجھے دھکے دے کر نکال دیں گے۔"

شاہین ملکوں، سرحدوں اور فضاؤں کے فرق کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ایک دن کسی نے اسے ہندوستانی سکہ دے دیا۔ شاہین نے کیرلین کی دکان سے اس کی ٹافی خریدلی۔ کیرلین نے ہندوستانی روپیہ لینے سے انکار کر دیا اور بولا "یہ روپیہ یہاں نہیں چلتا۔" شاہین نے روپیے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے دکان کے چکنے فرش پر سرسراتے ہوئے بولی "پاگل ہو؟ چل تو رہا ہے۔" دکان دار نے غصے سے جیب سے ایک ریال کا سکہ نکالا اور بتلانے لگا "۔ ایسا سکہ چاہیے۔"

شاہین نے ریال اس کے ہاتھ سے لے لیا اور روپے اور ریال کا تقابل کرنے لگی۔ دکان دار نے ٹافی اور ریال چھین کر شاہین کو دکان سے نکال دیا۔ شاہین کو کیا پتہ کہ ملکوں کے نہ صرف سکے الگ ہوتے ہیں بلکہ ان کی آب و ہوا میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض ملکوں کی آب و ہوا میں معصوم لوگوں کے خون کی بو بھی شامل رہتی ہے اور بعض ملکوں کی مٹی میں جلے ہوئے مقدس مقامات کی راکھ بھی۔

شاہین کو تین چیزوں کا شوق ہے۔ مردانہ لباس، میٹھا اور گوشت۔ میٹھا اور گوشت میں شاہین ترک کی قائل نہیں لیکن گوشت کھانے سے پہلے وہ اخلاقاً آپ سے پوچھ ضرور لے گی کہ آپ ان چیزوں کا کھانا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ نے اثبات میں جواب دیا تو وہ احتیاطاً آپ سے محفوظ فاصلے پر ہٹ کر بیٹھ جائے گی اور پھر شیر کی طرح ماحول سے بے خبر کھانے میں مصروف ہو جائے گی۔ شیر اور شاہین میں یہ فرق ہے کہ شیر اپنا بچا کھچا دوسروں کے لیے چھوڑ دیتا ہے لیکن شاہین سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔

شاہین بڑی درویش مزاج ہے کبھی کبھی گھر سے پیدل نکل جاتی ہے اور پھر اس کو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک بار مردانہ لباس میں ٹوپی پہنے وہ کہیں نکل گئی۔ سارا محلہ ڈھونڈ ڈھونڈ لیا کہیں پتہ نہ چلا۔ کسی نمازی نے فون کر کے بتلایا کہ وہ کسی مسجد میں عبادت میں مصروف ہے۔ فوراً پھر تیلے کمانڈوز کا دستہ روانہ کیا گیا۔ مسجد کے سارے مصلی جا چکے تھے۔ محترمہ گہرے جذب و مراقبے کے عالم میں پکڑی گئیں۔

شاہین کو پڑھنے کا بہت شوق ہے اکثر وہ میرے پاس بستہ لے کر آجاتی ہے اور کاپی نکال کر لکھنا شروع کر دیتی ہے

معلوم نہیں پڑتا کہ وہ کیا لکھ رہی ہے اگر میں اسے پڑھنے کے لیے کہتا ہوں تو وہ اپنی تحریر فر فر پڑھنے لگتی ہے۔ اس کی لاہوتی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر میں اس کو الف لکھنے کو کہوں تو با لکھے گی اور مصر رہے گی کہ یہ الف ہے۔ تب مجھے پتا چلتا ہے کہ دنیا میں کسی چیز کے وجود کو ثابت کرنا کتنا مشکل ہے حالانکہ وہ ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کا شاہین حریت اور خودی کا مظہر ہے اور یہ معصوم سی شاہین ہمارے جذبۂ ترحم اور جذبہ انسانیت کی بقا کی علامت ہے۔ دنیا کے وہ سارے بچے جو ذہنی و جسمانی اُپج سے محروم ہیں شاہین ان کی نمائندہ ہے۔ یہ بچے ہماری توجہ اور ہماری محبت کے محتاج ہیں۔

ایک روز ایک صاحب نے فون پر مجھ سے دریافت کیا "مہتاب صاحب کے گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں؟"

میں نے ان سے پوچھا "کیا آپ کا تعلق محکمۂ مردم شماری سے ہے؟ انھوں نے کہا۔ جی نہیں"

میں بولا "فیملی پلاننگ سے ہوگا؟ کہنے لگے "جی نہیں" میں نے کہا "سراغ رسانی سے ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا "جی نہیں" میں نے کہا "جناب! انسانوں سے متعلق ایک اور محکمہ بھی ہے جس کی ماہر مس شاہین یہاں موجود ہیں۔ آپ ان سے بات کیجیے" میں نے ریسیور شاہین کو دے دیا۔

شاہین نے "ہیلو" کہا پھر ان سے پوچھنے لگی "آپ کون ہیں؟" پتہ نہیں انھوں نے کیا جواب دیا۔ شاہین اچانک دھاڑی "آپ پاگل ہیں، فوراً فون رکھ دیجیے۔

●●

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

کھانا

(انتباہ: یہ مضمون کھانا کھاتے ہوئے نہ پڑھیں، نہ سنیں ورنہ پیٹ میں موجود چوہے ڈر جائیں تو دوڑنا بند کر دیں گے، خوش ہو جائیں تو ہاتھی بن جائیں گے ویسے زیادہ امکانات تو مر جانے کے ہیں)

"آبا چچا" نے ہمارے منہ بولے "انکل" کا نام "داغی رنگ مال" رکھ دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انکل اپنے سامنے بیٹھے کھڑے لیٹے کسی بھی شخص کا بھیجہ کھانے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ "رشوت" کھانے کھلانے کے سبھی معاملات میں درمیانی آدمی کا رول بحسن و خوبی ادا کرتے ہیں۔ کلرکی کا زمانہ ہو تو بقول چچا غالب "کپڑے کھاتے ہیں" یا میلوں سڑکیں ناپتے ہوئے آلودہ ہوا کھاتے ہیں یا مدرسوں، دفتروں اور پارکوں میں بلیڈز (یعنی شیونگ بلیڈز) کھانے کا جادو بھرا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پیسے وصول ہوتے ہی ڈبل روٹی کھاتے ہیں اور خوشی سے پھول جاتے ہیں۔ چغلی کھاتے ہیں تو بلیوں اچھل جاتے ہیں۔ گدھے کو کاغذ کھاتا دیکھتے ہیں تو از خود "ڈھینچوں! ڈھینچوں!" کی سی آوازیں نکالتے ہیں۔ کاغذ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کھانے کی ہمت کبھی نہیں کی ہاں البتہ بلغم کبھی نہیں تھوکتے بلکہ.... کھا جاتے ہیں، نہ کسی کا غم پالتے ہیں نہ کسی کا غم کھاتے ہیں۔ (جگالی سے بچ جاتے ہیں) گانا بھی گاتے ہیں تو ع

"گائے جا گیت ملن کے" کے بجائے ع

"کھائے جا سوپ چکن کے" یا ع

"آئے گا، آئے گا، آئے گا، آئے گا آنے والا آئے گا" کے بدلے ع

کھائے جا کھائے جا، کھائے جا، کھائے جا تر نوالہ کھائے جا" کہتے ہیں۔

قلی قطب شاہ سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک بلکہ ادھر یعنی آصف سابع میر عثمان علی خاں بہادر تک کا اردو کلام دیمک کی طرح چاٹ گئے ہیں اور موقع دیکھتے ہیں تو مغل شاہی کلام یوں اگل دیتے

ہیں کہ کسی بھی سامع (تو کجا خود اُن) کے لیے سمجھنا کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے، اس پر زبان دانی کا ڈھول بغیر پھیر دانی سینہ ٹھوک کر تو کبھی توند سہلا کر کرتے ہیں "ہم سے کوئی سیکھے اور مزہ لے ٹکسالی زبان کا" زبان کا عالم کچھ یوں ہے کہ ہمیشہ "عوام کھا رہی ہے" کہتے ہیں۔ باوجود لقمہ دہندگی بھول کر بھی انھوں نے "عوام کھا رہے ہیں" نہیں کہا اور کہا"——— کو ہمیشہ ———"کہا" ہی لکھا۔

کوئی دوست انھیں کھانا کھاتے وقت صدا دے تو منہ بسور کر کہتے ہیں "یہ ہے میرا جگری دوست جو کھاتے وقت ہی آتا ہے ——"

عدالتوں میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے میں طاق ہیں۔ مزے لے لے کر جھوٹی گواہی دیتے ہیں۔

منچلوں کی کمیٹیوں میں قسم کھا کر کبھی معاملات میں پیچیدگی پیدا کر دیتے ہیں تو کبھی قضیوں کو ختم کروا دیتے ہیں۔ یہ ان کے موڈ پر منحصر ہے۔ ایسے کسی معاملے میں جن محلّوں کے نوجوانوں سے پیٹ بھر جوتے "کھا جاتے ہیں تو پھر ان محلّوں میں برسوں اپنی صورت نہیں دکھاتے۔

کئی بینکوں میں کھاتے ہیں۔ پیسہ، کسی کا بھی کسی غرض سے بھی ہاتھ لگے فوری اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر دیتے ہیں۔ سود کھانا خود پر فرض کر لیا ہے —— ہر میت میں شریک ہو جاتے ہیں تاکہ چہلم کی بریانی کھانے کو ملے..

ایک دعوت میں بیٹھے ابھی پہلا چمچہ حلیم کا اٹھایا ہی تھا کہ "سخت گیر میزبان نے دبوچ لیا۔

"دعوت نامہ ہے —؟"

بولے، "دلہن والوں کی طرف سے آیا ہوں "— "یہاں دو مہینے کے لڑکے کے عقیقہ کی دعوت ہو رہی ہے "— "اتنا بڑا شادی خانہ لے کے، آرکسٹرا، آتش بازی کے ساتھ"— "ہاں - ہاں۔ ہماری مرضی - تم سے مطلب ——— ؟" —"کھاؤں بولتے یا جاؤں بولتے ——؟"

"گھر جا کے بیگم کے ساتھ کھاؤ۔ جو زنانہ میں پکڑی گئی ہیں اور گیٹ پر تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔"

نہ جانے کیسے کیا کھلایا پلایا - اصل عمر سے بہت ہی کم عمر کی پیدائش کا سرٹی فکیٹ" اور گریجویشن کی سند لے کر کھلا پلا کے بلدیہ میں ملازم ہو گئے۔ کچھ ہی دن میں جانے کیا کھا لیا معطل ہو گئے —— پھر حال - پوچھے پر بس یہ : "کھا کے پکڑا گیا —— کھلا کے چھوٹ گیا"

بفضلہ تعالیٰ سے یہ سلسلہ چلتے چلتے نوکری سدا کے لیے چلی گئی —— پولس میں بھرتی ہو گئے ہاتھ کرپشن کو بھی کھلایا اور خود بھی خوب کھایا۔ ہر دم یہی ورد کرتے کہ دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام

امانت میں خیانت بالکل سیاسی عقائد کے مطابق کرنے لگے ہیں۔ موقع ملتے ہی ان کی اصطلاح میں "تر مال" کھا جاتے ہیں تو ڈکار بھی نہیں لیتے اور دوسرے تر مال کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

آج کل غریب لڑکیوں کی شادیوں، غریب بچوں میں کاپیوں، ربر، پنسل کی امداد، زخمیوں کے پلا

کی مٹی پلید کرنے کے لیے "انجمنِ صلاح فلاح کھا" قائم کرلی ہے۔ تر مال کا سیلاب دنیا کے کونے کونے سے ان کے گھر چلا آرہا ہے۔ دنیا جہاں کی نعمتیں دسترخوان پر چن رکھی ہیں۔ وقت بے وقت کھائے چلے جارہے ہیں ——— اتنا کھا رہے ہیں کہ ہاضمہ کسی چورن کو خاطر میں نہیں لا رہا ہے، آپریشن کی نوبت آگئی۔ مزاج پرسی کو گئے تو دیکھا درد سے تڑپ رہے ہیں۔ ان کے ہاں ذرا بھی منہ کھول دیں تو تھوڑے بہت مچھر کھا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں انکل کے چچا حضرت بھی مزاج پرسی کو چلے آئے تو ہم نے ان سے کہا "چچا جان! ان کی بیماری ہے ——— کھانا! چچا جان کی رال ٹپک پڑی، کھا جانے والی نظروں سے بھتیجے کو گھورا اور گویا ہوئے "یہ ——— یہ تو بچپن ہی سے "پیٹو" ہے۔ مدرسہ کبھی نہیں گیا بلکہ مدرسہ جانے والے بچوں کے ٹفن زبردستی چھین کر کھا لیا کرتا تھا ——— بعد میں تو کئی شرطیں میٹھا کھانے کی جیتی ہیں۔ ایک ایک لگن ڈبل کا میٹھا کھا جاتا تھا۔ ایک بار تو کیا کیا معلوم ایک ہی وقت میں چوبیس ابلے انڈے کھا گیا ——— پیشاب رک گیا ——— بہت مزہ آیا یہ کہتے ہوئے انھوں نے بسکٹ کی تھال اٹھائی ——— ہم نے انکل کے چچا حضرت کو مزید منہ نہ لگایا اور بھاگ کھڑے ہوئے کہ یہ تو "دماغی ریگ مال" کے سلسلے کے حقیقی بزرگ ہیں۔ ہمارا بھیجہ کھانے لگیں گے تو کہیں کا نہ رکھیں گے۔ چچا بھتیجے کی کھائیں۔ کھائیں۔ بسکٹ کھائیں" والی آوازیں دور تک پیچھا کرتی رہیں۔ لالی پیلے بسکٹ بس وہی کھائیں۔ خدا جانے انسانوں کے کھانے کے بسکٹ تھے یا ۔ ۔ ۔ ۔ حالاں کہ پیٹ میں چوہے ویسے ہی بے ہنگم رقصاں تھے جیسے آج کل کی فلموں میں ہیرو، ہیروئنیں (معہ جم غفیر) جدید موسیقی پر ناچ کر رہے ہوں ——— یا بے مقصد اچھل کود کر رہے ہوں۔

●●

غزل

جادو یہ کیسا دیکھیے پاگل ہوا میں ہے
دن کا لباس رات کا آنچل ہوا میں ہے

پیاسی زمیں کا ہے بُرا حال اور اِدھر
پانی کو جیب میں لیے بادل ہوا میں ہے

ہم کیا بتائیں آپ سے مے کی اڑان کو
جس نے ذرا بھی پی ہے یہ بوتل ہوا میں ہے

گاندھی نے جب سے کھادی کا عادی بنا دیا
مشہور شہر ڈھاکہ کی ململ ہوا میں ہے

جھک مارتے ہی رہ گئے اک شعر کے لیے
پھیلا ہوا خیالوں کا جنگل ہوا میں ہے

میں نے کہا کہ جانِ تمنا قریب آ
پھر کیا تھا سر کے پاس ہی چپل ہوا میں ہے

اہلِ خرد ہوں، رینگ رہا ہوں زمین پر
الٹا ہوا وہ عقل سے پیدل ہوا میں ہے

ٹھٹھرا ہوا ہے جاڑے سے عارف زمین پر
ہائے نصیب دیکھیے کمبل ہوا میں ہے

رشید عارف (پٹنہ)

ایک نظم

مجھے بہت تعجب ہوا
میری بغل والی سیٹ کے دونوں آدمی
چھ بج کر گیارہ منٹ ہونے کے لیے
بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے
پھر چھ بج کر گیارہ منٹ ہوتے ہی
ان دونوں نے
اپنے رومال میں بندھی کچھ چیزیں
کھانا شروع کر دیں۔
بالآخر انٹرول میں
میں نے ان سے پوچھ ہی لیا
آپ دونوں چھ بج کر گیارہ منٹ ہونے کے لیے
بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے تھے

اور آپ یہی چیزیں
اس انٹرول میں
سنیما ہال کے باہر جا کر
کسی کینٹین میں بھی تو کھا سکتے تھے

ان میں سے ایک نے کہا
بھائی صاحب
بات دراصل یہ ہے
کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے
اور ہم لوگ روزہ بھی رکھتے ہیں
اور ہم لوگوں کے یہاں یہ حکم ہے
کہ وقت ہو جانے کے بعد
ایک منٹ بھی دیر نہیں کرنا چاہیے

نادر تسنیم احمد (مظفر پور بہار)

جمیل صدیقی

(بدایوں)

کمپیوٹر

بیسویں صدی کی محیر العقول ایجادات میں ایک ایجاد کمپیوٹر بھی ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ محیر العقل۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کوئی ایجاد کسی جادوئی چھڑی کے کرشمہ سے پل بھر میں نہیں ہوتی دنیا کی ہر ایجاد کا کیڑا انسانی دماغ میں سیکڑوں سال تک کلبلاتا ہے۔ تب کہیں وہ تولد ہوتی ہے۔ جہاں تک کمپیوٹر کا تعلق ہے تو اس کی بنیاد بابا آدم کے زمین پر قدم رنجہ فرمانے کے ساتھ ہی پڑ گئی تھی۔ انھیں جب محسوس ہوا کہ دنیا میں جنت جیسی ایک بھی آسائش میسر نہیں ہے تو انھیں رہ رہ کر اپنی فردوسِ گم شدہ کی یاد ستانے لگی۔ وہ سوچتے تھے کہ وہاں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہر خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ انتہا یہ کہ اللہ میاں سے گفتگو بھی روزانہ کا معمول تھا لیکن یہاں تو ایک ہُو کا عالم ہے۔ یہاں تک کہ انھیں حوا تک کا علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان احساسات اور خیالات نے اس پر آمادہ کیا کہ اگر دنیا میں زندہ رہنا ہے تو کچھ کر کے دکھانا ہوگا تاکہ آئندہ کبھی خدا خوش ہو کر انھیں جنت میں واپس بلانا چاہے تو صاف کہہ دیا جائے :

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

تو جناب یہیں سے ضرورت کو ایجاد کی والدہ ماجدہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ جب اولادِ آدم پروان چڑھی تو سابقہ آسمانی آرام و آسائش کی داستانیں بھی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ اور اس طرح ایک مبہم سا کمپیوٹری تخیل اس کے ذہن میں نسل در نسل کلبلاتا رہا۔ آدم سے لے کر پیغمبر آخر زماں تک وحی و الہام، کشف و کرامات کا تذکرہ تمام آسمانی اور زمینی کتابوں میں موجود ہے۔ اگرچہ یہ ذرائع اصلی خدا کی صرف برگزیدہ ہستیوں تک ہی محدود تھے لیکن عام آدمی بھی ذرے چاہتا تھا کہ کبھی [illegible]

اس میں بھی ہوتیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے کسی دور افتادہ دوست یا محبوب سے بات کرنے اس کے ہوتے تو اڑ کر پہنچ جاتا وغیرہ وغیرہ لیکن اس وقت تک عقل و تجربہ میں اتنی وسعت نہیں آ اس لیے اس کے دماغ نے گپ بازیوں کا سہارا لے کر کام چلایا۔ جن، دیو، پری، جادو اڑتے قالین اور بولتے جانوروں کے قصے ایجاد ہوئے۔ یعنی کمپیوٹر سازی کی ابتدائی تصوری تشکیل لگی۔ اس کی مکمل تفصیل جاننے کے لیے الف لیلیٰ اور طلسم ہوش ربا جیسی مستند تصانیف کا مطالعہ ثابت ہوگا۔

رامائن اور مہابھارت جیسی معتبر کتابوں سے بھی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ موجودہ دور کی بہ ایجادات، جن کا سہرا ہم لوگوں کے ان پڑھ رہ جانے کی وجہ سے یوروپ والے اپنے سر باندھ لیے ہمارے ملک کی ایجاد ہیں۔ ہوائی جہاز کو ہی لیجیے سب سے پہلے رام چندر جی نے پشپک وماں سے سے لے کر اجودھیا تک کا ہوائی سفر کیا تھا۔ مہابھارت کی جنگ میں اندھے دھرت راشٹر کو ان کو چوان سنجے نے جنگ کی رننگ کمنٹری سنائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک کلوز سرکٹ ٹی وی ہو چکا تھا۔ سنجے نے اسی میں دیکھ کر آنکھوں دیکھا حال سنایا ہوگا۔ لیکن ٹی وی اور کمپیوٹر کی نیوٹ کا سب سے بڑا واضح ثبوت قدیم ایرانی روایات میں ملتا ہے۔ کہتے ہیں ایران میں جمشید نام کا فرماں روا تھا جو اپنے عہد کا ایک عظیم سائنس داں تھا۔ تاریخ میں دو بادشاہ ایسے گزرے ہیں جو حکمراں ہونے کے بھی اعلیٰ پایہ کے موجد بھی تھے۔ ایک تو یہی جمشید تھا جس نے ہزاروں سال پہلے ایک ا جام بنایا جس میں دیکھ کر دنیا میں ہونے والے ہر واقعہ کو دیکھا جا سکتا ہے دوسرا موجد سکندر تھا کہتے ہیں اس نے آئینہ ایجاد کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ جام جمشید کا مفصل حال شعرائے فارسی و کے کلام میں بکثرت موجود ہے۔ مرزا غالب جام جم کی روایت پر فرماتے ہیں:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بھلا یہ کیا بات ہوئی یہ تو ایسا ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ آپ کے جاپانی تھری ان ون سے میرا ٹرانسسٹر اچھا ہے۔ دراصل غالب جام جم کی اصلیت سے ہی واقف نہیں تھے۔ وہ اسے شیشے گلاس سمجھ رہے تھے۔ اگر وہ جانتے کہ وہ ایک اعلیٰ قسم کا ملٹی میڈیا کمپیوٹر تھا تو ہرگز ایسا شعر نہ آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اصل موضوع سے ہٹ کر ادھر ادھر کی ہانک رہے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو پھر بتا ہیں کہ ماضی کے بطن سے ہی حال جنم لیتا ہے اور کمپیوٹر جیسی ایجاد کوئی پچاس ساٹھ سال کے اندر نہیں ہوئی ہے جیسا کہ یوروپ کے لوگ شیخی مارتے ہیں بلکہ ع

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

پہلے انسان نے اس کی تصوری تشکیل دی پھر دھیرے دھیرے اس کی ایجاد کی طرف قدم بڑھایا۔ لیتے آپ کو بندر کی نسل مان چلیں تو زیادہ آسانی سے بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کافی عرصے تک ہاتھ آنکھوں اور ہونٹوں کی جنبش سے اپنا مافی الضمیر ادا کیا ہوگا بلکہ کبھی کبھی ہماری مرحوم دادی بھی

اغ میں اہم رول ادا کرتی رہی ہوگی بعد ازاں انسان نے اپنے قدرتی مسکن کی دیواروں پر چیل کوئے نما تپ مصوری کی ہوگی جو رفتہ رفتہ حروف تک آئی ہوگی اور تب کہیں ہزاروں سال میں آغوں آغوں سے تو تو میں کی منزل پر پہنچا ہوگا ۔

برخلاف اس کے اگر ہم اپنے آپ کو آدم کی اولاد مان کر چلیں تو ذرا دشواری ہوتی ہے ۔ ہمارے دماغ ن اکثر یہ فتویٰ سا اٹھتا ہے کہ آدم دنیا میں کون سی زبان بولتے آئے تھے یا پھر جنت سے بے دخل ہو جانے کے صدمے سے گو مگو کے عالم میں ہی رہتے تھے ۔ انھوں نے اپنی اولاد کو پڑھایا لکھایا تھا یا نہیں اگر پڑھایا تھا تو قوم اور ہر ملک کی زبان و تحریر جدا جدا کیوں ہے ، ہمارا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان کے ہر دو لڑکوں میں یک لائق نکلتا تھا اور دوسرا کندۂ ناتراش اور یہیں سے دو قبیلے بن گئے ایک مہذب اور دوسرا غیر مہذب پھر ان دو قبیلوں کے بھی قبیلے بنتے چلے گئے اور بنی نوع انسان ہزاروں قوموں اور نسلوں میں تقسیم ہو گئی لیکن بنیادی طور سے مندرجہ بالا دونوں اقسام ہر سماج میں موجود رہیں یعنی ایک خواندہ اور دوسری ان پڑھ۔

بہر حال جب زبان ایجاد ہو گئی تو تحریر کی ضرورت محسوس ہوئی اور مسئلۂ تحریر بہت زمانوں تک زینتِ طاقِ نسیاں بنا رہا ۔ آخر رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور خالقِ لوح و قلم نے یاقوت کی تختیوں پر احکام عشرہ کندہ فرما کر جناب موسیٰ کو عطا فرمائے اور انسان کو فن تحریر کی تعلیم دی ۔ اسی طرح ہمیں فن تحریر کے معاملے میں براہ راست تلمیذ الرحمن ہونے کا شرف حاصل ہوا ۔ مٹی اور پتھر کی تختیوں کے بعد بھوج پتر ، چمڑے کے ٹکڑوں وغیرہ سے گزرتا ہوا فن تحریر چھاپے خانے تک پہنچا لیکن اس فن طباعت میں بیچاری اردو کی تقدیر میں لیتھو کا پتھر ہی لکھا تھا اور یہ پتھر کی سل آج تک کہیں نہیں اردو کی جانِ ناتواں پر پہاڑ کی طرح ٹوٹتی لاتی ہے ۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے ریڈیو ، وائرلیس اور ٹی وی جیسی ایجادات منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے لگیں اور آخر کار ہم کمپیوٹر تک آگئے ۔

بڑے بڑے سرکاری اور تجارتی اداروں میں حساب کتاب کا سارا بوجھ کمپیوٹر کے نازک کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے ۔ اب اس کے ماہرین اعداد شمار میں سر کھپانے کی بجائے جھٹ سے دو ایک بٹن دبا کر ہر قسم کا بوجھ اپنے دماغ سے اتار دیتے ہیں ۔ اب دماغ کی بجائے آنکھوں اور انگلیوں کا کام رہ گیا ہے ۔ اس ایجاد نے ٹیلی ویژن کے ساتھ مل کر ایسے ایسے گل کھلائے ہیں کہ عقل باور نہیں کرتی ۔ اب وہ دن دور نہیں جب آپ کو اخبار یا کتاب کے اوراق پلٹنے کی ضرورت .. رہے گی ۔ صبح اٹھتے ہی اخبار کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا ۔ بٹن دباتے ہی اسکرین پر اخبار موجود ہوگا ۔ دنیا جہان کی تازہ ترین خبریں جیتے جاگتے مناظر کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوں گی ۔ یہ بھی امکان ہے کہ مستقبل میں کمپیوٹر کی وساطت سے ماضی کی سیر بھی کر لیا کریں ۔ شعرائے کرام کو بھی دماغ پچی کی ضرورت نہیں رہے گی ۔ بس اپنی فکر شریف کو کمپیوٹر کے حوالے کر دیں گے ۔ چند لمحوں میں ردیف قافیے کے التزام کے ساتھ گرما گرم اشعار کا تانتا لگ جائے گا جو آپ کو پسند آئے اسے اپنی کمپیوٹری بیاض میں منتقل کر لیجیے تقطیع کرنا چاہیں تو تقطیع کروا لیں

وزن و بحر معلوم کرنا ہو تو کمپیوٹر یہ بھی خدمت انجام دے گا۔ بس اتنا خدشہ ہے کہ ان کمپیوٹری اشعار میں توارد واقع نہ ہو جائے۔

ایک سوال ضرور ہمارے سامنے منہ پھاڑے کھڑا ہے کہ جب ہم اپنا تمام ذہنی سرمایہ کمپیوٹر کے حوالے کر دیں گے تو ہمارے بھیجے میں کیا رہ جائے گا۔ وہ تو ایک زنگ آلودہ، کند اوزار کی مانند کسی کباڑی کی دکان میں سجانے کے لائق رہ جائے گا۔ ہمارے سر میں دماغ کی جگہ بھوسہ بھرا ہوگا اور ہم خود ساختہ خدائے کمپیوٹر کے، کوڑھ مغز بندے کہلائیں گے۔ ●

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

انکل کیا لیں گے آپ؟

ہم کو اپنی تمام زندگی میں سب سے پہلے اپنے "بزرگ" بن جانے کا اذیت ناک احساس اس وقت ہوا جب ہم ایک بہت بڑے اور شاندار ڈپارٹمنٹل اسٹور میں اپنی ضرورت کی ایک چیز خریدنے کے لیے داخل ہوئے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہم نے ابھی ابھی پرسوں[1] پرسوں ہی یعنی دو تین سال پہلے چالیس کی سرحد کو پار کیا تھا اور بزعم خود اس خوش گمانی میں گم تھے کہ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے کہ ہماری مسیں بھیگی تھیں۔ غم کھانے کے لیے تو ہنوز دلی دور است والا معاملہ تھا۔

بہرحال جوں ہی ہم نے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے وسیع و کشادہ ہال میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا تو ایک سے بڑھ کر ایک نوبہار ناز کاؤنٹرس کے پیچھے ہفت[2] ہتھیاروں سے لیس ایستادہ و مستعد نظر آئیں۔ گویا۔ تو کجے بتخانہ آ در کھلا کا سا دلفریب منظر تھا۔ ہم نے ایک طائرانہ نظر سے چاروں طرف دیکھا تو ایک کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی اک نگار "آتش رخ" پری پیکر سے نظر جا ٹکرائی اور ہم دل ہی دل میں یہ دعا مانگتے ہوئے انکوائری کاؤنٹر کی جانب بڑھے کہ یا الٰہی! تو خود جمیل ہے اور جمال کو پسند بھی فرماتا ہے۔ لہٰذا ہماری اس مطلوبہ شئے کو اس کاؤنٹر پر پہونچا دے۔ اسی دعا کا ورد کرتے ہوئے ہم نے ایک میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے خونخوار قسم کی مونچھوں والے مگر ایک ڈیڑھ پونڈ پیئے منحنی بندے سے پوچھا کہ فلاں شئے کس کاؤنٹر پر دستیاب ہوگی۔

اس نے پہلے تو بنظر غائر ہمارا معائنہ فرمایا اور اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ہم کو بے ضرر اور غیر مشکوک پا کر بغیر اپنی زبان سے کچھ بولے کے ہاتھ سے اسی طرف جانے کا اشارہ کر دیا جس کے لیے ہم نے نہایت صمیم قلب سے دعا مانگی تھی۔ (ہم نے دل میں کہا وہ مارا!)

---

1. ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں دس بیس برس پہلے کی بات کو بھی "پرسوں، پرسوں" ہی کی بات کہا جاتا ہے۔
2. محبوبوں کی آرائش ہفت رنگ: پوشاک، زیور، مہندی، سرمہ، پان، مسّی اور آرائش گیسو۔

سلیمہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری دعا پر نہیں پر طاقت پرواز ضرور رکھتی تھی اس لیے ڈائرکٹ ایکشن میں مرغی کے پلیٹ سے جا ٹکرائی اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مستجاب الدعوات ہو گئی۔ درمیان میں کسی سر پسند اڑیل ٹٹو قسم کے کلرک فرشتے کو روڑے اٹکانے کا موقع ہی نہ مل سکا اور وہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے اپنی بغلیں جھانکتا رہ گیا۔⊖

نسخہ بھی تو ہم نے ایسا ہی تیر بہدف استعمال کیا تھا۔ الٰہی! تو خود جمیل ہے۔"

اب تو صاحب! کیا پوچھنا بس سراسر اللہ دے اور بندہ لے والی کیفیت تھی چنانچہ ہم نپے تلے قدم ایک تجاہل عارفانہ بلکہ بہ انداز سوبیانہ SOBER چلتے ہوئے اس کاؤنٹر پر پہونچے اور نہایت متانت اور وقار و تمکنت کی دبیز چادر کو اپنے اوپر اوڑھ کر شوکیس میں سجائی گئی چیزوں کا ملاحظہ کرنے لگے بیچ میں تھوڑی سی فرصت نکال کر دزدیدہ نظروں سے اس زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے کے رخ زیبا کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو سینک بھی لیتے تھے جو ہمارے سوال کی منتظر تھی جب کچھ ہوا کے دوش پر پر لگا کر اڑ چکا تو اس پیکر ناز نے جو بمقابلہ کرنل محمد خاں والی سیلس گرل کے زیادہ اور مہذب تھی ڈوپٹہ کھسکا کر کانوں میں رس گھول لینے والی مترنم آواز میں ہم سے خود پوچھا! اور کیا پوچھا؟ انکل! کیا چاہیئے آپ کو؟

الٰہی! خیر ہو اس دو روزہ زندگی مستعار میں پہلی بار اس پری رخ نے، کمر موئے، عطر بوئے و طوطی آواز کی زبان سے اپنے لیے "انکل" سن کر ہمارے ہوش کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے اور ہم نے اپنے کہا۔ اے آتش! لد گئے تیری جوانی اور رعنائی کے دن اب بیٹھ جا مصلیٰ بچھا کر اور ہو جا مشغول یادِ الٰہی۔ کبھی اپنے پسینے کے گلاب ہونے کا مرثیہ پڑھ لے۔ جب کچھ اور وقت گزرا تو اس شعلہ جوالہ بلکہ آفت نے ہمارے جواب کا انتظار کرنے کے بعد دوبارہ پوچھ لیا۔

"انکل! کیا لیں گے آپ؟" ہم نے یہ سن کر اور صبر کے تلخ گھونٹ پی کر اپنے دل میں کہا۔ کہا کہ کوسا۔ بیٹی۔ اب لینے کے لیے تم نے باقی ہی کیا رکھ چھوڑا ہے؟ اور یہ بھی ایک المیہ ہی ہے کہ اپنی میں پہلی بار ہی ہم نے اس منحوس دن اپنی لخت جگر کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو بھی۔ گو دل ہی دل میں بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا . . . . .

مشکل الفاظ اور جملوں کے معنی

دہلی کی ایک ادبی محفل میں جب ہم نے اپنا ایک غیر ادبی مضمون سنانے کی گستاخی کی تھی تو اس ہونے پر ہریانہ کے رہنے والے ایک میوات' صورت بزرگ اپنی نشست سے اٹھ کر ہمارے قریب آ اور چپکے سے ہمارے کان میں ایک قیمتی مشورہ پھونکا۔

مجوز! (حضور) آپ کا واج بیان (وعظ) بڑا ہی ایمان افروج (افروز) تھا۔ آپ سے :

⊖ کرنل محمد خاں کی بجنگ آمد سے تھوڑے سے تصرف کے ساتھ۔

یک بنتی ہے کہ آپ کی واج میں بہت سارے مشکل (مشکل) لفظ (لفظ) آ گئے ہیں، اگراب کے سے آپ ایسے (لغوی) کے معنی بھی بتلادیا کریں تو یہ بڑا "کار ثواب" کا کام ہوگا"۔

حقیقت اس کار ثواب کے کام کی صرف اس قدر تھی کہ ہمارے مضمون میں ایک دو مقامات پر مثنوی مولانا روم کے "من نہ دانم فاعلاتن فاعلات + شعر می گویم بہ از قند و نبات" قسم کے ایک دو شعر دخیل ہو گئے تھے۔ جن کو ہم نے مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی مرحوم کے لحن میں بعد از پریکٹس بسیار پڑھ کر سنا دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے ان ایک دل سادہ لوح بزرگ کا یہ انمول مشورہ فوراً اپنی عقل کی گانٹھ میں باندھ لیا اور اب اس مضمون کے مشکل الفاظ کے معنی ہی نہیں بلکہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طبا طبائی کی اتباع کرتے ہوئے ان کی "شرح دیوانِ غالب" کے رنگ میں تشریح بھی بیان کیے دیتے ہیں تاکہ ہماری طرح اس کے پڑھنے والوں پر بھی چودہ طبق روشن ہو جائیں۔

ہوا یوں تھا کہ جس زمانے میں میرزا نوشہ ہمارے حلق سے نہیں اتر رہے تھے تو ہم نے ضیق ہو کر اپنے محب صادق برادر محترم جناب سید امین الحسن صاحب ایڈیٹر ریڈینس دہلی کو لکھا تھا کہ بھائی صاحب اس مہم کو سر کرنے کے لیے دہلی سے آپ کوئی معقول قسم کی شرح دیوانِ غالب انتخاب فرما کر بھجوا دیں۔ چنانچہ امین بھائی نے جن کو ہم سے زیادہ ہماری خاطر بے حد نہایت عزیز ہے اردو بازار جامع مسجد میں پرانی کتابوں کے انبار کو کھود کر اور کھنگال کر یہ شرح "طبا طبائی" برآمد کی اور "آؤ دیکھا نہ تاؤ" بس ہمیں بھجوا دیا ہمارے استفادے کے لیے یہ کہہ کر کہ لے بیٹا پڑھ اس شرح کو دل کی آنکھوں سے۔ اگلوں کے تبرک سے تیرے دیدہ و دل ہی روشن نہیں ہوں گے بلکہ پانچوں اس بھی ٹھکانے لگ جائیں گے اور پھر ہوا بھی یوں ہی بلکہ یہ راز بھی ہم پر منکشف ہوا کہ غالب کو کندن بننے کے لیے ابھی ایک نہیں بلکہ کئی آنچ کی کسر باقی رہ گئی تھی اور کسی خیالی عبدالصمد تازہ وارد ولایت ایران کے علاوہ بھی طبائی صاحب جیسے ایک استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا باقی رہ گیا تھا (یا للعجب)

چنانچہ اس پس منظر میں اس مضمون (انکل اکیائیں گے آپ ؟) کے مشکل الفاظ کے معنی درسی کتابوں کا تتبع کرتے ہوئے اسی انداز میں رقم کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا اور پڑھا ہوگا اکثر درسی کتابوں میں سبق کے اختتام پر "مشکل الفاظ کے معنی" اور ان کی تشریح بھی کر دی جاتی ہے۔ مثلاً:

(۱) انڈا: ایک دودھ کی طرح سفید "بیضوی" شکل کی شے جس کو مرغیاں دکھ سہہ کر دیا کرتی ہیں اور ہم ان کو تل کر کھا جاتے ہیں اور بچیاں اس کی پہیلی اس طرح بنا کر پوچھتی ہیں۔ آؤ سہیلی بوجھیں پہیلی۔ ایک شیشی کا رنگ اندر جس کے دو دو رنگ۔ بوجھو کیا ؟

(۲) حقہ: وہ اونٹ نما شے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ جس کے سر پر ایک پیالے میں آگ جلتی ہے دادا ابا اس کی دم کو اپنے ہونٹوں میں دبا کر منہ اور ناک سے دھواں اگلتے ہیں اور اس کی گڑگڑاہٹ پر بچے تالیاں بجاتے ہیں۔ گویا بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں۔

ہم نے بھی اس سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے اس مضمون کے مشکل الفاظ کے معنی لکھ دیے ہیں بلکہ اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے نہایت آسان زبان میں تفسیر و تشریح بھی بیان کر دی ہے۔ اس امید اور بھروسے

پر کر اس کارِ ثواب کے کام کی انجام دہی پر اللہ رب العزت ہم کو دارین کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین

مشکل الفاظ		معنی
۱. پری روئے	:	نسیمِ صبح جو چھوئے رنگ ہو میلا (انشاء)
۲. کمر موئے	:	شانے نے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے کیا ساتھ نزاکت کے رگِ گل سی کمر ہے (میر)
۳. عطر بوئے	:	صبا بہ وقت سحر بوئے ز زلف یار گر آورد (حافظ) دلِ شوریدۂ ما را از در کار حقی آورد
۴. خوش آواز ے	:	اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو (مومن)
۵. شعلۂ جوالہ بلکہ آفت کی پر کالہ	:	ترے سرو قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں (غالب)
۶. اے آتش! لد گئے تیری جوانی و رعنائی کے دن	:	وہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا
۷. اپنے پسینے کے گلاب ہوتے کا مرثیہ	:	وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا
۸. الٰہی! تو خود جمیل ہے اور جمال کو پسند بھی فرماتا ہے	:	اللہ جمیلٌ و یحب الجمال

اقبال ہاشمی

قطعات

کبھی پانی کو روتا ہوں کبھی بجلی کو روتا ہوں ÷ چھلک پڑتے ہیں جب آنسو تو اپنے منہ کو دھوتا ہوں
مسلسل جاگتا ہوں مچھروں کے ساتھ راتوں میں ÷ خدا کے فضل سے دفتر میں جا کر خوب روتا ہوں

میری ہر بات کو فریاد سمجھ لیتے ہیں ÷ میری بیداد کو وہ داد سمجھ لیتے ہیں
ترجمہ کرتے ہیں اردو میں وہ جب انگلش سے ÷ ایڈز کے معنی کو امداد سمجھ لیتے ہیں

تیری جانب اُٹھے ہر گام پہ رونا آیا ÷ اپنے اندر اُٹھے کہرام پہ رونا آیا
ایڈز کا روگ نظر آیا تو نکلا منہ سے ÷ "اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا"

جنونِ شاعری

اِنشا غلط ہے آپ کا اِملا بھی غلط ہے ÷ کھولیں اگر زبان تو لہجہ بھی غلط ہے
اس پر جنونِ شاعری اقبال ہاشمی ÷ اب میل جول آپ سے رکھنا بھی غلط ہے

سُنائیے

مجھ کو نہ اپنے عشق کا نوحہ سُنائیے ÷ گر ہو سکے تو میٹھا سا نغمہ سُنائیے
مَیں آپ کو بتاتا ہوں اِک رازِ شوہری ÷ بیوی کو دل کی بات کبھی مت سُنائیے
جھوٹا سا ہیں آپ کہ سچا غرض نہیں ÷ کالج کے عشق کا کوئی قصہ سُنائیے
محفل میں شور کرتا ہو جو مسخرہ بہت ÷ اس کو کوئی ثقیل سا مصرعہ سُنائیے
غیروں کو خوب دیجیے جمہوریت کا ڈوز ÷ اپنوں کو راجہ رانی کا قصہ سُنائیے
اے کاش کوئی نقرئی آواز یہ کہے ÷ پرویز جی یہ شعر دوبارہ سُنائیے

ڈاکٹر پرویز احمد
(ریاض)

کسی قوم کی زندگی میں
چار سال کی اہمیت ہی کیا ہے۔

تاریخ کا ایک ورق؟

جبکہ ان چار برسوں کے دوران اصلاحات کے [illegible] کایا ہی پلٹ گئی ہو اور غریب طبقے کو پہلے سے زیادہ [illegible]

یہ جون ۱۹۹۱ کا زمانہ تھا جب —

* زرعی پیداوار میں کمی آ رہی تھی۔
* صنعتی ترقی کی رفتار سست تھی۔
* برآمدات میں کمی آ گئی تھی۔
* غیر ملکی زر مبادلہ میں کمی آ گئی تھی۔
* ملک غیر ملکی قرضے ادا کرنے کا اہل نہ رہا تھا۔
* ملک کا سونا غیر ملکی بینک میں گروی پڑا تھا۔
* سیاسی غیر یقینی کی صورت حال تھی۔
* ملک دیوالیہ ہونے کے قریب تھا۔

اور اب ، جون ۱۹۹۵ کا زمانہ ہے جب —

* معیشت اب متعدد شعبوں مثلاً بجلی، تیل، مواصلات، پٹرولیم، فولاد، انفراسٹرکچر وغیرہ میں سرمایہ کاری کے نئے مواقع فراہم کر رہی ہے۔
* اناج کی پیداوار ۱۸ کروڑ ٹن تک پہنچ چکی ہے۔ یعنی اب تک کی سب سے زیادہ [illegible]
* ۱۹۹۲ میں شروع کیا گیا [illegible] شدہ سرکاری نظام تقسیم اب [illegible] دور دراز اور پہاڑی علاقوں میں ۱۷۷۵ بلاکوں میں زیر عمل ہے۔
* زرعی پیداوار کے لیے کسانوں کو اب زیادہ منفعت بخش قیمتیں، کھاد پر سبسڈی جاری۔
* ۱۹۹۲-۱۹۹۵ کے دوران 2،330 کروڑ روپے کی برآمدات کی گئیں۔ [illegible]
* برآمدات کو اعلیٰ
* معاشی ترقی سے روزگار کے زیادہ مواقع۔ ہر سال ۹۰ لاکھ مواقع فراہم کیے گئے۔
* جواہر روزگار یوجنا کے تحت 5،670 ملین کام کے دن مہیا کیے گئے۔
* روزگار کی یقینی اسکیم کے تحت ۱۲ ملین سے زیادہ لوگوں کو روزگار مہیا کیا گیا۔
* ۲۲۰۰۰ ہیکٹیئر زمین، بنجر زمین کے ترقیاتی پروگرام کے تحت لائی گئی ہے۔
* گاؤں کی سطح پر جمہوریت کے استحکام کے لیے پنچایتی راج ایکٹ کا نفاذ کیا گیا۔
* دستکار اور بنکروں کی بہبود کے لیے ۱۸۲ کروڑ روپے کی فراہمی کی گئی۔
* خواتین کو خود کفیل بننے میں مدد کے لیے مہیلا سمردھی یوجنا اور راشٹریہ مہیلا کوش۔
* ۱۹۹۷ تک ملک کے تمام گاؤں میں ٹیلی فون کی سہولت۔
* مواصلاتی سیارے کے ذریعے منی آرڈر سروس کی شروعات۔



* دور درشن کے پروگرام ۲۶ کروڑ ناظرین کے لیے دستیاب۔
* آکاش وانی کے علاقائی پروگرام اب ملک کے کونے کونے تک۔

کمزور طبقات کی بہبود پر توجہ

* مرکزی حکومت اور عوامی شعبے کے اداروں کی ملازمتوں میں پسماندہ طبقات کے لیے ۲۷ فی صد روزگار کا ریزرویشن۔
* قومی صفائی کرمچاری کمیشن کا قیام
* اقلیتوں کی ترقیاتی و مالیاتی قومی کارپوریشن اور پسماندہ طبقات کے مالیاتی و ترقیاتی قومی کارپوریشن کا قیام۔

امن اور ہم آہنگی کے لیے جدوجہد

* پنجاب اور آسام میں امن و سکون بحال
* جموں و کشمیر میں انتہا پسندی کے خاتمے اور عام حالات کی بحالی کی کوششیں جاری۔



[illegible] ہر سال کی [illegible] وقت ہمارا عہد [illegible] کی خواہشات
[illegible] ایک خوشحال قوم [illegible] کی تمنا کر سکتی ہے۔

ہمارے سامنے ایک تابناک مستقبل ہے۔
ہمارے خوابوں کی تعبیر

ہندوستان ایک تابناک مستقبل کی راہ پر گامزن ہے۔ آیئے ہم سب کاندھے سے کاندھا جوڑ کر آگے بڑھیں

پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ حکومت کے چار برس

davp 95/178

تبصرہ

"نوٹے" لب و لہجے کے شاعر جناب رؤف خیر کا مجموعہ کلام

شہداب

ہنٹر کریم نگری

شاعر خوش مقال و خوش عیال جناب رؤف خیر نے اپنا تیسرا مجموعۂ کلام ازراہ خلوص میری نذر کیا۔ جن کا منفرد لب و لہجہ ہندوپاک سے اپنا لوہا تو لوہا فولاد بھی منوا رہا ہے۔ جن کے کلام کی نہ صرف طوطی بولتی ہے بلکہ طوطا بولتا ہے۔ سنجیدہ تبصرے تو بعد میں عوام کے سامنے آئیں گے ہی۔ جی چاہا کہ کیوں نہ اس مجموعہ پر اپنے انداز میں "ہنٹر" گھمالیں تاکہ لوگوں کے سامنے یہ بات بھی آجائے کہ ایک مزاحیہ شاعر یا ادیب کس قسم کے عینک سے کلام اور صاحب کلام کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔

خیر تو صاحب ہم رؤف خیر کی قسمت پر نہ صرف رشک کرتے ہیں بلکہ ذرا جلتے بھی ہیں۔ ایک دو نہیں بلکہ تین تین مجموعہ ہائے کلام کا منظر عام پر آنا کوئی معمولی بات نہیں جبکہ ہمارے اپنے پہلے مجموعۂ کلام کو شائع کروانے کے تصور سے تک ہمیں غشی آرہی ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کسی شاعر کے مجموعۂ کلام کو طبع یا تباہ کرنے میں اس کے بیوی بچوں کا رول انتہائی اہم ہوتا ہے ورنہ اس آسمان کو چھوتی ہوئی گرانی میں کون بھلا آدمی مجموعۂ کلام کے پیچھے پیسہ اور وقت خراب کرتا ہے جبکہ گرانی کا یہ عالم ہے کہ خوردنی تیل ۶۰ روپیہ فی کلو ہو رہا ہے۔ خوردنی تیل کا مجموعۂ کلام سے کیا تعلق اسے سمجھنے کے لیے آپ کو بھی رؤف خیر کی طرح خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف چلنا پڑے گا۔

اس شاعر خوش نوا کے مجموعۂ کلام کا دوسرا صفحہ الٹتے ہی رگ ہنٹر پھڑک اٹھی اس لیے کہ ناشر کے کالم میں شاعر نے عمری پبلی کیشنز بیت الخیر لکھ کر اپنے بچوں کے لیے ایک بہتر مستقبل اور اپنے اور بیوی کے لیے بہترین "حال" کا جیتے جی پیشگی بندوبست کرلیا ہے۔ مشاہدہ یہ ہے کہ ایک شاعر کو دراصل بیوی بچے خود پالتے ہیں۔ اس کے کھانے اور کپڑوں تک کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک شاعر دوست کے جسم پر شوخ رنگ کا بشرٹ دیکھا تو میں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا خدا کی قسم کھا کر بولو بشرٹ کا یہ کپڑا بھابی کے میکے والوں کے

. . . . . پاس سے تو نہیں خریدا؟ انھوں نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا تم نے ٹھیک ٹھیک پہچانا ہے۔ بھئی مجھے معلوم ہے کہ ایک شاعر کی بیوی اپنے شوہر نامدار کے لیے شوخ رنگ کا بشرٹ ہی پسند کر سکتی ہے۔ چاہے وہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا نظر آتا ہے۔

اب ذرا مرتبین کے ناموں کی طرف آئیے صاحب۔ شاعر نے اپنے بچوں کی قطار کا بڑے فخر سے ذکر کیا ہے۔ یہ بھی ایک انداز ہے۔ اپنے بچوں کے تعارف کا۔ ایک دو نہیں الحمدللہ کئی بچے۔ ان کے ناموں کے آگے خیری لکھ کر شاعر ہوشیار نے بچوں کو نظر بد سے بچا لیا ہے۔ لڑکیاں کتنی ہیں لڑکے کتنے ہیں معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کاش لڑکوں کے ناموں کے آگے خیری کے بجائے "خیرا" لکھا جاتا تو ہمیں پہچاننے میں سہولت ہوتی۔

انتساب میں رؤف خیر نے مجموعہ کو اپنی ایک ہی چہیتی بیٹی کے نام منسوب کیا ہے۔ ایک منصف مزاج باپ کے لیے زیبا نہیں کہ پوری کتاب ایک ہی بچی کے نام منسوب کرے۔ خیر!

اب ذرا کلام کی طرف آئیے۔ حمد اور نعت میں شاعر نے اچھوتے انداز میں خانقاہی مزاج رکھنے والوں کو نہ صرف چوکنا کر دیا ہے بلکہ چونکا دیا ہے۔ شاعر کو محتاط انداز میں حمد یا نعت کہنا چاہیے تھا۔ جبکہ لب و لہجہ بتاتا ہے کہ شاعر بڑا کٹر وہابی یا دیوبندی ہے۔ اہلحدیث بھی کہا جا سکتا تھا مگر شاعر کی شوخ مزاجی اور مختصر فرنچ کٹ داڑھی کو دیکھ کر تامل کرنا پڑتا ہے کہ کہیں ہم سے غلو نہ ہو جائے۔

انفرادیت کا یہ عالم ہے کہ غزلوں میں بھی شاعر نے کسی کے رنگ یا کلر کو پھٹکنے نہیں دیا۔ اپنی منفرد نوابی چال کی طرح نپے تلے شاہانہ بلکہ والہانہ پن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جیسے:

بیعت کرو تو ایک ہی دست رسول پر
دو رکعتی امام کی تقلید مت کرو

—

کھینچو بڑی لکیر لکیروں کے درمیان
چھوٹی کسی لکیر کی تردید مت کرو

شاعر نے آگے بڑھ کر یہاں تک کہہ دیا:

وہ تو کھلی کتاب ہے اسے کافرانِ حق
ایمان اک رسول پہ لاؤ بھی مان

شاعر اور کفر کا فتویٰ ——؟

بعض خاندانوں میں دیکھنے میں آتا ہے ایک بیٹے کا تبلیغی جماعت سے تعلق ہوتا، دوسرے کا جماعت اسلامی سے۔ تیسرے کا اہل حدیث سے۔ چوتھے کا سنت الجماعت سے۔ مشہور ہے پانچ انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں مگر بات بھی شاعر کو کھٹک گئی شاید:

شاخیں تو بہت کچھ ہیں بھائی بہنوں میں
بلا کا فرق بڑے فاصلے ہیں ذہنوں میں

ایک مصرعے میں نظم کہہ کر شاعر نے طویل نظمیں والے شعرا کی مٹی پلید کی ہے۔ اب میٹرک فیل کو تو اچھا موقع مل جائے گا۔ ایک ایک ہاتھ نظم کہنے والا شاعر مشاعروں میں ہوٹ ہوگا جب میٹرک فیل شاعر ایک مصرعہ میں نظم کہہ کر لوٹ لے گا۔ اگر نظم کہنے کا یہی حال رہا تو آگے کی نظموں کا بھی معراج ہو سکتا ہے۔ جیسے:

شادی بے شر

اشکوں کی جھڑی

ساس بہو

نند بھاوج

وعلیٰ ہذا القیاس اس قسم کی ادبی بدعت کر کے

اس مجموعہ میں آزاد نظمیں اور ترائیلے بھی پڑھنے کو زیادہ اور سمجھنے کو کم ملیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے امپورٹیڈ بھیجہ درکار ہے۔ ابہام کی بھی حد ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے رؤف خیر نے اپنے کنجلک خیالوں کے پیکر کو خوب صورت فرانسیسی سوٹ پہنا کر ٹائی لگانے کی "خیاطانہ" کوشش کی ہے۔ جسے کسی صورت میں جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بڑے تبصرہ نگار ان کی اس غیر ملکی تخلیقات پر کتنی ہی تعریفوں کے پل باندیں مگر حق تو یہ ہے کہ ان نظموں اور ترائیلوں کے ساتھ اس کا پس منظر ترکیب استعمال یعنی اس کا مطلب بھی لکھ دیا جاتا تو بہتر تھا۔

مختصر یہ کہ اس مجموعہ کو ادبی دنیا میں ضرور کھرے ہاتھوں لیا جانا چاہیے۔ خرید کر پڑھنے والوں کے لیے قیمت ۵۰؍ بھی ہی ہے یعنی پچاس روپیوں سے ۱۰ روپے کم ہی ہیں۔ مجموعہ کی کتابت بڑی پیاری ہے اور غلطیاں بھی نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کاتبِ خوش خصال نے اس کی کتابت کی ہے ورنہ خدمتِ خلق کے بجائے خدمت حلق لکھنے والے کاتبوں کی حیدرآباد میں کمی نہیں۔

سگ گزیدہ

مضامین از عابد معز

ناشر: زندہ دلانِ حیدرآباد

قیمت: ۶۰ روپے

مبصر: وزیری پانی پتی

سگ گزیدہ عابد معز کے ایسے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوچکے تھے اور اب انھیں کتابی صورت دے دی گئی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کو پڑھنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ عابد معز نے محض صاحب کتاب کہلانے کے لیے ان مضامین کو کتابی صورت نہیں دی بلکہ وہ لکھنے کا ہنر جانتے ہیں اور ایک مقصد کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ یہ مقصد انسان کو انسان ہونے کا شعور دلانا ہے۔ عابد معز نے اس سلسلے میں اپنا ایک الگ راستہ تلاش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے مزاح کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ عام طور پر مزاح اور ظرافت کے ساتھ طنز کو لازمی سمجھا جاتا ہے لیکن کچھ اہل قلم نے اس سے الگ ہو کر دکھایا ہے۔ عابد معز کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی کتاب میں شامل سولہ مضامین میں قوسِ قزح کے سارے ہی رنگ ملتے ہیں۔ ظرافت طنز، مزاح اور دکھ بھرے مزاح کے رنگوں کی آمیزش سے انھوں نے اپنی دنیا الگ آباد کی ہے۔

"سگ گزیدہ" کے بیشتر مضامین میں موضوع کی افادیت کو اتنا نمایاں اور روشن رکھا گیا ہے کہ قاری دوسری چیزوں کو بھول جاتا ہے۔ عابد معز کی تحریروں میں روانی اور گفتگو ملتی ہے۔ عابد معز کی تحریروں میں روانی اور شگفتگی ملتی ہے۔ یوسف ناظم نے اس کتاب کے حوالے سے بڑی مزے دار بات لکھی ہے کہ "عابد معز کی تحریر پڑھنے کا وہی لطف ہے جو جھولے جھولنے میں آتا ہے"۔ ایک ایسے دور میں جب مختلف عوامل کے زیر اثر انسان خود کو نڈھال محسوس کرنے لگا ہے۔ اس انداز کی ہلکی پھلکی تحریریں، ذہن کو آسودگی اور راحت عطا کرتی ہیں۔

(مطبوعہ "رابطہ")

-o-

دسے کے خط (مراسلے)

محبی، آداب!

"شگوفہ" کے خصوصی شماروں کے بارے میں گفتگو کے وقت ایک بات کہنی یاد نہ رہی۔ یہ سال رشید احمد صدیقی کی صد سالہ تقاریب کا ہے۔ دہلی میں کسی سر سید میموریل سوسائٹی نے ایک جلسہ کیا ۳ر اور ۴ر مئی کو دہلی یونیورسٹی میں رشید صاحب پر سمینار ہو چکا ہے۔ اکتوبر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سمینار کرنے والی ہے۔ دسمبر میں جامعہ اردو میں "جشن رشید" منایا جائے گا۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی کی اعانت سے جونپور میں بھی تقاریب کے انعقاد کی اطلاع ہے۔ ممکن ہے اور لوگ بھی کریں ـــ اس لیے آئندہ چار پانچ ماہ میں کسی شمارہ کو "رشید احمد صدیقی نمبر" کے بطور شائع کرنا مناسب ہوگا۔

(پروفیسر) سلیمان اطہر جاوید، ترویتی

★

مکرمی تسلیمات

شگوفہ کی ادارت کے فرائض نبھاتے ہوئے آپ جس طرح طنز و مزاح کی خدمت کر رہے ہیں اس کا اعتراف ہم سبھوں کو ہے۔

عظیم آباد میں بھی یہ شمع روشن ہے اور ہماری خواہش ہے کہ نومبر میں جناب رضا نقوی واہی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جشنِ واہی کا انعقاد کیا جائے جس میں آپ حضرات بھی تشریف لائیں۔ ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ اس جشن میں زندہ دلان حیدرآباد کا بھی تعاون شامل ہو۔ اس ضمن میں اگر شگوفہ کا خصوصی شمارہ واہی صاحب کے نام ہو سکے تو جشنِ واہی میں چار چاند لگ جائیں گے۔

شفیع مشہدی (پٹنہ)

★

محترم کمال بھائی

آپ کی طرف سے شہ پا کر ایک "خاکہ" روانہ کر رہا ہوں۔ یہ خاکہ ایک ایسی لڑکی کے متعلق ہے جو ذہنی طور پر اپاہج ہے۔ مضمون نگاروں نے دنیا کی عظیم ہستیوں پر خاکے لکھے ہیں لیکن میں نے ایک غیر معروف لڑکی پر خاکہ لکھا ہے۔ یہ خاکہ دراصل ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے لیے لکھا ہے "شاہین" تو بس ایک علامت ہے۔

میرا یہ مضمون مولوی عبدالحق کے گدڑیے کا لال اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے کالج کے چپراسی اور مشتاق احمد یوسفی کے اسکول کی گھنٹی بجانے والے جیسا مکمل نہیں۔ اس میں میری کم علمی اور دوسری بعض مجبوریاں بھی شامل ہیں۔ بعض واقعات اور بعض گوشوں کا تذکرہ کرنے کی مجھے شاہین کے والدین کی طرف سے اجازت نہیں ملی اور بعض باتیں میں نے لکھنا مناسب نہیں سمجھیں اور بعض چیزوں تک میری رسائی نہ ہو سکی۔ اس لیے شاید مضمون ادھورا محسوس ہو۔ معذور بچوں میں قدرتی تلافی اور "ماورائے حسّیت" (E.S.P) کے جو مشاہدے کیے گئے ہیں میں نے شاہین میں وہ باتیں دیکھی ہیں۔ اگر میں ان باتوں کا تذکرہ کرتا تو مضمون بہت بوجھل ہو جاتا۔

سلیم مقصود

(جدہ)

اداریہ

گذشتہ مہینے ہمارے خاندان کے سر سے ایک طوفان گزر گیا۔ میرے دو ہونہار نوجوان بھانجے مرزا عاصم علی بیگ ولد جناب مرزا محمود علی بیگ (حال مقیم شارجہ) اور عظمت علی عمیر ولد جناب محمد افتخار علی ڈپٹی رجسٹرار ریجنل انجنیرنگ کالج ورنگل ۲۳ / جولائی ۹۵ء کو ماگر جوما ساگر کی تیز اونچی لہروں کی لپیٹ میں آگئے۔ اور جاں بحق ہوگئے۔ ہم سب تفریحاً ماگر جوما ساگر گئے ہوئے تھے۔ ہنستے کھیلتے بچے منٹوں میں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ اس سانحہ عظیم نے بچوں کے والدین اور خاندان کے سارے افراد کو دہلا کر رکھ دیا۔ موت تو برحق ہے لیکن جس عمر اور جن حالات میں اس سانحہ ارتحال سے دوچار ہونا پڑا اس کے اثرات اور درد کا مداوا ممکن نہیں۔

اس جانکاہ حادثے پر عزیزوں، رشتہ داروں کے علاوہ بے شمار سماجی و سیاسی اہم شخصیتوں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دیگر احباب و کرم فرماؤں نے شخصی طور پر، فون اور خط کے ذریعہ اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔ غم و اندوہ کے اس ہجوم میں مخلص احباب کی دلجوئی زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ شہید نوجوانوں کے والدین، میں اور میرے خاندان کے تمام افراد ان سب کے ممنون ہیں، جنھوں نے مخلصانہ تعزیت کے ذریعہ ڈھارس بندھائی اور دعاؤں سے سرفراز کیا۔

ان حالات نے شگوفہ کی اشاعت پر بھی اثر ڈالا۔ اگست کا شمارہ کسی قدر تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ لیکن یقین ہے کہ آئندہ دو تین مہینوں میں ہم مقررہ تاریخ کی پابندی کے قابل ہو جائیں گے۔

جشن ظرافت کمیٹی پٹنہ کی جانب سے نومبر ۹۵ء کے تیسرے ہفتہ میں مامور شاعر رضا نقوی واہی کے اعزاز میں تہنیت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ شگوفہ کا ایک خصوصی شمارہ بھی شائع ہوگا۔ رشید احمد صدیقی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر بھی ایک خصوصی نمبر شائع ہوگا۔ جس کی ادارت کے لیے ہم نے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید سے درخواست کی تھی۔ موصوف نے ہمارے اصرار پر اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے۔ ۲۵ سالہ نثری انتخاب کا کام بھی اختتامی مرحلہ میں ہے اسکے بعد دیگرے یہ خصوصی شمارے آئندہ چند مہینوں میں شائع ہوں گے۔

واذاجاء اجلهم لایستاخرون ولایستقدمون (قرآن)
(اور جب ان پر موت کا وقت آجاتا ہے کوئی لمحہ دیر سے آتا ہے نہ کوئی لمحہ جلد آتا ہے)

مکرمی مصطفیٰ کمال صاحب

سلام علیکم۔ بعد از خیریت آپ کے دونوں ہمشیر زادوں کی ناگہانی و اندوہناک موت (شہادت) پر جسقدر افسو[س]
جائے کم ہے۔ یہ ہونہار قابل قدر نوجوان آپ ہی کے نہیں بلکہ قوم و ملت کے لیے بھی باعث افتخار تھے۔ اپنے جذ[بات]
و احساسات بصورت تاریخی قطعات پیش کرتا ہوں، اور ان کے لیے دست بہ دعا ہوں آپ کے غم میں برابر کا [شریک]

مخلص (ڈاکٹر عقیل ...)
صدر نشین بورڈ آف اسٹڈیز جامعہ ...

قطعات تاریخی

دو ہونہار قابل قدر نوجوان انجینیروں کی غرقابی پر

بھائی تھے دو عاصم اور عظمت ۔ قابل تھے ۔ نوجوان
کیا ان کو موت آگئی صد آہ ۔ غرقاب ہوئے مآل

۱۹۹۵ء

سیر تفریح ۔ خوشی دیکھئے دیکھئے ۔ کیا سے کیا ہوگئی ۔ دیکھئے
عمر بھر وہ نظارہ بھلا نہ سکیں ۔ وائے پونجی لٹی ۔ دیکھئے

۱۴۱۶ھ

قطعہ تاریخ وفات

لگ گئی شاید زمانے کی نظر
شاخ سے یہ گل گرے ہیں ٹوٹ کر
زندگی بھی کسقدر ہے بے وفا
چھوڑ دیتی ہے وہ لاکر بام پر
کیا اٹھا طوفان مرگ ناگہاں
ہوگئے دونوں ہی موجوں کی نذر
کون دے کس کو دلاسا متقی
ہر کوئی ہے اشک غم میں تربہ تر
آج پایا سال غم یہ حسب حال
آئے باغ خلد میں وہ ڈوب کر

۱۹۹۵ء

ڈاکٹر سید عباس متقی



مرزا عاصم علی بیگ ولد مرزا محمود علی بیگ - متعلم بی ای

پیدائش : 10-12-1972

وفات : 23-07-1995

M. Azmath Ali Umair (Abu, Guruji)



He was amongst the rare breed who had swept aside a scholarship to the 'promised land' pursuit of his convictions. A regular source of 'alien' goodies to many in the institute, he was an acclaimed computer wiz. This lanky Hyderabadi was an epitome of 'tameez' and 'tehzeeb', though only a few were privy to the zippy hindi that he was capable of. Rumour has it that most of his 'summers' were spent at a rather unconventionally domestic place of work (reported to be somewhere in A.P., suspiciously close to Secunderabad). The insti was witness to his metamorphosis into the politically. correct 'corpodile' with a generous display of stiff upper lip. A soft spoken person, he was the blue eyed boy of more than one member of the faculty. This efficient and systematic man of action is sure to inject somethin more substantial than vaporware into the world of Indian finance.

DOB · 25.08.72
D1/4 REC Quarters
R.E.C.
Warangal (A.P.) - 506 004
Ph : 76525. IDBI

'The Inprint - 1995' magazine from
IIM, LUCKNOW.

CURRICULUM VITAE

Name	:	M. Azmath Ali Umair
Born	:	23-10-1972
Died	:	23-07-1995

* Got merit scholarships from S.S.C. to B. Tech all years.
* Passed with distinction B.Tech (E.C.E.) for RECW and MBA from IIM, LUCKNOW.
* SSC - 1987, INTER - 1989, B.Tech 1989 - 93 & MBA 1993-95 joined IDBI on 17th. May 1995.
* Secured 75 rank in EAMCET.
* Secured 2280 out of 2400 in GRE, Toefl 637 out of 650 and selected in MBA through CAT (Common Admission Test - an All India Test)
* Got admission in Colardo State University, Colarado, USA and aslo VISA, but preferred MBA from IIM.
* Umair was a perfect gentleman, full of manners, a symbol of Hyderabad Tahzeeb. A gem in Computers.

ماہنامہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۸
شمارہ : ۹

ستمبر ۱۹۹۵

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
ایڈیٹر اوورسیز : ڈاکٹر عابد معز (ریاض)
ایڈیٹوریل اوورسیز کمیٹی

مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (ریاض)
سعید شوکت (دمام)
یس۔ ایم۔ حسینی (آسٹریلیا)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس ادارت :
مصطفیٰ مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

مجلس مشاورت :
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

کتابت : محمود سلیم۔ محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف
طباعت : دائرہ ملکر کلک پریس۔ حیدرآباد

قیمت فی پرچہ : ۹ روپے
سالانہ خریداری : ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۱
فون آفس : 595716 رہائش : 521064

زندہ دلان حیدرآباد

کی

سالانہ تقاریب

۱۷ر اور ۱۸ر نومبر ۹۵ء

کو منعقد ہوں گی

رشید احمد صدیقی

کی

صد سالہ تقاریب

کے موقع پر

ماہنامہ "شگوفہ" کا

رشید احمد صدیقی نمبر

شائع ہوگا

مہمان مدیر : ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

مالِ مفت (انشائیے)

تو تو میں میں (مکالمہ)

جانچ پڑتال (تعارف و تبصرہ)

پیوند (منظومات)

* * * *

خامہ بگوش

کیفی اعظمی فن اور شخصیت

کیفی اعظمی موجودہ دَور کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں۔ شاعری تو وہ نصف صدی سے کر رہے ہیں لیکن جب سے ان کا ایک مصرعہ تر شبانہ اعظمی کی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے' ان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ پہلے وہ ترقی پسند شاعری کے جدِ امجد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے' اب شبانہ اعظمی کے والد ہونے کی وجہ سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست' تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

خدا جب کسی کو نوازتا ہے تو خلقِ خدا کا یکساں ردِ عمل نہیں ہوتا۔ جہاں مداحوں کی تعداد میں لاکھوں کا اضافہ ہوتا ہے میں دو چار ایسے حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کیفی کے حاسدوں میں سرِفہرست ختر الایمان کا نام ہے۔ انھوں نے مختلف موقعوں پر ایک ہی جیسے انداز سے کیفی کو شاعر ماننے سے انکار کیا ہے۔ ایک مرتبہ ہوں نے کہا تھا "ایک شاعر ہیں کیفی اعظمی۔ بڑا نام ہے ان کا۔ آئے دن ان کے جشن ہوتے رہتے ہیں۔ ترقی پسندوں کے مقبول عر سمجھے جاتے ہیں۔ میں انہیں GENUINE شاعر نہیں سمجھتا۔ ان کے ہاں VERCIFICATION کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

محمد حسین آزاد کے اسلوب میں بات کی جائے تو یوں کہا جائے گا کہ اختر الایمان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ حسد زہر میں بجھا ہوا تیر ہے۔ اختر الایمان نے کیفی کی شاعری کے لیے جو انگریزی لفظ استعمال کیا ہے' اس کے معنی ہیں تک بندی اور قافیہ ئی۔ گویا کیفی شاعر نہیں ہیں' تک بند ہیں جو قافیہ پیمائی کی حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ کیفی اس کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ حضرت، ب تو قافیہ پیمائی بھی نہیں کر سکتے' شاعری یوں کرتے ہیں جیسے نثر کا خانہ خراب کر رہے ہوں لیکن یہ کیفی کی عظمت اور شرافت ہے کہ ں نے کبھی اختر الایمان کو پلٹ کر جواب نہیں دیا بلکہ پلٹ کر بھی وہ شاعری ہی کرتے رہے۔

کیفی کے ایک اور حاسد استاد لاغر مراد آبادی ہیں۔ انہوں نے عجیب بات کہی ہے کہ کیفی نثری نظم کے شاعر ہیں۔ وہ ردیف فیہ اور وزن کی پابندی کے ساتھ نثری نظمیں لکھتے ہیں۔ استاد کی رائے دراصل اختر الایمان ہی کی رائے کی توسیع ہے۔ ان دونوں رگوں کا مشترکہ مسئلہ یہ ہے کہ آئے دن کیفی کے جشن کیوں ہوتے رہتے ہیں۔ اب ان بزرگوں کو کون سمجھائے کہ کیفی ایک مقبول عر ہیں اور دنیا کے ہر خطے میں ان کے عقیدت مند پائے جاتے ہیں جو ان کا جشن منا کر خوش ہوتے ہیں اور اپنے ممدوح خوش کرتے ہیں۔ اگر اختر الایمان اور لاغر مراد آبادی کا جشن نہیں منایا جاتا تو اس میں بے چارے کیفی کا کیا قصور ہے جو ان شاعر ہونے سے انکار کر دیا جائے۔

کیفی کے حاسدوں کو مژدہ کہ گزشتہ ہفتے خلیج کی کئی ریاستوں میں ایک مرتبہ پھر کیفی کا جشن منایا گیا۔ اس حوالے حاسد کیفی کی مخالفت میں مضامینِ تازہ کے انبار لگا سکتے ہیں' بلکہ اس کتاب کی بھی مذمت کر سکتے ہیں جو اس جشن کے ع پر شائع کی گئی ہے اور جس کا نام ہے "کیفی اعظمی شخصیت اور فن کے آئینے میں"۔ اس سے پہلے کہ حاسدان کشا

چشم اس کتاب کے عیوب ظاہر کریں، ہم اس کے محاسن ۔۔۔اہل ادب کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

اس کتاب کے مصنف جناب خورشید علی خاں ہیں جو ادبی حلقوں میں جوش ملیح آبادی کے مصاحب کی حیثیت سے خاصے مشہور ہیں۔ جوش کے آخری زمانے میں خورشید صاحب ان کے بہت قریب رہے ہیں۔ جوش کے مصاحبوں میں عموماً معمولی ذہنی صلاحیتوں کے لوگ ہوتے تھے لیکن خورشید صاحب استثنیٰ کی واحد مثال ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اور ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ بلا مبالغہ انہیں ہزاروں شعر یاد ہیں اور جوش کا تو تقریباً پورا کلام حفظ ہے۔ جوش سے متعلق یادداشتوں پر مشتمل انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جو پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی لیکن خورشید کی عنایت سے اس کا مسودہ ہماری نظر سے گزرا ہے۔ ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ شائع ہوگی تو جوش کی "یادوں کی برات" سے بڑھ کر مقبولِ خاص و عام ہوگی کیونکہ یہ یادوں ہی کی نہیں، یاروں کی برات بھی ہے۔

خورشید صاحب کی دوسری شناخت یہ ہے کہ وہ شبانہ اعظمی کے حقیقی ماموں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قریبی رشتے کی وجہ سے کیفی اعظمی اس کے مستحق تھے کہ ان پر خورشید صاحب کتاب لکھتے، سو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیا ہے۔ رشتہ داری سے قطع نظر کیفی اور خورشید میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں مزاجاً اور عملاً ترقی پسند ہیں۔ کیفی کی ترقی پسندی ان کی شاعری سے اور خورشید کی ترقی پسندی ان کی زیر نظر کتاب سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ دوسری بات ہے خود ترقی پسندی روزِ روشن میں ذرا کم ہی عیاں ہوتی ہے۔

کتاب کا انتساب بجا طور پر شبانہ اعظمی کے نام ہے۔ انتساب کی عبارت ایسی شاعرانہ ہے کہ اسے پڑھ کر جوش کی مقفیٰ عبارت آرائی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں "ترقی پسند فکر کی آئینہ دار، غریبوں اور محروم طبقوں کی غم گسار، بادۂ خدمتِ انسانی سے سرشار، چمنِ حیات کی ابدی بہار، جادۂ حیات پہ ہر قدم باوقار، عظمت انسانی کا معتبر معیار شبانہ اعظمی ...... کے خوابوں کو تکمیل کا روپ ملے گا تو انسان کے سر پر الوہیت کا تاج جگمگا رہا ہوگا ......"

خورشید صاحب نے مقفیٰ نثر لکھتے لکھتے بیچ بیچ کا شعر بھی کہہ دیا۔ انسان کے سر پر الوہیت کا تاج! گویا انسان خدا بن جائے گا۔ فلمی ستاروں کے بارے میں یہ تو سنا تھا کہ ہر جگہ ان کے پرستار ہوتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ آزر کی طرح انہیں خدا سازی کا فن بھی آتا ہے۔

جس کتاب کا آغاز ایسی خوبصورت اور خوب سیرت نثر سے ہو، قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پوری کتاب کیسی ہوگی اگر صفحۂ انتساب کے بعد کے تمام صفحات خالی بھی ہوتے تو قاری کا کوئی نقصان نہ ہوتا۔ بلکہ فائدہ ہی ہوتا۔ خالی صفحات قاری کے گھر والوں کے کام آجاتے۔ ان پر دھوبی کا حساب کتاب لکھا جا سکتا تھا۔

خورشید صاحب نے یہ کتاب لکھنے کے لیے غزل کی ٹیکنیک سے کام لیا ہے۔ جو بات جہاں یاد آگئی وہیں لکھ دی۔ اس کا خیال نہیں کیا کہ مطالب میں ربط یا تسلسل رہتا ہے یا نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح انہیں بھی شعر استعمال کرنے کا بہت شوق ہے۔ مولانا آزاد کے ہاں شعر آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں، لیکن خورشید صاحب کے ہاں نمک ہی نمک ہوتا ہے، آٹا چٹکی دو چٹکی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آدھی کتاب کیفی اعظمی کی نظموں سے لبالب ہے اور ایک چوتھائی میں غالب، جوش، ساحر، مخدوم اور فہمیدہ ریاض وغیرہ کا کلام ہے۔ کتاب کے باقی حصے میں ترقی پسند تحریک کی تاریخ

برصغیر کی سیاست کی تفصیل، بمبئی اور حیدرآباد کی کمیونسٹ پارٹی کے معاملات کا تذکرہ اور متعدد دوسرے موضوعات کے ساتھ عصمت چغتائی اور فہمیدہ ریاض کی تقریریں بھی ہیں۔ ان سب کے درمیان کیفی کی شخصیت اور فن کو بھی حسبِ گنجائش موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ ۲۳۷ صفحات کی کتاب میں کیفی کے بارے میں بمشکل ۲۰۔۲۵ صفحات دستیاب ہوتے ہیں جبکہ مچھلی کی طرح ہاتھ سے نکل اور پھسل جانے والے موضوع پر اتنے صفحات لکھ دینا بھی لکھنے والے کا کمال ہے اور وہ اس کے لیے مبارکباد کا مستحق ہے۔

بہرحال کیفی کے متعلق تھوڑا بہت جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اس سے ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔
کیفی کی ادبی زندگی کا آغاز نہایت نامساعد حالات میں ہوا۔ اس سلسلے میں خورشید صاحب نے دو بڑے دردناک واقعات بیان کئے ہیں۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز بہت عمدہ موسم تھا، گھٹائیں گھر گھر کر آرہی تھیں، بجلی کڑک رہی تھی، موسلادھار بارش ہورہی تھی۔ کیفی نے موسم سے متاثر ہو کر ایک خوبصورت نظم لکھی اور اپنے رشتے کے ایک بھائی کو سنائی۔ نظم سنانے کے بعد کیفی نے بھائی سے نظم کے بارے میں رائے مانگی تو اس نے جواب دیا۔ "میں بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ میری بھینس جگالی کیوں نہیں کررہی"۔ اس سخن فہمی پر کیفی نے سر پیٹ لیا۔

اگرچہ شاعری کے آغاز ہی میں کیفی کو معلوم ہو گیا تھا کہ جن لوگوں کے لیے وہ شاعری کررہے ہیں، انہیں شاعری سے نہیں، بھینس کی جگالی سے دلچسپی ہے، اس کے باوجود کیفی نے ہمت نہ ہاری اور زندگی بھر کسانوں اور مزدوروں کے لیے شاعری کرتے رہے۔ شاید اسی لیے بعض محققوں نے ترقی پسند شاعری اور جگالی میں معنوی ربط کی نشاندہی کی ہے۔

دوسرا واقعہ خورشید صاحب نے کیفی کی زبانی بیان کیا ہے جو یہ ہے: "سب سے پہلے میں نے جس مشاعرے میں شعر پڑھے اس کی صدارت مشہور شاعر مانی جائسی کررہے تھے۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا شعر پڑھ رہا تھا..... شعر پڑھنے اور صدر کے بیٹھنے کے لیے تخت کا ایک اسٹیج بنایا گیا تھا۔ میں نے اپنی غزل شروع کی..... جب میں ایک شعر پر پہنچا تو یہ شعر مانی صاحب کو اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے..... میری پیٹھ پر ایک گھونسا مارا........ اور میں نیچے گر پڑا۔ مانی صاحب نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ میں گر گیا ہوں۔ وہ اسی جوش میں کہتے رہے دوبارہ سناؤ۔ اور میں فرش پر پڑا پڑا وہ شعر دہراتا رہا"۔

ہم نے یہ تو سنا تھا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کے بزرگ اپنے چھوٹوں کو شاعری سے باز رکھنے کے لیے نصیحتیں کرتے تھے۔ لیکن یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ برسرِ مشاعرہ گھونسے بازی سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔

خورشید صاحب نے کیفی سے اپنی حقیقی بہن شوکت خانم کی شادی کا واقعہ بھی نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ترقی پسندوں کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے کیفی حیدرآباد دکن گئے۔ ان دنوں شوکت اور خورشید علی خاں اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور اپنی بڑی بہن کے ہاں مقیم تھے جن کے شوہر مشہور اشتراکی دانشور اختر حسن تھے۔ اختر حسن نے ایک شاعر میں، مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے شوکت اور خورشید صاحب کو کیفی سے متعارف کرایا۔ اب آگے کا قصہ خورشید صاحب کی زبانی حقیقت ترجمان سے سنیے: "اختر حسن تعارف کروا رہے تھے مگر کیفی صاحب کہیں دور خلاؤں میں گھور رہے تھے اور بار بار شوکت خانم کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ غالباً حضرت غالب ان کے کان میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ:

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے ؛ دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

اور کیفی صاحب نے اس شب مشاعرے کے ساتھ ساتھ شوکت خانم کا دل بھی لوٹ لیا، حسن اور عشق کی نگاہیں لڑ گئیں

تصادم سے قلبِ شاعر پر کیا گزری یہ آپ خود کیفی ہی کی زبانی سنیئے:

اس کے بعد کیفی کی نظم "شرارہ" درج کی گئی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دو لگا ہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ ؛ تھیس لگتے ہی اڑا عشق شرارہ بن کر

خورشید صاحب مزید لکھتے ہیں: "مشاعرہ ختم ہوا تو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کیفی صاحب کے گرد جمع ہوگئیں — ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ کیفی صاحب اس کی آٹوگراف بک پر کوئی شعر لکھ دیں۔ شوکت خانم نے بھی آٹوگراف بک پر کوئی شعر لکھوالیا مگر بات اب آٹوگراف بک سے بہت آگے بڑھ چکی تھی۔"

مشاعرے سے پہلے بات شروع ہوئی اور مشاعرے کے بعد "بہت آگے" بڑھ گئی۔ ظاہر ہے کہ باقی مرحلے بھی تیزی سے طے ہوئے اور بالآخر ایک دن محمد خورشید صاحب اور شوکت خانم کے والد محمد یحییٰ خان صاحب اکیلے ہی . . . ." شوکت کو لے کر اورنگ آباد سے بمبئی روانہ ہوگئے۔ وہاں سجاد ظہیر اور ان کی بیگم نے اپنے گھر ٹھہرایا اور ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو کیفی اور شوکت کی شادی ہوگئی . . . .
اس تقریب میں حضرت جوش ملیح آبادی بھی شریک تھے جن کے سر پر تمام شعراء نے افشاں مل دی تھی اور وہ اسی طرح ستارہ بار سر اقدس لیے گھومتے رہے۔ وہ اس شادی سے بہت خوش تھے اور خاص طور سے یحییٰ خاں صاحب کی روشن خیالی کے تو وہ اتنے معترف تھے کہ بار بار کہہ رہے تھے، خاں صاحب اللہ سب کو آپ جیسا خسر عطا کرے۔"

خورشید صاحب نے یہ واقعہ بیان کر کے دو زبردست غلط فہمیوں کو دور کردیا ہے۔ پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح آج کل دولہا برات لے کر دلہن کے گھر جاتا ہے آج سے پچاس سال پہلے بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا لیکن اب معلوم ہوا کہ اس زمانے میں اس کے برعکس عمل ہوتا تھا۔

دوسری غلط فہمی مشہور شاعر رفعت سروش کی پیدا کردہ ہے۔ جنہوں نے اپنی کتاب "بمبئی کی بزم آرائیاں" میں کیفی اور شوکت کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ وہ شادی کے منتظمین میں سے تھے۔ اس موقع پر بھنڈی بازار سے سہاگ پڑا خرید کر وہی لائے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ دلہن اپنے والد کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے بہنوئی اختر حسن کے ساتھ حیدرآباد سے بمبئی آئی تھیں اور ریلوے اسٹیشن سے سیدھی سجاد ظہیر کے گھر آکر اتری تھیں۔ خورشید صاحب کے بیان کی روشنی میں دلہن کا اختر حسن کے ساتھ بمبئی آنا غلط قرار پاتا ہے۔ لہٰذا رفعت سروش کو چاہیئے کہ اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اپنے یا اپنے بیان کی اصلاح کرلیں۔

کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں کیفی کے دو مرتبہ پاکستان آنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہے۔ یہ تک بتا دیا گیا ہے کہ کس دن کون کون ملنے آیا اور خود کیفی کہاں کہاں گئے۔ ان تفصیلات سے ضمنی طور پر بعض اہم واقعات کا بھی علم ہوجاتا ہے۔ مثلاً ۲ مئی ۱۹۸۴ء کو ڈاکٹر جمیل جالبی کے صاحبزادے کا ولیمہ تھا۔ جس میں کیفی نے شرکت کی۔ ۱۳ مئی کو شان الحق حقی کے ہاں دعوت تھی لیکن خورشید صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دعوت ولیمہ تھی یا دعوت عقیقہ۔

سب سے دلچسپ روداد انجمن ملازمت پیشہ خواتین کے جلسے کی ہے۔ یہ جلسہ خورشید صاحب کے گھر کے وسیع لان میں ہوا تھا جس میں مذکورہ انجمن کی بہت سی اراکین اور بعض اداکاراؤں نے شرکت کی تھی۔ اس جلسے کی روداد چوبیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس حصے کیفی سے زیادہ خود مصنف کتاب کی شخصیت

اور فن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس محفل میں کیفی کی بیگم (شوکت خانم) موجود نہیں تھیں۔ کیفی کو پھولوں سے لاد دیا گیا تو انہوں نے کہا: "میں بے انتہا خوش بخت ہوں اور شکر گزار بھی اور یہ جو کچھ مجھے پہنایا گیا ہے (ہار وغیرہ) تو خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ خورشید صاحب کے گھر میں ہوا ہے ورنہ اگر کہیں یہ باہر ہوتا اور بیوی دیکھ لیتی تو سمجھتی میں نے شادی کر لی ہے۔"

خورشید صاحب نے بھی اس محفل میں بیگم کیفی کی عدم موجودگی کا ذکر بڑے شاعرانہ انداز سے کیا ہے۔ "کیفی کو اس محفل میں تمام حسیناؤں نے دل کھول کر داد دی۔ مگر افسوس کہ دامنِ یوسف تہی دست رہا، غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ سب یہ بات جانتی تھیں کہ یوسف پر جس زلیخا کا قانونی حق ہے' وہ گو اس محفل میں شریک نہیں ہے مگر یہ اس کے ہی بھائی کا گھر ہے جہاں یہ مصر کا بازار لگا ہوا ہے۔"

بھائی کے گھر پر ایسی محفلیں منعقد کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ خالہ جی کے گھر پر ہمیں کسی پرانے استاد کا ایک شعر یاد آگیا ہے' اسی پر ہم اس کالم کو ختم کرتے ہیں کیوں کہ اب مزید کچھ لکھنے کی ہمت نہیں رہی:

دل میں گھر کرنا بتوں کے کارِ بازی گر نہیں
برہمن! کعبہ ہے یہ' کچھ خالہ جی کا گھر نہیں

■■

مُجتبیٰ حُسین

بات چیت ایک ووٹر سے

جوں جوں انتخابات قریب آنے لگتے ہیں تو ہم اپنے آپ سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انتخابات کے قریب آنے کی بھنک کانوں میں پڑتے ہی کسی مخصوص حلقۂ انتخاب کا نمائندہ دوبارہ اپنے رائے دہندوں سے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ پانچ برسوں تک وہ ہم سے دور رہتا ہے اور انتخابات سے عین پہلے کے دو ایک مہینوں میں ہم اس سے دور رہنے کے سو سو جتن کرتے ہیں۔ بہرحال اس "جمہوری آنکھ مچولی" کی ایک لمبی داستان ہے۔ اس وقت تو ہمیں انتخابات کے بارے میں کچھ لکھنے کی ترغیب محض اس لیے ہوئی کہ پچھلے دنوں دہلی کے ایک مشہور انگریزی روزنامہ کے ایک رپورٹر نے دہلی کے مختلف پارلیمانی حلقوں کے رائے دہندوں سے انٹرویوز لینے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایسے ہی ایک انٹرویوز میں ایک رائے دہندہ سے مذکورہ رپورٹر کی جو بات چیت ہوئی اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

رپورٹر: کیا آپ اپنے حلقہ کے موجودہ رکن پارلیمنٹ کی کارکردگی سے خوش ہیں۔؟

رائے دہندہ: (حیرت سے) کیا ہمارے حلقہ کا کوئی رکن پارلیمنٹ ہے؟

رپورٹر: آپ کیسی باتیں کرتے ہیں کیا آپ کو اپنے علاقہ کے رکن پارلیمنٹ کا نام نہیں معلوم ہے؟

رائے دہندہ: آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں۔ رکن پارلیمنٹ سے پوچھئے کہ کیا انہیں میرا نام معلوم ہے۔ جب انہیں میرا نام معلوم نہیں ہے تو میں ان کا نام یاد رکھنے کی کوشش کیوں کروں۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی دو ہاتھ سے بجتی ہے۔

رپورٹر: (مایوس ہوکر) آپ اچھا مذاق کرلیتے ہیں۔

رائے دہندہ: اچھا تو اب مذاق کرنے کا الزام بھی مجھ پر ہی عاید کیا جارہا ہے۔ اب میں کیا بتاؤں کہ کون کس کے ساتھ مذاق کررہا ہے اور پھر یہ مذاق تو میں پچھلے چار دہوں سے برداشت کرتا آرہا ہوں۔

اس کے بعد رپورٹر نے اس رائے دہندہ سے مایوس ہوکر دوسرے رائے دہندوں سے بات چیت شروع کردی اور اس بیچارہ رائے دہندہ کا انٹرویو دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ بات چیت کے اس اہم ترین موڑ پر اخبار کا رپورٹر خواہ مخواہ مایوس ہوگیا۔ اگر اس رائے دہندہ سے بات چیت جاری رہتی تو ہماری جمہوریت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی۔ اخبار کے رپورٹر نے اس رائے دہندہ کا صرف نام لکھا ہے اس کا پورا پتہ نہیں لکھا ورنہ ہم اس رائے دہندہ سے خود بات کرتے۔ تاہم اس نے اپنے انٹرویو میں جو بھی باتیں کی ہیں اور جس طرح کی ہیں ان سے اس کے مزاج کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس نے جہاں انتخابات سے اپنے آپ کو بے تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے وہیں اس کی باتوں میں ایک گہرا تعلق خاطر بھی موجود ہے۔ چنانچہ ہم نے فرضی طور پر اس کے انٹرویو کو وہاں سے آگے بڑھایا ہے جہاں سے اصل بات چیت شروع ہوئی تھی۔

ملاحظہ فرمائیے:۔

رپورٹر: آپ کی بات چیت سے ایسا لگتا ہے کہ آپ نے پچھلے انتخابات میں اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کیا تھا تبھی تو آپ کو اپنے حلقہ کے رکن پارلیمنٹ کا نام نہیں معلوم ہے۔

ووٹر: آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نے اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کیا تھا۔ میں پچھلے تیس برسوں سے لاٹری کے ٹکٹ خرید رہا ہوں یہ سوچ کر کہ کیا پتہ کسی دن کوئی لاٹری نکل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ لاٹری آج تک نہیں نکلی۔ ووٹ دینے کے معاملہ میں بھی میرا یہی رویہ ہے آدمی سوچ سمجھ کر لاٹری کا ٹکٹ نہیں خریدتا۔ میں بھی اس طرح اپنے ووٹ کا استعمال کرتا ہوں کیا پتہ کسی دن اس ملک میں جمہوریت کی لاٹری نکل ہی آئے۔

رپورٹر: ووٹ دینے سے پہلے آپ کی کیا ذہنی کیفیت ہوتی ہے؟!

ووٹر: حضور! میں ووٹ دیتا ہوں مرغی کی طرح انڈا نہیں دیتا کہ انڈا دینے سے پہلے اور بعد میں شور مچاؤں۔

رپورٹر: میرے سوال کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں کوئی نہ کوئی سیاسی پارٹی تو رہتی ہوگی جسے آپ ووٹ دینا چاہتے ہونگے۔

ووٹر: پارٹی! کیسی پارٹی؟ مجھے تو ساری پارٹیاں ایک جیسی لگتی ہیں۔ کیا آپ نے پڑھا نہیں کہ ساری پارٹیوں میں جرائم پیشہ افراد موجود ہیں۔ اس قدر مشترک کے بعد آپ کسی پارٹی میں کوئی نصب العین کیسے تلاش کرسکتے ہیں۔

رپورٹر: آپ کے اپنے ووٹ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ووٹر: ووٹ دینا ہر شخص کا جمہوری حق ہے یہ اور بات ہے کہ اس جمہوری حق کا استعمال کرنے کے بعد آپ پانچ برسوں تک اپنے باقی سارے جمہوری حقوق سے محروم ہوجاتے ہیں۔ ہماری ہندوستانی جمہوریت کی یہی خوبی ہے۔

رپورٹر: آپ نے پچھلی بار کس پارٹی کو ووٹ دیا تھا؟

ووٹر: اب یاد نہیں رہا تاہم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جس پارٹی کے اُمیدوار نے بھی پولنگ بوتھ پر جانے کے لئے ٹیکسی روانہ کی تھی اسے ووٹ نہیں دیا تھا۔

رپورٹر: کیا آپ نے کبھی اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ نہیں دیا؟

ووٹر: ضمیر کی آواز! کیسی ہوتی ہے یہ آواز؟ چڑیا کی طرح یا جانور کی طرح مجھے تو یہ آج تک سنائی نہیں دی کیا آپ نے کبھی ضمیر کی آواز سنی ہے۔

رپورٹر: بھائی صاحب! ہر آدمی کے اندر ضمیر کی آواز ہوتی ہے آدمی کے پاس صرف وہ کان ہونے چاہئیں جو اس آواز کو سن سکیں۔

ووٹر: گویا میں پہلے اپنے اندر ضمیر کی آواز پیدا کردوں پھر وہ کان لے آؤں جو اس آواز کو سن سکیں۔ بھائی صاحب! مجھے ووٹ دینا ہے یا قصہ حاتم طائی کی طرح گوہر مقصود کو حاصل کرنا ہے۔ صرف ووٹ دینے کے لیے میں ایسی کڑی آزمائش سے نہیں گزر سکتا۔

رپورٹر: آپ جس طرح ووٹ دیتے ہیں یہ نہ صرف دھاندلی ہے بلکہ سراسر غنڈہ گردی بھی ہے۔

ووٹر: جب سیاستدانوں کے لیے غنڈہ گردی جائز ہے تو آپ ہم لئے دہندوں کو کیوں اس نعمت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ عملی سیاست کو جس طرح جرم آلودہ (CRIMINALISED) بنایا جارہا ہے۔ اس طرح اگر رائے دہندے بھی ووٹ دینے کے معاملہ میں تھوڑی سی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کریں تو سیاستدان خود بخود راہِ راست پر آجائیں گے۔

رپورٹر: خیر یہ ایک لمبی بحث ہے۔ یہ بتائیے اس بار آپ کس پارٹی کو ووٹ دیں گے؟

ووٹر: میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ میں پارٹی کو نہیں امیدوار کو ووٹ دیتا ہوں اور اس طرح ووٹ دیتا ہوں کہ جس ہاتھ سے ووٹ دیتا ہوں اس کی خبر خود میرے دوسرے ہاتھ کو نہیں ہوتی۔ اب بھلا میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں کہ کس کو ووٹ دوں گا وقت آنے دیجئے۔ تاہم اس بار ووٹ دینے کے معاملہ میں تھوڑی سی غنڈہ گردی ضرور کروں گا۔

رپورٹر: آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ ہندوستانی جمہوریت کا دارومدار آپ کے ووٹ پر ہے اور اس اعتبار سے آپ کا ووٹ بہت قیمتی ہے۔

ووٹر: مجھے پتہ ہے کہ میرا ووٹ بہت قیمتی ہے کیونکہ ایک مرتبہ ووٹ دے کر میں پورے پانچ برسوں تک اس ووٹ کی قیمت چکاتا رہتا ہوں۔ میری تو ساری زندگی اس ووٹ کی قیمت چکانے میں گزر گئی۔

رپورٹر: آپ ایک مشکل ووٹر ہیں لہٰذا آپ سے مزید بات چیت نہیں کی جا سکتی۔

ووٹر: میں کب آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی نے چھیڑ خانی کی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اور میرے ضمیر وغیرہ کو جگانے کی کوشش نہ کیجئے جب ضرورت پیش آئے گی میں ایسے ضمیر سیاستدانوں کے خلاف خود اپنے ضمیر کو جگالوں گا۔

رپورٹر: آپ کا بہت بہت شکریہ!

ووٹر: آپ لوگوں سے مشکل یہ ہے کہ جہاں غصہ کا اظہار کرنا چاہیئے وہاں شکریہ ادا کر دیتے ہیں۔ ■

طالب خوندمیری

ابلیس کا اعتراف

تو نے جس وقت یہ اِنسان بنایا یارب
اُس گھڑی مجھ کو تو اک آنکھ نہ بھایا یارب
اس لیے میں نے سر اپنا نہ جھکایا یارب
لیکن اب پلٹی ہے کچھ ایسی ہی کایا یارب

عقلمندی ہے اِسی میں کہ میں توبہ کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

ابتداً تھی بہت نرم طبیعت اس کی
قلب و جاں پاک تھے، شفاف تھی طینت اس کی
پھر بتدریج بدلنے لگی خصلت اس کی
اب تو خود مجھ پہ مسلط ہے شرارت اس کی

اس سے پہلے کہ میں اپنا ہی تماشا کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

بھر دیا تو نے بھلا کون سا فتنہ اس میں
پکتا رہتا ہے ہمیشہ کوئی لاوا اس میں
ایک اک سانس ہے اب صورتِ شعلہ اس میں
آگ موجود تھی کیا مجھ سے زیادہ اس میں

اپنا آتش کدۂ ذات ہی ٹھنڈا کرلوں!
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں!

اب تو یہ خون کے بھی رشتوں سے اکڑ جاتا ہے
باپ سے، بھائی سے، بیٹے سے بھی لڑ جاتا ہے
جب کبھی طیش میں ہتھے سے اُکھڑ جاتا ہے
خود مرے شر کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے

اب تو لازم ہے کہ میں خود کو ہی سیدھا کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

میری نظروں میں تو بس مٹی کا مادھو تھا بشر
میں سمجھتا تھا اِسے خود سے بہت ہی کم تر
مجھ پہ پہلے نہ کھلے اس کے سیاسی جوہر
کان میرے بھی کترتا ہے یہ قائد بن کر

شیطنت چھوڑ کے میں بھی یہی دھندا کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

کچھ جھجکتا ہے، نہ ڈرتا ہے، نہ شرماتا ہے
رنت نئی فتنہ گری روز ہی دکھلاتا ہے
اب یہ ظالم مرے بہکاوے میں کب آتا ہے
میں بڑا سوچتا رہتا ہوں یہ کر جاتا ہے

کیا ابھی اس کی مریدی کا ارادہ کرلوں!!
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں!

اب جگہ کوئی نہیں میرے لیے دھرتی پر
میرے شر سے بھی سوا ہے یہاں انساں کا شر
اب تو لگتا ہے یہی فیصلہ مجھ کو بہتر
اس سے پہلے کہ پہنچ جائے وہاں سوپر پاور

میں کسی اور ہی سیارہ پہ قبضہ کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

ظلم کے دام بچھائے ہیں نرالے اس نے
رنت نئے پیچ مذاہب میں بھی ڈالے اس نے
کردیئے قید اندھیروں میں اجالے اس نے
کام جتنے تھے مرے، سارے سنبھالے اس نے

اب تو میں خود کو ہر اک بوجھ سے ہلکا کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

استقامت تھی کبھی اس کی مصیبت مجھ کو
اپنے ڈھب پر اسے لاتا تھا قیامت مجھ کو
کرنی پڑتی تھی بہت اس پہ مشقت مجھ کو
اب یہ عالم ہے کہ دن رات ہے فرصت مجھ کو

اب کہیں گوشہ نشینی میں گزارہ کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

مست تھا میں ترے آدم کی حقارت کرکے
خود پہ نازاں تھا بہت تجھ سے بغاوت کرکے
کیا ملا مجھ کو مگر ایسی حماقت کرکے
کیا یہ ممکن ہے کہ پھر تیری اطاعت کرکے

اپنے کھوئے ہوئے رتبہ کی تمنا کرلوں
سوچتا ہوں کہ اب انسان کو سجدہ کرلوں

قطعہ

بے سبب ہر بات پر ہنستے رہو
سب سے ہو کر بے خبر ہنستے رہو
جب کسی احمق پہ ہنسنا ہو تمھیں
آئینے میں دیکھ کر ہنستے رہو

ایک شعر

قد کسی بونے کا مجھ سے بھی بڑا ہوجائے
جب مرے کاندھے پہ وہ سیدھا کھڑا ہوجائے

پرویز ید اللہ مہدی

یک نہ شُد دو شُد

ایک زمانہ تھا جب شریف گھرانے کی شادی شدہ خاتون کا کسی غیر مرد کی طرف بے ارادہ دیکھ لینا تعزیری جرم سمجھا جاتا تھا، چنانچہ نک سک کی سیدھی بے چاری گرہستن اپنی اس حرکت بے ارادہ کی پاداش میں اپنی ناک یا چوٹی سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھی، تب ہی تو اس دور کا ہر دوسرا شادی شدہ مرد بات بے بات میں یوں اپنی منکوحہ کو زبانی دھمکی دیا کرتا تھا "اپنی حد میں رہ ورنہ ناک چوٹی کاٹ کے واپسی ڈاک بے رنگ لفافے کی طرح مائیکے پارسل کر دوں گا۔" ماضی بعید کے معاشرے میں عورت کی ناک چوٹی پر زور اس لیے دیا جاتا تھا کہ اگلے وقتوں میں عورت کی "آن" جھٹی عرف "لوچھ" میں اور مرد کی شان "مونچھ" میں ہوا کرتی تھی جب کہ آج اگلی ساری قدریں بدل گئی ہیں۔ آج مردوں کی اکثریت میں مونچھ اور خواتین کی نئی پود میں چوٹی صاف کرنا فیشن میں داخل ہے۔ قدروں کی اولا بدلی کا ایک اور ثبوت ہے۔ شری آیا رام کی بیوی کا شری گیا رام کی پتنی سے بدل جانا یا شریمتی تارامتی کے پتی شری جرنجی لال کا شریمتی بھانامتی کے پتی دیو شری نوزنگی لال سے بدل جانا قدروں کی اس اُلٹ پھیر کو ماڈرن سوسائٹی کے افراد ماڈرن ٹھیکے دار روشن خیالی گردانتے ہیں۔ یہ اسی روشن خیالی کا شاخسانہ ہے کہ آج جس بیوی کے پانچ سات دوست عرف "بوائے فرینڈز" اور میاں کی دو چار سہیلیاں عرف "گرل فرینڈ" نہ ہوں وہ میاں بیوی ہماری نام نہاد روشن خیال سوسائٹی کی رو سے مہذب اور کلچرڈ ... نہیں کہلاتے!

نئی روشنی، نئی تہذیب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے آدمی کی ساری توجہ "ایگری کلچر" AGRICULTURE سے ہٹا کر کلچر کی طرف مرکوز کر دی ہے چنانچہ تہذیب نو کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے بچے جوان بعد میں ہوتے ہیں لیکن گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کی علت میں پہلے مبتلا ہو جاتے ہیں یہی نہیں بلکہ اب تو دوستی، دشمنی، پیار محبت، ہجر وصال سب کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ گئے وقتوں میں اگر بدقسمتی سے محبوبہ کی شادی کہیں اور ہو جاتی تو عاشق دل گرفتہ گریباں چاک کر کے ان دیکھے صحراؤں اور بیابانوں کے لیے ٹور پر بلا کسی زاد راہ کے تن تنہا نکل جایا کرتا تھا جبکہ آج اگر کسی کی گرل فرینڈ کی شادی کسی اور سے ہو جائے تو اس کا بوائے فرینڈ جشن مناتا ہے۔ جس میں نہ صرف یہ کہ اس کی گرل فرینڈ بہ نفس نفیس شریک ہوتی ہے بلکہ اپنی شادی کی دعوت بھی اسے یوں کھلے عام دیتی ہے۔

میرے محبوب میری شادی میں آ کر دیکھو ÷ صرف آنا ہی نہیں، ناچنا گانا دیکھو
جس طرح دوستی مجھ سے ہے نبھائی تم نے ÷ میرے دُلہے کو بھی تم دوست بنا کر دیکھو

استاد فصاحت جنگ جلیل مانکپوری کا شعر ہے:

ایک سے جب دو ہوئے تو لطف یکتائی نہیں ÷ اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں!

اصل میں شعر کے پردے میں استاد نے بڑا فلسفیانہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ جب تک ایک ہے اکائی ہے اور جب بات ایک سے آگے بڑھی یعنی ایک سے دو ہوئے تو پھر دہائی شروع۔ گویا یک نہ شد دو شد ہوتے ہی نا گفتنی حادثات کا سلسلہ

لامتناہی شروع ہو جاتا ہے، اسی لیے کسی استاد نے جب اپنے شاگرد کی زبانی یہ سنا کہ وہ بہت جلد شادی کے بندھن میں بندھ کر ایک سے دو ہونے جارہا ہے تو استاد عالی مقام نے فوراً اس لڑکی دعا سے اسے نوازا۔

اے میرے شاگردِ رشید' ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا، یوں بھی یہ ٹیکس ہم سب پر واجب الادا ہے"! ہم میری دعا ہے کہ تم جو ایک سے دو ہونے جارہے ہو خدا کرے کہ زندگی بھر ایک رہو"۔

شاگرد نے گھبرا کر پوچھا "کیا مطلب استاد! میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ یہ دعا ہے یا بددعا"؟

استاد نے وضاحت فرمائی "بے وقوف! ایک سے دو تو سبھی ہوتے ہیں لیکن زندگی کا صحیح لطف ایک سے دو ہونے کے بعد ایک ہو کر رہنے میں ہے۔ بلکہ اب تو زمانہ اتنی ترقی کرگیا ہے کہ لوگ محض ایک سے دو ہونے کے بعد ایک ہو کر رہنے پر اکتفا نہیں کررہے ہیں بلکہ ون ٹو کا فور اور فور ٹو کا ون بھی کررہے ہیں"۔

بہرحال جہاں تک استاد کی ایک سے دو ہونے کے بعد پھر ایک ہو کر رہنے والی دعا کا تعلق ہے ہماری نظر میں یہ مستحسن ہوتے ہوئے بھی بے اثر ہے کیوں کہ نہ تو پَر رکھتی ہے نہ طاقت پرواز بلکہ ایک سے دو ہونے کے بعد 'اعداد و شمار' رفتار اس تیزی سے آگے بڑھتی ہے کہ محکمہ مردم شماری کے وسیع رجسٹر بھی شکوہ کوتاہی داماں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔ ایک نوجوان زچگی خانے عرف میٹرنٹی ہاسپٹل کے ویٹنگ روم میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا اسی ویٹنگ روم میں ایک طرف ایک اور شخص صوفے پر پھیلا اطمینان سے اخبار چاٹ رہا تھا، دونوں ہی اگرچہ ایک ہی خوشخبری کے منتظر تھے مگر ایک مضطرب تھا دوسرا مطمئن، مضطرب نوجوان یقیناً پہلی بار باپ بننے کے مرحلے سے گزر رہا تھا اس لیے بے چینی میں کمرے کے محدود حدود اربعہ میں مالی پیمانے کی دوڑ لگا رہا تھا جبکہ دوسرے شخص کا اطمینان اس بات کی دلیل تھا کہ "عادی ہے"۔ چنانچہ اس مصرعے کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ع

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

تھوڑی دیر بعد نرس نمودار ہوئی۔ مضطرب نوجوان لپک کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ نرس نے مسکراتے ہوئے اسے خوشخبری سنائی "مبارک ہو مسٹر چوناوالا، آپ کی بیوی نے ایک ساتھ دو بچوں کو جنم دیا ہے!" ڈبل دھماکے کی خبر سن کر چوناوالا کا اچھا خاصا چہرہ چونے کی طرح سفید رنگ مارے خوف کے کشتیٔ ہوگیا۔ اسے شاید یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ مسز چوناوالا پہلے ہی راؤنڈ میں اسے چت کر دیں گی۔ وہ بھی ڈبل کوٹ۔ مطمئن شخص نے چوناوالا' کی یہ دگرگوں حالت دیکھ کر طنزیہ لہجے میں چوٹ کی "ایک ساتھ دو بچے" یعنی یک شد دو شد..." اتنا کہہ کر اس نے ایک زوردار قہقہے کا اسٹارٹ لیا ہی تھا کہ نرس نے یہ کہہ کر اس کے قہقہے میں بریک لگا دیا "مسٹر کانچ والا جن کے اپنے گھر شیشے کے ہوں وہ دوسروں پر پتھر نہیں پھینکتے"! فلمی اسٹائل میں یہ ڈائیلاگ ارشاد فرمانے کے بعد نرس نے اصل بم داغا "مسٹر چوناوالا کی بیوی نے تو صرف دو ہی بچے پیدا کئے ہیں، آپ کی بیوی نے ایک ہی کھیپ میں آپ کو چار چار لڑکیوں کا باپ بنا دیا ہے!!" ——— اس دھماکو انکشاف پر چوناوالا نے کانچ والا پر جوابی چوٹ کی "اِدھر تو معاملہ تو یک نہ شد دو شد پر رک گیا تھا لیکن آپ کے معاملے میں یک نہ شد دو سے چہار شد"! اس چوٹ سے بے چارے کانچ والا کے وجود میں ایسا چھناکا ہوا کہ ہوش و حواس تاب و تواں سب ایک ایک کرکے داغ کے اس شعر کی طرح غائب شد ہوگئے۔

ہوش و حواس تاب و تواں جاچکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

بانو سرتاج (چندراپور)

شِکشک دِین

اس مضمون کو جمال دین، گلاب دین، فضل دین جیسے اشخاص کے ہم نام کسی شخص کا خاکہ سمجھنے کی غلطی نہ کیجیے گا۔ وضاحت ہوجائے گی۔ ذرا صبر کریں۔

چھٹی کا ایک دن تھا۔ دوپہر کو ہم قیلولہ کرنے کے لیے لیٹے تو ایک گھنٹہ تیرہ منٹ بعد بیدار ہوئے۔ لمبی تان کر سونے کا خواب ہم ایسے بے فکرے بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی سسرال والوں کو درکنار کردیا جائے تو رادی ہماری زندگی میں چین ہی چین لکھتا ہے۔ روزی روٹی کی طرف سے ضرورت سے زیادہ بے فکری ہے کہ شوہر اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور خیر سے ہم بھی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں — یہ مسلمہ امر ہے کہ درس و تدریس کا واحد ایسا پیشہ ہے جس میں کام کرنے پر تو پیسہ ملتا ہی ہے، کام نہ کرنے پر بھی پیسہ ملتا ہے۔ اسکول یا کالج میں پڑھانے پر پیسہ ملتا ہے تو اسکول کالج کے باہر پڑھانے پر بھی پیسہ ملتا ہے۔ پھر کام کے دنوں سے کہیں زیادہ تعطیلات ملتی ہیں۔ آرام کی ملازمت ہے۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ طبیعت کچھ کسلمندسی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی اتنی زور سے بجی اور مسلسل بجنے لگی کہ اسے سن کر انسان تو انسان مردہ بھی جی اٹھتا۔ ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ جن کے گھروں میں کرخت آواز والی کال بیل ہے اور جن کے یہاں بے صبرے ملاقاتی آتے رہتے ہیں انھیں صور اسرافیل کی آواز کافی جانی پہچانی لگے گی۔ دوسروں کی بہ نسبت وہ اسے بآسانی جھیل جائیں گے — ہاں تو ہم نے دروازہ کھولا اور تین پریشان حال حضرات کو کھڑا پایا۔ ایک صاحب بہ عجلت تمام بولے "میڈم پلیز۔ جلدی سے ہمارے ساتھ چلیں۔ ہمارے مہمانِ خصوصی نے عین وقت پر تشریف آوری سے معذوری ظاہر کر کے ہمارے لیے پریشانی کھڑی کردی ہے۔"

فلموں میں ہیرو ہیروئین کے ڈپلی کیٹ ہوتے ہیں جو ان کے لیے تمام جوکھم بھرے شاٹ دیتے ہیں ہم بھی شہر کی محفلوں کے صدر اور مہمانانِ خصوصی کے ڈپلی کیٹ ہیں۔ کوئی بھی شخص جو کسی جلسے میں مار کھانے یا ہوٹ ہونے سے ڈرتا ہے، یا کسی نزاع میں پڑنے کی جھنجھٹ سے دامن چھڑانا چاہتا ہے وہ کارڈ پر نام چھپا لینے کے بعد گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوجاتا ہے۔ اور لوگ بھاگ ہمیں پکڑ لے جاتے ہیں اور وہ بھی اکثر بیشتر دس بیس منٹ کے شارٹ نوٹس پر۔

یہ شارٹ نوٹس بھی ایسا ہوتا ہے جس میں وہ انکم ٹیکس والوں کی مانند ہم پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ مبادا ہم تیاری کے بہانے پچھلے دروازے یا پچھلا دروازہ نہ ہونے پر غسل خانے کی کھڑکی سے کود کر بھاگ نہ جائیں یا تیار ہونے کے دوران صورت حال پر غور کر کے ڈپلی کیٹ بننے سے انکار نہ کردیں۔

آپ سے کیا چھپانا بعض اوقات ہمیں ایسے جلسوں میں بولنا پڑا ہے جس کے اغراض و مقاصد سے ہم قطعی واقف نہیں ہوتے۔ فنِ تقریر [illegible] کے بولنا سیکھنے کے مماثل ہے۔ بچے کو بس ایک مرتبہ حرفوں کو جوڑ کر جملہ بنانا آجائے

وہ بولتے ہی رہنا چاہتا ہے۔ اسی طرح مقرر کی بس ایک مرتبہ گاڑی اسٹارٹ ہو جائے، غیب سے خیالات کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔

کار میں بیٹھتے ہی اُن لوگوں نے اپنا رونا شروع کر دیا کہ مہمان خصوصی سے سترہ روز پہلے منظوری لی تھی۔ ایک کا فرسٹ کلاس کا کرایہ بھی دے دیا تھا۔ پھر بھی وہ دغا دے گئے پروگرام میں ریاستی وزیر بھی تشریف لا رہے ہیں اور بس ہم ہی اُن کی عزّت کو مٹی میں ملنے سے بچا سکتے ہیں۔

جلسہ گاہ میں پہنچے تھے کہ عزت مآب وزیر ریاست کی آمد کا غلغلہ بلند ہو گیا . . . . وزیر ریاست کو کسی دوسری بھی پروگرام اٹنڈ کرنا تھا اس لیے بلا تاخیر جلسے کی کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ گل پوشی ہوئی اور استقبالیہ تقریر کے فو بعد ہمارے نام کا اعلان کر دیا گیا . . . . ہم نے مڑ کر دیکھا . . . . پیچھے بینر لگا تھا جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ شکشک دین . . . ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ ہم بے کار ہی پریشان ہو رہے تھے۔ شکشک ہو کر دین شکشک پر بولنا کوئی مشکل کام ہے ؟

ہم نے تقریر شروع کی۔ دو منٹ اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد موضوع پر آ گئے . . . . یہ بات سولہوں آنے سچ ہے کہ شکشک دین یعنی غریب ہوتا ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے تنخواہ کی کمی کا رونا روتا ہے۔ تنخواہ بڑھانے کے لیے ہڑتالیں کرتا اور کمیشن بٹھواتا ہے۔ شکشک غریب ہوتا ہے اِسی لیے دوسرے ذریعوں سے آمدنی بڑھانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ مدرسی کو ثانوی حیثیت دے کر دوسرے ذرائع سے آمدنی میں اضافہ کرتا ہے . . . ٹیوشنیں وہ کرتا ہے۔ کتابوں کی ایجنسی لیتا ہے۔ بسونگ ایجنٹ بنتا ہے، مختلف ادارے قائم کرتا ہے جن میں طلباء سے داخلے کے لیے ڈونیشن لیتا ہے۔ پیپر آؤٹ کرانے اور پاس کرانے کے پیسے لیتا ہے۔ کوئی لمبی اُڑان کا گھوڑا ہوتا ہے تو سرکار کی سہولیات کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے کمیونٹی ایجوکیشن، ایڈلٹ ایجوکیشن ڈسٹنٹ ایجوکیشن پاپولیشن ایجوکیشن وغیرہ گورنمنٹ کی ایسی اسکیمیں ہیں جن کے ذریعے اور نام تو کماتا ہی ہے۔ دو تہائی رقم جیب میں رکھ کر معیارِ زندگی بھی بلند کر لیتا ہے۔ عزت مآب وزیر یہاں تشریف فرما ہیں۔ میں اُن سے گزارش کروں گی کہ مدرّسوں کی غریبی دور کرنے کی طرف خصوصی توجہ دیں . . . انھیں غریبی کے سمندر میں غرق ہونے سے بچا لیں۔

شکشک یعنی مدرّس ؍ دین یعنی قابلِ رحم ہوتا ہے۔ "بےچارہ ماسٹر" کہہ کر لوگ اسے مخاطب کرتے ہیں . . . طلبہ کی وہ سنتا ہے، طلباء کے والدین کی، کالج اسکول کے پرنسپال کی وہ سنتا ہے۔ بیوی کی وہ سنتا ہے۔ انتظامیہ کے ممبران کی وہ سنتا ہے یہاں تک کہ جاہل گنوار بھی اسے کچھ سنائے تو وہ سنتا ہے۔ گزشتہ سال ہمارے کالج میں یوم اساتذہ کے جلسے میں ایک صنعتی ادارے کے مالک کی جاہل بیوی کو بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا۔ وہ صاحبہ بیوٹی پارلر چلاتی تھیں۔ چار گھنٹے اُن منٹ سینتالیس سکنڈ میک اپ میں صرف کرنے کے بعد وہ جلسہ گاہ میں یوں وارد ہوئیں جیسے "مس یونیورس" کے مقابلے میں شرکت کرنے آئی ہوں۔ صرف سترہ منٹ وہ بولیں اور جو بولیں وہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

آنا کیسے ؟ نہ سر نہ پیر۔ خدا جانے کیا بکتی رہیں۔ جملہ اساتذہ یوں بیٹھے رہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ جاہل کی آ عالم تنے اس سے زیادہ مدرس کی بے قدری اور کیا ہو سکتی ہے ؟ زمانہ قدیم میں کہا جاتا تھا بلکہ آج بھی ضرب المثل ہے کہ جب باپ کا جوتا بیٹے کے پاؤں میں آنے لگے تو اسے اپنے برابر مان کر برابری کا سلوک کرنا چاہیے . . . تعلیمی پس منظر

اسے یوں کہا جاتا ہے کہ طالب علم کے دسویں جماعت پاس کرتے ہی استاد کو اُسے اپنے برابر ہی نہیں اپنے سے بڑا مان لینا چاہیے .... مدرّس کی حالتِ زار سے سب کو سبق سیکھنا چاہیے ... طلباء کے جی میں آتا ہے تو پڑھانے دیتے ہیں ورنہ جماعت سے نکال باہر کرتے ہیں۔ استاد، طالب علم کو ڈانٹ نہیں سکتا۔ کبھی غلطی سے کوئی سخت بات کہہ دے تو اسکول کالج بند کر دیتے ہیں۔ گھیراؤ کرتے ہیں۔ امتحان گاہ میں نقل نہ کرنے دینے پر چھرا دکھلاتے اور امتحان گاہ سے باہر دیکھ لینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ... انتہا یہ ہے کہ پہلے جہاں طلباء استاد کے جوتے اٹھاتے تھے آج استاد پر جوتے اٹھاتے ہیں۔ جناب وزیر صاحب اور سامعین! آپ یقیناً میرے اس خیال سے متفق ہوں گے کہ شکشک دین یعنی عجز و انکسار کا پُتلا ہوتا ہے۔ بے چارے کی گردن ہمہ وقت کسی نہ کسی کے پاؤں کے نیچے دبی ہوتی ہے۔ طلباء کے سامنے وہ آنکھ نہیں اُٹھاتا۔ طلباء کے والدین سے سامنا ہو جائے تو راستہ بدل دیتا ہے۔ انتظامیہ کے ممبران کے سامنے تو سر مستقلاً جھکا رہتا ہے ... صبح شام حاضری دینی ہوتی ہے ... وہ چاہے ذلیل و خوار کریں، وہ اف نہیں کرتا۔ کٹھ پتلی کی طرح اُن کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ موم کی طرح جدھر موڑیں اُدھر کا رُخ کرتا ہے .... ہاتھ نمسکار کی شکل میں ہمیشہ جڑے رہتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ استاد یا مدرّس یا شکشک عجز و انکسار کی مجسم مثال ہوتا ہے۔

سامعین! آج ہم دین شکشک کے بارے میں خیال آرائی کر رہے ہیں۔ دین یعنی وہ جس کا دل بجھ گیا ہو، ڈکشنری میں دین کے معنی مردہ دل بھی دیئے گئے ہیں۔ شکشک دین یعنی مُردہ دل ہوتا ہے۔ بی ایڈ۔ ڈی ایڈ میں داخلے کے لیے اسے ڈونیشن دینا پڑتا ہے ... کریم تو میڈیکل انجینیرنگ میں جاتی ہے۔ کھرچن ہی مدرّسی کے پیشے میں آتی ہے اور کھرچن ہوتی تو بہت زیادہ ہے اس لیے مقابلہ زور دار ہوتا ہے۔ ٹریننگ میں داخلے اور کامیابی کے لیے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے تو ملازمت حاصل کرنے کے لیے موٹی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے ... ایک کے بعد ایک لگاتار دھکوں سے استاد کا مُردہ دل ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ باپ کی جمع پونجی، ماں کے زیورات، حتیٰ کہ مکان رہن رکھنے کے بعد کچھ پایا تو کیا پایا؟ شکشک دین ... بہت زیادہ دین دکھی ہو جاتا ہے۔ بس دنیا سے سنیاس ہی نہیں لیتا ورنہ شکشک نہ کہلا کر بیراگی کہلانے لگتا۔

شکشک دین یعنی بے حوصلہ ہوتا ہے ... ہمارا مطلب اساتذہ کی بڑی تعداد سے ہے کیوں نہ ہو صاحب؟ سچے اور ایماندار استاد کو ملتا کیا ہے؟ جی جان سے پڑھاتا وہ ہے۔ پرنسپال، ہیڈ ماسٹر سلام ٹھوکنے والے کو پسند کرتے ہیں۔ وقت پر آنے والا اپنا کام برابر کرنے والا انتظامیہ سے کوئی تمغہ نہیں پاتا۔ تمغہ حاصل کرتا ہے وہ استاد جو دن رات اُن کے پاؤں چاٹتا ہے۔ انعام پہنچ والوں کو ملتا ہے ... سہولیات خوشامدیوں کو اور فائدہ للو چپو کرنے والوں کو ملتا ہے۔

شکشک دین دکھی ہوتا ہے ... سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ سوچتا بلکہ پچھتاتا ہے کہ کیوں میں اس پیشے میں آ گیا؟ جو شان قائم کرنے، دیش کا بھلا کرنے یا اپنی ذہانت اور قابلیت سے طلباء کو فیض یاب کرنے کا مقصد لے کر آتا ہے وہ سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ یہ آدرش کبھی ہماری درس گاہوں میں ہوا کرتے تھے آج نہیں رہے۔ آج لاکھ سوا لاکھ کی تحصیل کا آدرش ہی اہم ہو گیا ہے۔

ہم یہاں تک بول کر سانس لینے کے لیے رُکے تھے کہ آہستہ سے ایک چٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دی گئی .... لکھا تھا: "مہربانی فرما کر توجہ دیں۔ آج ۵ ستمبر ہے۔ بینر پر غلط لکھ دیا گیا ہے۔ شکشک دین نہیں شکشک دن لکھا جانا چاہیے تھا۔ ہماری بہت دھلائی ہو چکی۔ اب بخش دیں۔" بخش دیا ہم نے انھیں تھا لیکن آپ بھی غور فرمائیں۔ قوم کے معماروں کی حالتِ زار ... کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ راشٹر بھاشا بھی شدھ نہیں لکھ سکتے۔

ہم کو کیا!

اقبال شانہ
حقل۔ تبوک

چل رہی ہے دوکان ہم کو کیا
ہے خدا مہربان ہم کو کیا

گر نہیں ہے مکان ہم کو کیا
ہے تنا سائبان ہم کو کیا

آپ ہوں تیس مار خاں کوئی
جائیے بھائی جان ہم کو کیا

فیل ہوں گے یا کامیاب ہوں گے
ہو گیا امتحان ہم کو کیا

بیچ دیں یا کرائے پر دے دیں
آپ کا ہے مکان ہم کو کیا

کوئی احمق انہیں بچا لے گا
اُن کی آفت میں جان ہم کو کیا

ہم سے ڈرتے ہیں سب گلی والے
یار ہے پہلوان ، ہم کو کیا

ہم سینما کو جائیں گے شانہ
ہو رہی ہے اذان ہم کو کیا

کیا چیز ہے!

عشق کا اظہار بھی کیا چیز ہے
بے تحاشا مار بھی کیا چیز ہے

ہو گئے چودہ طبق روشن میرے
یار کا دیدار بھی کیا چیز ہے

میان سے باہر کبھی نکلی نہیں
آپ کی تلوار بھی کیا چیز ہے

چیخنے لگتا ہے مجھ کو دیکھ کر
اُن کا برخوردار بھی کیا چیز ہے

یہ بنا دھکے سے چلتی ہی نہیں
اپنی موٹر کار بھی کیا چیز ہے

وہ نہ روتا ہے نہ ہنستا ہے غریب
آپ کا بیمار بھی کیا چیز ہے

ہیں کئی درجن زلیخائیں میاں
مصر کا بازار بھی کیا چیز ہے

وہ سمجھتا ہی نہیں دل کی زباں
یار اپنا یار بھی کیا چیز ہے

مخمصہ

کوئی سلجھاتا نہیں اُلجھن مگر
پوچھتے ہیں لوگ کیا ہے مخمصہ

میں نے ٹمبکٹو میں دیکھا ہے اسے
اونٹ سے کافی بڑا ہے مخمصہ

حسنِ فتنہ ساز اُن کا دیکھ کر
مخمصے میں پڑ گیا ہے مخمصہ

ہم پھٹے میں ٹانگ کیوں ڈالیں میاں
آپ سمجھیں آپ کا ہے مخمصہ

ترک کر دیں آپ شانہ شاعری
کیا ردیف و قافیہ ہے مخمصہ

نصرت ظہیر

(دہلی)

دایاں بازو، بایاں بازو

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی سماجی اقتصادی اور معاشی حالات و واقعات کا جتنا صحیح تجزیہ کمیونسٹ کرتے ہیں اتنا کوئی اور نہیں کرسکتا خود ہم نے بھی جتنا علم اب تک حاصل کیا ہے وہ ہمارے کاسارا کمیونسٹوں کی صحبت میں بیٹھ کا نتیجہ ہے کمیونسٹوں کے ساتھ نہ اٹھتے بیٹھتے تو آج بھی ہم ہدیس ابابا کو ملک حبش کا بادشاہ، پورتوریکو کو روس کا کوئی پڑوسی ملک، ...... پرتگال کو صدر ڈی گال کا قریبی عزیز اور سالانیکا کو روس کے کسی زار کا سالا سمجھتے رہتے۔

اس ضمن میں کامریڈ شمشاد حسین کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہیں گے کہ ان کی ہی بدولت آج ہم ادق اور پیچیدہ سیاسی وسماجی اصلاحات اور تاریخی اہمیت کے واقعات سے واقف ہیں۔ ہم نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ فسطائیت اور نازیت میں کتنا فرق ہوتا ہے بلکہ یہ عقدہ بھی حل کرچکے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم پہلی جنگ عظیم کے بعد کیوں ہوئی اور تیسری کب منعقد کی جائے گی۔

جہاں تک اصلاحات کا تعلق ہے تو ان کا دروازہ ہم پر تب کھلا جب ہمیں کامریڈ شمشاد کی زبانی معلوم ہوتا۔ کہ دایاں بازو کیا ہوتا ہے اور بایاں بازو کسے کہتے ہیں بعد میں جیسے جیسے ہمارا علم بڑھا یہ راز منکشف ہوتا گیا کہ نہ صرف تمام اصطلاحیں بلکہ تمام عالمی وملکی تبدیلیاں بھی ان ہی دونو بازوؤں کے اردگرد گھومتی ہیں۔

بات کالج کے دنوں کی ہے۔ اس وقت ہمارا خیال تھا کہ جو لوگ اپنے بیشتر کام دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں وہ دائیں بازو والے ہوتے ہیں۔ اسی حساب سے ہم نے خود کو رائٹسٹ (RIGHTIST) ڈکلیر کر دیا تھا۔ اور محلہ کی مسجد کے امام صاحب کو لفٹسٹ (LEFTIST) سمجھنے لگے تھے کیوں کہ وہ لکھتے بھی بائیں ہاتھ سے تھے اور بچوں کو بغدادی قاعدہ پڑھاتے وقت قمچی بھی ان کے بائیں ہاتھ میں ہی رہتی تھی۔

چنانچہ جب کامریڈ شمشاد سے پہلی ملاقات ہوئی اور ہم نے انھیں دائیں ہاتھ سے پیچ کے کباب کترتے

ہوئے دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ بھی ہماری طرح رائٹسٹ تھے۔ لیکن جب ہم نے ان سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تو وہ اس قدر ناراض ہوئے کہ غصے میں مزید پانچ چھ سیخ کباب اور کھا گئے اور ہمیں ایک کے لیے بھی نہ پوچھا۔

بعد میں سیخوں اور کبابوں سے فارغ ہو کر انھوں نے دائیں اور بائیں بائیں بازو پر اس زور کی تقریر کی کہ ہمارے کان جھنجھنا اٹھے اور آنکھیں کھل گئیں۔

کامریڈ نے بتایا کہ دائیں بازو کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو بائیں بازو والوں کے خلاف ہوں اور بائیں بازو کے وہ جو دائیں والوں کے خلاف ہوں۔

"اور جو کسی کے خلاف نہ ہوں۔ وہ؟" ہم نے پوچھا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آدمی یا تو کسی کے خلاف ہوگا یا کسی کے حق میں ہوگا۔ بس اسی بات سے پتہ چل جائے گا کہ وہ دائیں بازو کا ہے یا بائیں بازو کا!"

ہم نے مزید وضاحت چاہی تو بولے۔

"دائیں بازو والا وہ ہوتا ہے جس کے خیالات بورژوا ہوں اور بائیں بازو والا وہ جو پرولتاری نظریات رکھتا ہو۔"

"بورژوا اور پرولتاری کیا ہوتا ہے؟"

ہم نے پوچھا۔

"بورژوا وہ ہے جو رجعت پسند ہو اور پرولتاری وہ ہے جو ترقی پسند ہو۔"

"اوہ! لیکن رجعت پسند اور ترقی پسند میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو قدامت پرستی اور جدیدیت میں ہوتا ہے" اور جو انفرادیت اور اجتماعیت میں ہے۔"

"اور ان دونوں میں کیا فرق ہے؟"

"جو دائیں بازو اور بائیں بازو میں ہے۔"

"اوہ یس ـــــ تو یہ بات ہے۔ میں سمجھا کچھ اور بات ہوگی لیکن کامریڈ میرا سوال تو یہ تھا کہ جو نہ دائیں بازو والا ہو نہ بائیں بازو والا۔ . . . . اسے آپ کس خانے میں فٹ کریں گے؟"

"وہ بھی کہیں نہ کہیں ضرور فٹ ہو جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بازوؤں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔"

"وہ کیا؟"

"دائیں بازو میں دو بازو ہوتے ہیں۔ ایک بہت دایاں بازو۔ دوسرا کم دایاں بازو، ان دونوں کو تم دائیں بازو کا رائٹسٹ اور دائیں بازو کا لیفٹسٹ کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح بائیں بازو میں ہوتا ہے۔ وہاں بھی بائیں بازو کے رائٹسٹ اور لفٹسٹ ہوتے ہیں پھر ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں ان میں بھی ایک رائٹسٹ اور دوسرا لیفٹسٹ ہوتا ہے جیسے دائیں بازو کا لفٹسٹ اور بائیں بازو کا رائٹ لیفٹسٹ پھر ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً دائیں بازو کا رائٹ لیفٹ رائٹسٹ اور بائیں بازو کا لیفٹ رائٹ

لیفٹسٹ۔ چنانچہ جو آدمی سیدھے طور پر دائیں یا بائیں بازو میں نہیں ہے وہ یا تو دائیں بازو کا رائٹسٹ ہوگا یا لیفٹسٹ! یہ بھی نہیں تو بائیں بازو کا رائٹسٹ ہوگا! . . . . یا لیفٹسٹ یہ بھی نہیں تو . . . . . . "

"بس بس رہنے دیجیے۔ میں سمجھ گیا۔"

اور واقعی، اس روز ہماری سمجھ میں آگیا بچنے کا راستہ کوئی نہیں ہے۔ کسی نہ کسی خانے میں فٹ ہونا ہی پڑے گا۔ بہت چاہا بہت سوچا کہ نیوٹرل ہو جائیں۔ نیوٹرل رہنے میں ہی زیادہ عافیت ہے مگر افسوس یہ بھی نہ ہو سکا۔ کامریڈ نے بتایا کہ نیوٹرل کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں!

رشید عارف
(پٹنہ)

غزلیں

جانِ من پیار میں خطرے کا گزر ہونے تک
بھاگ چلنا ہے زمانے کو خبر ہونے تک

صبر مشکل ہے دعاؤں میں اثر ہونے تک
فار بریک فاسٹ بریڈ اینڈ بٹر ہونے تک

عیش و مستی میں شب و روز گزارے جاؤ
دردِ دل، دردِ جگر، درد کمر ہونے تک

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے جاناں
جانے کیا ہو ترے ڈیڈی کو خبر ہونے تک

کیسے سو پائیں جبی رہتی ہے محفل شب بھر
کتنے اشعار سناتے ہیں سحر ہونے تک

آپ ہر روز بدل دیتے ہیں نسخہ حضرت
مر ہی جاؤں نہ دواؤں میں اثر ہونے تک

باپ کا مال اڑاتے تو ہو بے دردی سے
بھاؤ دال آٹے کا سمجھو گے پدر ہونے تک

غیر کو اپنا بنانے کی ہے کوشش بے کار
دیر کیا لگتی ہے طوطے کی نظر ہونے تک

میں نے کیا کیا نہیں بیلے یہاں پاپڑ عارف
شہر میں اپنا بھی اک چھوٹا سا گھر ہونے تک

سید ساجد گلریز
(بمبئی)

●

ملی جو آنکھ تو دل میں اتر گیا کوئی
پلٹ کے پھر نہ کبھی اپنے گھر گیا کوئی

نہ استرا تھا نہ قینچی تھی اور نہ کنگھا تھا
فقط نظر سے حجامت سی کر گیا کوئی

شبِ فراق میں سویا ہوا تھا کھٹیا پر
حلق سے نکلا جو خراٹا ڈر گیا کوئی

یقین ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ کڑکا تھا
تبھی تو لے کے میرا دل مکر گیا کوئی

کچھ اس طرح سے لگا ہے محلے میں کرفیو
گماں ہوتا ہے جیسے کہ مر گیا کوئی

عجیب ڈھیٹ ہے تشریف رکھنے کو جو کہا
تو بیٹھنے کے بجائے پسر گیا کوئی

تمام جسم میرا جھنجھنا گیا اکرم
بدن کو میرے جو چھو کر گزر گیا کوئی

سراج زملی

●

کچھ تو کرم غریب پہ فرمائیے جناب
ٹنڈر مرے ہی نام پہ دلوائیے جناب

بجلی کہے کڑک کے، لپٹ جائیے جناب
موسم کی آرزو کو نہ ٹھکرائیے جناب

کمری ہے آپ سے تو بڑی شاعری کی شاپ
کیا کیا کموڈیٹیز ہیں دکھلائیے جناب

دولت کدے پہ آؤں تو کچھ دیجئے حضور
آئیں غریب خانہ تو کچھ لائیے جناب

ہوگا ہمارے حق میں عدالت کا فیصلہ
جھوٹی گواہی دینے کو کل آئیے جناب

جھوٹا فریبی اور دغا باز ہے سراج
بانٹوں میں آس کے آپ یوں مت آئیے جناب

بابو آر کے
(اچل پور)

جوتے، سر کے لیے

آج کل تو جوتے، اپنی قیمتوں کی وجہ سے بجائے پیروں میں پہننے کے سروں پر لینے لائق ہو گئے ہیں۔ ایک جوڑی جوتا خریدنے کے لیے انسان کو کتنے ہی دنوں تک بلس مائنس کرتے ہوئے کاٹ کتر سے کام لینا ہوتا ہے تب کہیں وہ جوتے پانے کے قابل ہوتا ہے۔ جوتے خریدنے کے بعد، انھیں سنبھالے رکھنے کے عجیب و غریب مراحل بھی اہلِ جوتا کے لیے پریشانی کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ نامۂ محبوب کی طرح چھپانے اور ہتھیلی کے چھالے کی طرح سنبھالنے کے باوجود انھیں چوری ہو جانے کی لت ہوتی ہے...... اور یہ چوری ہو جاتے ہیں، اب کسی دوسرے جوتے کی دستیابی کا دار و مدار آپ کے جیب پر ہے یا پھر.... نزدیک کے علاقے میں عبادت گاہ کی دستیابی اور عبادت کے اوقات پر منحصر رہتا ہے کیوں کہ آج کل اچھے سے اچھے جوتے کھونے اور پانے کا ایک معتبر مقام تقریب گاہوں کے ساتھ ساتھ عبادت گاہیں بھی ہیں۔

موجودہ زمانے میں جوتوں کی اونچی قیمتوں نے اہلِ جوتا کے ساتھ عجیب سازش رچی ہے۔ پتہ نہیں وہ کون سا زمانہ تھا جب جوتے انسانی پیروں کی حفاظت پر بھی مامور ہوا کرتے تھے، جب کہ ہم نے تو...... آنکھ کھولی بلکہ جوتے پہنے تب سے انسان کو جوتوں کی حفاظت ہی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اہلِ جوتا کو جوتوں کا چوکیدار ہی پایا ہے۔ جس زمانے میں خلیل خاں صاحب فاختہ اڑا کر امن چین کی بنسی بجایا کرتے ہوں گے ٹھیک اس زمانے میں جوتے بھی ہمارے پیروں کی حفاظت پر مامور رہا کرتے ہوں گے۔ ویسے مذکورہ خلیل خاں کے تعلق سے ہم، ہمیشہ ہی کشمکش و پیچ میں مبتلا رہتے آئے ہیں کہ خدا جانے ان کے پاس کہاں سے اتنا فاضل وقت ہوتا تھا جو یہ بے محابا فاختائیں اڑا کر ایک عالم کو حواس باختہ کیے جاتے تھے۔ جب کہ انھیں خلیل خاں کو پتنگ، کبوتر، گل چھرے، افواہیں اور بے پرکی یہ تمام تمام چیزیں اڑانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ خیر خدا قادرِ مطلق ہے وہ اپنے بندوں سے جتنا اور جیسا کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے۔

جوتوں کے پرستار، انسان ہی نہیں محکمے بھی ہوا کرتے ہیں۔ محکمۂ پولس تو جوتوں کا سب سے

برائیں ... ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ہم پر زبردست فوقیت دی گئی ہے بلکہ جوتوں کی پرداخت، عمدہ تربیت کو پولیس قوانین میں خاص مقام حاصل ہے۔ جوتوں کی غلط دیکھ ریکھ اور ناقص پر پولیس ملازمین کے انکریمنٹ بار ہوجاتے ہیں۔ پروموشن رک جاتے ہیں۔ گویا یہ محکمہ جوتوں پر ایڑی چوٹی کا سارا زور صرف کردیا کرتا ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ امن عامہ کے پیش نظر محکمے کو جوتوں سے شغل فرمانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے اور لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داری کسی اور محکمے سر ڈالی جائے۔ گذشتہ زمانوں میں "سر کی پگڑی" عزت کا استعارہ تھی اسے پیروں میں رکھ کر بگڑے بنائے جاتے تھے۔ جوتوں کی چڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث امید کی جاسکتی ہے کہ اب اکیسویں میں بجائے پگڑیوں کے جوتوں کو ہماری عزت کی نمائندگی کا حق حاصل ہوجائے گا۔ "جوتیوں میں دال" یہ محاورہ بھی ہمارے سنہرے دور کی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ آج کل یہ محاورہ منظر کا روپ دھار کر رونے سے اس لیے کتراتا ہے کہ ان دنوں جوتیاں اور دال دونوں چیزیں اپنی قیمتوں کی وجہ سے نادر شامل ہوگئی ہیں اور بات یہاں تک پہنچی ہے کہ اگر ہم سے کوئی بیک وقت جوتی اور دال خریدنے کا ظاہر کرے تو ...... "یہ منہ اور مسور کی دال" کا طعنہ اس پر اچھال دیا جاتا ہے۔ اب چوں کہ جوتی اور یہ اشیا ہماری دسترس سے نکل چکی ہیں اس لیے یہ پیروں اور ہانڈیوں سے کوچ کرکے محاوروں میں پڑ چکی ہیں۔ گذشتہ زمانے میں عورت کو "پیر کی جوتی" کہا جاتا تھا۔ شاید اس زمانے میں جوتیاں بہت ہی ارزاں تھیں۔ اس لیے خواتین بھی اس محاورے کا سخت نوٹس لیا کرتی تھیں۔ فی الوقت زمانے نے جو اور جوتیوں کے favour میں کروٹ بدلی ہے اور عزت و وقار جوتوں اور جوتیوں کے ہاتھ آگیا ہے؟ ہماری خواتین اور ان کی نام نہاد انجمنوں کو چاہیے کہ وہ اندولن کرکے سبھائیں منعقد کرکے، بھوک کرکے "پیر کی جوتی" اس محاورے کو پریکٹس میں لائیں تاکہ مرد، عورت کو بھی اپنے جوتوں ہی کی طرح سینت کر رکھ سکیں۔ ان کی حفاظت کرسکیں۔

اگر ہماری خواتین خود کو "مرد کے پیر کی جوتی" ثابت کرواکر اپنا پرانا حق واپس لینے میں کامیاب ہیں ..... تو اس بات کے قوی امکان ہیں کہ پھر ان کی ازدواجی زندگیوں میں صرف پھول ہی نہیں کھلتے بلکہ چار چاند بھی لگتے رہیں گے۔

شکیل شاہجہاں (کامٹی)

نعرے

زندہ باد ـــــــ مردہ باد ـــــــ غریبی ہٹاؤ ـــــــ دیش بچاؤ ـــــــ بھرشٹاچار دور کرو ـــــــ جو ہم سے ٹکرائے گا۔ مٹی میں مل جائے گا ـــــــ آگے بڑھو، آگے بڑھو ـــــــ وغیرہ نعرے ہماری موجودہ تہذیب کا ایک اہم حصہ بن گئے ہیں۔ آج جس کو دیکھو کوئی نہ کوئی نعرہ لے کر دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہو رہا ہے۔ گلی، چوراہا، نکڑ، قومی شاہراہ ہر جگہ دیواروں پہ کوئی نہ کوئی نعرہ لکھا ضرور نظر آئے گا۔ ہمارا ملک جو کسی زمانے میں سانپ اور سپیروں کا ملک کہلاتا تھا اب نعروں کا دیش بن گیا ہے۔ سانپوں کے سارے کھیل تماشے اور منتر اب نعروں میں بدل گئے ہیں۔ سارے رشتے ناتے نعروں کا روپ دھار لیے ہیں۔ اب ہم نعرے کھا رہے ہیں، نعرے اگل رہے ہیں۔ ہمارے خون میں یہ نعرے پوری طرح سرایت کر گئے ہیں۔

کسی زمانے میں خاموشی عقل مندی کی دلیل سمجھی جاتی رہی ہوگی مگر موجودہ زمانے میں خاموشی بے وقوفی اور بزدلی کی علامت ہے۔ آپ بولیے، خوب بولیے ـــــــ مگر ٹھہریے! آپ بولیے نہیں نعرہ لگائیے کسی جلوس میٹنگ اور سبھا میں اور راشن، کروسین اور مہنگائی بھتہ کی قطاروں میں کھڑے ہو کر نعرہ لگائیے۔ اپنے دل کی مراد پائیے۔ گلی سے لے کر دلی تک، کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک ہر جگہ لوگ نعروں میں مشغول ہیں۔

زندگی میں نعروں کی بڑی اہمیت ہے۔ کچھ لوگ نعرہ اس لیے لگاتے ہیں کہ وہ نعرہ لگانے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ نعرہ اس لیے لگاتے ہیں کہ ان کو نعرہ لگانے کا معاوضہ ملتا ہے۔ کچھ لوگ نعرہ اس لیے لگاتے ہیں کہ انھیں ہر حال میں نعرہ لگانا ہی ہوتا ہے۔ جب نعرہ بنایا جاتا ہے یا اس کی تخلیق ہوتی ہے تو اسے عام کرنے کے لیے باقاعدہ بھیڑ اکٹھا کی جاتی ہے۔ پھر مجمع میں نعرہ لگا کر اسے عام کیا جاتا ہے۔ ان نعروں کے ہمارے دل پر اچھے اور برے دونوں طرح کے اثرات پڑتے ہیں۔ اچھے اثرات یوں کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے نعرہ ایک پیٹنٹ نسخہ ہے۔ نعرہ لگائیے اپنے جی کو ہلکا کیجیے۔ . . . . نعرہ لگائیے اپنے آپ کو نمایاں کیجیے۔ نعرہ لگائیے اپنی پہچان بنائیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب نیتا حضرات بھی اپنے نام اور کام سے کم نعروں سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔

اب تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ لائبریریاں خالی پڑی ہیں۔ ان میں کتابیں پڑھنے والے ہی

نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دانشور، مفکر، فلسفی ادیب اور شاعروں کی کمی ہوگئی ہے۔ ان کی تعداد تو دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے۔ لوگ باگ اب لائبریریوں میں نہیں آتے۔ کتابوں میں دھرا ہی کیا ہے۔ وہی پرانی اور روایتی باتیں۔ اب تو پڑھنے کے لیے لائبریریوں سے باہر بہت کچھ ہے۔ شہر کی فیشن ایبل سڑکوں پر منی اسکرٹ پہنی لڑکیوں کے چہرے اور دیواروں پر نعرے۔ اب شہر کی دیواریں بڑی بڑی لائبریریوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ دیواروں پر اتنے نعرے لکھے ہوتے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے لوگ تھک جاتے ہیں۔ اب بھلا کتابیں کیا پڑھیں گے۔

نعرے ہماری تہذیب کا اٹوٹ حصہ بن گئے۔ "غریبی ہٹاؤ"! غریبی تو نہیں غریب ہٹ گئے۔ "دیش بچاؤ" یا نہیں جتا کی کرسی بچ گئی۔ "ہندو مسلم سکھ عیسائی، آپس میں ہیں بھائی بھائی" (بہتوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟)

"اس دیش کو اکیسویں صدی میں لے کر جانا ہے"۔ مگر کیسے؟ بیل گاڑی میں کمپیوٹر رکھ کر یا کمپیوٹر کے ذریعے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو بے روزگار کرکے۔

اب تو عالم یہ ہے کہ لوگ مہنگائی کے لیے آواز نہیں اٹھاتے۔ روٹی روزی کی باتیں نہیں کرتے بھوک نہیں چلاتے۔ نعروں میں مست ہیں۔ اب لوگ نعرے کھا رہے ہیں۔ نعرے پہن رہے ہیں۔ نعرے پی رہے ہیں۔ نعرے اوڑھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وصیت کے طور پر چند نعرے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہمارے قائدین فراخدلی سے نعرے فراہم کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر ایک نعرہ سازی میں مصروف ہو جائیے۔ شاندار، مزے دار، دم دار، رعب دار اور دار دار نعرے بنا لیجیے۔ نعرے بنا دیں گے تو زندگی بن جائیگی۔ کسی کے فقر سے فاقہ ہو جائیے۔ ادھر ادھر ہوٹلوں میں۔ پان کے ٹھیلوں اور پانواڑوں میں اور بستی کے چوراہے پر اڈہ کرنے کے بجائے سے بہتر ہے کہ نعرہ بازی میں مصروف ہو جائیں۔ اگر مردہ باد کا نعرہ لگائیں گے تو آپ زندہ ہو جائیں گے اور زندہ باد کا نعرہ لگائیں گے تو آپ پائندہ باد ہو جائینگے لیکن یہ بھی یاد رکھیے کبھی کبھی نعروں کا غلط انتخاب جوتوں، ٹماٹروں اور سڑے ہوئے انڈوں کی بارش کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے سنبھل کر، سنبھال کر، اپنے دل سے نکال کر نعرے لگائیے اور دل کی مراد پا لیجیے۔

محمد طارق
(امراؤتی)

ٹی وی کا بھوت

جب سے ہمارے گھر ٹی۔ وی آیا ہے کرشمہ یہ ہوا کہ ہماری بیگم صاحبہ اور پڑوسن خاموشی سے ٹی وی دیکھتے ہیں ہم انھیں خاموش دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں، دنیا میں دو عورتوں کو صرف ٹی وی ہی خاموش بٹھا سکتا ہے ——— ہے نا یہ سائنس کا بڑا کرشمہ!

ہماری بیگم صاحبہ میں ٹی۔ وی دیکھ کر زبردست تبدیلی آئی ہے۔ رہن سہن تو بدلا ہی، بات چیت کا انداز بھی بدل گیا۔

اور ہمارا "سرمایہ حیات" یعنی بچے، دیوانے، مستانے اور پروانے بن کر فلم کے گیت گنگنانے لگے ہیں۔ گھر کا سارا ماحول "فلمی چکر" میں مبتلا ہے اور ہم اس "فلمی چکر" کے تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔

ہر روز نئے نئے ڈائیلاگ ہمیں سننے کو ملتے ہیں۔

جیسے: جب ہماری بیگم نئی ساڑی پہنتی ہیں!

بچے بے اختیار کہتے ہیں: "واہ۔ کیا ساڑی ہے!"

ہم پوچھتے ہیں "کتنے کی ہے؟!"

بیگم صاحبہ جواب دیتی ہیں: "کفایت شعاری سے گھر چلانے کے بعد جمع کیے ہوئے پیسوں کی ہے!"

ہم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے ہیں۔

ایک روز بچے نے اپنی سفید قمیص پر روشنائی کے داغ لگا لیے ہم نے بچے کو ڈانٹا۔ ہماری بیگم صاحبہ کمان سے نکلے تیر کی طرح سیدھی ہماری طرف آئیں اور بچے کی طرف داری میں ہمارے سامنے ہاتھ نچا کر بولیں۔ داغ ——— ! ڈھونڈتے رہ جاؤ گے!

اس کے بعد ہم اپنے بچے کی وہ قمیص ڈھونڈتے رہ گئے جس پر اس نے داغ لگائے تھے!

ٹی وی دیکھ کر ہماری بیگم صاحبہ ہم سے نت نئی فرمائشیں کرنے لگی ہیں۔ جیسے: وہ تیل لانا جس سے بال ریشم کی طرح ملائم ہو جاتے ہیں۔ وہ صابن لانا جس کے لگانے سے عمر کا پتہ ہی نہیں چلتا اور اس ماہ وہ

پوڈر تو ضرور ملانا جس کے استعمال سے چہرے پر اتنا نکھار آجاتا ہے کہ بوڑھی بھی کنواری لگنے لگے
ہم اپنی ادھیڑ عمر بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں: بیگم آپ ہماری صرف
پوری کر دیجیے۔ خدا کی قسم ہم آپ کی ساری فرمائش پوری کر دیں گے۔"
"کون سی ——— ؟!"
اپنے گھر کے آنگن میں اس درخت کا پودا لگا دیجیے جس پر پیسے لگتے ہوں۔"
"ہوں ——— میں سمجھ رہی ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر میری بھی ایک بات کان کھول کر
اگر آپ نے میری فرمائشیں پوری نہیں کیں تو میں گھر خرچ میں بالکل کفایت شعاری نہیں کروں گی
بیگم صاحبہ کا پارا چڑھ جاتا ہے اور ہم فوراً گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے اپنی
بیگم کو ٹی وی کے ایک پروگرام سے کچھ سیکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اگر اس نے ہدایت کو ہم پر ہی
ہمارے گنجے سر کا کیا حال ہوگا اپنے سر کا خیال آتے ہی جیسے ہی بیگم کا پارا چڑھتا ہے ہم گھر سے ہوا کے
طرح نکل پڑتے ہیں۔

ہوا یوں کہ ہماری بیگم صاحبہ کو ٹی وی پروگرام "کھانا خزانہ" کے نئے نئے ہر قسم کے کھانے
ساری ترکیبیں از بر ہو گئی تھیں۔

مرغ مسلم، شاہی کوفتے، شاہی قورمہ، بٹیر کا پلاؤ۔ نرگسی مچھلی، مرغ کی بریانی، بادام
چکن روسٹ وغیرہ۔

ایک دن وہ ہمیں کھانا بنانے کی ترکیبیں تفصیل سے بتا رہی تھیں ہمارے منہ میں پانی آ رہا تھا جسے
مجبوری کے تحت بڑے سلیقے سے نگل رہے تھے

بیگم جب نئے نئے قسم کے کھانا بنانے کی ساری ترکیبیں بتا کر جواب کے انتظار میں ہما
دیکھنے لگیں تب ہمارا دل بے اختیار چاہا تھا کہ کوئی سبز خواب بیگم کو دکھا دیں لیکن کیا کریں۔ ہم نہ
ہیں۔ ہمارے پاس خواب نہیں حقیقت ہے۔ چناں چہ ہم بیگم سے بولے۔

"بیگم صاحبہ! کھانا خزانہ پروگرام ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہوتا۔ جن کے پاس خزانہ
ان کے لیے کھانا خزانہ پروگرام مفید ہے۔ ہاں! آپ اس پروگرام سے بیلن اچھالنے کا طریقہ سیکھ
بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گا۔"

بیگم نے تیوری پر بل ڈال کر، سر ہلا کر اس طرح "ہوں" کہا کہ ہم سہم گئے اور آج تک
ہوئے ہیں۔ جب بھی بیگم صاحبہ کے تیور بدلتے ہیں ہم سہم کر گھر سے نکل پڑتے ہیں۔

ایک دن ٹی وی خراب ہو گیا۔ ہم بے حد خوش ہوئے۔ ہماری خوشی دیکھ کر گھر سارا ماحول
بیگم صاحبہ ہم سے روٹھ گئیں۔ بچے ناراض ہو گئے سب نے جیسے عہد کر لیا تھا کہ جب تک ٹی وی
نہیں ہو جاتا کوئی ہم سے سیدھے منہ بات نہیں کرے گا۔

گھر کی خوشی، سکون کسے عزیز نہیں ——— مجبوراً ہم ٹی وی میکانک کے پاس پہنچے۔
ٹی وی میکانک ڈاکٹر کی طرح بیگ لے کر آیا اور ایک گھنٹے میں ٹی وی درست کر کے ہم

ڈیڑھ سو روپیے اور چلتا بنا۔

ہمیں چھوڑ سب کے چہرے خوشی سے ایسے کھل اٹھے جیسے انھیں دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔

دوسرے دن ہم بیمار ہو گئے ـــــ

سر درد اور بخار کی شدت کی وجہ سے بستر پر کراہ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسرے کمرے میں ہماری بیگم صاحبہ مع بچوں کے ٹی۔وی دیکھنے میں مگن تھیں ۔

ہم اپنے وجود پر افسوس کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے ۔ کاش ! ہم، ہم نہ ہوتے۔ ٹی وی ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا ۔!

لطائف شاہد صدیقی

فراہم کردہ : امان فاروقی

○

ایک بار سلیمان اریب ماہنامہ 'صبا' کے دفتر میں فائلیں دیکھ رہے تھے کہ شاہد صدیقی مرحوم داخل ہوئے ۔ اریب صاحب نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ایک غزل ہوئی ہے سنو۔" پھر اریب صاحب نے ایک غزل سنائی۔ قافیہ تھا 'رس'، 'دس' وغیرہ اور ردیف تھی 'سے آتی ہے'۔ غزل ختم کر کے انھوں نے کہا "یار پتا نہیں اس کا مطلع نہیں ہوا" شاہد صاحب نے کہا "لکھو میں لکھواتا ہوں۔"

میرے پاس اک لڑکی دو برس سے آتی ہے
اس کے پاس مونہہ سے بھرکھی لیس سے آتی ہے

○

۱۹۵۹ء میں جب شکیلہ بانو حیدرآباد آئیں تو ہم ان سے ملنے رائل ہوٹل پہنچے۔ ان کے کمرے میں پہلے ہی مخدوم محی الدین اور کچھ اصحاب موجود تھے۔ کچھ دیر بعد مخدوم صاحب نے مصرعہ اچھالا :

تم شکیلہ ہو کہ بانو ہو کہ بھوپالی ہو

شاہد صدیقی نے فوراً گرہ لگائی :

خیر جو کچھ بھی ہو تم ماہر قوالی ہو

○

ایک جہاز سمندر میں غرق ہو گیا تو دو ایک اشخاص کشتی میں سوار ہو گئے اور کئی دن تک سمندر میں بہتے رہے ۔ ان میں سے ایک شخص قنوطیت پسند تھا اور دوسرا رجائیت پسند۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد دونوں کو ایک جزیرہ نظر آ گیا۔ جزیرے کو دیکھ کر قنوطیت پسند شخص نے کہا مجھے یقین ہے کہ اس جزیرے میں وحشی انسان رہتے ہیں جو ہمیں کھا جائیں گے۔

اس پر رجائیت پسند شخص نے خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔ یا رب تو خوش ہو جاؤ یہاں اگر جنگلی اور وحشی انسان رہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب تو یہاں وحشی عورتیں بھی رہتی ہوں گی۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔!

صاف صاف

جہاں بھی پان کا ٹھیلہ دکھائی دیتا ہے — وہیں جوانوں کا میلہ دکھائی دیتا ہے
تمام لوگ مجھے گائے بھینس لگتے ہیں — تمام شہر طویلہ دکھائی دیتا ہے
نکل کے گھر سے کوئی جائے تو کہاں جائے — ہر ایک سمت جھمیلہ دکھائی دیتا ہے
اٹھا کے لائے ہیں جو بمبئی سے آپا جی — وہ کوٹ مجھ کو پڑیلا دکھائی دیتا ہے

یہ کڑوی کڑوی سی ہر بات رات دن منہ پھٹ
تری زبان پہ کریلا دکھائی دیتا ہے

●

جن کے اونچے مکان ہوتے ہیں — وہ بڑے بھاگیہ وان ہوتے ہیں
سیٹھ جی کے بچے کچے لقمے — ہم غریبوں کو دان ہوتے ہیں
زور باہر دکھائیں تو جائیں — گھر میں سب پہلوان ہوتے ہیں
موم کے دل ملے ہیں ماؤں کو — باپ اکھڑ پٹھان ہوتے ہیں
تان سین ایک ہو گیا کب کا — اب تو سب تان سین ہوتے ہیں
جب کسی کے دن اچھے آتے ہیں — غیر کے مہربان ہوتے ہیں
آدمی ہو تو کوئی بات کرو — جانور بے زبان ہوتے ہیں

لکھنوی ہیں وہ واقعی منہ پھٹ
جن کے کلے میں پان ہوتے ہیں

قطعات

آج کل کے نئے نئے گاہک
شاعروں کو پلاتے ہیں لسا
اور لسا پلا کے لکھوائیں
کوئی تضمین یا کوئی خمسہ

مجھ کو دنیا کہے نہ جذباتی
سیریس ہو کے عشق کرتا ہوں
پہلے مرتی ہیں لڑکیاں مجھ پر
اور میں اس کے بعد مرتا ہوں

یوسف امتیاز
ٹورانٹو (کینیڈا)

سگریٹ نوشی منع ہے

کسی بھی سگریٹ کے پیکٹ پر نظر ڈالیں تو تین چوتھائی حصہ صرف خطرناک، ڈراؤنے، بڑے بڑے نمایاں نعروں سے بھرا رہتا ہے۔ سگریٹ سے دل کی بیماریاں ہوتی ہیں۔ سگریٹ سے دل پر حملہ ہو سکتا ہے۔ سگریٹ نوشی مہلک ہے۔" "سگریٹ نوشی کینسر کی ایک وجہ ہے۔" بات یہیں تک ختم ہو جاتی تو کوئی بات بھی تھی۔ بعض پیکٹوں پر لکھا ہے ـــــ "تمباکو نوشی سے آپ کی اولاد کو خطرہ ہے۔" جب بھی کوئی سگریٹ پیکٹ خرید کر سگریٹ سلگاتا ہے تو نہ موت کا خوف اس کے ہوش و حواس اڑا دیتا ہے اور نہ دل کی حرکت بند ہو جانے کا خوف اسے باز رکھتا ہے ـــــ وہ صرف ایک مسکراہٹ کے ساتھ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر ہوا میں مختلف دائرے بنانے لگتا ہے۔ اس کے اندر کی ساری دفاعی انتقامی طاقتیں یک بیک بیدار ہو جاتی ہیں۔ شاید سگریٹ کے خلاف مہم چلانے والوں کے خلاف ساری جارحانہ قوتیں اور توانائیاں یکجا ہو کر حملے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ سگریٹ پینے والے ڈھیٹ، بے حیا، و بے پرواہ اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سگریٹ پیکٹ پر لکھی وارننگ "تمباکو نوشی کی عادی بنا دیتی ہے۔" اس کے لیے بے معنی نعرے اور وارننگ سے زیادہ نہیں ہے اور وہ پوچھتے ہیں: "واقعی کیا یہ سچ ہے" ـــــ سگریٹ نوشی کرنے والے کی انگلیوں میں ایک اور سگریٹ آ جاتا ہے اور وہ زندگی کے مزید چھ منٹ تمباکو نوشی میں ضائع کر دیتا ہے۔

"آخر ان تک یہ پیام کیوں نہیں پہنچتا ـــــ" اتنے سارے نعرے، اعداد و شمار، سائنسی تحقیقات، ڈاکٹروں، ماہروں کے بیانات، ٹی وی، اخبارات، رسائل میں آئے دن شائع ہونے والے اشتہارات، کہانیاں یہ سب دیکھ کر بھی ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ شاندار محفلوں اور سماجی تقریبات سے نکالے جانے کے باوجود اجتماعی زندگی میں اچھوتوں جیسا سلوک ہونے پر [illegible] اچھوتے بہرے کیوں بن گئے ہیں۔ بعض مذاہب نے تو کھلم کھلا سگریٹ نوشی منع کر دی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کہا کرتے تھے کہ اردو کا یہ محاورہ میں استعمال کرنے سے رہا۔ مجھ پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جائے گا۔ "دنیا نے میرا

پتہ نہیں کیوں تمباکو نوشی سے پرہیز کرنے والے کسی کے پیٹ پر لات مارنے اور اس کا حقہ پانی کرنے کے درپے ہیں۔

سگریٹ پینے والوں کی بڑی تعداد سنجیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کے خیال میں ساری ر اور ہیجان میں حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اور نہ سو فی صد یقینی۔ انہیں سماجی آشیرواد سے محرومی کا بھی ہے۔ بعض کے عمر کے تقاضے نے ان سے کامن سینس چھین لی ہے

پرانے زمانے میں نانی اماں بچوں کو بتلاتی تھیں کہ اگر تمباکو نوشی اچھی چیز ہوتی تو خدا سر پر چمنی ضرور بنا دیتا ۔۔۔ پتہ نہیں یہ بیان کہاں تک سچ ہے۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ بچپن میں گھر کے روم کی کھڑکیاں دھویں کو اڑانے کے لیے کھلی رکھی جاتی تھیں۔ آج سگریٹ پینے والے واقعی سماج باہر کر دیے گئے ہیں۔ کبھی ریسٹورانٹس میں ایک انسانی پہلو ضرور تھا جہاں سگریٹ پینے اور نہ پینے والو علیحدہ سکشن ہوتا تھا۔ اب تو اکثر بلبوں پر یہ لکھا جاتا ہے کہ "صرف سگریٹ نہ پینے والوں کے لیے" میں ریسٹورانٹس اور بار میں نیویارک میں صرف بار کو چھوڑ کر ریسٹورانٹس میں سگریٹ نوشی کی اجازت نہیں ہے۔ سگریٹ نوشی کے خلاف مختلف حکومتیں اور بلدیات سخت قوانین پاس کر رہی ہیں مگر عمل کے بارے میں چستی نہیں دکھائی جاتی کہ تجارتی نقصانات کا خوف ہے۔ ٹیکسی والے نہایت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تختی لگاتے تھے "تمباکو نوشی نہ کرنے کے لیے شکریہ" اب تو ٹیکسی میں بھی سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ "NO SMOKING PLEASE" کی تختی منہ چڑاتی نظر آتی ہے۔

یہ کتنی دردناک اور تلخ سچائی ہے کہ تمباکو نوشی کرنے والے ان ساری ناانصافیوں ظلم اور کو ہنسی خوشی نہایت ٹھنڈے دل سے برداشت کیے جا رہے ہیں ۔۔۔ ایک کی ہر بات اور مطال سر آنکھوں پر اور دوسرے کے ذاتی حقوق اور جذبات پامال ۔۔۔ باہمی تعاون، بھائی چارگی، ہم کے سارے اصول بالائے طاق ۔۔۔ خون کا ایک سفید ہو گیا۔ جیو اور جینے دو کا اصول نذر آتش دیا گیا۔ تمباکو اور شراب کی ساری کمپنیاں کھیل کود کے سارے ہی ٹورنمنٹ اسپانسر کر سکتی ہو نہ تو اشتہار دے سکتی ہیں اور نہ اپنا نام ٹورنمنٹ کے ساتھ جوڑ سکتی ہیں۔ ٹی وی، ریڈیو پر ہونے وا بڑے بڑے پروگراموں کے لیے رقومات قبول ۔۔۔ خون اپنے جگر کا ہے اور اف بھی نہ ہو۔ بے چارے سگریٹ پینے والے ہیں کہ برف باری، تند اور تیز ہواؤں کے جھکڑ کا مقابلہ کرتے ہوئے سردیوں لباس میں ملبوس بلڈنگ کے باہر کھڑے مرغولے چھوڑ رہے ہیں اور رہی ہی جی میں مخالفین کو کوس رہے جو دیدہ دلیری اور سینہ زوری پر اتر آئے ہیں۔ ہوائی جہاز کی کمپنیاں بھی اب سگریٹ نوشی کو اڑان کے دوران آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں سگار بیچنے اور خریدنے پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر کیوبا کا تمباکو خریدا نہیں جا سکتا اور نہ بیچا جا سکتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ابھی ابھی مئی میں کلاسیک سگارز کا نیلام ہوا جن میں فیڈل کاسترو کی آٹوگراف کے ساتھ ڈبے بھی شامل تھے اور وہ بھی جو صرف فیڈل کے لیے خاص طور سے بنائے گئے تھے۔ سب سے زیادہ قیمت ایک پر اٹھارہ ہزار ڈالر لگائی گئی اور خریدنے

اور نہیں بلکہ ٹیکساس سے کی ایک امیر ترین شخصیت بہ نفس نفیس اس نیلام میں حصہ لینے کے لیے ذاتی ہوائی جہاز میں خاص طور پر آئی تھی ۔ ہالی ووڈ کے مشہور ستارے بھی اس نیلام میں موجود تھے ۔ سارا ہال سگار کی مخصوص خوشبو سے نہ صرف مہک رہا تھا بلکہ مطلع SMOKEY تھا ۔ پتہ نہیں انکل ٹام کے دل ناتواں پر کتنے سانپ لوٹے ۔ جیسے سب ہی نے سگار کے لمبے کش لے کر سارا دھواں ان کے چہرے پر چھوڑ دیا ہو ۔

ان سارے ہنگاموں کے درمیان سگریٹ پینے والے مخالفت سے بے پرواہ ، اکیلے یا مشترکہ مقصد سے یکجا جمع ہونے والے گروپ سکڑتے کانپتے گردن توڑ عمارتوں کی بالکنیوں سے جیسے لٹکے ، جھانکتے ۔ دیواروں اور گلی کوچوں میں ٹیکا لگائے تمباکو نوشی میں مصروف نظر آتے ہیں ۔ ان کی نظریں سماج بائیکاٹ سے تنگ آکر جلا وطنوں کی طرح خاندان کو اکٹھا کرنے میں کوشاں نظر آتی ہیں ۔ یہ سب کچھ ایک کا مریڈری ہی تو ہے جو خاندان کو ایک اسٹیج پیدا کھڑا کرتی ہے ۔ اس کٹھور ، بے مطلب ، بے معنی اور بے قابو دنیا میں اپنی شخصی آزادی اور حق کے لیے لوہے کی ایک ڈھال کی طرح بر سر جنگ ہیں ۔ سگریٹ پینے والوں میں بے انتہا قوت ارادی ہے مگر مخالف بھی تو کسی سے کم نہیں ۔ کاش سگریٹ نوشی کے مخالف جس قدر توانائی اس مہم پر لگا رہے ہیں روزانہ بچوں اور عورتوں پر ہونے والے بے جا مظالم ۔ نہتی عورتوں پر شوہر کی دست درازی وغیرہ جیسے مسائل پر صرف کرتے تو دنیا نہ جانے آج کتنی بہتر ہوتی !

سگریٹ پینے والوں کے لیے گھروں کے دروازے بند ہو گئے ہیں ۔ پبلک مقامات پر تمباکو نوشی کرنے کا انام میں صلیب پر چڑھایا جا رہا ہے ۔ خواہ مخواہ لوگ لباس سے آنے والی سگریٹ کی بو سے خوفزدہ ہیں ۔ شہر کے ہسپتالوں شاپنگ سنٹرز ، دفاتر ، عمارات کے بعد یہ سازشیں کی جا رہی ہیں کہ ان کو پارکنگ لاٹس سے بھی باز رکھا جائے جو عادی تمباکو نوشی ہیں وہ اور زیادہ ستائے ہوئے تنگ آمد بجنگ آمد ۔ کالی صدیوں کے سر سے رات کا آنچل کب ڈھلکے گا ۔ کیا دل یا دل جیتیں گے کیا سکھ کا ساگر چھلکے گا کیا امبر جھوم کے گائے گا کیا دھرتی نغمے گائے گی ۔ اس کا جواب صرف وقت کے پاس ہے ۔ تب تک امرت کی دھن میں سگریٹوں کے کش جاری رہیں گے ۔

ساحر نے یقین دلایا تھا ـــــ وہ صبح کبھی تو آئے گی تب تک :

سگریٹ پیے جا سگار پیے جا ـــ ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا

غزلیں

عبدالحفیظ لقب عمران

اپنا اچھا آدمی اک دم گدھا کیوں ہو گیا
پارسا تھا جو کبھی وہ بیوڑا کیوں ہو گیا

ہار ڈالا ہے گلے میں غیر کے اُس شوخ نے
آؤ چل کر دیکھ لیں ایسا بھلا کیوں ہو گیا

ہم کہاں جاکر کریں اس بات کی اِنکوائری
شہر سے وہ دلربا اب لاپتہ کیوں ہو گیا

پیار کرنا ہر جواں کا جنم سِدھ حق ہے تو پھر
بند مجھ پر اس گلی کا راستہ کیوں ہو گیا

دُبلا پتلا آدمی فربہ نظر آنے لگا
بھجیا ہوتے ہوتے کوئی گلگلہ کیوں ہو گیا

سادگی مشہور تھی جس کی زمانے میں کبھی
آج وہ ناز و ادا سے آشنا کیوں ہو گیا

جب کہ ہم دونوں نے اُلفت کو رکھا ہے راز میں
اس قدر چرچا ہمارا جابجا کیوں ہو گیا

ہو نہ ہو اِس میں رقیبوں کی شرارت ہے ضرور
عشق میرے واسطے سیلِ بلا کیوں ہو گیا

یہ سزا کس جرم کی مجھ کو ملی ہے اے خدا
چاہنے والا مجھے، مجھ سے جُدا کیوں ہو گیا

دیکھ کر میری ترقی، کہتے ہیں حیرت سے لوگ
عاشقِ ناکام آخر کام کا کیوں ہو گیا

آج کل وہ لِفٹ کیوں دیتا ہے تم کو سوچ لو
وہ طبیعت کا بُرا انساں بھلا کیوں ہو گیا

اپنی دُنیا میں اندھیرا دیکھ کر اکثر لقب
سوچتا ہوں میں وہ مہوش بے وفا کیوں ہو گیا

بھول جاؤں میں تمہیں، آ آ کے سمجھاتے ہیں لوگ
بن گئے ہیں گویا شیطان مجھ کو بہکاتے ہیں لوگ

باتیں کرتے ہیں ہمیشہ مجھ سے بے سر پیر کی
کیا بتاؤں کس قدر اے دوست کھولاتے ہیں لوگ

ترکِ اُلفت کا دیا کرتے ہیں اکثر مشورہ
اُن کو کیا تکلیف ہے کیوں مجھ کو پھسلاتے ہیں لوگ

چارسوبیسی میں مَیں نے کرلی ہے پی۔ ایچ ڈی
دیکھ کر کرتوت میرے اب تو شرماتے ہیں لوگ

دَور ہے ہائی برِڈ کا آج کل بھائی مرے
ساٹھ کا سِن ہوتے ہی کھٹیا سے لگ جاتے ہیں لوگ

اس طرح شہرت نہیں، رسوائی تو ہو گی مری
شکر ہے کچھ تو مرے حق میں بھی فرماتے ہیں لوگ

مانتے ہیں لوہا سب جادو بیانی کا مری
مجھ سے جب بھی بات کرتے ہیں تو ہکلاتے ہیں لوگ

گھومنے جب بھی نکلتے ہیں سڑک پر ساتھ ہم
یہ حقیقت ہے کہ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں لوگ

فضل حسنین
(الہ آباد)

قصہ پہلی روٹی کا

آزادی کے زمانے میں یعنی شادی سے قبل تو ہم اپنی مرضی کے آپ مالک تھے لیکن شادی ہوتے ہی اچانک ہمارا تعلق "غلام ونش" سے ہو گیا۔ ویسے یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ملازمت کے سلسلے میں ہماری مالکن (بیگم) ہم سے دور یعنی دوسرے شہر میں رہتی ہیں لیکن ملاقات ہونے پر ہمیں انواع و اقسام کی ہدایات دینے پر کبھی نہیں چوکتیں اور ہم ایک سچے بیوی پرست شوہر کی طرح ان کے ہر حکم کی تعمیل کو اپنی زندگی کا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔ ابھی تک صرف ایک حکم کی تعمیل میں ہم کچھ کچے ثابت ہو رہے تھے کیونکہ یہ کام ہمیں بہت ہی پر خطر اور کچھ غیر فطری سا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی پرانی ہوٹلی زندگی چھوڑ کر دست خود دہان خود کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا کریں۔ ادھر بیگم تھیں کہ ہماری ہر جسمانی تکلیف کی واحد وجہ ہوٹل کے کھانے کو ہی گردانتیں۔ تنگ آکر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا کہ چلو جب بیوی کی اور عدولِ حکمی نہیں کرتے تو اس ایک مورچے پر کیوں پیچھے رہیں اور پھر بیگم کو ہماری صحت کی اتنی فکر ہے تو اس میں تھوڑا بہت ہمارا بھی تو فائدہ ہے اور جب "اوپر" سے کچھ مزید سختی ہوئی تو پھر ہمیں ہتھیار ڈالنا ہی پڑا۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کھانے میں خاص آئیٹم تو روٹی ہی ہوتی ہے۔ اس کے لیے بیگم نے فرمان جاری کیا تھا کہ گیہوں اچھی طرح چھان پھٹک کر اپنے سامنے ہی پسوانا چاہیے۔ ورنہ چکی والے عموماً خالص آٹا دینے سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن بیگم کی عدم موجودگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے شارٹ کٹ کے طور پر ہم راست آٹا ہی خرید لائے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہر نیا کام کرتے وقت شروع شروع میں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش رہتا ہے اور ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ مشکل ترین کام ہم پہلے کرنے کی سوچتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے زیادہ تر کام ہم کر بھی نہیں پاتے۔ اپنی اسی پرانی عادت کے طفیل ہم نے سب سے پہلے روٹی پکانے کی ٹھانی۔

چنانچہ اللہ کا نام لے کر ہم نے آٹا سانا شروع کیا۔ اندازہ نہ ہونے کے باعث پانی زیادہ ہو جاتا تو ہم اور آٹا ملا لیتے۔ لیکن پھر پانی کم محسوس ہوتا۔ عدم توازن کا یہ سلسلہ دراز ہو گیا [illegible] اصل آٹے

سے گلگلے بنانے پڑے کیوں کہ کھیر جیسے آٹے سے روٹیاں بننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ اتفاق سے ہمیں گلگلے پسند بھی بہت ہیں۔ شاید اسی وجہ سے آٹے میں پانی زیادہ گر جاتا تھا۔ نتیجے میں دو تین وقت تک تو یہی ہوتا رہا کہ ہم نیت تو باندھ کر بیٹھے روٹیاں کھانے کی لیکن کھانے کو ملتے گلگلے۔ عاجز آ کر آٹا سانتے میں ہم نے ڈراپر dropper کا سہارا لینا زیادہ مناسب سمجھا۔ آخری مرحلے تک پہنچنے سے قبل ہم ڈراپر سے dropper سے بوند بوند پانی ٹپکاتے جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ہم روٹی والا آٹا سان لینے میں تقریباً کامیاب ہو گئے۔ اب ہم نے فاتحانہ شان سے خوشی خوشی اسٹو جلا کر اس پر توا چڑھا دیا۔ پہلی روٹی ہندوستان کے نقشے سے کافی مشابہت رکھتی تھی جس سے ہمیں اپنے حبّ الوطنی کے جذبے پر اطمینان سا ہوا کہ مادرِ وطن کی محبت ہمارے دل میں کس گہرائی تک اتر چکی ہے۔ کسی طرح روٹی توے تک پہنچی تو ہم دوسری روٹی کی تیاری میں لگ گئے لیکن جب ہم نے نانِ اول پلٹی تو ہمیں لگا جیسے روٹی کے ساتھ توا بھی چلا آیا ہو کیونکہ روٹی کا رنگ اب توے کے رنگ سے میل کھانے لگا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ روٹی پلٹنے میں کچھ زیادہ ہی تاخیر ہو گئی تھی اور اسٹو بھی ہم نے پوری رفتار سے چلا رکھا تھا۔ اب دوسری طرف روٹی توے پر رکھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ کم از کم ایک طرف تو روٹی کھانے لائق بچی رہے۔ اس لیے ہم نے اسے سینکنا شروع کر دیا۔ اسی درمیان اسٹو بے تحاشہ دھواں اگلنے لگا۔ ہم نے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ آخر جانک اسٹو اس نازیبا حرکت پر کیوں اتر آیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے روٹی شعلوں میں تبدیل ہونے لگی۔ تب ہماری سمجھ میں آیا کہ دھواں بھی اسٹو سے نہیں بلکہ روٹی سے ہی نکل رہا تھا۔ ہم نے جھپٹ کر روٹی توے سے اتار لینی چاہی تو پیٹوں نے ہماری آستین کا دامن تھام لیا۔ روٹی کا چکر چھوڑ کر اب ہم آگ بجھانے میں جٹ گئے۔ روٹی خود ہی جل بھن کر خاک ہو گئی۔ البتہ پیٹ کی آگ اور بھی بھڑک رہی تھی۔ کیوں کہ ہم نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ آج روٹی کھائیں گے تو اپنے ہی ہاتھ کی کھائیں گے۔ اس لیے جلنے کی تکلیف بھول کر ہم نے کرتہ پاجامہ بالائے طاق رکھا اور جسم پر سادہ سا لباس ہی باقی رکھا کہ پھر آگ لگنے کی گنجائش ہی نہ رہ سکے۔

اس بار ہم نے روٹی توے پر ڈالتے ہی فوراً اسے پلٹ دینی چاہی تو روٹی کا بیشتر حصہ پھر آٹے میں تبدیل ہو کر چپکنے لگا۔ ہم ایک دم جھلا اٹھے۔ دل میں خیال آیا کہ ابھی دو ایک روز توے کا چکر چھوڑ ہی دیں۔ پھر جب کچھ چل نکلیں گے تو توے کا استعمال بھی شروع کر دیں گے۔

لہٰذا ہم نے اسٹو بجھاتے ہوئے ایک خوب تندرست روٹی کو ہیٹر پر ڈائرکٹ سینکنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہم نے مزدوروں کو اکثر اسی فارمولے سے روٹی پکاتے دیکھ رکھا تھا۔

خیر صاحب! جب کسی طرح ہماری یہ تاریخی روٹی پک کر تیار ہو گئی تو اس طرح خوشی سے ناچ اٹھے جیسے کسی بہت بڑے مقابلے میں ہم نے میدان مار لیا ہو۔ پھر ہم فوراً اپنی اس تخلیق کو پیٹ کے اندر پہنچانے میں لگ گئے۔ روٹی کی پہلی پرت تو چاقو سے کھرچ کر نکال ہی دینی پڑی۔ کیونکہ پہلی پرت کوئلے سے میل کھانے لگی تھی۔ البتہ دوسری پرت کچھ روٹی جیسی بن گئی تھی۔ روٹی کا اندرونی حصہ ہمیں چینی ملا کر حلوے کی طرح استعمال کرنا پڑا کیونکہ آنچ اتنی اندر پہنچنے میں قطعاً ناکام رہ گئی تھی!

سنجر ہلال بھارتی
(کلکتہ)

گر تو برا نہ مانے

"تمہارا نام ــــ ؟"
"گدھا ــــ !"
"باپ کا نام ــ ؟؟"
"گدھا ــ !!"
"دادا کا نام ــ ؟؟؟"
"گدھا ــ !!!"
"تعجب ہے ــ سب کے سب گدھے ــ !!"
"آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا؟"
"ہاں ــ !"
"وہ کیوں ــ ؟"
"اس لیے کہ تمہاری زندگی گدھے سے شروع ہوتی ہے
اور گدھے پر ختم ــ !"
"میری بات سنو گے ــ ؟"
"جی ــــ فرمائیے ــ !!"
"آدمی بنو گے ــ ؟"
"استغفر اللہ ــ !!"
ایسا کیوں ــ ؟
"الرجی ہوتی ہے اس نام سے ــ !"
"ایک بات عرض کروں ــ ؟"
"ارشاد فرمائیے ــــ !"

"میری طرف دیکھو ــ !"
"دیکھا نہیں جاتا ــ !"
"ایک بار تو دیکھو ــ !"
"شرم آتی ہے ــ !!"
"کیوں ــ ؟"
"آپ آدمی ہیں نا ــ ؟!"
"تم بڑے لفاظ ہو ــ !"
"میں شاعر نہیں ــ !"
"جھوٹ مت بولو ــــ !!"
"میں لیڈر نہیں ــ !"
"تمہارے قول و فعل میں تضاد ہے !!!"
"جی ــــ میں منسٹر نہیں ــ !!"
"آخر تم آدمی بننا پسند کیوں نہیں کرتے ــ ؟"
"رسوا ہو جاؤں گا اپنی برادری میں ــ !"
"مطلب ــ ؟"
"دعا مانگی ہے خدا سے میری برادری نے ــ !"
"کیسی دعا ــ ؟"
"یہی کہ ــــ بھگوان تو نے مجھے گدھے میں جنم دیا
ہے تو دم مرگ بھی گدھا ہی رکھنا ــ ۔"
"ایسا کیوں ــ ؟"

"تاکہ 'باپ' کہہ سکے ضرورت پڑے مجھے آدمی —!"

"باپ کہلانے میں لذت ملتی ہے، کیا — ؟"

"بے شک —!"

"آخر کیوں —؟"

"ایک اعزاز ہے میرے لئے قدرت کا یہ —!"

"کیا بکتے ہو —؟!"

"سچ کہتا ہوں — یہی اعزاز تو دنیا کی دیگر مخلوقات
میں مجھے منفرد بناتا ہے!!"

"تم کفر بکتے ہو —!"

"خدا لگتی کہتا ہوں"

"کوئی دلیل — ؟"

"ہاں، ہے —!"

"مثلاً — ؟؟"

"یہی کہ زندگی کے ہر شعبے میں میری برادری
کا کوئی نہ کوئی فرد آپ کے ساتھ رہتا ہے۔

سیاسی اکھاڑوں میں، سماجی میدانو
ادبی اداروں میں، انجمن دانشوراں میں،
سخنوراں میں، لسانی اکاڈمیوں میں، سر
دفتروں میں، اسمبلی ہاؤسوں میں، پارلیمنٹ
ایوانِ اقوامِ متحدہ میں ——— یہاں تک
گھر میں میری برادری کی نمائندگی لازمی ہے
کیوں ہے نا —؟"

"آپ خاموش کیوں ہو گئے —؟؟

"حضور ناراض ہو گئے کیا ——؟؟؟"

ہی ہی ہی ہی ہی

o

یوسف ناظم

(بمبئی)

کچھ پیش رفت کے بارے میں

ڈاکٹر محبوب راہی کا تازہ ترین مجموعۂ کلام "پیش رفت" ہاتھ آیا اور اسے فرصت سے پڑھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ اس میں رفت سے زیادہ آمد کا انتظام ہے اور قاری اسے اپنی زندگی کے پیش آمدہ واقعات کا منظرنامہ بھی سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اس سے پہلے ان کی غزلوں کے ۳ مجموعے منظر عام پر آ کر ان کے پرگو اور زودگو شاعر ہونے کا حلفیہ ثبوت دے چکے ہیں۔ "ثبات"، "تردید" اور "بازیافت" کے بعد "پیش رفت" اس بات کا دستاویزی ثبوت ہے کہ یہ شاعر تھک جانے والے شاعروں میں سے نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ اس بات کا اعلان ہے کہ جس طرح شاعر نے اپنی عملی زندگی میں ایک رزق کا دروازہ مقفل کر کے دوسرے پر دستک دی اور اندر سے آواز آئی "اے آمدنت باعثِ آبادی ما" اسی طرح شاعر نے جب بھی شعر و ادب کا دروازہ کھٹکھٹایا لیلیٰ غزل نے دبی آواز میں آمنا و صدقنا کہا۔ شاعر نے دعا مانگی تھی۔

سرنگوں مجھ کو کبھی میرے خدا مت رکھنا
سربلندوں میں بھی بالا مری قامت رکھنا

اس دعا کے لیے ڈاکٹر محبوب راہی نے شاید کوئی اچھا وقت چنا تھا۔ ممکن ہے یہ دعائے نیم شبی ہو اور شاعر نے کسی مشاعرے سے لوٹنے کے بعد گھر پہنچ کر خضوع و خشوع کے ساتھ مانگی ہو اور وہ بھی اس طرح کہ خضوع اور خشوع کا حرف ع تقطیع کے لحاظ سے اپنی جگہ اٹل رہا ہو اس لیے دعا کی قبولیت میں دیر نہیں لگی۔ دعاؤں کے معاملے میں یہ بڑی سہولت ہے کہ یہ ریل سے یا ہوائی جہاز سے سفر نہیں کرتیں ورنہ پتہ نہیں ان کا کیا حشر ہوتا۔ شاعر کی عمر میرے حساب سے اس وقت ۵۴ سال ہے اور ان کی شاعری کی عمر ان کے حساب سے ۳۳ سال ہے۔ اس عمر اور اس مدت میں شعر و ادب کا جو ذخیرہ ڈاکٹر محبوب راہی نے بہ ثبات عقل و ہوش، پیش کر ڈالا ہے۔ وہ بہتوں کے لیے رشک اور اکثر کے لیے عبرت کا باعث ہے۔ وہ بچوں کو کو پڑھاتے بھی تھے اور ان کے لیے نظمیں بھی لکھتے تھے۔ "رنگا رنگ" اور "گل بوٹے" یہ دو مجموعے انھوں نے خاص طور پر بچوں کے لیے تصنیف کیے کیونکہ ان کے شب و روز انہی میں گزرے تھے یہ نظمیں جہاں تک میرا

خیال ہے ماحول کے زیر اثر کہی گئیں اور بعد میں ان کا اثر ماحول پر پڑا (حساب برابر ہو گیا) ______
جس علاقے سے محبوب راہی تعلق رکھتے ہیں وہاں کی روایت یہ ہے کہ اگرام۔ اے کی سند حاصل کر لو تو پھر مت رک جاؤ۔ دو قدم اور چلو اور پی ایچ ڈی ہو جاؤ۔ ڈاکٹر محبوب راہی نے اس روایت کی پاسداری میں اپنے روزمرہ کی مصروفیات میں سے وقت کاٹ کاٹ کر بچانا شروع کیا۔ (ان کی ریسرچ مبارک اس مقالہ کی دین ہے جو انھوں نے ڈاکٹر مظفر حنفی کی حیات اور کارنامے سے متعلق لکھا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ محبوب راہی کی لگن اور محنت شاقہ بھی ان کے شعری کارناموں کی طرح باعث رشک (بلکہ موجب حسد) ہے اور تو اور یہ اندرونی طور پر مفلس قارونی بھی ہیں اور مزاح گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی قامت بالا ہے۔ ان کا ایک قدم سنجیدہ مشاعرے میں ہے تو دوسرا مزاحیہ مشاعرے میں۔ دونوں کا ذائقہ انھوں نے چکھا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر یہ سنجیدہ شعر گوئی کے شاعر بھی ہیں اور شاطر بھی۔ نرم لہجے میں سخت بات کہنے کا انھیں سلیقہ ہے اور جب بھی چوٹ انھیں گہری پہنچتی ہے۔ ان کا شعر بتا دیتا ہے کہ اس چوٹ کے پیچھے خود ان کی مرضی ہی نہیں محنت بھی شامل ہے۔ محبوب راہی زخم خوردہ شاعر ہیں اور زخموں کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے شوقین ہیں۔ ان کے یہ اشعار شاید میرے اس بیان کی تائید کر سکیں۔

کرب غم، ذوق نظر، جوش طرب کچھ بھی نہیں
جی رہے ہیں اور جینے کا سبب کچھ بھی نہیں

فکر کا اغیار کے، ریتوں کے چھلا کا تذکرہ
چھوڑیئے اب بیتا بیتے والے کل کا تذکرہ

جہنم کی ضرورت کیا ہے آخر
عذابوں کو تو یہ دنیا بہت ہے

ان اشعار کے ساتھ محبوب راہی کا ایک انداز یہ بھی ہے:

جس طرف سے وہ گل اندام گزر جاتی ہے
سارے ماحول میں خوشبو سی بکھر جاتی ہے

پتہ نہیں یہ ذکر ان کی جائے ولادت بارڈ گاؤں کا ہے یا ان کے وطنی پیپل گاؤں راجہ کا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بارسی ٹاکلی ضلع اکولہ کی واردات ہو جو شاعر کا مقام رہائش ہے۔ شاعر کو بہرحال خود اس کا پتہ نہ ہوتا تو اسے یہ شکایت نہ ہوتی:

یاد سے جس کی ذہن ہمارا روشن ہے
جانے کہاں وہ چاند سا مکھڑا روشن ہے

اور پھر شاعر فوراً تصورات کی سنہلی اور رنگیلی دنیا سے نکل کر حقیقت کے خارزار میں آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے

ساری فضا گلنار ہے جس کی سرخی سے
خون ہمارا نیزہ نیزہ روشن ہے

پیش رفت میں گریہ و تبسم کی یہ کیفیت قاری کو ہر جگہ نظر آئے گی۔ دکھوں کی دھند میں لپٹی ہوئی روشنی کی کرنیں بھی ہیں اور خندہ ہائے گل کے پس منظر میں خزاں اور حسرت جبر کی آلودگی بھی۔
۱۴۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی یہ کتاب شاعر کی زندگی کی کتاب ہے جس کی ابتدا ایک بہت ہی پراثر اور دل میں اتر جانے

والی دعائیہ نظم سے ہوتی ہے:

یہ کرب کا احساس مسلسل مرے اللہ
کر دے گا کسی دن مجھے پاگل مرے اللہ

یہ کرب انگیز نظم اس شعر پہ ختم ہوتی ہے:

سرمایہ و اسباب جسے چاہے اسے دے
راہی کو بس اک صبر مسلسل مرے اللہ

دعا تو خیر دعا مانگنے والے کی ذاتی ملکیت اور شخصی آرزو ہوتی ہے لیکن یہ دعا اس لیے بھی ذاتی معلوم ہوتی ہے کہ شاعر نے صبر مسلسل کی دعا مانگ کر اپنی ضرورت ہی کا نہیں۔ اپنی انفرادیت کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

کتاب بہت خوب صورت چھپی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور مصور شکیل اعجاز نے راہی کو ایک لکیر پہ چلتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ یقیناً خط مستقیم ہونا چاہیے۔ میں بھی اس راہی کے قلم اور قدم دونوں کی خیریت چاہتا ہوں۔

شیخ امیر

(اکولہ)

سیپیاں کا شاعر

بقول یوسف ناظم" اردو کے بڑے شاعر، ادیب اور محقق چھوٹے چھوٹے شہروں بلکہ دیہی میں جنم لینا زیادہ پسند کرتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی ایک آدمی کو میں جانتا ہوں۔ بلڈانہ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں " پیپل گاؤں" کا جنم ہوا۔ میں آج تک اس گاؤں کے نام کی وجہ تسمیہ نہ جان سکا نہ تو یہاں پیپل کے پیڑوں کی ہے نہ یہاں کے لوگوں کو پیپل کے پتے کھانے یا جمع کرنے کا شوق ہے۔ اس گاؤں کا نام تو "گوٹے" یا پتھر گاؤں ہونا چاہیے تھا۔ جہاں تک آپ کے قدم جائیں گے پتھر ہی پتھر آپ کی راہوں میں بکھرے نظر آئیں گے۔ لمبے لمبے گول گول چمک دار پتھر، گلی، کھیت، ندی، جدھر سے بھی آپ گزر جائیں آپ کو سوائے ان پتھروں کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ مجھے تو ان لوگوں کی عقل پر پتھر پڑے نظر آتے ہیں جو اسے " پیپل گاؤں" کہتے ہیں۔

اسی چھوٹے سے گاؤں کیا بالفاظ دیگر ان ہی کنکر پتھروں سے ایک ہیرا نکلا۔ جس کی چمک اس چھوٹے سے گاؤں کو چمکا دیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد "Animal Husbandary" کا کورس ناگپور سے کیا۔ اس سے ان کا مقصد جانوروں کو فیض پہنچانا تھا مگر کاتبِ تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس لیے پیشۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے اور یہیں سے میرا ان کا ساتھ ہوا۔ یہ سن ۶۸ء کی بات ہے۔

دراز قد، چوڑا سینہ، گول گول آنکھیں، محنتی جسم، پہلے کبھی گھنے کالے بال تھے مگر اب وہ فارغ البال ہوتے جا رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ وہ دن بھی دور نہیں جب لوگ ان کو دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھیں گے ع

"ایک رات میں دو دو چاند کھلے"

اچھے بھلے انسان تھے۔ "تھے" پر آپ چونکیے مت، میرا مطلب یہ ہے کہ اب شاعر ہیں۔ شاعری ورثے میں نہیں ملی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ان کے خاندان والوں نے کبھی یہ روگ نہیں

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم دونوں بیٹھے تھے۔ بقول پطرس بخاری "جب دوستی پرانی ہو جاتی ہے تو خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے"۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک اچھل پڑے اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگے گویا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ میں نے کہا خان صاحب خیریت تو ہے؟ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔ کہنے لگے "سنیئے! بہت دنوں سے ایک بات ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا مگر اب مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے پوچھا کس بات کا؟ انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "شاعری کا"۔ شاعری لفظ سن کر میں تو سکتہ میں آ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بس ٹکر ٹکر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ چمک دار نظر آنے لگا۔

شاعری کا کہہ کر خان صاحب پھر اپنی دنیا میں کھو گئے۔ شاید اپنے آپ کو آل انڈیا مشاعرے کی اسٹیج پر بیٹھا دیکھ رہے ہوں۔ آنکھیں بند چہرہ کھلا ہوا اور ہونٹوں پر نہ سمجھ میں آنے والی مسکراہٹ۔ میں نے ٹھوکا دیا۔ "اجی حضرت" ذرا یہ تو بتائیے کہ یہ خیال آپ کے ذہن مبارک میں آیا کس طرح؟ مسکرایا اور کہنے لگے۔ بس آ گیا، میں نے سوچا ع

"کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

یا پھر ہو سکتا ہے کوئی ان کا جانی دشمن ہو۔ طاقت سے بس نہ چلا تو یہ بلائے دے دی۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ میں نے پھر دوبارہ پوچھا۔ اجی قبلہ! جہاں تک میرا خیال ہے یہ تمھارے ذہن کی اپج نہیں ہو سکتی۔ ضرور اس کے پیچھے کسی کی سازش ہے۔ کہنے لگے "لاحول ولاقوۃ" تو رہا نرا! مٹر کا مٹر، ارے اپنے موفق اللہ خاں صاحب ہے نا انھوں نے مجھے شاعری کے لیے اکسایا ہے۔

موفق اللہ خاں صاحب کا نام سن کر میں تو حیرت میں پڑ گیا کیوں کہ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آدمی معقول ہیں مگر ایسی صلاح! دشمنی نکالنے کے اور بھی طریقے دنیا میں رائج ہیں۔ یہ بھی کیا تک ہوئی! پھر خیال آیا کہ آدمی عقل مند معلوم ہوتے ہیں۔ شاید وہ جانتے ہوں کہ "گڑ سے مرے تو زہر کیوں دو"۔

ایک مہینہ گزر گیا مگر خاں صاحب نے شاعری کا ذکر نہیں کیا۔ میں خوش ہو گیا۔ چلو اچھا خاصا آدمی ضائع ہونے سے بچ گیا۔ لیکن ایک دن وہ پھر شاعری کا ذکر لے کر بیٹھ گئے۔

میں نے پوچھا "تخلص کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کہنے لگے "تخلص بھی ان کی دین ہے"۔ میں نے پوچھا ذرا ہم بھی تو سنیں کیا تخلص عنایت ہوا ہے۔ خاں صاحب کی بارگاہ سے۔ کہنے لگے "نقیب"۔ "نقیب"! میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ یہ بھی کوئی تخلص ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آدمی چت لیٹ گیا ہو۔ اور اس کے اوپر تلے ۲۔۳ پتھر رکھ دیئے گئے ہوں کہ بیٹا اٹھا کر گیا۔

میں نے کہا جیسا نام ویسا تخلص بھی ہونا چاہیے۔ کہنے لگے تم نے کیا سمجھا ہے میں نے کہا ہاں۔ پٹھان آدمی ہو اس لیے تخلص بھی زوردار بلکہ بھاری بھرکم ہونا چاہیے۔ "فصیح اللہ خاں جہانی" یہ تخلص تمھاری شخصیت پر فٹ آتا ہے۔ سمجھتے گئے بیٹا تم کیا جانو۔ شاعری کیا اور تخلص کیا۔ اس کے بعد واقعی کچھ عرصہ میں نقیب لوگوں کے دلوں کا نقیب بن گیا۔ اس کے کلام کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ ان کے کلام کا شہرہ شہر کی گلیوں کوچوں سے نکل کر "آل انڈیا" میں ہونے لگا۔ دوستوں کے سر فخر سے اونچے ہو گئے اور دشمنوں نے زمین

چاٹنی شروع کردی ۔

کالج میں وہ اکثر غزلیں سنایا کرتے تھے اور ہم سب ان کی تعریف کرتے تھے ۔ جب ان کی شہرت شباب پر پہنچ گئی تو ایک دن میں نے ان سے کہا ۔ خاں صاحب ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گے ۔ کہا کہ کہنا چاہتے ہو ۔ میں نے کہا بات ذرا سی ہے ۔ بزرگوں کا قول ہے " سو بکا نہ ایک لکھا " کیوں نہ تم اپنا دیوان چھپا لو تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے ۔ کہنے لگے ۔ میاں " چہ پدی چہ پدی کا شوربہ " میں نے کہا اس طرح اپنے آپ کو under estimate کیوں کرتے ہو ۔ بس اللہ کا نام لو ۔

" ہمت مرداں مدد خدا " بات معقول تھی سمجھ میں آگئی اور پھر جٹ گئے اپنے کام میں ۔ ایک دن دیوان کا مسودہ لے کر آئے ۔ ہاتھ میں ایک پوڑی بھی تھی ۔ آتے ہی کہا ۔ منہ کھولو ۔ میں نے کہا یہ کیا مذاق ہے ۔ پھر ڈانٹ کر کہا ۔ منہ کھولو ۔ میں ڈر گیا نہ جانے کیا کریں ۔ آدمی پہلوان قسم کے ہیں ۔ اس لیے با دل ناخواستہ منہ کھول دیا مگر دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا ۔ خدا خیر کرے ۔ انھوں نے جھٹ ایک جلیبی میں ڈال دی اور کہا ۔ لو منہ میٹھا کرو اردو اکادمی نے میرا دیوان چھپوانے کے لیے مالی امداد دی ہے ۔ میں نے کہا مبارک ہو ۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا ۔

دیوان کے لیے کوئی نام بھی تو سوچا ہو گا ۔ کہنے لگے " سیپیاں " ۔ میں نے کہا سیپیاں نام مناسب نہیں ۔ ضروری نہیں کہ ہر سیپ میں سے موتی ہی نکلے ۔ اگر سیپیاں خالی نکلیں تو اسے کون خریدے گا ۔ ابھی تم جانتے ہو کہ آج کل اردو کی کتابیں خرید کر کون پڑھتا ہے اور پھر وہ بھی شاعری کی کتابیں چھپا لو اور اُن کے پیچھے پھرو ۔ ان کی خوشامد کرو کہ میاں کتاب خرید لو ۔ تمھارے بال بچے جئیں ۔ اگر تم کتاب نہ خریدو تو اردو کا مستقبل تاریک ہو جائے گا ۔ اس کا جنازہ نکل جائے گا ۔ آج کل تو لوگ صاحب دیوان سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح کچھوا اگربتی سے مچھر ۔

کھل کھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے ہم اسے بیچیں گے نہیں مفت بانٹیں گے ۔ پھر تو لوگ پڑھیں گے ۔ میں ان کی معصومیت پر مسکرا دیا ۔ کوئی جواب نہ دیا ۔ دل میں سوچا کہ کتنا نادان انسان ہے ۔ اس دور میں لوگوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ اردو کی کتابیں پڑھیں بہر حال خدا سے دعا ہے کہ نقیب کا کلام ہر خاص و عام کے دلوں کی پکار ہو جائے ان کے کلام پر نکھار آئے اور یہ دن بار بار آئے ۔

اداریہ

پچھلے چند مہینوں میں "شگوفہ" کو عزیز رکھنے والی چند اہم شخصیتیں ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوگئیں ـــ نامور افسانہ نگار عوض سعید کو شگوفہ اور طنز و مزاح کے فروغ سے بڑی دلچسپی تھی۔ رسالہ کے اجرا کے ابتدائی دور ہی سے ان کا قلمی تعاون ہمیں حاصل تھا۔ وہ اکثر بڑے شگفتہ انداز میں شگوفہ کے لیے نامور ادیبوں اور شاعروں پر خاکے لکھا کرتے تھے۔ شگوفہ کی پابندیٔ اشاعت، توسیع اور ترقی پر وہ حیرت اور دلی مسرت کا اظہار کرتے تھے۔

منفرد صحافی، نقاد، شاعر اور دانشور جناب اختر حسن، حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے سرخیل تھے اپنی بزرگی اور علمیت کے باوجود ہر ایک سے انکسار، محبت اور اخلاص سے پیش آتے تھے۔ شگوفہ کے چند شماروں میں ان کا کلام ناچیز حیدرآبادی کے قلمی نام سے شائع ہوچکا ہے۔ ادھر کوئی پانچ سال سے وہ سخت علیل اور فریش تھے۔

جواں سال ریسرچ اسکالر عزیز ابرار نے یم فل کے لیے شگوفہ پر مقالہ لکھا تھا۔ اساتذہ اُن کی ادبی صلاحیتوں کے بے حد معترف تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ ذہنی اُلجھنوں اور صحت کی خرابی سے وہ چند ماہ دوچار رہے۔ پھر اچانک انتقال کی خبر ملی۔

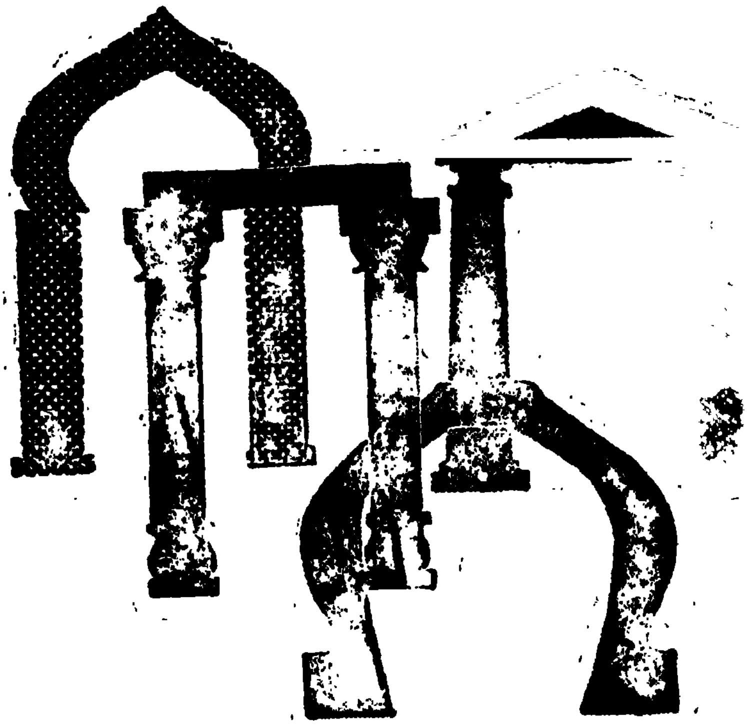
ممتاز مزاح نگار جناب عبدالقادر ادیب "شگوفہ" کے عاشق تھے۔ جب بھی وہ حیدرآباد آتے یا میرا بنگلور جانا ہوتا، ملاقات کے لیے ضرور وقت نکالتے۔ بنگلور میں قیام تھا، لیکن حیدرآباد، اِس شہر کی تہذیب اور زبان سے انھیں لگاؤ تھا۔ مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

محقق و مزاح نگار رام لعل نابھوی کے تخلیقی سفر کا شگوفہ سے آغاز ہوا۔ طبیعت میں عجب تلون و غصہ تھا۔ دس سال قبل کسی ناواجبی بات پر ناراض ہوئے اور پھر بالالتزام ہر مہینہ ایک خط شگوفہ کے نام پوسٹ کرتے رہے جس میں اپنے کارناموں اور نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین اور مصطفیٰ کمال کی بے توجہی کا ذکر ہوتا! یہ خطوط بڑے شوق سے اجتماعی طور پر پڑھے جاتے تھے۔

عزیز دوست جناب محمد مظہر، پیشہ کے اعتبار سے خوش نویس تھے لیکن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو خوش رکھنا اور اُن کے ساتھ خوش رہنا، اُن کی زندگی کا گویا بنیادی مقصد تھا۔ ادبی تحریکات سے وابستہ تھے اور شگوفہ سے ان کا قریبی تعلق تھا۔

ہندی کے نامور شاعر کاکا ہاتھرسی کا چند دن قبل انتقال ہوگیا۔ ہندی مزاحیہ شاعری کے وہ اہم ستون تھے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرہ میں بھی کلام سناچکے تھے۔

ادارہ شگوفہ ان تمام معاونین و مخلصین کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔



زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

جلد ۲۸
شمارہ: ۱۰
اکتوبر: ۱۹۹۵

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال
ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (ریاض)
سعید شوکت (دمام)
ایس۔ ایم۔ حسینی (آسٹریلیا)
ظلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس ادارت:
مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

کتابت: محمود سلیم۔ محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ الکٹرک پریس۔ حیدرآباد

قیمت فی پرچہ: ۹ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ ٹیچرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ ۱
فون آفس: 595716 رہائش: 521064

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

روڈ نمبر-46 ، جوبلی ہلز، حیدرآباد-033 500 (اے پی)

ٹیلی فون-244729

اہلیت کا امتحان برائے داخلہ سال اول بی اے / بی کام /

بی ایس سی نان فارمل کورسس 97 - 1996

معیار اہلیت

کسی بھی قابلیت کے بغیر امیدوار جنکی عمر 18 سال ہو بی اے / بی کام / بی ایس سی کے سال اول میں داخلہ کے لئے اہلیت کے امتحان میں شرکت کرنے کے اہل ہیں امیدوار کی عمر یکم جولائی -1996 تک 18 سال مکمل نہ ہوئی تو اہلیت کے امتحان میں شرکت کرنے کے اہل نہیں ہوں گے۔

اگر مقررہ عمر سے کم عمر کے امیدوار لسٹ میں شرکت کر رہے ہوں تو ایسی صورت میں ان کے نتائج کسی بھی مرحلہ پر منسوخ کردئے جائیں گے۔ اور فیس واپس نہیں کی جائے گی۔

تاریخ ، مقام اور ذریعہ تعلیم برائے امتحان اہلیت

امتحان 21 / جنوری-1996 کو صبح 10 بجے تا ایک بجے دن کے دوران یہاں مندرجہ یونیورسٹی کے اسٹڈی سنٹرس پر انگلش / تلگو / اردو ذریعہ تعلیم میں ہوگا۔ جس کا انتخاب امیدوار کی جانب سے کیا جانا چاہئیے۔

درخواست فارم کس طرح حاصل کیا جائے

شخصی طور پر۔ درخواست فارم و پراسپکٹس شخصی طور پر 20 روپے نقد ادائیگی کے ذریعہ یونیورسٹی ہذا کے قریبی کسی بھی اسٹڈی سنٹر سے حاصل کئے جاسکتے ہیں یا یونیورسٹی کے امتحانی برانچ سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

ذریعہ ڈاک۔ درخواست فارم و پراسپکٹس ذریعہ ڈاک یہاں ذیل میں مندرجہ کسی بھی اسٹڈی سنٹر سے یا اگزامنیشن برانچ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی روڈ نمبر- 46 ، جوبلی ہلز، حیدرآباد-033 500 سے درخواست فارم کے لئے تحریری درخواست کے ساتھ خود کا پتہ لکھا ہوا لفافہ (سائز 22 x 28 سنٹی میٹر) جس پر 13 روپئے مالیتی ڈاک ٹکٹس چسپاں ہوں اور 20 روپئے کی ڈیمانڈ ڈرافٹ رجسٹرار ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد کے نام منسلک کر کے حاصل کئے جاسکتے

اسٹڈی اسٹڈی سنٹر
گورنمنٹ ڈگری کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
سری آر آر کالج
ایس آر آر گورنمنٹ ڈگری کا
سلور جوبلی کالج کرنول
ایم وی ایس آرٹس اینڈ سائنس کا
گورنمنٹ کالج
سری سرودیا کالج
گورنمنٹ کالج
سی ایس آر شرما کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
ایس وی آرٹس کالج
ڈاکٹر وی ایس کرشنا کالج
ایم آر کالج
یونیورسٹی آرٹس اینڈ سائنس کا
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
ایس جی ایس آرٹس کالج
وی ایس آر اینڈ این وی آر کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
ڈی این آر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
ایس وی اے گورنمنٹ کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
ایس ڈی جی ایس کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ جونیر کالج
گورنمنٹ ڈگری کالج
گورنمنٹ ڈگری

ہیں -

درخواست فارم داخل کرنے کا طریقہ

مکمل کردہ درخواست فارمس جس میں اسٹڈی سنٹر کا نام اور مکمل وقوع مختصر میڈیم درج کیا جائے - 30 / نومبر 1995 یا اس سے قبل داخل کئے جانے چاہئیں - امیدواروں سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ اسی اسٹڈی سنٹر سے اپنا ہال ٹکٹ جہاں انہوں نے درخواستیں داخل کی ہوں - ماسوا - جمعرات ، جس دن اسٹڈی سنٹر بند رہے گا اہلیت کے امتحان کی تاریخ سے کم از کم ایک ہفتہ قبل حاصل کرلیں - ایسے رجسٹریشن فارمس جو کہ 30 / نومبر - 1995 کے بعد وصول ہوئے ہوں - کسی بھی صورت میں قبول نہیں کئے جائیں گے - حتی کہ دیرانہ فیس بھی جمع کروائی گئی ہو اس سلسلہ میں کوئی مراسلت قبول نہیں کی جائے گی -

درخواست فارم کی فروخت کے آغاز کی تاریخ یکم نومبر - 1995

درخواست فارمس داخل کرنے اور فروخت کرنے کی آخری تاریخ 30 نومبر 1995

اہم نوٹ

1. - اعلان کی تاریخ یعنی یکم نومبر - 1995 سے قبل اور آخری تاریخ یعنی 30 نومبر 1995 کے بعد حاصل کردہ ڈی ڈیز قبول نہیں کئے جائیں گے - انڈین پوسٹل آرڈرس / منی آرڈرس / چیکس بھی قبول نہیں کئے جائیں گے -

2. - ایسے امیدوار بھی تعلیمی سال 97-1996 کے لئے ڈگری کورسس میں راست داخلہ کے اہل ہوں گے ، جنہوں نے یونیورسٹی کی جانب سے 1994، 1993، 1992 اور 1995 کے دوران منعقدہ اہلیت کا امتحان کامیاب کیا ہو -

3. - ایسے امیدوار جنہوں نے انٹرمیڈیٹ یا اس کے مماثل امتحان کامیاب کیا ہو بی اے / بی کام / بی ایس سی سال اول میں راست داخلہ لینے کے اہل ہوں گے - جس کے لئے ماہ مئی / جون - 1996 میں ایک علحدہ اعلان کیا جائے گا -

دستخط (پروفیسر پی راميا) رجسٹرار

درخواست فارم داخل کرنے کا طریقہ

Advt. No. Dr. BRA OU/39/PR/95

ایم ایف سی جونیئر کالج کریم [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
اے سی کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
ایس اے پی آرٹس اینڈ سائنس کالج [illegible] آباد
گورنمنٹ جونیئر کالج فار ویمن [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
کے جی ایس پال ٹیکنیک فار ویمن [illegible]
[illegible] گورنمنٹ ڈگری کالج [illegible]
[illegible] گورنمنٹ کالج [illegible]
ایس سی این آر گورنمنٹ کالج [illegible]
وی ایس [illegible] ڈگری کالج [illegible]
ایس کے این گورنمنٹ ڈگری کالج [illegible]
ایس پی اینڈ کے وی ایس گورنمنٹ ڈگری کالج [illegible]
[illegible] آرٹس اینڈ سائنس کالج [illegible]
وی آر جونیئر جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
[illegible] کالج [illegible] کے وی آر کالج [illegible]
[illegible] کالج [illegible]
ایس پی وی ڈگری کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج سری سیلم
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
ایس کے آر بی آر کالج [illegible]
سری [illegible] کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج فار [illegible]
ایم اے ایل ڈی گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج [illegible]
سری [illegible] کالج [illegible]
گورنمنٹ ڈگری کالج [illegible]
گورنمنٹ ڈگری کالج فار [illegible]
وی ایس آر اینڈ این وی آر کالج [illegible]
حیدرآباد میں واقع نوین سیوا اسٹڈی سنٹرس
گورنمنٹ سٹی کالج
گورنمنٹ جونیئر کالج فار گرلز [illegible]
ریلوے جونیئر کالج فار [illegible]
گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن بیگم پیٹ
[illegible] گورنمنٹ ڈگری کالج [illegible] آباد
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج فار [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
[illegible] جونیئر کالج فار ویمن [illegible]
[illegible] ڈگری کالج [illegible]
سکندرآباد گورنمنٹ جونیئر کالج [illegible]
گورنمنٹ جونیئر کالج فار [illegible]

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

بحران (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

4-1-825/C سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ، عابد روڈ حیدرآباد 500001

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو بیس 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار (6000/-) روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح 6% سود پر دیا جاتا ہے۔

کارپوریشن مندرجہ (2) اسکیموں کے تحت مارچ 94 تک 51935 افراد میں 10,02,13,000 روپے مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 43,22,05,000 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2644 افراد میں 1,23,56 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 44. 584 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کرچکا ہے۔ اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985 سے اب تک 54579 افراد میں 25.69/11 لاکھ روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 49. 4906 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کرچکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو، اس سال توسیع دیکر نظام آباد گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کیئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (13) ہنر سکھانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان میں 53 کو کمپیوٹر، 28 کو ٹائپ رائٹنگ، 100 کو لائیٹ ڈرائیونگ، 11 افراد کو لیاب ٹیکنیشین 7 کو بیوٹیشن 11 کو شارٹ ہینڈ 10 کو الکٹریشن 5 کو ٹیلرنگ 13 کو ویڈیو گرافی 5 کو فیبریکیشن 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ 5 کو ہیرے تراشنا 6 کو کارپنٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 218 نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا ــــ!

:- خواہشمند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں :- محمد لائق علیخان (مینجنگ ڈائرکٹر)

مجتبیٰ حسین

اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح

بہت عرصہ پہلے سویڈن سے آئے ہوئے ہمارے ایک غیر ملکی دوست نے (جو اردو بالکل نہیں جانتے) ہم سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کسی اردو مشاعرہ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں اس وقت اردو مشاعرہ سے دور رکھنے کی بساط بھر کوشش کی تھی لیکن وہ برابر مصر رہے کہ اردو مشاعروں کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ دیکھیں تو سہی یہ کیا ہوتا ہے، کیسا ہوتا ہے؟ ان کی خواہش کے احترام میں ہم انھیں ایک ایسے اردو مشاعرے میں لے گئے تھے جس میں کئی نامی گرامی شعراء نے شرکت کی تھی۔ شعر تو خیر ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئے۔ لیکن مشاعرہ میں ایک مرحلہ پر داد کا عجب بے پناہ شور بلند ہونے لگا اور لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر داد دینے کی خاطر شاعر کی طرف بڑھنے لگے تو ہمارے غیر ملکی دوست نے "آداب مشاعرہ" سے عدم واقفیت کی بناء پر یہ سمجھ لیا کہ یہ لوگ شاعر پر حملہ کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا فوراً اسٹیج پر کود پڑے اور داد دینے والے سامعین سے مخاطب ہو کر انگریزی زبان میں کہنے لگے "یہ ایک نہایت انسانیت سوز حرکت ہے کہ آپ ایک نہتے اور اکیلے انسان کے ساتھ ایسا غیر انسانی برتاؤ کر رہے ہیں۔ آپ میں ہمت ہے تو ایک ایک کر کے اس کا مقابلہ کریں۔" وہ تو اچھا ہوا کہ اکثر سامعین انگریزی نہیں جانتے تھے اور یہ اردو نہیں جانتے تھے لہٰذا معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ان کی اس بیجا مداخلت پر سب سے زیادہ اعتراض اس شاعر کو ہی تھا جس کی حمایت میں انھوں نے آواز اٹھائی تھی۔ اس پر ہمارے غیر ملکی دوست کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کہنے لگے "صاحب! اردو شاعر بھی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ میں تو انسانی ہمدردی کے ناطے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اور وہ الٹا مجھ سے ناراض ہو گیا۔" ہم نے انھیں سمجھایا کہ اردو شاعری اور شاعر دونوں کبھی آپ کی سمجھ میں نہ آسکیں گے۔ دور کیوں جائیے، خود ہمیں دیکھ لیجئے کہ اردو ماحول اور تہذیب میں پلے بڑھے ہیں لیکن آج تک صحیح معنوں میں شاعری ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔ کبھی شاعری سمجھ میں آگئی تو شاعر سمجھ میں نہیں آیا اور اگر شاعر سمجھ میں آگیا تو اس کی شاعری ہمارے پلے نہیں پڑی۔ اس لیے ایک عرصے سے ہم نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا ہے کیوں کہ تضییع اوقات کے لیے ہم نے اس سے کہیں زیادہ بہتر بہانے تلاش کر لیے ہیں۔

لیکن پچھلے دنوں ہمیں پھر ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے کا موقع ملا اور اتفاق دیکھئے کہ اس بار بھی ہمیں ایک غیر ملکی کے ساتھ مشاعرہ میں جانا پڑا۔ اب کے ہمارے ایک جاپانی دوست (جو اردو بالکل نہیں جانتے) ہندوستان آئے تو کہنے لگے اردو شاعروں کا بڑا شہرہ سنا ہے، دیکھیں تو سہی کہ یہ کیسا ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ ہم نے انھیں بہتیرا سمجھایا کہ حضور آپ اردو مشاعرہ کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکیں گے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم چڑیا گھر دیکھ لیں۔ وہاں بھی بھانت بھانت کے جانور آپ کو دیکھنے کو

بل جائیں گے۔ بولے "چڑیا گھر تو ہمارے ٹوکیو میں بھی ہے۔ آپ جن "جانداروں" کا ذکر کر رہے ہیں وہ ہمارے چڑیا گھروں میں پائے نہیں جاتے۔" سچ تو یہ ہے کہ سویڈن والے دوست کے تلخ تجربہ کی روشنی میں ہم نے اپنے جاپانی دوست کو بہت ڈرتے ڈرتے مشاعرہ میں لے گئے تھے۔ مشاعرہ کے دوران ان پر کڑی نظر بھی رکھی کہ وہ کہیں انسانیت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر ڈائس پر نہ پہنچ جائیں۔ یہ ضروری ہے کہ مشاعرہ میں جانے سے پہلے ہم انھیں "آداب مشاعرہ" کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بتا دیں کہ داد کس طرح دی جاتی ہے، شاعر کس طرح سلام کرتا ہے، صدر مشاعرہ کس طرح اونگھتا رہتا ہے۔ خواتین شعراء کم عمر نظر آنے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کرتی ہیں۔ ناظم مشاعرہ سے ان کی نوک جھونک کس طرح چلتی ہے۔ ہمیں کیا پتہ کہ وہ اتنی جلدی "آداب مشاعرہ" کو جان لیں گے چنانچہ وہ مشاعرہ میں گئے تو لگتا نظر آئے جیسے مشاعروں کے "عادی سامع" ہوں (عادی سامع اور عادی مجرم میں ہمیں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آتا)۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ انھوں نے سمجھا کہ مشاعرہ اصل میں ایک ڈرامہ ہے جس میں ہر کردار (بشمول سامعین کے) پہلے سے طے شدہ ریہرسل کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم مشاعرہ گاہ میں پہونچے تو ڈائس پر بیٹھے ہوئے بھانت بھانت کے شعراء کے مختلف لباس اور حلیہ کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا کہ ان شاعروں کے (COSTUMES) یعنی لباس منتظمین مشاعرہ فراہم کرتے ہیں یا اس کی ذمہ داری خود شاعروں کی ہوتی ہے۔ ہم نے کہا "لباس تو ان کا اپنا ہوتا ہے"۔ پوچھا "اور جو یہ لوگ مشاعرہ میں کلام سنا رہے ہیں تو وہ بھی ان ہی کا ہوتا ہے یا منتظمین مشاعرہ اپنی طرف سے کلام فراہم کرتے ہیں؟" اس معصوم مگر مشکل سوال کا جواب ہمیں بھی نہیں معلوم تھا۔ بلکہ ہم نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا "آپ نے عجیب و غریب سوال پوچھا۔ اس کا آسان سا جواب دینے کے ہم بھی اہل نہیں ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیشتر شعراء کا کلام یا تو منتظمِ مشاعرہ فراہم کرتے ہیں یا کوئی اور انھیں فراہم کرتا ہے۔ پھر بھی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شعراء کا کلام ان کا اپنا ہوتا ہے اور اگر وہ کسی سے اصلاح لیتا ہے یا نظر ثانی کرواتا ہے تو یہ اس کا اور اصلاح دینے والے کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے"۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ "اور یہ جو کلام پر سامعین کی طرف سے داد دی جاتی ہے تو کیا اس کی مقدار بھی پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے کہ کس کلام پر کتنی داد دی جائے گی؟" ہم نے کہا "داد دینے کا معاملہ بھی مشکوک ہے۔ اکثر شعراء اپنے سامعین اپنے ساتھ لاتے ہیں اور جن کے داد دینے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ابھی شاعر صرف "عرض کیا ہے" ہی کہتا ہے اور ادھر اس کے سامعین "مکرر" کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں۔ بے ساختہ داد وہی ہوتی ہے جو بنا سوچے سمجھے دی جائے"۔ پھر ہمارے جاپانی دوست نے ایک شاعر کے لمبے اور بکھرے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ بال مصنوعی ہیں یا اصلی؟" حیرت سے کہنے لگے "ایسے بالوں کے ساتھ کسی کا نارمل حالت میں زندہ رہنا اور پھر اوپر سے شعر کہنا واقعی کمال کی بات ہے۔ ایسے بال اگر میرے سر پر ہوں تو بلاشبہ میں اپنے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاؤں۔ کیا ان بالوں کو دیکھ کر آپ میں وحشت کے آثار نہیں پیدا ہو رہے ہیں؟" ہم نے کہا "ہمارے اکثر شاعر تو اب بال بھی بنوانے لگے ہیں اور جمعہ جمعہ کو نہا بھی لیتے ہیں۔ جو شیروانی سال میں ایک بار دُھلتی تھی اب مہینہ میں ایک بار دُھلنے لگی ہے لیکن کچھ برس پہلے تک اردو شاعروں کا مقبول و معروف حلیہ یہی رہا ہے"۔ اس پر ہمارے دوست بڑی دیر تک اردو شاعر کے حوصلہ کی داد دیتے رہے۔

مشاعرہ میں جب ایک مرحلہ پر سامعین نے ایک شاعر پر انڈے اور ٹماٹر پھینکے شروع کیے تو ہمارے جاپانی دوست نے ہم سے پوچھا "مجھے لگتا ہے اس شاعر کا کلام بہت اچھا ہے تبھی تو سامعین اس پر کھانے پینے کی چیزیں پھینک رہے۔

ہیں۔ دیگر شاعروں کو تو صرف "روکھی سوکھی زبانی داد" دی گئی جب کہ اس شاعر کو کھانے پینے کی چیزوں اور نعمتوں سے نوازا جارہا ہے۔ اب ہم انھیں کیا سمجھاتے کہ اردو مشاعرہ ہماری وہ عظیم روایت ہے جس کے اسٹیج پر جہاں تہذیب کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں بد تہذیبی کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ جسے ہم ہوٹنگ کہتے ہیں اسے بھی وہ "داد" بلکہ "بے ساختہ داد" سمجھ بیٹھے تھے۔ ہم نے ان کی غلط فہمی دور کرنی بھی نہیں چاہی کیوں کہ انھیں کونسا بار بار مشاعروں میں جانا تھا۔ مشاعرہ کو دیکھ کر (ظاہر ہے کہ مشاعرہ ان کے لیے سننے کی چیز تو تھا ہی نہیں) وہ بہت خوش تھے۔ باہر نکلے تو کہنے لگے "مجھے صدر مشاعرہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ لگا تار چار گھنٹوں تک وہ مسند صدارت پر بیٹھا رہا۔ ایک بار بھی اس نے پہلو نہیں بدلا۔ ایک بار بھی وہ اسٹیج سے اٹھ کر کہیں نہیں گیا جب کہ دیگر شعراء حضرات بار بار اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے جارہے تھے۔ یہ اسٹیج کے پیچھے کیوں جارہے تھے؟ کیا نئے شعر کہنے کے لیے جارہے تھے؟"

یہ ایسے سوالات تھے جن کے صحیح جواب ہم دے دیتے تو اردو مشاعرہ کی روایت کے بارے میں ان کے ذہن میں کئی شکوک و شبہات پیدا ہوسکتے تھے۔ اسی لیے ہم نے موضوع کا رُخ موڑ دیا اور انھیں خاتون شعراء کے ترنم میں اُلجھا دیا۔

■■

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

خط کا جواب دیکھ

لگتا ہے پھر سے لوٹ کے آیا شباب دیکھ ۔۔۔ مٹلاتا جا رہے ہیں لگا کر خضاب دیکھ
گلشن میں بھائی جان کا یہ انتخاب دیکھ ۔۔۔ ان کو پسند آگیا کالا گلاب دیکھ
گر دیکھنا ہے خواب تو رنگین خواب دیکھ ۔۔۔ اور خواب ہی میں ان کو بھی بے حجاب دیکھ
چھت ان کی چھت سے تیری اگر ہے لگی ہوئی ۔۔۔ گرما میں چاندنی میں انھیں محوِ خواب دیکھ
کتنوں کو دل سے چاہا تھا عہدِ شباب میں ۔۔۔ دل کی کتاب کھول کے اپنا حساب دیکھ
کیا جانے لکھ دیا انھیں کیا اضطراب میں ۔۔۔ خط پرزے ہو کے آیا ہے خط کا جواب دیکھ
واعظ بھی جوتے پہن کے کھاتے ہیں میز پر ۔۔۔ آیا ہے اس زمانے میں یہ انقلاب دیکھ
بچّے بھی اب یہ گاتے ہیں تو چیز مست ہے ۔۔۔ ٹی وی سے گھر میں آیا ہے یہ انقلاب دیکھ

اوروں کی لغزشوں پہ نہ انگلی اٹھا ظریفؔ
کھانے میں ڈال کے اپنا پانا حساب دیکھ

طوطا طوطی

امیر شیخ اکولوی

سنیے جناب کہتا ہوں تم سے انوکھی بات ۔۔۔ شوہر گیا تھا باغ میں بیگم کو لے کے ساتھ
وہ دونوں پھر رہے تھے چمن میں ادھر ادھر ۔۔۔ بیگم نے ڈالی آم کی ڈالی پہ جب نظر
بیٹھا تھا ایک جوڑا پرندوں کا ڈال پر ۔۔۔ تھی چونچ ایک کی ٹکی دوجے کے گال پر
شوہر سے اپنے بیوی نے یوں پیار سے کہا ۔۔۔ للہ اک نظر تو ادھر ڈالیے ذرا
اُلفت تو اُن میں دیکھیے کیا بے مثال ہے ۔۔۔ اک آپ ہیں کہ رکھتے نہیں میرا کچھ خیال
شوہر نے اس کو ڈانٹ کے خاموش کر دیا ۔۔۔ اشکوں سے چشم ہائے غزالہ کو بھر دیا
وہ دونوں اگلے دن بھی اسی باغ میں گئے ۔۔۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کے وہ گھومنے لگے
بیگم کی پھر نگاہ اسی شاخ پر پڑی ۔۔۔ حیرت سے اس مقام پہ وہ رہ گئی کھڑی
بیٹھے ہوئے پرندے اُسے آئے پھر نظر ۔۔۔ ڈوبے ہوئے تھے پیار میں وہ دونوں بے خبر
بولی وہ مسکرا کے ذرا دیکھیے ادھر ۔۔۔ وہ کر رہے ہیں کیسی حسین زندگی بسر
بہتر ہیں ہم سے پیار میں یہ جانور جناب ۔۔۔ کرتے ہیں ایک دوجے سے وہ پیار بے حساب
بیوی کے کہنے پر وہ ادھر دیکھنے لگا ۔۔۔ آیا اسے نظر وہاں منظر ہی دوسرا
کہنے لگا کہ غور سے تو دیکھ سر پھری ۔۔۔ [illegible] طوطی ہے دوسری

یوسف ناظم

قلمدان

صرف اس برصغیر میں نہیں بلکہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں ساری دنیا میں صرف ایک قلمدان تھا جو کسی کی دستبرد سے محفوظ تھا۔ قانون کے ہاتھ بھی جن کے متعلق مشہور ہے کہ بہت لمبے ہوتے ہیں اس قلمدان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور دوسروں کے ہاتھ لگانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا بلکہ بری نظر سے بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہماری مراد حضرت سوداؔ کے قلمدان سے ہے جو ان کے پرسنل اسسٹنٹ (پی اے) مسمی المتخلص غنچہ کی تحویل میں رہتا تھا۔ یہ قلمدان عمر بھر اسی کی تحویل میں رہا اور خود یہ غنچہ اپنے مالک کی جسے آج کل سیٹھ کہا جاتا ہے تحویل میں رہا۔ غنچہ کے درجے کا وفادار (جسے آج کل لائلسٹ (Loyalist کہا جاتا ہے) اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی پیدا نہیں ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ غنچۂ ثانی پیدا کرنے کے لیے یعنی خاک کے پردے سے پیدا کرنے کے لیے فلک کو ابھی اور کئی دن گھومنا پھرنا پڑے گا۔ وفاداری کے سلسلے میں دو تین نام اور بھی لیے جاتے ہیں جیسے کہ ایاز، بیربل اور یاقوت لیکن ان لوگوں کی وفاداریاں الگ قسم کی تھیں اور ان لوگوں کے پاس علی الترتیب ظرافت تھی اور شجاعت تھی لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی قلمدان نہیں تھا۔ محمود کے ساتھ ایاز کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ لیکن حسد کی آگ میں جلنے والوں کی زبان پہ یہی رہتا تھا کہ ایاز قدر خود بشناس۔ بیربل کو البتہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں ایک اہم شخصیت مانا جاتا تھا۔ وہ نورتنوں میں شامل نہیں تھے لیکن اکبر کے مقرب خاص تھے یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر کو بعض صورتوں میں اپنے نازل کیے ہوئے فیصلے تک بیربل کے مشورے پر بدلنے پڑتے تھے۔ وہ واقعہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ شہنشاہ اکبر نے اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ایک شخص کو پھانسی کی سزا کا حکم دے دیا اور اپنے زبانی حکم میں کہا کہ اس شخص کو پھانسی کے تختے پہ لٹکا دیا جائے۔ اس زمانے میں ایسے موقعوں پر لوگ دوڑے دوڑے بیربل کے پاس جاتے تھے اور بیربل جو وزیر نہ ہونے کی وجہ سے باتدبیر تھے اور غور و خوض کرنے کے عادی تھے۔ وعدہ کر لیتے تھے کہ جاں بخشی کے لیے کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر لیں گے۔ اور وہ واقعی یہ نکتہ پیدا کر لیتے تھے مثلاً اسی واقعے میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں جب خاطی کو جو درحقیقت خاطی نہیں تھا، پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا تو قبل اس کے کہ وہ اللہ کو پیارا ہو جاتا بیربل نے فوراً با آواز بلند کہا، رک جائیے ورنہ صرف جلاد ہی کا [illegible]

کی سانس رک گئی اور شہنشاہ اکبر جو ٹیلی وژن کے ایک سیریل کے مطابق ایسے موقعوں پر حاضر رہا کرتے تھے کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ بعد میں جب بیربل نے بتایا کہ موصوف کا حکم ادھورا تھا تو اکبر کا غصہ خوشی میں تبدیل ہو گیا اور وہ کھل اٹھے۔ اسی واقعے کے بعد عدالتوں نے پھانسی کی سزا دینے کے مخصوص الفاظ مقرر کر لیے اور فیصلے میں لکھا جانے لگا کہ پھانسی کی سزا کا عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ مجرم کا دم نہ نکل جائے جہاں تک یاقوت کا تعلق ہے وہ دنیا کا سب سے زیادہ بھروسے کا سکیورٹی گارڈ تھا۔ آج تو سکیورٹی کا یہ عالم ہے کہ وہ آدمی نظر نہیں آتا جس کی حفاظت کی جا رہی ہے دیکھنے والے صرف سکیورٹی کا دیدار کرتے اور خوش ہو لیتے ہیں کہ واہ کیا کیا اسلحہ بن گئے ہیں۔ بندوق ہو تو ایسی ہو کہ لبلبی پر انگلی رکھے بغیر چل پڑے ——— بندوق کے ذکر پر ہمیں ایک تاریخی واقعہ یاد آیا لیکن یہ یاد نہیں آ رہا ہے کہ اس واقعے میں ممدوح سکندر اعظم تھا یا نپولین بونا پارٹ بہر حال ان دونوں سپہ سالاروں ہی میں سے کوئی ایک تھا جس نے مرتے وقت اپنے آپ پر بندوقوں کا سایہ کروا لیا تھا اور میدان جنگ ہی میں جان دے دی تھی۔ آج دنیا بھر کے سربراہان مملکت ہی نہیں ان کے بھانجے بھتیجے بھی بندوقوں کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ گھر بیٹھے یہ اعزاز کسے ملتا ہے۔

ہم نے ایاز، بیربل اور یاقوت کے نام یونہی برسبیل تذکرہ لے لیے ورنہ ہم تو سودا کے اس قلمدان کا ذکر کرنا چاہتے تھے جو غنچہ کے قلمدان کے نام سے مشہور ہے۔ اس قلمدان سے لوگ ڈرتے بہت تھے بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ عہد غنچہ میں دلی کے کئی امرا اور عمائدین سلطنت نے شاہ عالم ثانی سے گزارش کی تھی کہ وہ بادشاہ وقت کی حیثیت سے سودا صاحب کو منع کریں کہ وہ ولیموں اور نذر و نیاز کی دعوتوں میں قلمدان اپنے ساتھ نہ لایا کریں۔ امرائے شہر کی شکایت یہ تھی کہ جس دعوت میں دیکھیے محمد رفیع صاحب اپنے غنچہ کو ضرور ساتھ لاتے ہیں اور غنچہ آتا ہے تو قلمدان بھی آتا ہے۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک ہے لیکن صاحب قلمدان کسی بھی بات پر ناراض ہو کر عین کھانے کے وقت ہجو لکھنے بیٹھ جاتے ہیں اور ساری دعوت غارت ہو جاتی ہے۔ شاہ عالم ثانی نے امرائے شہر کی شکایت بڑے غور سے سنی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاص الخاص مشیروں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ سودا جیسے رفیع المرتبت شاعر سے اس معاملے میں ایک لفظ بھی نہ کہیں ورنہ وہ خود ان کے قلمدان کی گرفت میں آ جائیں گے۔ شاہ عالم ثانی یوں بھی کمزور دل کے بادشاہ تھے۔ عام طور پر بادشاہ دل کے بادشاہ ہوا کرتے ہیں۔ اور شاہ عالم ثانی بھی دل کے بادشاہ تھے لیکن ان کا دل ذرا کمزور تھا۔ ان کی ہمت نہیں ہوئی کہ سودا جیسے قادر الکلام شاعر سے اس معاملے میں ہم کلام ہوں۔ کہا جاتا ہے عاجز آ کر خود امرائے شہر نے سودا کو دعوتوں میں بلانا چھوڑ دیا۔ کوئی اگر انھیں بلاتا بھی تو کہلوا دیتا کہ آپ کو تنہا زحمت کرنی ہے۔ سودا کو ناگوار تو بہت گزرتا لیکن وہ کس کس کی ہجو لکھتے۔ غزل لکھنے کے لیے تو کوئی جواز نہیں چاہیے لیکن ہجو، خاص طور پر اچھی ہجو صرف تحریک ہی نہیں جواز کی بھی طلب گار ہوتی ہے۔ سودا کا دعوتوں میں آنا جانا کم ہو گیا تو لوگوں سے ناراض ہونے کے مواقع بھی کم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک شعری سرمائے میں ان کا ہجویہ کلام کم ہے۔ سودا کی کم گوئی کی وجہ سے غنچہ کا کام بھی بڑی حد تک

ہو گیا اور باہر کی مصروفیات یعنی ایگزیکیٹو نوعیت کا کام جو اہل قلمدان کی خاص دل چسپی کا کام ہوتا ہے سب سے رہا ہی نہیں۔ وہ تو محمد رفیع سودا تھے جنھوں نے اپنی خاندانی شرافت کی بنا پر یہ قلمدان بدستور غنچے ہی کے پاس رہنے دیا ورنہ وہ شاعر ہونے کی بجائے کچھ اور ہوتے تو غنچے کی ہجو ہی کر دیتے۔
غنچہ تھا بھی بڑا ایماندار شخص۔ کیا مجال جو اس نے اس قلمدان میں سے کبھی ایک کاغذ نکال کر اپنی نجی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا ہو۔ غنچہ خود بھی شاعر تھا اور اسے شعر کہنے کی عادت تھی۔ وہ فرصت کے اوقات میں شعر بھی کہا کرتا تھا خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اپنے یہ شعر بھی اپنے ہی بیسیوں سے بندی ہوئی بیاض میں لکھتا تھا۔ (یہ الگ بات ہے کہ اس کے ملنے جلنے والوں نے ان سے کہہ رکھا تھا غنچہ بھائی اپنی یہ بیاض کسی کو دکھانا نہیں اور اپنے شعر کسی کو سنانا نہیں!) قلمدان کے فائدے کیا ہوتے ہیں یہ بات اس کے ذہن میں کبھی نہیں آئی اور اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ قلمدان الہ دین کا چراغ ہوتا ہے۔ ایسا چراغ جسے زمین پر گھسنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور بتدا اس جن کو کوئی حکم دینا پڑتا ہے جو اس چراغ کے تابع ہوتا ہے۔ یہ جن قدرتی طور پر اہل قلمدان کا مزاج داں ہوتا ہے اور یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک شریف آدمی کی ضروریات اور ضروریات پوری ہونے کے بعد خواہشات کیا ہوتی ہیں۔
اپنی نادانی اور غفلت کی وجہ سے غریب غنچہ عمر بھر غریب ہی رہا۔ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس نے نہ اپنے خستہ شکستہ گھر کی مرمت کروائی نہ داغ دوزی۔ اپنی گلی کے نکڑ پر سرکاری قندیل کا کھمبا تک نہیں لگوایا۔ دوستوں کے ساتھ کسی مشاعرے میں جاتا اور اپنی ہی گلی میں ٹھوکریں کھاتا ہوا گھر پہنچتا۔ غلطی یہ ہو گئی کہ اس قلمدان کو اپنے سر پر رکھ کر گھومتا تھا گویا قلمدان نہ ہو جنتر منتر دکھانے والی کوئی مشین ہو۔ (لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ سڑک پر چلتا تھا تو کچھ بچے ہمیشہ اس کے پیچھے دوڑتے رہتے کہ اب یہ اپنے سر کا سامان اتارے گا اور ہمیں بائسکوپ دکھائے گا۔ ہم سوچتے ہیں کہ یہ غنچہ بھی کوئی شخص تھا نہ شاعر نہ ... کم سے کم اپنا کلام ہی چھوڑ جاتا۔ تخلص بھی رکھا تو سمجھ میں نہ آئے کہ یہ شاعر ہے یا شاعرہ۔
غنچہ نے اگر اپنی زندگی میں کچھ کیا ہوتا تو آج اس کے خاندان کی ساتویں بلکہ گیارھویں پشت محل جیسی عمارت میں مقیم ہوتی اور اس گیارھویں پشت کے دیدار کے لیے عوام کا اتنا مجمع ہوتا کہ اسے قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کو آنسو گیس چھوڑنی پڑتی۔ (عوام رہتے تو ہیں ہی لیکن ان کے آنسو بھی تو نکلنے چاہییں)
قلمدان کے جن کبھی کبھی سفلی عمل بھی کر دیتے ہیں۔ یہ عمل بھی صاحب قلمدان کی پشت ہی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چہرے پر بھی اثر پڑتا ہوگا۔ لیکن ایسے موقعوں پر چہرہ دکھایا نہیں جاتا۔ □□

رؤف رحیم (حیدرآباد)

غزل

غزل اخبار میں میری چھپی ہے ؛ مگر تصویر اس میں اور کی ہے
یہ کرسی بھی کسوٹی ظرف کی ہے ؛ خسر داماد میں تک ٹھن گئی ہے
غزل جب آپ جیسوں نے کہی ہے ؛ غزل کی ایسی تیسی ہو گئی ہے
مرے دل میں جگر میں بس گئی ہے ؛ وہ معشوقہ جو سونے کی چھڑی ہے
کہاں اہلِ مروت کی کمی ہے ؛ غزل اپنی کہاں پھیکی پڑی ہے
سیاہی دل کی تم اب تو نکالو ؛ کہ بالوں میں سفیدی آگئی ہے
میں پکا جانشین استاد کا ہوں ؛ غزل استاد سے میری لڑی ہے
ترنم کی وبا پہنچی یہاں تک ؛ صدا کے ساتھ سازوں کی کمی ہے
غزل سگریٹ کی ڈبی میں لے لو ؛ رحیم آسان اپنی شاعری ہے

شبنم کالسواری

گیا۔ گیا۔ گیا

محبت کے چکر میں جو پھنس گیا ؛ یہ سمجھو کہ وہ کام سے بس گیا
اترتا گیا زیرِ پاتال وہ ... ؛ محبت کی دلدل میں جو دھنس گیا
اکڑ کے گیا تھا جو اُن کی طرف ؛ وہ لٹکائے گردن کو واپس گیا
اُسے دیکھوں روتا ہوا ایک دن ؛ جو ناکامیوں پہ میری ہنس گیا
تیرے وعدے کی عیدبانی ہے اب ؛ دیوالی گئی اور کرسمس گیا
یہ چوسے ہوئے آم سے گال ہیں ؛ وہ سب گوشت گھلا وہ سب رس گیا
پنپ کب سکا کاروبارِ شباب ؛ ہوا عشق ناکام بزنس گیا
وہ بس کا ڈرائیور تھا پر عشق میں ؛ حسینہ کے در سے وہ بے بس گیا
وہ سیکرٹری ہوگئی باس کی ؛ وہ بے چارہ میری کا تھامس گیا
میرے دوست نے پی میری سگریٹیں ؛ وہ جاتے سمے لے کے ماچس گیا
جوانی میں ہوتے نہ تھے ٹس سے مس ؛ بڑھاپے میں ٹس رہ گیا مس گیا
ریٹائر ہوئے اور پنشن بھی لی ؛ جو ڈیوٹی کا ہیٹر تھا وہ گھس گیا
اُدھر ماں سے لے کر گیا پانچ وہ ؛ اِدھر لے کے مجھ سے بھی وہ دس گیا
پراگندہ بچوں کے اخلاق ہیں ؛ وہ پاکی گئی وہ تقدس گیا
محبت کا سر سے جب اُترا بخار ؛ تو وہ جوش اور وہ تجسس گیا
کہاں جائیں شبنم کر بیٹھے یہ دل ؛ شہر میں جو آیا تھا سرکس گیا

پروفیسر [illegible] اللہ مہدی

یک نہ شد......

کہاوت ہے کہ جہاں ایک سے دو برتن اکٹھے ہوں وہاں ٹکراؤ بالفاظ دیگر دھکا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ازدواجی مورچے پر اس ٹکراؤ کے نتیجے میں برتنوں کو عموماً کم سے کم اور شوہروں کو خصوصاً زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے بلکہ بعض اوقات اتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے کہ ریپیرنگ (REPAIRING) کے لیے ورکشاپ عرف اسپتال پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی شری چرنجی لال کشمش آنجہانی ہیں گذشتہ سال ہی بے چارے آئے دن اپنی دھرم پتنی عرف مسز چرنجی لال کی برتن پھینک مشق عرف ڈسکس تھرو پریکٹس (DISCUSS THROW PRACTICE) کا نشانہ بنتے رہتے ہیں نتیجتاً گھر میں کم اور اسپتال میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی ان کی عیادت کو جاتا ہے اس کے آگے یہی رونا روتے ہیں "اگر اوپر والے کو میری موجودہ پتنی کے تعلق سے کوئی کمپرومائز (COMPROMISE) نہیں کرنا تھا تو کم از کم ہم دونوں کو اس زمانے میں پیدا کیا ہوتا جب لوگوں کو زرہ بکتر پہننے کی آزادی حاصل تھی" موصوف کا خیال ہے کہ زرہ بکتر پانی پت کی تمام جنگوں سے زیادہ روز مرہ کی خانہ جنگیوں کے لیے مفید ہے اور اس کی ایجاد یقیناً بیوی کے ستائے کسی مظلوم شوہر ہی نے کی ہے۔

ہو سکتا ہے شری چرنجی لال کشمش کا یہ خیالی مقولہ ان کے اپنے دل کا جلا پھپھولا ہو تاہم شوہروں کی عالمی برادری اس سے سو فیصدی اتفاق کرتی ہے کہ شوہر چاہے دبنگ ہو یا دبیل، دھاکڑ ہو یا لاغر، جلاد ہو یا فریاد زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر بیوی کے عتاب کی زد میں ضرور آتا ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ عشق کی یہ چوٹ کوئی اپنے سینے پر سہتے ہوئے سہتا ہے تو کوئی نالہ و شیون کرتے ہوئے بسورتے ہوئے پیٹھ پر سہارتا ہے۔ ازدواجی جھگڑوں یعنی خانہ جنگیوں میں عموماً ہتھیاروں کی تقسیم بڑے انوکھے ڈھنگ سے عمل میں آتی ہے۔ بیویوں کی دسترس میں بالعموم مختلف سائز کے ظروف عرف برتن بھانڈے اور شوہروں کی جھولی میں صرف ظرف آتا ہے ظاہر ہے جب مقابلہ کا ظرف اور ظروف کے مابین ہو تو عشق کی ہر چوٹ سے ابھرنے والی آواز ایک سی نہیں ہو سکتی بقول شاعر :

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں ۔ ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

شوہروں کی اکثریت کی یہ فطرت دیکھ کر ہم ان نوجوانوں کو جو تاحال کنوارے ہیں بغیر فیس کے یہ مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو کسی صورت ایک سے دو نہ ہوں اور اگر غلطی سے یک نہ شد دو شد ہو گئے تو کوشش اس بات کی

کریں کہ پھر سے ایک ہو جائیں۔ خیال رہے کہ یہ کوشش جوانی ہی میں بارآور ہونی چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ جوانی کی کوشش کا پھل بڑھاپے میں ہاتھ لگے۔ جب کہ اس کا مزہ چکھنے کے لیے نہ تو منہ میں دانت باقی رہتے ہیں نہ پیٹ میں آنت حال ہی میں ایسے ہی ایک پوپلے جوڑے سے ہم مل چکے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ ہم ایک ہوٹل میں ایسی میز پر بیٹھے تھے جو فیملی کیبن سے لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ کیبن کے اندر ہونے والی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔ پہلے پوپلی مردانہ آواز اُبھری۔

"تمہیں میرے سر کی قسم پہلے تم کھانا تناول فرماؤ"۔

جواب میں پوپلی زنانہ آواز سنائی دی۔

"نہیں میرے سرتاج، نہیں میری جان کی قسم پہلے تم کھاؤ"۔

اس کے بعد کافی دیر تک پہلے آپ، پہلے آپ کی تکرار ہوتی رہی اور اس سے پہلے کہ پہلے آپ پہلے آپ کے چکر میں گاڑی چھوٹ جاتی، اچانک بڑے میاں کی پوپلی مگر فیصلہ کن آواز اُبھری۔ "ایک ترکیب آئی ذہن میں بیگم پہلے میں تمہیں ایک نوالہ کھلاتا ہوں اپنے ہاتھ سے پھر تم مجھے ایک نوالہ کھلاؤ اپنے ہاتھ سے اس طرح ہم دونوں ایک ساتھ کھانے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

پھولی ہوئی سانسوں کی لے پر ہونے والی اس گفتگو میں پوپلی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ بوڑھا جوڑا قبر کے دہانے تک پہنچ چکا ہے لیکن اس کے باوجود باہمی محبت میں کمی نہیں آئی ہے، ان دیکھے ہی ہمیں اس جوڑے پر رشک ہونے لگا چنانچہ جیسے ہی دونوں میاں بیوی لکڑی ٹیکتے ہوئے کیبن سے باہر نکلے ہم نے ان کے آگے سرتسلیم خم کرتے ہوئے کہا "میں آپ دونوں کی بے لوث محبت کو سلام کرتا ہوں، عمر طبعی کو پہنچ کر تو میاں بیوی اکثر ایک دوسرے کو کھانے دوڑتے ہیں اور آپ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ سے نوالہ بنا بنا کر کھلاتے ہیں۔ آفریں ہے"۔

بڑے میاں نے برا سا منہ بنا کر پوپلے منہ سے جواب دیا "تمہیں شاید غلط فہمی ہوگئی ہے برخوردار۔ تم جسے محبت سمجھ رہے ہو وہ محبت نہیں مجبوری ہے"۔

مجبوری! ہم نے حیرت سے دُہرادیا۔

بولے "ہاں مجبوری، دراصل ہم دونوں کے بیچ ایک ہی بتیسی ہے" اتنا کہہ کر بڑے میاں نے کوٹ کی جیب سے مصنوعی دانتوں کا ایک سیٹ نکال کر دکھایا اور ہم تصویر حیرت بنے اس انوکھی محبت کے بارے میں سوچتے رہے جو مصنوعی دانتوں کے سیٹ میں سمٹ آئی تھی! گویا کبھی جن بتیس دانتوں کے بیچ صرف زبان ہوا کرتی تھی محبت کی شامت اسے بھی دانتوں کے شکنجے میں لے آئی ہے۔ سچ ہے جب ابتداء میں دو اجنبی ازدواجی بندھن میں بندھتے ہیں تب اس بندھن کو محبت کا نام دیا جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ محبت کی جگہ مجبوری لے لیتی ہے، مجبوری جس کا دوسرا نام ہے مصنوعی بتیسی، خیر یہ بھی غنیمت ہے کہ مشرقی ممالک کے جوڑے کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے سے بندھے تو رہتے ہیں جب کہ مغربی ممالک کے جوڑوں کے بارے میں سنا ہے کہ اس مجبوری سے بھی محروم ہیں بلکہ ازدواجی زندگی، جو کبھی ایک عمر پر محیط ہوا کرتی تھی اب مغربی سوسائٹی میں اس کا عرصہ حیات اس قدر تنگ ہو گیا ہے کہ عمر بھر کا ساتھ گھنٹوں، منٹوں اور سکنڈوں کے ساتھ تبدیل ہو گیا ہے تاہم بعض مغربی جوڑوں کی ازدواجی زندگی کی مدت کسی قدر طویل ضرور ہوتی ہے لیکن اس طوالت کی وجہ باہمی محبت و رفاقت نہیں بلکہ وہ زائد مصروفیات ہوتی ہیں جن میں یہ جوڑے اس قدر اُلجھے ہوتے ہیں کہ میاں بیوی ہفتوں بلکہ مہینوں ایک دوسرے

سے نہیں مل پاتے اور ظاہر ہے ایک سے دو ہونے کے باوجود جب میاں بیوی مل ہی نہ پائیں تو پھر یک نہ شد دو شد والی دُعا کا سوال ہی پیدا ہوگا اور نہ ہی ازدواجی تعلق ختم شدہ ہوگا گویا تعلق برقرار رکھنے کے لیے بے تعلق پہلی اور آخری شرط ہے ایسے ہی بے تعلق جوڑوں کے متعلق اکبر الٰہ آبادی برسوں پہلے فرما گئے۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں ؛ حجاب ان کو نہیں آتا، انہیں غصہ نہیں آتا

یک نہ شد دو شد کا سلسلہ کا رجحان درازیٔ کی طرح خاصا دراز ہے کہ گھر گرہستی ادب سیاست، ثقافت، صحافت فلم، علم مذہب کوئی بھی شعبہ حیات اس کی دسترس سے محفوظ نہیں، یہاں محض ایک ہی مثال کافی و شافی ہوگی، ایک بار مولانا اپنے وعظ میں لوگوں کو عذاب قبر سے ڈرا رہے تھے کہ اے نافرمان لوگو! ڈرو اس وقت سے جب تمہارے مُردہ جسم کو تمہارے اپنے بڑی بے دردی سے قبر کی تہوں میں دفنا کر تم پر مٹھیوں سے مٹی ڈالیں گے بقول شاعر

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن ؛ اور زندگی بھر کی دعاؤں کا صلہ دینے لگے۔

دوستوں کے اس ستم کے بعد قبر میں منکر نکیر تمہاری پرسش کو پہونچیں گے!

واعظ محترم نے جیسے ہی منکر نکیر کا حوالہ دیا، مجلس میں سے کسی نے بے ساختہ کہا "منکر نکیر یعنی کہ ایک ساتھ دو فرشتے ہمارا انٹرویو لینے گے گویا قبر میں بھی یک نہ شد دو شد!!!"

بات خود بخود قبر اور عذاب قبر تک پہنچ گئی ہے تو ذرا اور آگے بڑھیں اور اس مظلوم شوہر کا احوال سنیں جو کسی طرح جنت کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ متعلقہ فرشتے نے داروغہ جنت سے سفارشی لہجے میں کہا "داروغہ صاحب یہ بے چارا شوہر بڑا دکھی پریم نگری ہے، بیوی کا ہر ستم اس نے چپ چاپ برداشت کیا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی نیکی ہے جس کی بناء پر اسے جنت میں داخل کیا جا سکتا ہے"۔ اس سے پہلے کہ داروغہ جنت کوئی فیصلہ صادر فرماتے، شوہر دل کی لمبی چوڑی قطار میں سب سے پیچھے کھڑے ہوئے ایک عدد شوہر بھاگتے قطار کو توڑ تاڑ کے آگے بڑھ آئے اور داروغہ جنت سے بولے "داروغہ صاحب محض بیوی کے ستم سہنے کی وجہ سے اگر اسے جنت میں داخل کیا جا رہا ہے تو اس سے پہلے مجھے جنت میں داخل کیجیے کیوں کہ میں نے ایک ساتھ دو دو بیویوں کے دہرے ستم سہے ہیں داروغہ صاحب جب تک میں اس دنیا میں رہا گندم کے دانے کی طرح چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستا رہا، جس کی حالت دیکھ کر سنت کبیر داس بھی رو پڑے تھے یہ کہتے ہوئے

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے ؛ دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

سچ کہتا ہوں، دو پاٹن کے بیچ میں پسنے کی پاداش میں مجھے جنت میں داخلہ ضرور ملنا چاہیئے اس اجمال کی تفصیل سننے کے بعد داروغہ جنت نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "نادان! جنت میں بے وقوفوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ ایک بار غلطی کرنے کے باوجود تجھے عقل نہیں آئی اور تو نے دوبارہ وہی غلطی دہرائی، تیری اس یک نہ شد دو شد والی حماقت پر تجھے دوزخ کا ایندھن بننے سے کوئی نہیں بچا سکتا"۔ یہ تو خیر ایک لطیفہ تھا لیکن طرفہ تماشا ملاحظہ فرمایئے ایک نہ شد دو شد کی جس حماقت پر آپ ہم سبھی ایک دن پکڑے جائیں گے وہ سلسلہ شروع بھی تو اسی جنت سے ہوا تھا، کتنے اچھے دن تھے جب باوا آدم بالکل اکیلے تھے۔ تو زندگی کے جھمیلے نہ دکھوں کے ریلے تھے لیکن جیسے ہی باوا آدم اور ماں حوا ایک دوسرے کے ہوئے جنت سے بے دخل ہوئے اور پھر یک نہ شد دو شد پر ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ آدم تا ایں دم کا کارواں یک نہ شد دو شد کی گردان کرتا ہوا چلا آ رہا ہے اور نہ جانے کب تک دم میں دم ہے جب تک یہ سلسلہ جاری رکھے گا۔
نہ تھا کچھ تو خدا تھا، نہ ہوتا کچھ تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔

ڈاکٹر محبوب راہی
(بارسی ٹاکلی)

بڑے گھر کا داماد

مٹ گیا جو ورثہ اجداد ہوں ایک مفلس باپ کی اولاد ہوں
مبتلائے تہمت بیداد ہوں صید ہوں آپ اپنا ہی صیاد ہوں
میں کہ اک مجموعۂ اضداد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

بے نوا ہوں بے کس و مجبور ہوں شدتِ رنج و الم سے چور ہوں
غمزدہ ہوں بے بس و معذور ہوں قید ہوں محبوس ہوں محصور ہوں
کون کہتا ہے کہ میں آزاد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

اُس زمیں اُس آسماں سے کٹ گیا میں جہاں کا تھا وہاں سے کٹ گیا
بزم ہائے دوستاں سے کٹ گیا اپنے اہلِ خانداں سے کٹ گیا
کوچۂ اغیار میں آباد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

ایک دن میں بھی تھا شجر پُر بہار تھا کبھی میرے بھی جذبوں پر نکھار
زندگی سے تھا کبھی مجھ کو بھی پیار میرا بھی زندہ دلوں میں تھا شمار
اب تو بس اک بھولی بسری یاد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

گھر میں یا وہ رہیں چوپال پر ہے نظر میری خسر کے مال پر
ناز ہے مجھ کو مری سسرال پر لوگ کیوں ہنستے ہیں میرے حال پر
ان کو کیا میں شاد تھا شاد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

ساس میری اور میری سالیاں مجھ کو دیتی ہیں ہمیشہ گالیاں
ہنستی ہیں سن کر محلے والیاں اور بچے پیٹتے ہیں تالیاں
جیسے میں مجنوں ہوں یا فرہاد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

جی میں آتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ دوں سارے رشتے سارے ناتے توڑ دوں
حال کو ماضی سے اپنے جوڑ دوں زندگی کو پھر نیا اک موڑ دوں
ہائے لیکن صاحبِ اولاد ہوں اک بڑے گھر کا میں گھر داماد ہوں

دیکھتا تھا خواب شاہی ٹھاٹ کا ہوں نہ گھر کا اور نہ ہی گھاٹ کا
جیسے ٹکڑا ہو پرانے ٹاٹ کا یاں یا جیسے شکستہ کھاٹ کا
بے وطن ہوں خانماں برباد ہوں اک بڑے گھر کا میں داماد ہوں

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (پٹنہ)

کچھ اپنے بارے میں

یوں کہ زندگی کے مدرسے میں ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اپنا بیان اگر پروفیسروں کے تذکرے سے شروع کروں ۔کیا حرج ہے ؟ دس بیس سال پہلے تک پروفیسر ان لوگوں کو سمجھا جاتا تھا جن کے سر پر بال بہت کم اور آنکھوں میں روشنی اس سے بھی کم ہوتی تھی مگر آج کل ہر وہ شخص جو ایم اے پاس کر جاتا ہے خود کو کسی پروفیسر سے کم نہیں سمجھتا بلکہ بعض لوگ تو ایم اے پاس کرنے سے قبل ہی پروفیسر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے پروفیسروں میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی ہے جو کسی عارضی درس گاہ میں ملازمت ملتے ہی خود کو مستقل طور سے پروفیسر لکھنا اور لکھوانا پسند کرتے ہیں اور کیوں نہ پسند کریں جب کہ بقول شخصے ان میں اور پروفیسروں ںمیں بس اتنا ہی فرق ہے جتنا ماہِ نو اور بدر کامل میں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ ماہ نو اور بدر کامل کے معنی بھی نہیں جانتے۔ ایسے پروفیسروں کے بارے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ملازمت کے عام اصولوں کے برعکس ہر تقرری کے بعد ان کی مالی حالت خراب اور ادارے کی اچھی ہوتی جاتی ہے مگر یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ فی الحال میری گفتگو کا موضوع پروفیسروں کی وہ قسم ہے جو جانے مانے تعلیمی اداروں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر کی مالی حالت تعلیمی صلاحیت سے بہتر ہوتی ہے۔ ان میں بھی بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو لکچرر یا ریڈر وغیرہ ہوتے ہیں مگر عرف عام میں پروفیسر ہی کہے جاتے ہیں۔ البتہ کچھ لوگ ضرور ایسے ہوتے ہیں جو واقعی پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بدخواہوں نے طرح طرح کی باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ آیئے ذرا ان باتوں کا جائزہ لیں۔

سب سے بڑی اور بُری بات یہ کہی جاتی ہے کہ پروفیسر مطالعہ نہیں کرتے۔ لائبریری نہیں جاتے اور کلاس نہیں لیتے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں پروفیسروں کی نیت سے زیادہ ان کی مشغولیت کا قصور ہے۔ ظاہر ہے کہ پڑھ لکھ کر آدمی کل بھی خراب ہو جاتا تھا اور آج بھی خانہ خراب ہوتا ہے یعنی پروفیسر بن جاتا ہے، مگر پروفیسر بننے کے بعد کچھ تو مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا جیسی صورت سامنے ہوتی ہے اور کچھ فرصت نہیں رہتی کہ دن رات دوسرے مشاغل چین نہیں لینے دیتے۔ میرے ایک پروفیسر دوست نے مجھے بتایا کہ ہفتے کے سات دنوں میں ایک اتوار بچتا ہے جس میں کوئی وائیوا ، انٹرویو، سمینار وغیرہ نہیں ہوتا اس لیے وہ آدھا دن مختلف بل بنانے میں اور آدھا ٹی وی

دیکھنے میں لگاتے ہیں۔ اب بھلا مطالعہ کس وقت کیا جائے؟ ایک خاتون پروفیسر نے کچھ اور ہی وجہ بتائی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "میڈم! آپ لائبریری کیوں نہیں جاتیں"؟ کہنے لگیں۔ "وہاں جا کر کیا کروں گی؟ وہاں تو پانیر بالکل منع ہے۔"

اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ پچھلے سال جنوری کے آخری ہفتے میں ایم اے کے امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ ایک میٹنگ کے دوران طالب علموں میں غلطی سے کچھ لکھنے پڑھنے کی بات چل پڑی۔ ایک پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ انھوں نے عذرِ گناہ کے طور پر کہا۔ "کیا کہوں، میں۔ پچھلے ایک ماہ سے کچھ لکھ ہی نہیں پایا۔ لیٹر پیڈ ہی نہیں ہے۔"

ایک دور اندیش طالب علم نے دوسرے ہی دن پروفیسر صاحب کو دو رنگوں میں چھپا ہوا لیٹر پیڈ لا کر دیا۔ پروفیسر موصوف بے حد خوش ہو کر کہنے لگے۔

"یہ بات ہوئی، بس اب میں کل سے لکھنا پڑھنا شروع کرتا ہوں۔"

ایک سال پلک جھپکتے گزر گیا اور اس سال جنوری میں ایک بار پھر ایم اے کے امتحانات کا موسم آیا تو اساتذہ اور طلبہ جمع ہوئے۔ اب تک پروفیسر موصوف کا کوئی مضمون نہ کہیں چھپا تھا نہ نشر ہوا تھا مگر بات چیت کے دوران انھوں نے انکشاف کیا کہ پچھلے ایک ماہ سے لیٹر پیڈ پھر ختم ہے۔ میں بے حد حیران ہوا اور بڑی مشکلوں سے انھیں بولنے پر آمادہ کیا تو بتانے لگے کہ کل پانچ سو لیٹر پیڈ ملے تھے۔ دو سو مختلف امتحانات کے سلسلے میں سفارشی خطوط لکھنے میں خرچ ہوئے اور ایک سو رسالوں اور اخباروں کو خط لکھنے میں جو مفت اپنا پرچہ بھیجتے رہتے ہیں۔ پچاس عدد طالب علموں کو کیریکٹر سرٹیفکٹ دینے میں ضائع ہوئے اور پچاس سے ٹی نار، والوا وغیرہ کے سلسلے میں خط و کتابت کرنے میں صرف ہوئے۔ بقیہ ماہانہ آمد و خرچ کے حساب اور چھٹیوں کی درخواست لکھنے میں لگ گئے۔ اب آدمی کسی رسالے کو مضمون بھیجنا چاہے تو لیٹر پیڈ کہاں سے لائے؟

بات یہ ہے کہ پروفیسر ہو جانے کے بعد مضمون لکھنے یا چھپوانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ تو ایک ماڈرن حقیقت ہے کہ ہر پروفیسر صاحب قلم ہوتا ہے۔ جس دن وہ پروفیسر ہو جاتا ہے مستند ادیب بھی ہو جاتا ہے اور جس دن سے صدر شعبہ بن جاتا ہے اسی دن سے مایہ ناز ادیبوں، شاعروں اور نقادوں میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے۔ ہر ادبی جلسے میں اس کی حاضری لازمی تصور کی جانے لگتی ہے۔ ہر درجے میں اس کی تحریر کردہ بلکہ زیادہ تر تالیف شدہ کتابیں داخلِ نصاب ہو جاتی ہیں اور خاص طور پر ایم اے کے طالب علموں کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ میر، غالب اور انیس کے ساتھ صدر شعبہ کا بھی شجرۂ نسب یاد رکھیں۔ اب ظاہر ہے کہ جتنے دن وہ پروفیسر اور صدر شعبہ رہے گا، اتنے دنوں تو ادبی دنیا کے افق پر روشن ستارے کی طرح جگمگاتا ہی رہے گا اور پھر ساری زندگی تو کوئی بھی سرخیوں میں نہیں رہتا۔ پھر گلہ کس بات کا؟!

پروفیسروں پر یہ الزام بھی ہے کہ وہ امتحانات میں سفارش پر نمبر دیتے اور دلواتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے ایک بے حد ایماندار دوست سے بات کی تو بیچارے نے اپنے ساتھ گزرا ہوا واقعہ سنایا۔ پچھلے دنوں ایک طالب علم ڈرتے ڈرتے ان کے پاس آیا اور اپنے ساتھ دس کلو چینی اور ایک ڈبہ خالص گھی بھی لایا۔ انھوں نے ناراضگی ظاہر کی تو کہنے لگا کہ گاؤں سے آتے وقت تحفے کے طور پر یہ چیزیں لے آیا تھا، اس لیے قبول کر لی جائیں۔ بہرحال جب انھوں نے دونوں چیزیں

گھر میں بھجوادیں تو اس نے ایک رول نمبر دیتے ہوئے کاپی میں پچھتر نمبر دینے کی سفارش کی۔ ہمارے ایماندار دوست نے کاپی نکال کر دیکھی تو وہ چالیس نمبر سے زیادہ کی مستحق نہ تھی۔ پھر بھی لڑکے کے بہت اصرار پر انھوں نے ساٹھ نمبر دینے کا وعدہ کرلیا۔ اس کے باوجود وہ لڑکا اپنی جگہ پر کھڑا رہا تو انھوں نے پوچھا ــــ "اب کیا بات ہے"؟
وہ لڑکا ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:

"کچھ نہیں سر! ساٹھ ہی نمبر دے دیجیے گا مگر چینی رکھ لیجیے اور گھی واپس کر دیجیے"۔

پروفیسر صاحب یہ واقعہ سنا چکے تو میں نے ان کی ایمانداری کی تعریف کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی:

"لیکن جناب! آپ نے اسے دونوں ہی چیزیں کیوں نہ واپس کر دیں"؟ کہنے لگے:

"جی وہ ایسا ہے کہ صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے"۔

پروفیسروں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ کسی جلسے میں پچاس منٹ سے کم نہیں بول سکتے، چونکہ انھیں ایک پیریڈ پڑھانے کی عادت ہوتی ہے اور پیریڈ پچاس منٹ ہی ہوتا ہے۔ مگر میں اس بات کو غلط سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے کئی بار اپنے دوست پروفیسروں کو جلسے کے اختتام پر صرف چالیس منٹ میں حاضرین کا شکریہ ادا کرتے دیکھا ہے۔

پروفیسروں کی غریبی کا بھی اکثر تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ بعض ماہرین تو لفافہ دیکھ کر ہی خط کا مضمون سمجھ جاتے ہیں یعنی کسی چیز کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کا تعلق پروفیسروں سے ہے اس سلسلے میں میرے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آیا۔ میں اپنی اسکوٹر بنوانے کے لیے ایک مستری کے یہاں پہنچا تو اس نے پہلے میری وضع قطع کو دیکھا پھر اسکوٹر کا غور سے جائزہ لیا اور کہنے لگا:

"آپ یہ اسکوٹر اپنے کسی پروفیسر دوست سے مانگ کے لائے ہیں کیا"؟

بہرحال، یہ قصہ تب کا ہے جب نظیر اکبرآبادی جیسے لوگ غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے اور "مفلسی" جیسی نظمیں لکھتے تھے۔ اب پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہ طلبہ محسوس کرتے ہیں۔ نہ پروفیسر، اس لیے پروفیسر اخبار نکالتے ہیں اور سیاست لڑاتے ہیں اور مالا مال ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک پروفیسر سے پوچھا:

"بھائی! تمہارا کام تو دوسرا ہی ہے، تم یہ اخبار وغیرہ کیوں نکالتے ہو"؟
کہنے لگے: "گاندھی جی بھی تو اخبار نکالتے تھے"۔

میں نے کہا۔ "گاندھی جی تو ایکتا کے لیے مرن برت بھی رکھتے تھے۔ دیش کی بھلائی کی خاطر پد یاترا بھی کرتے تھے اور ....." وہ میری بات کاٹ کر بولے "لیکن میں گاندھی جی تھوڑے ہی بننا چاہتا ہوں"؟

اپنے ملک میں یہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ ہر آدمی "کچھ نہ کچھ" بننا چاہتا ہے مگر اسے پوری طرح یہ بھی پتا نہیں کہ آخر وہ کیا بننا چاہتا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ "چوں چوں کا مربّہ" بن جاتا ہے اور سیاست کے دسترخوان کی زینت بڑھاتا ہے خیر یہ الگ مسئلہ ہے، بات پروفیسروں کی ہو رہی تھی جن کی غائب دماغی کے قصے بھی مشہور ہیں اور بڑی حد تک درست ہیں۔ ایک پروفیسر کا واقعہ تو خود میرا دیکھا ہوا ہے وہ کلاس میں حاضری لے رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سگریٹ بھی پیتے جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد حاضری ختم ہو گئی اب وہ قلم جیب میں ڈالنا چاہتے تھے اور سگریٹ پھینک کر لکچر شروع کرنا چاہتے تھے۔ خدا جانے کیا بات ہوئی کہ جلتی ہوئی سگریٹ انھوں نے جیب میں ڈال لی اور قلم باہر پھینک کر لکچر شروع کر دیا پھر

چند ہی لمحوں بعد شیروانی کے جلنے کی بو کمرے میں پھیلی تو اِدھر اُدھر دیکھ کر فرمانے لگے:

"کہیں سے کچھ جلنے کی بو آرہی ہے۔"

ایک اور واقعہ جو میرے دوست نے سنایا، وہ بھی خاصا پُرلطف ہے۔ ایک پروفیسر اور صدر شعبۂ امتحان کے کمرے میں پہنچے تو سارے لڑکے چوری کر رہے تھے۔ بہت ناراض ہوئے اور لڑکوں کو بُرا بھلا کہنے لگے پھر دوسرے کمرے میں گئے تو لڑکے بہت ایمانداری سے لکھ رہے تھے (شاید انھیں پہلے ہی پروفیسر صاحب کے آنے کی خبر ہوگئی تھی) اب پروفیسر صاحب غصّے، خوشی اور غائب دماغی کی ملی جلی کیفیت میں کہنے لگے "شاباش الو کے پٹھو، بہت اچھا لکھ رہے ہو۔"

پروفیسروں کی غائب دماغی کے سلسلے میں یہ سنگین واقعہ بھی کافی مشہور ہے کہ ایک پروفیسر کسی یونی ورسٹی میں وائوا لینے گئے اور ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی انھوں نے مینیجر سے درخواست کی کہ ان کا کمرہ بدل دیا جائے۔ مینیجر نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے:

"اس کمرے میں بہت چھوٹا آئینہ لگا ہوا ہے جس میں صرف چہرہ نظر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں کل رات کو فُل پینٹ پہنے بغیر ہی بازار چلا گیا۔"

بہرحال، یہ باتیں بھی پُرانی ہیں۔ اب تو یہاں اُردو فارسی کے ہی کچھ پروفیسر ہیں جو کلیاتِ اقبالؔ اور دیوانِ حافظ کے مجاور بنے ہوئے ہیں ورنہ پروفیسروں کی حاضر دماغی اپنے دورِ شباب میں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کس محفل میں کس صاحبِ اقتدار سے قریب رہنا ہے، کس کو نظرانداز کرنا ہے، کیسے زیادہ سے زیادہ جلسوں کے دعوت نامے حاصل کرنے ہیں، کیسے کم سے کم محنت کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا ہے، کیسے چھوٹی سی نیکی کر کے بڑے بڑے اخباروں میں نام چھپوانا ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد کسی مالدار بورڈ یا کارپوریشن کا چیرمین بن جانا ہے۔

نئے زمانے میں پروفیسر حاضر دماغ ہی نہیں حاضر جواب بھی ہوگئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض طلبہ و طالبات کی تیزی کے آگے ان کی بولتی بند ہوجاتی ہے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ میرے ایک ہم عمر پروفیسر جو کئی دنوں سے ایک خوبصورت طالبہ سے بات کرنے کی کوشش میں اس کے باڈی گارڈ بنے ہوئے تھے، اسے تنہا کھڑا دیکھ کر کہنے لگے:

"آپ کی ہنسی بے حد دلکش لگتی ہے۔"

وہ طالبہ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی:

"بات یہ ہے سر، کہ میں اس کے لیے روزانہ ایک گھنٹہ مشق کرتی ہوں۔"

پروفیسر موصوف نے بات آگے بڑھانے کے لیے کہا:

"اگر یہی وقت آپ اپنی پڑھائی پر صَرف کرتیں تو..."

وہ طالبہ بات کاٹ کر کہنے لگی:

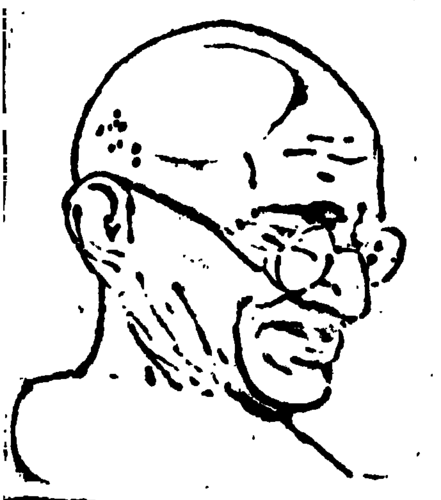
"آپ میری طرف ایک دن بھی رُخ نہ کرتے۔"

اسی طرح کا ایک پُرلطف قصّہ اور یاد آرہا ہے۔ ایک پروفیسر صاحب اپنے شاگردوں سے کہنے لگے:

"تم میں سے جو لوگ بے وقوف ہوں کھڑے ہوجائیں۔"

تھوڑی دیر بعد ایک لڑکا کھڑا ہوگیا۔ پروفیسر صاحب نے اس سے پوچھا "کیا تم بے وقوف ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا:
"نہیں سر! مگر آپ اکیلے کھڑے ہوئے اچھے نہیں لگتے"
میرا خیال ہے کہ آپ میری دماغی صحت کے بارے میں ضرور فکرمند ہوں گے کیوں کہ میں نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ کہنے کی جگہ پروفیسروں کے بارے میں ہی سب کچھ کہا ہے۔ آپ کی تشویش درست ہے لیکن کیا اب تک اپنے گھر کے بھیدی کو نہیں پہچانا؟ تب تو میں آپ کو بھی پروفیسری بن جانے کا آشیرواد دوں گا۔ ■■



میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے چاروں طرف
دیواریں ہوں اور کھڑکیاں بند ہوں میں چاہتا
ہوں کہ سب ملکوں کی ثقافتوں کی ہوائیں زیادہ
سے زیادہ آزادی کے ساتھ یہاں گھومتی رہیں
لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرے پاؤں اُن
میں سے کسی لہر سے اکھڑیں۔

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کا 126 واں یوم پیدائش
2 اکتوبر 1995ء

بانو سرتاج چندراپور (مہاراشٹر)

تندوری مُردہ

کچھ دنوں پہلے تک کھانے میں ہماری پہلی پسند تندوری مُرغا تھی. مہینہ پندرہ دن میں یا تو اپنے گھر کے اوون میں ہم تندوری مُرغا تیار کر لیتے یا بازار سے خرید لاتے. ہمارا یہ شوق یا چٹورا پن نیا نہیں تھا. بڑی طویل کہانی ہے اس شوق کی.......

ہماری دادی جان کو مرغیاں پالنے کا جنون تھا. پوری پلٹن بستی گھر میں... گھر میں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا. مہمان نوازی کے نام پر افرادِ خاندان کا ذوقِ طعام دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا. تندوری مرغے سے کم پر تو کوئی کھانے کی بات ہی نہیں کرتا تھا. سہاگ رات کو ہماری بیگم نے جب ہماری پسند ناپسند معلوم کرنی چاہی تو کھانوں کی فہرست میں تندوری مُرغا سب سے اوپر تھا.

ہم تندوری مرغا کھانے ہی میں نہیں، پکانے میں بھی ماہر ہیں. کئی مقابلوں میں ہمارا "تندوری" مُرغا پہلے انعام کا حقدار قرار پا چکا تھا. کچھ دادی جان کی عنایت، کچھ دوستوں کی مہربانی سے یہ ایک ایکسٹرا کوالی فی کیشن ہم نے حاصل کر لی تھی... مگر آج... آج یہ حال ہے کہ تندوری مرغے کے نام سے ہمیں بخار چڑھ آتا ہے کیوں کہ اس نام کے آتے ہی تصوّر کسی "تندوری مردے" کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے—!

ہم تو یہ نہیں جانتے (نہ جاننا چاہتے ہیں) کہ بنانے والے نے جو تندوری مُردہ بنایا اُس کے پیچھے کیا محرکات تھے... مگر پچھلی بار ہم نے جو مُرغا (تندوری) بنایا اس کے پیچھے جو وجوہات تھیں، اُن کی تفصیل دے کر صفائی ضرور پیش کرنا چاہیں گے.

"کپتان" تھا اس کا نام. ایسا نہیں تھا کہ ہم نے اسے اُس کے حصّے کا پیار نہیں دیا. ارے صاحب! ہم نے ٹوٹ کر اُسے چاہا تھا. (مرغے مرغیوں سے محبت کرنا ہمیں دادی جان سے وراثت میں ملا تھا). کپتان سے پہلے ہماری مرغیوں کا سردار کرنل تھا. (ماشاء اللہ اب بھی حیات ہے). مگر وہ دیسی یعنی گھر کا مُرغا ہونے کی وجہ سے دال برابر حیثیت رکھتا ہے. ہندوستانیوں کی فطرت کے عین مطابق ہم غیر ملکی چیزوں سے نسبتاً زیادہ پیار کرتے ہیں، اسی لیے کپتان کو کرنل سے زیادہ چاہتے تھے... مگر اُس نے ہمارے پیار ہماری توجہ کا ناجائز فائدہ اٹھایا. وہ تو تلسی داس کہہ گئے ہیں کہ...

ڈھول، پشو، شودر اور ناری

یہ تاڑنا کے ادھیکاری

تو کچھ غلط نہیں کہا. ایک مہا کاویہ اور اپنے خاندان کا تجربہ تھا اُن کے پاس — ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ادھر کپتان نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے اور اُدھر ہماری آنکھوں میں کھٹکنے لگا.

کپتان کی آواز بہت بلند ہوگئی تھی۔ سویرے سویرے اذان دیتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے دھمکا رہا ہو کہ "دیکھو! سنبھل کے رہو۔ باپ کا گھڑا ایک دن ضرور بھرے گا۔۔۔ نہ پھوٹے گا تو میں ہی بھانڈا پھوڑ دوں گا۔"

دوسرے مرغے دن بھر میں بس ایک مرتبہ یعنی سویرے سویرے بانگ دیتے ہیں۔ ہمارا کپتان، موقع دیکھا نہ محل، آواز بلند کرنے کو بے چین ہونے لگتا۔ حالانکہ یہ احتجاج ککڑوں کوں تک ہی محدود رہتا کیوں کہ ہم جھپٹ کر اُس کا منہ دبا دیتے اور وہ ککڑوں۔۔۔ کے بعد "کوں" نہ بول پاتا۔

وہ کمبخت ہماری جاسوسی کرنے لگا تھا۔ جہاں ہم نے کوئی ایسا ویسا کام کیا، اُس نے احتجاج کرنے کے لیے سر اٹھایا۔ ہم کب تک برداشت کرتے؟ گھر کا بھیدی لنکا ڈھا دے، اس سے پہلے اس کا انتظام کرنا ضروری ہوگیا۔

پھر ادھر کپتان نے پاس پڑوس کی کئی مرغیوں سے ناجائز تعلقات استوار کرلیے تھے جو ہمارے جیسے عزت دار شخص کی داڑھی کی مرغی کے لیے چیلنج تھا۔ کوئی بھی شریف آدمی یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کے گھر کی عزت سڑکوں پر ماری ماری پھرے۔

اس روز تو حد ہوگئی جب کپتان نے ہمیں چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی دی۔ یہ خوب کیا بدّی اور کیا بدّی کا شوربہ! واہ جی واہ! خوب رہی۔ گویا زمانۂ قدیم کی کہانی کی بڑھیا کی طرح وہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی اہم سمجھنے لگا تھا۔۔۔ سوچنے لگا تھا کہ وہ اذان نہیں دے گا تو سویرا ہی نہیں ہوگا۔۔۔ بس یہی وہ وقت تھا جب ہم نے وہ تاریخی فیصلہ کرلیا۔۔۔ یعنی کپتان کا قصّہ پاک کرنے کی اسکیم بنالی۔ کیوں نہ کرتے صاحب یہ فیصلہ؟ آخر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ایک وقت آتا ہے جب سر اُٹھانے والے کو سبق سکھانا ضروری ہوجاتا ہے۔۔۔ اُسے ہی نہیں، اُس کی طرح گھر کے دوسرے بھیدیوں کو بھی سبق سکھانا ضروری تھا۔ ایسے لوگ جو جس تھالی میں کھاتے ہیں اُسی میں چھید کرتے ہیں، اِسی سلوک کے حقدار ہوتے ہیں۔ خود چاہے کچھ بھی کریں، غیروں سے ناجائز تعلق بنائیں یا سماجی تعلقات کے نام پر گُل کھلیں، اپنے مالک کی اخلاقی پستی گوارا نہیں کرتے۔ کس نے دیا انھیں یہ حق؟ کس نے بنایا انھیں محتسب؟ بولو تو؟۔۔۔

بس، ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پکڑی گردن اور اللہ اکبر کہہ کر چھری پھیر دی۔ "میں" بول گیا وہ!

تندوری مرغا ویسے تو سالم اچھا بنتا ہے مگر ہمیں کپتان پر اتنا شدید غصّہ تھا کہ کھٹا کھٹ چھری چلاتے گئے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ کوئی ٹکڑا اِدھر گرا، کوئی اُدھر گرا۔۔۔ جب ہمارے ہوش ٹھکانے آئے تو تھوڑا افسوس ہوا مگر پچھتانے سے کیا ہونے والا تھا؟ دل پر پتھر رکھ کر ٹکڑے اُٹھائے اور تندور میں جھونک دیئے۔۔۔ بہت عرصہ گزرا اس تندوری مرغے کی بات کو۔ مرغا بھی اپنا تھا اور تندور بھی اپنا تھا۔ دنیا والوں کی پرواہ ہماری جوتیوں تک کو نہ تھی اس لیے ہم اس واقعے کو بھول بھال گئے ویسے کبھی کبھی پیارے کپتان کی یاد آکر ہمیں اشکبار کرگئی اور ہم نے سوچا، کپتان اپنی جگہ صحیح تھا۔ وہ اپنے مالک کو غلط کاموں سے روکنا چاہتا تھا تو کیا بُرا کرتا تھا ہم بھی صحیح تھے جو یہ سوچتے تھے کہ پاؤں کی جوتی کو پاؤں تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ سر پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔۔۔ جب ہم دونوں صحیح تھے تو غلط کون تھا؟ کیا ہم لوگ یا زمانہ؟ جو کہتی ہے ہاتھی کو سر اُٹھانے سے پہلے کچل دو۔ جو بھی ہو، یہ بات سولہ آنے، سَو پیسے سچ ہے کہ تندوری مرغے نے ہمیں تندوری مرغے سے توبہ کرادی ہے! ▲

> **قلمی معاونین سے التماس: اپنی تخلیقات پر پوسٹل ایڈریس ضرور لکھیں**

خامہ بگوش

بڑا شاعر، چھوٹا آدمی

یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اُردو ادب کی عزت افزائی کا سبب غزل گو شعرا ہیں یا وہ مقالہ نگار جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کرتے ہیں۔ غزلوں کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں۔ یہ راز نہیں کھلتا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے دیکھیے تو گمان گزرتا ہے جیسے غزلیں کہی جا رہی ہیں۔ جس طرح غزل کے ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اسی طرح ان مقالوں کے ایک باب کا دوسرے باب سے تو کیا، ایک صفحے کا دوسرے صفحے سے بھی کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ غزل کی شیرازہ بندی ردیف اور قافیہ سے ہوتی ہے، مقالوں کی شیرازہ بندی جلد ساز کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جلد سازی کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا تھا، افسوس کہ اب یہ فن لطائف و ظرائف کے فروغ کا وسیلہ بن گیا ہے۔

یہ قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی سزا ملتی ہے۔ لیکن پی ایچ ڈی کرنے والوں کے اعمال کی سزا ان کو نہیں، ان کے مقالے پڑھنے والوں کو ملتی ہے۔ ان سزا یافتگان میں ہمارا شمار بھی ہوتا ہے۔ پی ایچ ڈی کے متعدد مقالے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہر مقالہ نگار اپنے موضوع اور قاری کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ ایک پر مقالہ لکھ کر اور دوسرے کو اپنا لکھا پڑھوا کر کسی لائق نہیں چھوڑتا۔ جو موضوع پی ایچ ڈی کے لیے کام آ جائے، وہ موضوع اہل نظر کی نظر سے اور مقالہ پڑھنے والا خود اپنی نظر سے گر جاتا ہے۔ ہماری بے بسی اور بے کسی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہم نے وہ غیر مطبوعہ مقالہ بھی پڑھ لیا ہے جو نظیر صدیقی پر لکھا گیا تھا اور جس پر مقالہ نگار کو بہار یونیورسٹی مظفر پور سے دو سال قبل پی ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔ نظیر صدیقی کی بے بسی اور بے کسی کا اندازہ ان کی اپنی تحریروں سے تو ہوتا ہی تھا، ان پر لکھا گیا مقالہ سونے پر سہاگا ہے۔

پی ایچ ڈی کے سارے مقالے سونے پر سہاگا نہیں ہوتے۔ سو میں ایک آدھ ایسا بھی ہوتا ہے جسے پڑھ کر بصارت اور بصیرت پر منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اس وقت ایک ایسا ہی مقالہ ہمارے سامنے ہے جو فراق گورکھپوری کے بارے میں ہے اور جسے ڈاکٹر نوازش علی نے لکھا ہے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ فراق گورکھپوری بیسویں صدی کے چند بڑے اردو شاعروں میں سے ہیں لیکن ڈاکٹر نوازش علی کے بارے میں سوائے اس کے ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ وہ زیر نظر مقالے کے مصنف ہیں۔ وہ ادبی حلقوں میں شہرت نہیں رکھتے۔ اخبار و رسائل کے ادبی صفحوں پر ان کا نام کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ کتابوں کی رونمائیوں میں ان کی جلوہ نمائی کبھی نہیں ہوتی۔ ٹیلی ویژن کے ادبی پروگراموں میں ان کا رخ زیبا کبھی نظر نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شہرت حاصل کرنے کی طرف [illegible]

اپنا سارا وقت فراق گورکھپوری پر مقالہ لکھنے میں صرف کر دیا۔ گویا بیسویں صدی میں وہ انیسویں صدی کے آدمی ہیں کہ کام سے کام رکھتے ہیں، نام سے کام نہیں رکھتے۔ معلوم نہیں اس بے سرو سامانی کی حالت میں وہ اکیسویں صدی میں کس طرح داخل ہوں۔ جب وہ داخل ہوں گے تو کہا جائے گا کہ اکیسویں صدی میں ایک آدمی انیسویں صدی کا بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر نوازش علی نے مقالہ لکھنے میں بڑی محنت کی ہے۔ ان کی تحقیق ہند و پاکستان تک محدود نہیں رہی۔ وہ ہندوستان بھی گئے۔ دہلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد میں فراق کے قریبی لوگوں سے ملاقاتیں کر کے معلومات اکٹھی کیں۔ فراق کی کتابیں ہی نہیں، رسالوں میں بکھرے ہوئے ایسے بے شمار مضامین بھی تلاش کیے جن پر ماہ و سال کی گرد جم چکی ہے اور جن سے عام اہل ادب واقف نہیں ہیں۔ غرض کہ فراق نے جو کچھ لکھا اور جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا، اس سے استفادہ کر کے ڈاکٹر نوازش علی نے یہ مقالہ لکھا جسے فراق کی شخصیت اور فن کا پہلا جامع مطالعہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں فراق کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد کے تین ابواب بالترتیب غزلوں، نظموں اور رباعیوں کے حوالے سے فراق کی شاعری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پانچویں باب میں نقاد کی حیثیت فراق کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ آخری دو باب متفرق نثری تحریروں اور تراجم کے مطالعے کے لیے وقف ہیں۔

فراق ایک بڑے غزل گو بھی تھے اور بڑے نقاد بھی۔ کتاب کا تقریباً نصف حصہ فراق کی انہیں دونوں حیثیتوں سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی نے نہایت خوش اسلوبی سے فراق کی غزل گوئی اور تنقید نگاری کی خصوصیات واضح کی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی غزل اور تنقید دونوں نے اردو ادب کو نئے طرز احساس اور نئے لہجے سے روشناس کرایا ہے۔ اس مقالے سے خود مصنف کے بارے میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ اچھے محقق بھی ہیں اور اچھے نقاد بھی۔ لیکن کہیں کہیں ان کی تحقیق بہت گاڑھی ہو گئی ہے اور تنقید بہت پتلی۔ تنقید کے پتلے ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ انہوں نے بعض ضمنی مباحث کو ضرورت سے زیادہ پھیلا دیا ہے جس کی وجہ سے مقالے کی ضخامت حد اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے (پورے ۲۸ صفحات ہیں) غزل والے باب میں وہ حصہ جو معاصرین پر فراق کے اثرات سے متعلق ہے، نامناسب حد تک طویل ہے۔ اس میں سے غیر ضروری مثالوں کو با آسانی کم کیا جا سکتا تھا۔ "فراق کے لطیفے" کے عنوان سے جو ضمیمہ شامل کتاب کیا گیا ہے، وہ کتاب کی سنجیدہ فضا کو مجروح کرتا ہے۔ دو چار لطیفوں کے سوا باقی سب لطیفے فراق کے بڑے شعروں سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ پہلے باب میں فراق کے چھوٹے بھائی کے مرثیے، عبرت گورکھپوری کی مثنوی کے اشعار، خود فراق کی شادی پر لکھے گئے سہرے اور وفات پر جاری کیے گئے بیانات وغیرہ کی شمولیت کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر اس مقالے کی مناسب کاٹ چھانٹ کی جاتی تو اس کی ضخامت چار سو صفحات کے اندر ہوتی اور پڑھنے والا بھی کتاب کی ضخامت سے اسی طرح خوف زدہ نہ ہو جاتا جس طرح سرورق پر فراق کی تصویر دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ فراق کی کئی اچھی تصویریں شائع ہو چکی ہیں مگر ڈاکٹر نوازش علی نے چھانٹ کر ایسی تصویر چھاپی ہے جو تصویر سے زیادہ کارٹون نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر نوازش علی کی تحقیق کے گاڑھے ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے فراق جیسے خوبصورت شاعر کی انتہائی بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ فراق کے حالات زندگی کے ضمن میں بعض ایسی باتیں بھی سامنے آتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ بڑا شاعر انتہائی چھوٹا آدمی تھا۔ فراق اپنے بیوی بچوں ہی سے نہیں، اپنی والدہ سے بھی نفرت کرتے تھے۔ ڈاکٹر نوازش علی نے فراق کے چھوٹے بھائی یدو بہاری کا یہ بیان نقل کیا ہے: "ایک دفعہ والدہ میرے پاس موجود تھیں اور فراق صاحب کسی مشاعرے سے واپسی پر یہاں لگے جب فراق کو معلوم ہوا کہ بڑے بھیا آئے تھے تو وہ ہماری بلا کر ملاقات کے کمرے میں فقط بیٹھ گئیں۔ جب میں نے فراق سے کہ

کہا والدہ صاحبہ آپ کی منتظر ہیں تو کہنے لگے وہ بڑھیا مجھ سے مل کر کیا کرے گی اور والدہ مایوس ہو گئیں ۔"

بیوی بچوں سے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ فراق کے آخری دنوں کے ایک خدمت گزار رمیش چندر کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ "مجھے یہ بات رہ رہ کر کھٹکتی تھی کہ فراق کبھی آنگن کی طرف نہیں جاتے تھے۔ فراق کی بیوی اور لڑکی آنگن سے متصل کمرے میں رہتی تھیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ چائے یا کھانے پر فراق کے ساتھ ان کی بیوی یا لڑکی موجود ہوں۔ میں نے کبھی فراق اور ان کی بیوی کے درمیان کوئی بات چیت نہیں سنی۔ ایک بھی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب فراق اپنی بیوی کو گالیوں سے نہ نوازتے ہوں اور دانت نہ پیستے ہوں۔ لگتا تھا، بیوی بیٹی سے فراق کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی یہ کہتے تھے "بھائی یہ دونوں میرے سر پر بوجھ ہیں۔"

بیوی اور بیٹیوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ فراق نے مرتے وقت وصیت کی کہ میری لاش پر بیوی اور بیٹیاں مگر مچھ کے آنسو بہانے کے لیے نہ آئیں۔

فراق مغلوب الغضب انسان تھے۔ غصے میں ان کی حالت وحشیوں کی سی ہو جاتی اور وہ گالیاں دیتے دیتے مار پیٹ پر اتر آیا کرتے تھے۔ بیوی سے وہ تقریباً ہر روز جھگڑا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی جھگڑے کا حال خود فراق کی زبان سے سنیے:

"ایک بار میں کسی بات پر زیادہ بگڑا۔ چیختے چیختے میرا گلا پڑ گیا مگر اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ میں تھک ہار کر باہر آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں پڑوس کی کچھ عورتیں آئیں۔ ان عورتوں نے میری بیوی سے پوچھا "کیا ہوا آج تمہارے پتی کس بات پر چلا رہے تھے۔ میری بیوی پہلے تو خاموش رہی پھر بڑی بے اعتنائی سے بولی "چڑ چڑے مزاج کے ہیں ..... تبایئے میں نے چلا چلا کر اپنا کلیجہ نکال دیا، وہ کم بخت کہتی ہے چڑ چڑے مزاج کے ہیں۔"

فراق کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری دولت کی ہوس تھی۔ دولت حاصل کرنے کے لیے وہ ایسے ایسے طریقے اختیار کرتے جن کی کسی خوددار انسان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس معاملے میں ان کے نزدیک عزتِ نفس کوئی چیز نہیں تھی۔ حکومت سے وزیروں سے اور بعض دوسرے لوگوں سے روپیہ مانگنے میں وہ بالکل تکلف نہیں کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اپنی بیماری کی جھوٹی خبریں اخباروں میں چھپواتے رہتے تھے۔ خبریں پڑھ کر مرکزی اور صوبائی حکومتیں علاج کے لیے مالی امداد دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک ایسی ہی خبر پڑھ کر ان کی ایک بیٹی جو پٹنہ میں رہتی تھی، پریشان ہو کر فراق کی عیادت کے لیے الٰہ آباد آ گئی۔ فراق نے بیٹی کو دیکھا تو بگڑ کر بولے۔ "الو کی ...... اگر میں بیمار ہوتا تو تجھے دو روپے کا تار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خبر تیرے لیے نہیں چھپی تھی، سرکار کے لیے تھی۔"

فراق کے آخری دس بارہ برسوں میں متعدد انعامات اور وظیفے ملنے کی وجہ سے ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ کئی بینکوں میں اکاؤنٹ کھول رکھے تھے جن میں تین چار لاکھ کے قریب روپیہ جمع تھا۔ اس کے باوجود وہ روپے کی ہوس میں پریشان رہتے تھے۔ اخباروں میں بیماری کی جھوٹی خبریں چھپوانے کے علاوہ اہل اقتدار کو اس مضمون کے خطوط لکھتے رہتے تھے کہ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ گھر کا سامان بیچ بیچ کر کھا رہا ہوں۔ بڑی تنگ دستی میں گزر بسر ہو رہی ہے۔ خط ہی نہیں لکھتے تھے بلکہ اس کام کے لیے وزراء اور حکام سے ملاقاتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ آخری زمانے میں جب وہ معذور ہو گئے تھے اور چل پھر نہیں سکتے تھے تو معذوروں کی کرسی پر بیٹھ کر حکام سے ملنے جاتے تھے۔ اس کام کے لیے انہیں کرسی پر بٹھانے اور اٹھانے کے لیے دو آدمی مامور تھے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر نوازش علی نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ فراق لکھنؤ میں اپنے

چھوٹے بھائی شری پتی سہائے کے ہاں مقیم تھے۔ ایک روز وہ مالی مدد حاصل کرنے کے لیے کسی وزیر کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ چھوٹے بھائی کو اچھا نہ لگا کہ بڑا بھائی اس معذوری کی حالت میں بلا ضرورت در در کی گدائی کرے۔ اس نے فراق سے کہا، سی آئی ڈی آپ کی مالی حالت کی جانچ پڑتال کر رہی ہے کہ آپ کو مالی مدد کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ جہاں جہاں آپ کا جتنا پیسہ ہے اس کی چھان بین ہو رہی ہے۔ آپ ہر جگہ مالی مدد کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں آپ کو احتیاط برتنا چاہیئے۔ بھائی کی زبان سے یہ سب کچھ سن کر فراق ڈر گئے۔ اور انھوں نے وزیر کے ہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ڈاکٹر نوازش علی نے بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے فراق کی شخصیت کے مکروہ پہلو سامنے آتے ہیں۔ کاش ڈاکٹر صاحب اتنی گاڑھی تحقیق کرکے اس قسم کی باتوں کو سامنے نہ لاتے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ سب باتیں انہوں نے اس شاعر کے بارے میں لکھی ہیں جو اس قسم کے سینکڑوں شعروں کا خالق ہے :-

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں ؛ تو نے تو خیر بے وفائی کی
سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں ؛ لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں
کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی ؛ یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے ؛ نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی
اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی ؛ اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

منظور الامین

قاضی غلام محمدؐ

(ایک منفرد شخصیت)

جہاں تک میرے علم میں ہے اس نام کے شخص سے ہم اور آپ کم واقف ہیں اس مضمون کے ذریعے میں ایک منفرد دانشور کو آپ سب سے متعارف کروانا چاہوں گا، ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مزاح نگار، ایک مصوّر اور ایک ریاضی داں کے امتزاج اور ہئیتِ ترکیبی کو اگر کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ نام ہوگا "قاضی غلام مُحمّد"!

معشوق کے بارے میں اکبرالہ آبادی کا نظریہ تھا کہ روزمرہ کی زندگی میں ہر معشوق حسن مجسم نہیں ہوتا نہ ہی وہ پیشہ ور قاتل ہوا کرتا ہے اردو شاعر عام طور پر اس نقطۂ نظر کو برادکاسٹ کرتے آئے ہیں کہ :-

تماشے کے لیے میرا جو ایسے خوں بہاتا ہے! ؎ مرے قاتل تجھے کیا بس یہی اک کام آتا ہے

ہمارے شاعرانِ کرام کی مشکل یہ رہی ہے کہ ان کے نصیب میں 'وصل' نہیں ہوتا۔ وصل تو دراصل بقول غالب ایک نکر ہے خیالی پلاؤ پکانے کا دوسرا نام ہے لیکن اصل پرابلم ہجر ہے اسی لذتِ طلب کے سہارے ہمارے شاعر ایک عمر گزار دیتے ہیں، ویسے عام زندگی میں مرد اور عورت کا سفر شادی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے پھر پیچھے یلغار کرتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں، زندگی میں کشاکش کشمکش، جہد للبقا سبھی کچھ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مرد اور عورت (میاں اور بیوی) دونوں ہی کو اپنی اپنی خوش دامنوں سے نپٹنا پڑتا ہے۔

اردو شاعر، محبوب یا معشوق کو قاتل یا TORMENTOR مانتے ہیں یا فرانسیسی زبان میں جسے کہتے ہیں FEMME FATALE قاضی غلام محمد نے اسی قاتل کے بارے میں لکھا ہے:

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی ؎ کس کا یہ جا کے دبائیں گے گلا میرے بعد

پہلا مصرعہ غالب کا ہے جس سے قاضی نے استفادہ کیا ہے

قاضی غلام محمد سے میری ملاقات کشمیر میں قیام کے دوران ہی ہوئی ان کی پیدائش اسی ایرانِ صغیر یعنی کشمیر میں ہوئی، پہلی ہی ملاقات میں میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصے کی چیز ہیں، ہوتا آیا ہے کہ جب دو شخص ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر جب وہ بار بار ملتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خیالات کا WAVELENGTH ایک ہی ہے تو پھر وہ ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں اور قاضی کا معاملہ بھی اسی طرح کا رہا ہم لوگ تقریباً ہر روز ہی ملتے اور میں دن بدن ان کی دانشوری کا قائل ہوتا گیا،

انگریزی کے ایک ناول نگار ڈاکر ڈکرانن نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ہر موٹے انسان کے اندر ایک دُبلا پتلا انسان پوشیدہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک چٹان کے اندر صنم موجود ہوتا ہے" مرزا غالب نے اس بات کو یوں کہا ہے کہ دیدہ ور وہ ہوتا ہے جو در دل سنگ بنگرد رقص بتاں آذری یعنی وہ جو چٹان کے اندر آذر کے اصنام کو پوشیدہ دیکھ سکے، قاضی غلام محمدؒ کا تعلق اسی قبیل کے دیدہ وروں میں ہے، آج جب میں بنجارہ ہلز کے علاقے میں بیٹھا یہ سطریں تحریر کر رہا ہوں تو مجھے ہمالیہ کے پیر پنجال کے بلند و بالا سلسلہائے کوہ یاد آرہے ہیں جن کے زیر سایہ قاضی غلام محمدؒ کے ساتھ ادب، فلسفہ، ریاضی، معاشیات، سیاسیات جیسے موضوع زیر بحث آتے قاضی غلام محمد کشمیر یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہیں اور ایک اعلیٰ درجے کے ریاضی داں اور ایک بہترین COMMUNICATOR، جب ریاضی کی بات چل نکلتی تو وہ ریاضی کے گنجلک مسائل پر روشنی ڈالتے ایک بار گفتگو کے دوران انھوں نے آئن سٹائن کی اس مشہور مساوات کا ذکر کیا M IS EQUAL TO $\frac{E}{C}$ SQUARE انھوں نے بتایا عرصہ ہوا یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا کی ایک بھی مادی چیز اگر اس کائنات میں باقی نہ رہے تب بھی زماں (TIME) اور مکاں (SPACE) یہاں باقی رہ جائیں گے لیکن آئن اسٹائن کے نظریۂ اِضافیت یا THEORY OF RELATIVITY کے مطابق ایسی صورت میں زماں اور مکاں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

کبھی وہ مجھے دنیا کے مشہور ریاضی دانوں کی باتیں بتاتے اور کارنامے سناتے جن کے نام مجھے آج بھی یاد ہیں یونان کے EUCLID (اسکندریہ میں انھوں نے ریاضی کا مشہور مدرسہ قائم کیا تھا) برطانیہ کے سر آئزک نیوٹن (جن کی PRINCIPIA MATHEMETICA شہرہ آفاق ہے) ایران کے عمر خیام (جنھوں نے کیلنڈر کی اصلاح کی) فرانس کے SIMON LAPLACE (جن کا ہمارے نظام شمسی پر بہتم بالشان کام ہے) جرمنی کے FREIDRICH GAUSS۔ (جن کو یورپ کا سب سے بڑا ریاضی داں مانا گیا ہے) اور ہمارے اپنے عظیم جوانمرگ راما نجم۔ اور کبھی ان عظیم ریاضی دانوں کے بالمقابل وہ اتنے ہی عظیم کلاسیکی شعراء حافظ سعدی، فردوسی، نظیری کو لاکر کھڑا کر دیتے اس طرح ریاضی جیسے خشک موضوع سے ہٹ کر وہ شعر و سخن کے نخلستان میں پہنچ جاتے اور پھر اچانک ہی مزاح کی طرف مڑ جاتے اور محبت کی دنیا کا ذکر جبر و مقابلہ کے فارمولوں میں یوں کرتے:

الف نے بے کے غم میں زہر کھا کر خودکشی کرلی۔

یا پھر یونیورسٹی کے امتحانوں کا ذکر چھڑ جاتا تو قاضی اپنے مخصوص انداز میں مُرید ہندی اور پیر رومی کے منظوم مکالمے سناتے اقبالؔ کی مشہور نظم کی پیروڈی کی شکل میں۔

مُرید ہندی: عقدہ دشکل کشا ہے تیری عقل
امتحاں میں کیسے کی جاتی ہے نقل؟

پیر رومی: امتحاں میں پاس ہونا ہے اگر ؛ ڈیکس پر پستول رکھ کر نقل کر

مُرید ہندی: سچ کہوں شاید تجھے آئے یقیں ؛ چوربازاری میں خود سمجھا نہیں

پیر رومی: ایسی باتیں پوچھی جاتی ہیں کہیں ؛ جب کہ الجبرا تجھے آتا نہیں!

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے جس ادب میں عوام کی زندگی کی بھرپور عکاسی نہ ہو وہ ادب نہیں کوئی اور شئے

ہوتی ہے مزاح نگار زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے اور زندگی ہی سے ادب کا مواد اکٹھا کرتا ہے۔
قاضی غلام محمد ایک ایسے ہی ادیب ہیں جنھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور زندگی کے مسائل پر نہ صرف تدبر اور غور وفکر کیا ہے بلکہ اپنے مخصوص لب ولہجے سے ان پر روشنی بھی ڈالی ہے جہاں ایک طرف ان کے شعور میں ریاضی جیسا خشک موضوع بسا ہوا ہے وہیں مزاح کی تروتازگی ان کے لاشعور میں رچ بس گئی ہے ان کے مزاح میں آورد کا شائبہ نہیں وہ تو دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے :

مرے اوقاتِ گریہ ٹائم ٹیبل پر مقرر ہیں
یہ بندۂ عشق کے بارے میں بھی انگریز ہے ساقی

کشمیر کی سردیوں اور ٹھنڈی راتوں کا ذکر ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :

وہ اس کا جاڑے کی سرد راتوں میں مجھ سے ایندھن کی بات کرنا
کہ جیسے یہ چیز ماورائی ہو یا الف لیلوی فسانہ !

واضح ہو کہ عام انسان کا کشمیر کے یخ بستہ موسم میں ایندھن ہی زیادہ تر موضوعِ سخن رہتا ہے۔ بار بار ذکر ہوتا ہے تو کانگڑی کا یا بخاری کا چنار کے پتوں کا یا ایندھن کا۔ ان کے کلام میں زندگی ہے اور زندہ دلی، گو وہ ذاتی طور پر غمِ دوراں کے شکار رہے ہیں لیکن اس غم کو انھوں نے اپنی زندگی پر مسلط نہیں ہونے دیا اپنے جذبات کی شگفتگی کو برقرار رکھا ان کے نکاہیہ انداز میں اور چلبلی ہے اور کھاپن ہے، ان کا مزاح خشک بے جان، پھسپھسا نہیں لگتا اس لیے کہ وہ خود روشن دماغ اور صاحبِ دل ہیں اور ایک تخلیقی فنکار ہیں :

اُٹھا کے سر سے اُونچا پہلے وہ مجھکو ٹپختے ہیں ÷ بہت ہی پیار سے پھر پوچھتے ہیں نیم جاں کیوں ہو

کشمیر میں رہائش کے دوران میرا جب بھی جی چاہتا تھا کہ وادئ کشمیر کے ایک نہایت عمدہ انسان، ایک UNIVERSAL MIND سے ملوں تو میں اپنا رُخ کشمیر یونیورسٹی کی طرف کر کے ناک کی سیدھ چل پڑتا تھا اور قاضی غلام محمد کے درِ دولت پر دستک دے دیا کرتا تھا جب قاضی باہر آتے تو محفل جمتی وہ عام طور پر ایک کم آمیز انسان ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں میرے ساتھ یہ کم آمیز کچھ اس طرح سخن ریز ہوتا کہ وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا یعنی ان کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھنے پر بھی ایسا لگتا جیسے دو ہی منٹ گزرے ہوں اور جب اس بات کا ذکر میں ان سے کرتا تو وہ کہتے کہ آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافیت یہی کچھ تو ہے۔

فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب؛ بالخصوص شاعری پر ان کی نظر بہت گہری ہے ان کی تحریر میں ہم کو فارسی اور اردو کے ادبیاتِ عالیہ کا رچاؤ اور علمیت ملتی ہے ان کی تحریروں کو پڑھ کر سادگی اور پُرکاری کا احساس ہوتا ہے۔
میرے اس ذہنی سفر کا ساتھ دیتے ہوئے آیئے ذرا اب قاضی غلام محمد کے ساتھ بس کے سفر کا لطف اٹھایئے ان کی نظم کے یہ بند ملاحظہ ہوں :

بس کا سفر

شہرِ جاناں تھا مجھے درپیش تھا بس کا سفر ÷ صحبتِ ناجنس سے ممکن نہیں ہرگز مفر
ہم نشیں میرا جو موٹا تھا بہ اندازِ دگر ÷ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جیسے لنگر ڈال کر

میری حالت دیکھ کر کہنے لگا وہ نکتہ سنج
"رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج"

گھس رہے تھے لوگ بس میں بے تحاشا بے مہار ÷ ہر طرف جمہوریت تھی جلوہ گر اور آشکار
ٹوکروں میں مرغیاں تھیں اور مرغے بے شمار ÷ بھیڑ بکرے بھی ہمارے ساتھ تھے بس میں سوار
بس میں کتنے لوگ تھے ان کا کسے اندازہ تھا
"خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا!"

بس کے اندر تھا مروت اور ہمدردی کا کال ÷ جیب کترے کے سوا کوئی نہ تھا پرسانِ حال
دبدبے میں بس کا کنڈ کٹر تھا افسر کی مثال ÷ سامنے اس کے کسے تھی لب کشائی کی مجال
کاٹ کر رکھ دی زبان اسکی شکایت جس نے کی
اس کی ٹھوکر سے تواضع کی حمایت جس نے کی

جو کھڑی تھیں بس کے بیچوں بیچ تھیلی والیاں ÷ سیٹ پر بیٹھے ہوؤں کو دے رہی تھیں گالیاں
من چلے جو تھے بجاتے تھے وہ مل کر تالیاں ÷ دید کے قابل تھیں ہم اشراف کی بدحالیاں
یوں کھڑا تھا بس میں لوگوں کا وہ بے قابو ہجوم
"ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم"

ایک محترمہ نے مجھ پر ڈال کر ترچھی نظر ÷ اپنے بچے کو اچھالا میری جانب تاک کر
کیچ میرے ہاتھ میں آیا گرا چشمہ مگر ÷ میری دنیا ریزہ ریزہ کچھ اِدھر اور کچھ اُدھر
عزتِ سادات تو مل ہی گئی تھی خاک میں
اب اندھیرا چھا گیا تھا دیدۂ نمناک میں

اک ہجوم بے دلاں تھا اور سرکاری تھی بس ÷ اس کو منزل تک پہنچنا تھا مگر اگلے برس
پی لیا تھا جھوم کر ڈیزل کے بدلے سوم رس ÷ منتیں لوگوں نے کیں ہوتی نہ تھی وہ ٹس سے مس
بدحواس اس درجے ہو کر رہ گیا اک ہمسفر
وہ کھجاتا تھا مرا سر اسکو اپنا جان کر

چال میں، رفتار میں، بس کی تھی کج رائی بہت ÷ دیکھ کر ٹریفک سپاہی کو وہ اترائی بہت
راہ گیروں سے مکانوں سے وہ ٹکرائی بہت ÷ وہ سفر تھا مجھ کو گھر والوں کی یاد آئی بہت
سر بہ زانو تھے بلا ترتیب محمود و ایاز
اور ڈرائیور صورتِ حالات سے تھا بے نیاز

مختصر کرتا ہوں اب اپنے سفر کا ماجرا! ÷ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"
منزلِ مقصود تک پہنچا تو میں اٹھنے لگا ÷ سینگ بکرے کا مگر پتلون میں ایسا پھنسا
سیٹ سے اٹھنا نہ تھا آساں و لے کوشش تو کی
اس کشاکش میں مری پتلون آدھی رہ گئی

بس سے میں اترا تو میرا حال تھا ناگفتنی ✤ میرا حلیہ دیکھ کر کتوں میں چپقلش ٹھنی
منزلِ مقصود تک پہنچا تھا قسمت کا دھنی ✤ چال میں تھی لڑکھڑاہٹ اور قدم تھا سخنی
"جان کر منجملۂ خاصاں میخانہ مجھے
۵۳ لے گئے پولیس والے جانبِ تھانہ مجھے

سید طالب حسین زیدی

(حیدرآباد)

نام بول

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

خلوص جیسے مانگی ہوئی سلطان محمد قلی قطب شاہ بانیٔ شہر حیدرآباد کی یہ دعا ادھر اس کے دل سے نکلی ادھر کھٹاک سے عرش کے پائے سے جا ٹکرائی اور مقبول بارگاہِ ربّ العزت ہوگئی، دریائے رحمت جوش میں آگیا اور پھر چار سو سال میں یہ شہر پھیلیوں ہی سے نہیں بلکہ جھینگوں اور مینڈکوں سے بھی معمور ہوا۔ اس کثرت کی وجہ سے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں چلنا پھرنا گویا اچھی خاصی دھینگا مشتی کر کے جوئے شیر لانے کے برابر ہوگیا۔

ایک دن ہم چار مینار جانے کے لیے لکڑی کے پل کی طرف سے آتے ہوئے جب رویندر بھارتی تھیٹر کے سامنے والے چوراہے سے ہری بتی ملنے پر آگے بڑھے تو کن انکھیوں سے دیکھنے پر یہ محسوس ہوا کہ ہمارے اسکوٹر کے صرف ایک ایک فٹ کے فصل سے دونوں جانب کاروں، آٹو رکشاؤں، بسوں، ٹرکوں، اسکوٹر، سیکلوں اور بیچ بیچ میں ایک آدھ رکشا کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے جن کے نرغے میں پھنس کر ہمارے اوسان خطا ہو رہے تھے کہ ہمارا نہ سہی کسی اور سواری کا مزاج ذرا سا بگڑا تو ہماری خیر نہ ہوگی۔ اور ہم سینڈوچ بن کر رہ جائیں گے۔ سانس سینے میں گھٹ کر رہ گئی اور جتنے وظیفے مشکل کشائی کے یاد تھے ان سب کا ورد کرتے ہوئے ہم اسکوٹر پر اس تنگ قطار کے درمیان دم سادھے کچھ اس طرح گزر رہے تھے جیسے سوئی کے ناکے میں تاگا پرو دیا جاتا ہے۔

جب ہم کنٹرول روم کے سامنے فٹ بال گراؤنڈ نما چوراہے پر پہنچے تو ہلکا سا یہ احساس ہونے لگا کہ سوئی کا تنگ ناکہ کچھ پھیلنے لگا ہے اور پھر پھیلتے پھیلتے کالی کمان بن گیا یوں لگا کہ صدیوں سے سینے کے اندر گھٹا ہوا دم اب آزاد ہوا ہے۔ سامنے نظر جو اٹھی تو دیکھا مسٹر گوتم ساؤنگ ڈپٹی کمشنر ٹریفک پولیس اپنی کار سے اتر کر ہاتھ میں وائرلیس انسٹرومنٹ لیے ہوئے کچھ کو "سنیال" کرتے ہوئے کھڑے ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ بات اب آیا کہ سوئی کے ناکے کی تنگی کے "کمالی کمان" بن جانے میں ان ڈی سی پی صاحب کی یہاں اس وقت استادگی کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

ٹریفک کی بے ہنگم روانی میں اصول اور ضابطہ قائم کرنے کی غرض سے نیفا کا یہ چھیتا نوجوان آئی پی ایس لڑکا اپنے یونیفارم میں سجے دھج کر بانکے سجیلے کرکٹ پلیر کی طرح جب کہیں کسی سڑک کے کنارے کھڑا ہوتا ہوگا تو نہ معلوم کتنے حسین اور نازک دلوں کی دھڑکنوں کی ٹریفک میں خلل ڈال دیتا ہوگا۔

یہاں سے چلتے ہوئے باغ عامہ کے پہلے گیٹ سے آگے بڑھ کر جب ہم رائل ہوٹل کے عین سامنے پہنچے تو یکایک ایک بھونچال میں گھر گئے، کہیں کسی اونچی جگہ سے کود کر بلکہ چھلانگ لگا کر ہاتھ اٹھائے ہم کو روکتے ہوئے اپنی کمیں گاہ سے نکل کر ایک سردار جی پولیس یونیفارم میں اچانک سامنے آگئے اور ہم نے اس وقت ناگہانی بلکہ بلائے آسمانی سے بوکھلا کر جو بریک لگایا تو اسکوٹر اسکوٹر بازی ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بمشکل اپنا توازن جسمانی و ذہنی برقرار رکھتے ہوئے ہم نے سردار صاحب سے پوچھا "کی گل ہے انسپکٹر صاحب، ابھی تو بارہ بجنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے کی دیر ہے پھر آج وقت سے پہلے ہی آپ کے سر میں یہ کیا سما گئی؟ کہ ہمارا کچومر بنتے بنتے رہ گیا۔ ہماری بات سن کر اپنی داڑھی اور مونچھوں کے درمیان کے وینٹیلیٹر کو ذرا سا کھول کر وہ مسکرائے اور ٹھیٹھ پنجابی میں گویا ہوئے "سرجی! تسی تو ساڈے نال مخول کردے ہو" (جناب عالی آپ تو ہم سے دل لگی کر رہے ہیں) اور پھر فرمایا "ذرا ودھے بغل میں آجائیں سرجی! آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس تو ہوگا؟ ۔ ذرا اس کو دکھائیے۔ ہم کو بھی اب ذرا شوخی کی سوجھی، اسکوٹر کو بغل میں یعنی فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا کر کے ان سے بولے۔ بادشاہو! پولس والوں کو بہ تھوڑا بہت چہرہ شناس بھی ہونا چاہیے، کیا آپ کو ہماری صورت پر لائیسنس دکھائی نہیں دے رہا ہے؟ یہ سن کر وینٹیلیٹر پھر ذرا سا کھل گیا۔ ہم جو ایسے ناگہانی وقتوں کے لیے اپنے سالخوردہ لائیسنس کو ہمیشہ اپنی شہ رگ سے لگائے رکھتے ہیں بیگ کھول کر بڑی احتیاط کے ساتھ اس کو نکالا اور سردار صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا سردار جی! ہمارے اس لائیسنس کی عمر شریف آپ کی عمر سے بھی کافی بڑی ہے۔ لہٰذا اس کی اس انتیکانہ اہمیت کے پیش نظر ذرا احترام کے ہاتھوں سے اس کو کھولیے۔ چھوٹوں کو ہمیشہ اپنے سے بڑوں کا پاس و ادب کرنا چاہیے ورنہ اگر کہیں آپ نے پولیس والے ہاتھوں سے دو چار جھٹکے لگا دیے تو یہ بے چارہ مارے غیرت کے پرزے پرزے ہوکر ہوا میں اڑ جائے گا۔

ہماری ان باتوں کو سن کر لائیسنس کے لیے بڑھتے ہوئے ان کے ہاتھ رک گئے اور بڑی شرافت بلکہ اپنائیت کے جذبے سے فرمانے لگے "سرجی اس کو رکھیے اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ بس ہم نے دیکھ لیا" ان کے اس طرح موم ہو جانے سے متاثر ہو کر ہم شکریہ ادا کر کے اسکوٹر پر سوار ہوئے اور "ست سری اکال" کا نعرۂ مستانہ لگا کر آگے بڑھے۔ سردار صاحب اسپرنگ کی طرح اچھل گئے اور فوراً برجستہ جواب دیا "جو بولے سو نہال" ہم نے بھی گرہ لگائی "بولو واہ گرو جی کا خالصہ" بڑے جوشیلے انداز میں جواب ملا "بولو واہ گرو جی کی فتح" دوسرے راہروؤں نے بھی ہماری یہ گرہ بازیاں ضرور سنی ہوں گی یہ مخول کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے اور پیچھے سے سردار صاحب کی آواز سرجی! اوے ذرا رکیے تو۔ آق

رہی۔ غالباً ہم کو روک کر وہ ہمارا جغرافیہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ مگر پلٹ کر دیکھے بغیر ہم آگے بڑھتے چلے گئے کیونکہ ہماری پنجابی اس کے آگے بالکل صفر ہے۔ اگر وہ "گدا" "بولیاں" اور "بھنگڑا" شروع ہو جاتے تو ہمارے فرشتے سے بھی جواب نہ بن پڑتا۔

جب ہم شہر کی سڑکوں پر نکلتے ہیں تو لگتا ہے بال سے باریک اور لکڑی کاٹنے کے آرے کی طرح دندانے دار پل صراط پر سے گزر رہے ہیں۔ ایک دندانے پر چڑھے اور دھپ سے گرے پھر چڑھے اور پھر گرے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

اور پھر اس پر مزید مصیبت آٹو رکشاؤں سے اپنے آپ کو اس طرح بچائے رکھنا چاہیے جس طرح ایک بپھرے ہوئے سانڈ سے بچا جاتا ہے۔

گورنر ڈاکٹر چینا ریڈی نے ایک مرتبہ جب وہ یہاں کے چیف منسٹر تھے بالکل صحیح کہا تھا کہ آٹو رکشہ کے ڈرائیور اگلے پہیے کو ڈیڑھ دو فٹ چوڑی جگہ سے گزار کر یہ گمان بلکہ یقین کر لیتے ہیں کہ اب سارا رکشہ بھی معہ سواریوں کے آسانی سے نکل جائے گا۔" پھر نتیجہ معلوم!

ہم اپنی خیر مناتے ہوئے مکرم جاہی روڈ سے گزر کر معظم جاہی مارکٹ کے چوراہے پر ہری بتی کے انتظار میں ایک ٹرک کے پیچھے رک گئے۔ ابھی ہم نے سہارے کے لیے اپنا پیر نیچے ٹکایا بھی نہ تھا کہ ادھر سے لنگڑے لولے ضعیف و مسٹنڈے بھک منگوں کی ایک فوج یلغار کرتی ہوئی آ گئی اور چاروں طرف سے اپنے نرغے میں لے کر ہماری تکا بوٹی کرنے پر تل گئی۔ ایک صاحب پہیے والے تختے پر پیر گھستے ہوئے آ کر اسکوٹر کے اگلے پہیے کے عین روبرو جم گئے بلکہ دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ اور اپنا ہاتھ اٹھا اٹھا کر سوال کرتے رہے۔ انداز کچھ ایسا تھا "اگر نہ دو گے تو ایک انچ بھی یہاں سے سرکنے نہ دونگا۔"

ہری بتی آئی اور چلی بھی گئی۔ سامنے والا ٹرک بدبودار دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتا ہوا گزر بھی گیا مگر ہم اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ کھسک سکے اور مارے کھانسی کے برا حال ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اپنے اڑے ہوئے اوسان کو پھر سے جمع کرنے لگے اس عرصے میں فقیر لوگ ہم سے مایوس ہو کر کوستے ہوئے دوسرے شکار کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہمارا پیچھا چھٹا دوبارہ ہری بتی کے آنے پر آگے سدی عنبر بازار کی طرف بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں سیاہ دھوئیں کا ایک بہت بڑا گولہ ساری سڑک پر بادل کی طرح چھایا ہوا ہمارے آگے دوڑا چلا جا رہا ہے، سڑک نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ چھینکتے کھانستے راستہ ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتے رہے۔ ہمارے اطراف سے بھی چھینکوں اور کھانسی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

خیر صاحب اللہ اللہ کرتے اور اپنی خیر مناتے ہوئے نئے پل تک پہنچے۔ اس پل پر سے گزرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک پہاڑ کی چوٹی سے دوسرے پہاڑ کی چوٹی تک رسیوں کی سیڑھی پر چلتے ہوئے پہنچنا۔ پل پر بے شمار گڑھے اور اور بڑا گڑھا بڑی سڑک بھی ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ تو اخباروں میں پڑھا تھا کہ نئے پل کی سڑک میں ایک گڑھا آر پار سوراخ میں تبدیل ہو گیا ہے اور اس سوراخ سے موسیٰ ندی کا پانی

ف دکھائی دے رہا ہے۔ آج کل بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ چار مینار کی سمت ابتدا ہی میں بائیں طرف
دگنبد کا سوراخ آر پار ہونے کی جد وجہد میں مصروف ہے۔
سے گزرنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے یہ جاننے کے لیے ایک حقیقی واقعہ سناؤں گا۔ یہ کوئی قصہ کہانی
ہے بلکہ منصف مجسٹریٹ کی داستانِ عزیمت وہزیمت ہے جو ہمارے ایک مرحوم سینیئر دوست
یہا عمر با عزال صاحب ایڈوکیٹ نے سنائی تھی۔
مسلطان بازار چادرگھاٹ کی کوتوالی کے دالانڈے میں ایک موٹے تازے جمعدار صاحب اپنا ایک پیر
سے ہوئے کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے میز لگی ہوئی ہے اور ایک رجسٹر کھلا ہوا رکھا ہے جس کے بازو جمعدار
ب کا شملہ اور ایک چائے کا خالی جھوٹا کپ بھی جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں دھرے ہوئے ہیں۔ ٹریفک
کے جوان بغیر قندیل سیکل چلانے والے "مجرموں" کو پکڑ پکڑ کر لا رہے ہیں۔ اور جمعدار صاحب ان کا نام
ور پیشہ رجسٹر میں درج کرکے "مجرموں" کے ہاتھ میں "فردِ جرم" پکڑاتے جا رہے ہیں اور دوسرے دن عدالت
مانہ ادا کرکے سیکل حاصل کر لینے کی ہدایت دے کر سیکلوں کو تھانے کے اندرونی حصے میں بھجواتے جا رہے ہیں۔
اسی اثنا میں ایک نہایت مہذب، شریف ومتین صورت والے ملزم بھی سمت گھبرائی ہوئی وحشت
حالت میں داخل ہوئے ان کی صورت پر اس شعر کی تفسیر صاف صاف پڑھی جا رہی تھی۔

دیکھ کر ہی در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا!

آپ کا جرم بھی وہی بغیر قندیل سیکل لانی تھا۔ آتے ہی جمعدار صاحب کہنے لگے جمعدار صاحب ذرا میری
جمعدار اپنا سر اٹھائے بغیر ایک اندازِ تغافل سے ان کی بات کو نظر انداز کرکے رجسٹر پر جھکتے ہوئے
، نام بولو" مجرم" نے عاجزانہ فریاد کی جمعدار صاحب! پہلے میری بات . . . . . . جمعدار خدا گری
ن کی بات کاٹ کر بولے، کیوں مرا وخت (وقت) خراب کر رہے ہو؟ تمہارا نام بولو جی۔ [illegible] اپنی بات
لے بغیر نام لکھانا نہیں چاہتا تھا، پھر نہایت انکساری سے بھیگی بلی بن کر بولے۔ [illegible] ذرا
یری بات تو سن لیجیے۔ اب تو صاحب! جمعدار اپنی بانی پر آگئے۔ پارہ چھتیس ڈگری پر پہنچ گیا بھلا کوئی
یل سیکل چلانے والے جیسے معمولی مجرم کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان کے حکم کو یوں مسلسل ٹالتا جائے۔
بر ایک گھرکی دی اور کہا . . . . . . کیا کہا؟ . . . . . . نام بول! بے چارہ مجرم سہم گیا اور بولا جی! طاہر
(قریب کھڑے ہوئے ہوئے جوان نے زیرِ لب کہا "اب آئے بیٹا رستے پر) پیشہ؟ جی! منصف مجسٹریٹ
ت مجسٹریٹ صاحب جن کا اصل نام پوشیدہ رکھا گیا ہے اب تک مجرموں کو سزا سنا کر ان کی سٹی بٹی گم
ستے تھے اس "نام بول" پر خود اپنی سٹی بٹی گم ہوتے دیکھ لیا) "منصف مجسٹریٹ" کہ سنتے ہی جمعدار
ب کو جیسے کرنٹ چھو گیا۔ جھٹ سے اپنا شملہ سر پر رکھا اور تیزی سے کھڑے ہو کر سلیوٹ بجا لاتے،
خفا ہونے لگے۔ ارے بے وقوف! تیری عقل گھاس چرنے گئی کیا؟ صاحب لوگوں کی صورت دیکھ کر
مانا کر۔

نہیں ہے، ابھی ابھی میں نے قندیل سلگائی تھی کہ سڑک پہ بنے ہوئے ایک گڑھے میں پہیہ گر جانے کے صدمے سے جھٹکا کھا کر بجھ گئی۔ جمعدار صاحب نہایت ادب سے پوری بات سن کر بولے ...... اور ے بھئی تو بجھ گیا "آپ کی بجھی تو کیا ہوا؟" معافی چاہتا ہوں اور پھر جوان سے مخاطب ہو کر حکم دیا۔ چل جلدی سے صاحب کی لالٹین باہر کپڑا مار کر باہر نکال" اور سلیوٹ کرتے ہوئے منصف صاحب بولے آپ تشریف لے جائیے سرکار" میں معافی چاہتا ہوں اور طاہر حسین صاحب منصف مجسٹریٹ شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے (بعد میں لالٹین لاکھوں پائے)

خیر صاحب! آپئے اور ہمارے ساتھ چلیے، نئے پل کو جوں توں پار کر کے مدینہ سرکل سے آگے بڑھ کر اپنی دونوں جانب کے اسکوٹروں، بسوں اور آٹو رکشاؤں سے بچتے بچاتے میر عالم منڈی کے موڑ تک اپنی خیر مناتے اور جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے پہنچے ہی تھے کہ ایک آٹو رکشہ والا بڑی تیزی سے ہم کو اوور ٹیک کر کے بغیر اشارہ دیئے منڈی کی طرف اسکوٹر کے اگلے پہیے سے صرف ایک سنٹی میٹر کے فاصلے سے گزرا۔ اس یکایک آفت سے بچنے کے لیے ہم نے بریک کو فلور تک جو دبایا تو اسکوٹر اسکڈ ہو گیا۔ اس کی اس بدتمیزی پر ہم کو بے حد غصہ آیا اور سنبھلتے سنبھلتے اس کو ڈانٹ کر لیے، بے وقوف آدمی! تم کو ڈرائیونگ بھی آتی ہے؟ یا ان ناتھی کے بیل کی طرح لوگوں پر چڑھ دوڑتے ہو؟ ایک لمبی چھا آ۔ آ۔ کہہ کر فرمانے لگے (آج کل سڑکوں پر بھائی، خالو اور چچا کے رشتے ٹکے سیر بک رہے ہیں) " جیب میں لیسنس رکھ کے چلاتوں بولا۔ کیا؟؟؟ (گویا جیب میں لائسنس کی موجودگی سے بارہ خون معاف ہو گئے) مڑتے وقت ہاتھ بھی بتایا تھا" ہاں مگر مڑنے کے بعد فرمانے لگے، چشمہ آنکھوں پہ لگا کے بھی یہ دو گز کا لمبا ہاتھ نہیں دکھا کیا؟ اب بتاؤں؟ اپنا دو گز کا ہاتھ دکھلاتے ہوئے وہ منڈی کی طرف ہجوم میں گھس گئے اور ہم بیچ بازار میں اپنا سا منہ لیکر کر جی میں خجالت محسوس کرتے ہوئے چار مینار کے لیے پچھلی کمان سے گزرے جہاں ایک بکرا چار پانچ بکریوں کو کھدیڑتے ہوئے تیزی سے کوچہ ملنیم سے نکل کر ہمارے آگے سے گزر گیا اور بیچ سڑک پر پچھلی کمان اور شہران مدنی کے درمیان ایک بکری سے اظہار عشق میں مصروف ہو گیا۔

گلزار حوض جب پہنچے تو یہاں بھی اپنی خیر منانا پڑا۔ میوے کے ٹھیلے درمیان میں ٹھیرے ہوئے تھے آٹو رکشاؤں کا ہجوم حوض کو چاروں طرف سے گھیرے دوسروں کا راستہ مسدود کیے ہوئے تھا۔ ان سب کے درمیان سے ایک سیکل خط محور کھینچتی ہوئی ہمارے اسکوٹر کو چھوتی ہوئی نہایت تیزی سے گزر گئی اور ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ اس پر مستزاد ارنے بھینسے کی طرح مٹس مٹس کرکے آتی ہوئی آر ٹی سی کی بسیں۔ الٰہی خیر ہو کا ورد کرتے ہوئے آخر کار، بدحال اور منہ بسورتے ہوئے چار مینار پہنچ ہی گئے جس کی چاروں گھڑیوں میں بعض اوقات دنیا کی چاروں سمتوں کا وقت ایک ساتھ معلوم ہو جاتا ہے۔ ہمیں یوں لگا جیسے منہ بسور کر چار مینار یہ کہہ رہا ہو کہ اگر قلی قطب شاہ کو معلوم ہوتا کہ اس شہر نگاراں کی کثرت آبادی اور عدم شعور بلدی کے ہاتھوں یہ درگت بننے والی ہے تو اپنی دعا کو سوری (Sorry) کہہ کر واپس لے لیتا۔ وہاں سے آٹو رکشاؤں وغیرہ کی بھیڑ اور قطاروں سے بچتے بچاتے نکل کر سید ھا اعتبار چوک پہنچے اور اپنے گھر میں داخل ہو کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور اپنے آپ سے بولے "خیر سے بدھو گھر کو آئے"۔

سنجر ہلال بھارتی
(کلکتہ)

"زندگی بڑھ کے چھینی جاتی ہے"

"انکل ! اندر آسکتا ہوں ؟"

"ہاں بیٹے ، آجاؤ !"

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آج انکل کا موڈ کچھ زیادہ ہی فریش ہے کیونکہ وہ بڑے ہی میٹھے سُروں میں گنگنا رہے تھے :

"یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو"

ویسے تو انکل کی عمر تقریباً ساٹھ سال کو پہنچ چکی تھی لیکن رکھ رکھاؤ اور وضعداری سے ایسا محسوس نہ ہوتا تھا۔ بالوں میں خضاب، تیز خوشبوؤں والا سینٹ لگاتے جس سے سارا ماحول خوشبوؤں میں نہا جاتا، دیپ کمار کی طرح بالوں کی چند لٹیں پیشانی پر مچلتی رہتیں۔ نفاست پسند اتنے کہ روزانہ نئے نئے کپڑے بدلتے گویا ان کی اسی تنوع پسند طبیعت نے انھیں بوڑھے، جوان اور لڑکوں میں ہر دل عزیز بنا دیا تھا اور وہ راتوں اپنے محلے میں متعارف اور مشہور ہوگئے، بالکل اسی طرح جیسے ڈاکٹر عنوان چشتی، جگر مراد آبادی کی شاعری پر تنقید لکھ کر۔ یوں تو انکل کے پاس کوئی تعلیمی سند نہ تھی مگر زبان و بیان پر تقریباً مہارت حاصل تھی۔ دراصل وہ بیس سال لکھنؤ میں رہ چکے تھے وہاں کی تہذیب و ثقافت اور نزاکت و ادا کا رنگ چڑھ گیا تھا، ہر جملے کی ادائیگی کے ساتھ ایک شعر ضرور جوڑ دیتے اور یہی انفرادیت ان کی ہر دلعزیزی کی ضامن بن چکی تھی۔ اخبار ڈیلی خریدتے جس کے سبب فری پڑھنے والے شرفا کے فروغی دستے کی آمد کا ایک طویل سلسلہ قائم رہتا۔ لوگ اخبار پڑھتے اور ادبی مباحثے چلتے۔ حاضر جواب اتنے کہ متکلم کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے۔ لکھنؤ سے آئے انھیں صرف چند مہینے گزرے تھے مگر ان کے مداحوں اور حاشیہ برداروں کا ایک وسیع حلقہ بن گیا۔

انکل بڑی توجہ اور انہماک سے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں کو سنوار رہے تھے۔

"یہ نئے مزاج کا شہر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ماشاء اللہ یہ آرائش جانی !!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چشم بد دور ۔ ۔ ۔ ۔ !"

"یا لیس پرانے جوتے ہیں مگر ملتی ہے ۔۔۔ نیان !"

انکل نے برجستہ جواب دیا۔ [illegible]

"ذرا فاصلے سے ملا کرو !"

"ڈاکٹر بشیر بدر آپ کو زیادہ پسند ہیں کیا؟" میں نے جواب طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بھتیجے! اس کی شاعری دل کو چھوتی ہے کیا چبھتا ہوا شعر کہتا ہے ظالم!! وہ عوامی شاعر ہے مگر بھتیجے تمہارا پسندیدہ شاعر؟"

"ڈاکٹر عنوان چشتی" میں نے اپنی پسند کا اظہار کیا۔

"تو پھر اپنے محبوب شاعر کا ایک شعر سناؤ" انکل نے فرمائش کر دی مگر میں شرمندہ ہو گیا، کیونکہ کافی ذہن پر زور دینے کے بعد بھی کوئی شعر یاد نہ آیا۔

"بھتیجے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ دراصل تمہارے محبوب شاعر کی فکر گاڑھی ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب شاعر سے نقاد بن گئے اور پھر مثل مشہور ہے کہ پٹا ہوا شاعر ناقد بن جاتا ہے۔ وہ شاعری کیا جس کا ایک شعر بھی زبان زدِ عام نہ ہو۔ شاعری تو کوئی بھی کر سکتا ہے مگر اچھا شعر کہنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے کتنی خدا لگتی بات کہی ہے،

مظفر ہمیں تجربہ ہو چکا ہے
کہ آساں ہے شاعر سے نقاد ہونا

میں نے انکل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ بشیر بدر کی بے جا حمایت اور جانب داری سے کام لے رہے ہیں۔" انکل یک لخت بھڑک اٹھے۔ اور جز بز ہو کر بولے — "میاں! تم نے مجھے کوئی اردو کا ڈھی سمجھ رکھا ہے کیا؟" اب انکل کے موڈ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا — "اچھا! بنگال کے کس شاعر نے آپ کو متاثر کیا ہے، انکل؟"

کئی ایک ہیں ۔ ۔ ۔ ! انکل نے جواب دیا۔

"مثلاً — ؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"منور رانا، شہود عالم آفاقی، معصوم شرقی ناصر کرم پوری اور عادل یاد کرپوری وغیرہ۔" انکل نے لگے ہاتھوں ایک فہرست سامنے رکھ دی۔

"عادل یاد کرپوری کا ایک شعر ارشاد کیجیے۔" میں نے ٹٹولا۔

"سنو — !"

"بس ایک لفظ صداقت زباں سے کیا نکلا
ہر ایک ہاتھ کا پتھر مری تلاش میں ہے"

"معصوم شرقی کا کوئی شعر — ؟" میں نے دوسری فرمائش کر دی۔

"سنو — !!" انکل نے جذباتی انداز میں کہا:

"تو نے ساحل جسے سمجھا ہے وہی اے ناداں
اپنی آغوش میں طوفان لیے بیٹھا ہے"

"ناصر کرم پوری کا ایک شعر عنایت کیجیے،" میں نے امتحان کی گرفت سخت کر دی۔ مگر انکل نے بڑی سرعت سے لپک کر کہا۔

"ہاں، ہاں — سنو!":

"ہیں تیرے پاس بھی موتی مگر خریدے ہوئے
ہماری طرح سمندر کھنگال تو جائیں!"

اب تو انکل کے حافظے پر مجھے رشک ہونے لگا غضب کی یادداشت ہے ظالم کی۔ میں نے آخری سوال کرتے ہوئے کہا۔

"منور رانا کا کوئی شعر تحفتہً؟"

انکل نے پہلو بدلتے ہوئے کہا: —

ہائے! ظالم کے مزاج اور اداؤں میں تفنن ہے۔ کیا شعر کہتا ہے ظالم! لو یہ بھی سنو!!:

"گفتگو فون پہ ہو جاتی ہے رانا صاحب
اب کوئی چھت سے کبوتر نہیں پھینکا جاتا"

کیا لفظوں کی بندش اور چابکدستی سے کام لیا ہے ظالم نے۔ میاں! اسی کو کہتے ہیں الفاظ کا دروبست، زبان و بیان اور اسلوب نگارش، اللہ کرے زورِ قلم اور ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ـــــ "مگر
انکل کبوتر تو اڑایا جاتا ہے"

"بھتیجے! یہی تو جدیدیت ہے۔" انکل نے مجھے
عصری شاعری کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جدیدیت کیا بلا ہے انکل؟" میں نے کریدا۔

یہی کہ ع

"الٹ کے رکھ دے رسوم کہن کبھی اے دوست"

"مطلب ـــ؟" میں نے استعجاب کا اظہار کیا۔

"مطلب یہی کہ محاورے کی دم پکڑے رہنے
سے احتراز کرنا، صوتی بندشوں سے انحراف کرنا۔
گل و بلبل اور حسن و عشق سے گریز کرنا۔ عصر حاضر
کی واردات اور حادثات کو قلم بند کرنا، دنیا
کے افلاس زدہ لوگوں میں امیروں کے خلاف
انقلاب پیدا کرنا، سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی کے
لیے اعلانِ جہاد کرنا اور فاقہ مستوں کی دادرسی کرنا،
کاہلوں کی حوصلہ افزائی کرنا جس طرح ترقی پسند
شاعروں نے کی ہے۔" انکل نے بھرپور وضاحت کی۔

"یہ ترقی پسند شاعری کیا ہوتی ہے؟" میں نے
کریدا۔

"یہی کہ دنیا میں ہر آدمی برابر ہے۔ یہاں
کوئی کسی سے برتر اور کمتر نہیں۔ آدمی کے پیدا ہونے
کی نوعیت ایک، تو پھر کوئی سرمایہ دار اور کوئی بیکار
کیوں؟ کوئی امیر اور کوئی غریب کیوں؟ کوئی مجبور
اور کوئی مسرور کیوں؟ لہٰذا فاقہ مستوں کو چاہیے
کہ وہ امیروں کے سینے پر چڑھ کر ان کی دولت اور
مال و متاع چھین لیں۔"

ساحر لدھیانوی نے کیا خوب کہا ہے:

تیرگی اپنے مقدر کی مٹانے کے لیے
چھین کر چاند ستاروں سے اجالے لے لو

اور

"زندگی بھیک میں نہیں ملتی
زندگی بڑھ کے چھینی جاتی ہے
اپنا حق سنگدل زمانے سے
چھین پاؤ تو کوئی بات بنے"

"مگر انکل" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا:
"یہ شاعر تو لوٹ مار کی ترغیب دے رہا ہے۔
شاعر تو وہی ہے جو انسان کو انسانیت، محبت
ہمدردی، اتحاد اور سچائی کا پیغام دے۔"

"بھتیجے! تم نرے احمق ہو، اگر انسانیت، خلوص
ہمدردی اور محبت کی بات کرو گے تو پیچھے رہ جاؤ گے۔
وقت کے ساتھ بدلنا سیکھو۔ آدمی کو احمق بناؤ
اور ترقی کرو۔ ہر قدم پر اپنا مفاد پیش نگاہ رکھو۔
انسانیت کا بورڈ لٹکا کر آگے کبھی نہیں بڑھ سکتے۔ ابن انشا
جی کو دیکھو! اگر وہ انسانیت اور ہمدردی کے لفڑے
میں الجھے رہتے تو یہ آفاقی شہرت آج اسے نصیب نہ ہوتی!"

انکل کی باتوں سے میں مطمئن نہ ہوا۔ عصری
اور ترقی پسند شاعری کا مقصد ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔
میں ذہنی کشاکش میں مبتلا ہو گیا۔ رات کو پہروں نیند
نہ آئی اور متواتر سوچتا رہا۔

اگلی شب کے آٹھ بجے حسب معمول میں نے
انکل کے یہاں حاضری دی مگر مجھے محسوس ہوا کہ گلاب
کی طرح کھلتا ہوا انکل کا چہرہ آج مرجھایا ہوا ہے۔
وہ باغ و بہار شخصیت آج سمندر کی خاموشی
کی طرح پُرسکوت نظر آ رہی ہے۔ میں نے بے ساختہ
ہو کر پوچھا ـــ "انکل! خیریت تو ہے؟" "بیٹے
غضب ہو گیا۔" "کسی نے ریوالور دکھا کر مجھے لوٹ لیا"
میں نے حیرت اور مسرت سے کہا۔ "انکل یہ

اپنا حق سنگ دل زمانے سے
چھین پاؤ تو کوئی بات بنے

یوسف امتیاز
ٹورانٹو (کینیڈا)

گوری رنگت بھی کیا بری شئے ہے

رنگ سب ہی خوب صورت ہیں۔ رنگوں کی قوس قزح کے کیا کہنے۔ اس سے کس کو انکار ہے۔ قدرت نے انسانوں کو بھی الگ الگ رنگوں سے نوازا ہے۔ گورے، کالے، سانولے، گندمی، بادامی، پیلے، صندلی اور نہ جانے کیا کیا رنگ ہیں جو انسان کی پوست پر چسپاں کر دیئے گئے ہیں۔ دیدۂ بینا نے بھی ان رنگوں میں دیدہ زیبی، خوب صورتی، جاذب نظری تلاش کر لی۔ کسی نے انسانی چمڑی پر ملاحت دیکھی اور کسی کو صرف سفید ہی سفید نظر آیا۔ اور پھیکا پن آنکھ کو کھٹکنے لگا۔ کسی نے سیاہ فامی میں ستاروں جیسی چمک کو بھانپا اور دل ہار بیٹھے۔ کہیں سیاہ فامی کے باوجود موٹے موٹے رسیلے ہونٹ خوب صورتی کا نشان پائے گئے تو کہیں چپٹی ناک خوب صورتی کا پیمانہ ٹھیری لیکن خوب صورتی کے سارے میزان اور پیمانے نہ جانے کیوں گوری صورت یا چمڑی کے مقابل ایک دم ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے جاتے ہیں اور صرف رنگ اور رنگ ہی عزت، توجہ، وقار، لاڈ پیار کا بلا مقابلہ امتیازی نمونہ بن جاتا ہے۔ گوری صورت اور گوری چمڑی کو یہ برتری آج سے نہیں غالباً روز ازل ہی سے فوقیت حاصل ہے۔ چاہے وہ کسی شاعر افسانہ نویس اور آرٹسٹ کے خوابوں کا مرکز نگاہ ہو یا مذہبی دیومالائی کہانیاں ہر جگہ صرف گورا پن ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ آرٹسٹوں نے صحیح یا غلط حضرت عیسیٰ کو گورا بنا کر پیش کر دیا یہ اور بات ہے کہ آج کل سیاہ فام اور گورے دونوں اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا رنگ واقعی کیسا تھا۔ ان کا پیغام تو ہوگیا درگزر۔ ہندوستان کی دیومالا میں اس کا ذکر ہے کہ نند لالہ یشودھا متا سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ رادھا گوری کیوں ہے اور میں کیوں کالا۔ کالی کلکتہ والی کا جادو اور کالی کی پوجا سر آنکھوں پر، سیاہ خضاب بالوں کے لیے قبول۔ ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ، منہ کالا کرنا، کالی کا واستہ کا تنا سماج کے لیے ہرگز گوارا نہیں۔ اسی رنگ کے جھگڑے نے تو ہر انسان کو ایک کامپلکس complex میں مبتلا کر دیا ہے اور لوگ اسی غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ وہ کالے کیوں ہوئے گورے کیوں نہ ہوئے۔ اب جو گورے ہیں ان کو نظر لگنے کا خوف اس قدر ستاتا ہے کہ وہ اپنی صورت پر سیاہ تل کا نشان لگا لیتے ہیں، ہاتھوں میں کالے گنڈے باندھ لیتے ہیں۔ یہ سب نظر اتارنے کے سامان کیے جا رہے ہیں۔

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔

کیوں نہ ہو کالے لباس پر گورا رنگ اس طرح کھل کر آتا ہے جیسے کالی گھٹاؤں کے درمیان چودھویں کا چاند بے چارے سیاہ فام تو اپنے چہرے پر تل لگنے سے رہے۔ انھوں نے گوری رنگت سے مقابلے کے لیے دوسرے ڈھنگ تلاش کرنے شروع کر دیے۔ میک اپ، خوش لباسی، بانکپن ادائیں انتہائی شوخ رنگوں کے لباس اور رفازے کا انتخاب وغیرہ وغیرہ۔ دل جیتنے کے لیے لاکھوں جتن تو کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اگر گوریوں کے ہجوم سے کالی کو ملکۂ حسن قرار دے دیا جائے تو اعزاز پانے والے اس کو گوروں کا ہمدرد قرار دیتے ہیں۔

اکثریت کے دل کی ملکہ کوئی کالی کلوٹی بدوضع شخصیت نہیں بلکہ بدوضع ہی سہی گوری ضرور ہے۔ آج بھی ہندوستان پاکستان سے نکلنے والے سارے اخبارات اور رسائل میں ضرورت رشتہ کے کالم کی اہم نشاندہی رنگ ہے۔ شادی کے لیے قبول صورت اور گوری لڑکی چاہیے۔ فلمی گیتوں میں صرف گوری گوری بانکی چھوری ہماری گلی آیا کرو۔ گورے گورے بانکے چھورے کبھی روز بلایا کرو۔ کی فرمائش ہے۔ شادی بیاہ اور ڈھولک کے گیت گورے گورے ہاتھوں میں مہندی لگانے، گھونگھٹ نکالنے اور پیا سے ملنے کی تیاری کا ذکر خاص ہے۔ گورے چہرے پر آنکھوں میں کجرا، گورے ہاتھوں میں چوڑیوں کی رٹ ہے۔ گورے چہرے پر چاندی جیسے دانت، نقرئی مسکراہٹ کا ذکر ہوتا ہے۔ محبوب اپنی گوری کو چھت پر آنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اسے چاند کے بہانے دیکھ سکیں۔ شوہر کا کیا ہے وہ اگر سیاہ فام اور توے کے پیچھے کا چاند ہوا تو یار لوگ اس جوڑے کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ کسی نے اس کو اپنی بیوی کا نظر توڑ شوہر قرار دیا تو کوئی کہتا ہے دودھ پیڑے کو مکوڑا لپٹ گیا۔ کسی نے اس کو نظر بد سے بچانے کا سامان ٹھیرایا۔ ماں باپ کی نظر میں تو اولاد گورے سے بھی گوری ہوتی ہے اور چاند کا ٹکڑا ورنہ جانتے بوجھتے لوگ سیاہ فام بچوں کے نام چاند خاں، ہلالی، ستارہ، مہر آفتاب سورج وغیرہ کیوں رکھتے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ اگر گورے کو گورا کہہ کر پکارا جائے تو وہ برا نہیں مانتا کسی کالے کو ذرا کالو یا کالی کہہ کر پکار دیجیے اور دیکھیے کیا درگت بنتی ہے۔

انسان کی انا اسے کسی بھی صورت میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ بہت سوں کی غلامانہ ذہنیت دور رنگ سے مرعوبیت ہی تو وہ رنگ دکھلاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ان کا کیا کہنا جو مغرب سے واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک میم لے آتے تھے۔ شوہر تو خیر میم کے ناز و انداز صرف رنگ کے حوالے سے اٹھایا کرتے۔ پڑوسی اور رشتہ دار میم کی تعظیم و تکریم، خاطر تواضع میں منہمک رہتے۔ یہ صورت حال ہماری سوسائٹی میں کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صاحب بہادر نے کوئی تیر مار لیا اور اولمپکس سے طلائی تمغہ جیت کر آ گئے۔ یہی گوری چمڑی بعض اوقات انسان کو اپنی ہی سوسائٹی اور اپنے ہی شہر میں اجنبی بنا دیتی ہے۔ دوسرے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ گورا کہیں باہر سے آیا ہے اور واقعی گورا ہے۔ انھیں کیا پتہ کہ وہ جسے گورا سمجھ کر پیچھے جا رہے ہیں دراصل نقلی گورا ہے۔ انھیں کے سماج اور سوسائٹی کا حصہ ہے۔ اپنی مادری زبان بھی اگر انگریزی میں مخاطب ہو رہے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ گورا جان کر مادری زبان میں صلواتیں سنا رہے ہیں ۔ اور گالیاں دے رہے ہیں یہ وہی لمحہ ہے جہاں اپنے شہر میں اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ اور جی چاہتا ہے کہ جسم پر دودھ رنگ مل کر شامل ہو جاؤں ۔ ابھی سائنس نے ایسی کوئی دوا ایجاد نہیں کی جو سو فیصد کامیاب ہو اور گورے کو کالا اور کالے کو گورا بنا سکے ۔ پھر پتہ نہیں رنگ و نسل کے جھگڑے اور تفرقات کیا رنگ اختیار کر لیں ۔ کہا جاتا ہے اسی سائنسی تجربہ کو مائیکل جیکسن نے خود پر کیا ہے اور سیاہ فام جسم مکمل سفید سہی تھوڑا بہت ضرور کر لیا ۔ مغربی دنیا میں سن ٹین لوشن SUNTAN LUTION صرف رنگ کو کالا کرنے کے لیے ہی تو استعمال ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ عام زندگی میں کالے قابل قبول ہیں یا نہیں ۔ یونانی اسٹیٹس کے اسکرین اور ٹی وی پر کالوں کو مناسب نمائندگی دینے کے چکر میں پروڈیوسرس کو ایسے چہرے کی تلاش ہوتی ہے جو کم سیاہ فام ہوں ۔

گوری صورت ہو یا گوری چمڑی بنانے والے نے سب کی قسمت میں سفید فامی نہیں لکھی اور بہت اللہ کے نیک بندے کالے رنگ پر ہی قناعت کر جاتے ہیں ۔ یہ قناعت اور شکرانہ صدق دل سے ہے اس کا راز تو وہی جانتے ہیں جو اس پل صراط سے گزرتے ہیں یا پھر دنیا بنانے والا ہی بہتر جانتا ہے ۔ بعض تو ایسے ہیں جنہیں ماتھے پر کلنک کے ٹیکے سے غرض ہے اور نہ منہ کالا ہونے کی پرواہ نہ کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے ہونے کا ڈر ۔ پھر سردیوں اور برسات کی سیاہ راتوں جیسی رنگت پر موتی جیسے دانت ہوں تو اور کیا چاہیے ۔

اسی گورے پن کے سبب بہتوں کی زندگیاں آسان ہو گئیں ، معاشی میدان میں بھی کئی چراغ جل ہاتھ میں ہاتھ آگیا اور منزلیں سہل ہو گئیں ۔ وہ سحر جس کی آرزو تھی مل گئی ۔ بے چارے کالے پریشان حیران ہیں کہ راہوں کے سارے چراغ گل ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ خود بھی سیاہیوں کا ایک حصہ بن ہیں ۔ دیار حسن کی خوابگاہوں سے دکسی نے آواز دی نہ پکارا اور نہ دامن ہی پکڑا ۔

بظاہر تو چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی ہے دور دور تک اجالے کا پتہ نہیں ۔ غالباً ایسے ہی موقعوں کے لیے قدرت نے قناعت ، صبر ، توکل اور امید جیسے الفاظ ایجاد کیے ہیں ۔ دوسری دنیا میں حوروں کی رفاقت کا وعدہ کیا ہے ۔ رنگ اتنا صاف کہ چھونے سے چمڑی میلی ہو جائے ۔ داغ دار ہو جا مگر عمر دراز کے چار دن نشاط وصل کی آرزو دل و نظر کی تسکین کی چاہ میں کٹ رہے ہیں ۔ ۱۵

ڈاکٹر رشید موسوی اور جناب حمایت اللہ کا نیا پتہ

303 ROSE APPARTMENT

GARDEN TOWER MASAB TANK.

HYDERABAD-5000 28 (A.P.)

انیس صدیقی (حیدرآباد)

"بہت پچھتائے شعر سمجھ کے"

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے"

زمانۂ طالب علمی میں ہمیں بیت بازی کا بڑا شوق تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انتاکشری نامی کسی شئے کا وجود نہیں تھا اس لیے شعر کا فلمی ہونا اور اس کو گا کر سنانا لازمی نہیں تھا۔ چن چن کر وہ اشعار یاد کر لیئے جاتے جو ایسے حروف پر ختم ہوں جن سے شروع ہونے والے اشعار مشکل سے ملیں مثلاً ؎

رہتے تھے کبھی جن کے دل میں ہم جان سے بھی پیاروں کی طرح
بیٹھے ہیں انہیں کی محفل میں ہم آج گنہگاروں کی طرح

اب سنائیے جناب "ح" سے شروع ہونے والا شعر

لیکن برا ہو اس شوق کا اس لیے کہ اسی کی وجہ سے ہمارے اردو کے استاد کی نظرِ انتخاب اس خاکسار پر پڑی۔ استاد محترم اقبال مرحوم کی صحبت سے ۱۴ برس تک فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے ہم میں شعر و سخن سے دلچسپی کے جوہر دیکھے تو ہم پر خاص توجہ دینی شروع کی اور سخن فہمی کے جراثیم ہم میں داخل کرنے شروع کیئے۔ ہماری تربیت کا سلسلہ اقبال کی نظم "حقیقت حسن" سے شروع ہوا اور فلسفہ خودی، فلسفہ ارتقاء سے ہوتے ہوئے بیشرو داغ، غالب، میر، اور دوسرے اساتذہ تک پہنچا اور ہمیں خود پتہ نہیں کہ ہمارے کس دشمن نے یہ خبر عام کر دی کہ ہم ان گنہگاروں میں سے ہیں جو کہ شعر کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور وقتِ ضرورت شعر سمجھنے کے لیے ہماری خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ بخدا اس تشہیر میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔

شروع میں تو ہمارے ذوق کی تسکین ہوتی رہی جو کہ شعر کی معنویت تک رسائی سے حاصل ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ جوں جوں اردو کے استعمال میں انحطاط آتا گیا ہم پر مصیبتوں کا نزول شروع ہوا۔ ابتداء میں لوگ ہم سے ایسے اشعار کی تشریح چاہنے لگے جن میں بہت دور کی کوڑی لائی گئی ہے۔ مثلاً

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا ؛ کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا۔

ہمیں سمجھانا پڑا کہ مگس یعنی شہد کی مکھی جب باغ میں جائے گی اور پھولوں کا رس چوس کر اسے شہد کی شکل میں شہد کے چھتے میں جمع کرے گی تو اس چھتے سے نہ صرف شہد بلکہ موم بھی حاصل ہوگا اور اس موم سے بنی جو شمع جلے گی تو

ظاہر ہے پروانے بھی آئیں گے اور آئیں گے تو اس کی لو میں جل کر مریں گے بھی۔ یہ ہوئی نہ آسان سی بات لیکن ذرا یہ بات ان کو سمجھانے کی کوشش تو کیجئے جو کہ صرف ٹیوب لائیٹ اور بلب کی روشنی ہی سے آشنا ہیں۔

اسے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

ہمارا یہ کہنا تھا کہ ارشاد ہوا "مجھے فارسی نہیں آتی۔ ذرا سمجھائیے تو سہی"۔

ہم نے کہا کوئی بات نہیں یہی غنیمت ہے کہ آپ نے اسے عربی یا جاپانی نہیں کہا۔

روشنی کے ذکر پر ایک اور سانحہ یاد آیا۔ ایک صاحب بڑی الجھن میں تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شعر تھا ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

انھیں یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی کہ جس بات کا کوئی ذکر ہی نہ ہو وہ ناگوار کیسے گزر سکتی ہے۔ ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ صاحب نثر اور شعر میں فرق یہی تو ہوتا ہے کہ نثر میں معنی ہوتے ہیں اور شعر میں معنویت اور اسی معنویت تک پہنچنے میں شعر کا اصل لطف آتا ہے۔ مثلاً

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا ؛ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

کہنے لگے اس میں معنویت کہاں کی۔ یہ تو سیدھی سادی بات ہے ہمارے ہاں بھی روزانہ لائیٹ جاتی ہے اور گھنٹوں غائب رہتی ہے! اس کے لیے تو کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ ان کے جانے سے ایسا ہوا۔

ہم سے ایک بار فرمائش ہوئی کہ کوئی رومانٹک اور پھڑکتا ہوا شعر سنائیں مثل مشہور ہے کہ برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔ اس کا ثبوت ہمیں فوراً مل گیا۔ اس اچانک فرمائش پر ہم نے سنایا ؎

یہ عشق میں خلش غم کا لطف پا نہ سکا ؛ نظر اٹھا کے بھی ان سے نظر ملا نہ سکا

پہلا مصرعہ تو کسی فاسٹ بولر کے بمپر کی طرح ان پر سے گزر گیا لیکن دوسرے مصرعے پر وہ واقعی پھڑک اٹھے اور ٹھیٹ حیدرآبادی انداز میں کہا "ابّاہ کیا لائیٹ ہونگی"۔ ہم نے خدا کا شکر کیا کہ شاہد صدیقی مرحوم موجود نہیں تھے ورنہ پوچھنے والے کو تو وہ بخش دیتے مگر ہمیں ان کا یہ شعر سنانے کے قصور پر سولی پر چڑھا دیتے۔

مگر ہماری مجبوری پر بھی غور کیجئے۔ اگر اس کی بجائے ہم کہتے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش ہے غالب ؛ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

تو ہمیں ڈر تھا کہ وہ کہتے کہ یہ شعر چار شاعروں عشق، زور، آتش اور غالب نے مل کر کہا ہے۔

سکندر علی وجد کے ایک شعر نے جہاں ہمیں سر پیٹنے پر مجبور کیا وہیں خدا کا شکر بجا لانے کی بھی ترغیب دی کہ ہم کو مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ شعر ہے ؎

جہل کے کنجشک و بوم باغ میں آزاد و شاد ؛ مرغ خرد زیر دام دیکھئے کب تک رہے

ہم نے بتایا کہ کنجشک چڑیا کو کہتے ہیں اور بوم الو کو جسے مغرب میں عقل و فراست کا اور مشرق میں بیوقوفی کا امام مانا جاتا ہے یہ تو ان کی سمجھ میں آگیا لیکن یہ مرغ خرد کونسی نسل کا مرغا ہے وہ جاننا چاہتے تھے۔ کیوں کہ وہ صرف اصیل اور برائیلر مرغ ہی سے واقف تھے۔ ہم نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ میاں مرغ بمعنی پرندہ استعمال ہوا ہے تو فوراً دوسرا سوال وارد

ہوا کہ یہ خود کس چڑیا کا نام ہے۔

ہم نے سر پیٹ لیا اور ساتھ ہی خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ انھوں نے غالب کے ان اشعار کا مطلب نہیں پوچھا ؎

ذرہ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی ؛ غم گیتی سے مرا سینۂ امر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر ؛ کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

اگر پوچھ بیٹھتے تو ہم یا تو لقا کی ڈاڑھی میں الجھ کر رہ جاتے یا پھر داستان امیر حمزہ کے عمر عیار کی زنبیل میں چھپ جاتے۔ ان حادثات سے ہلکان ہو کر ہم نے گھر پر تختی لگادی کہ "اندر آنا منع نہیں ہے لیکن شعر کا مفہوم پوچھنا سخت منع ہے۔ پوچھنے والے کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی"۔

الحمدللہ اس کے بعد کچھ دن سکون سے گزرے لیکن ؎ شامت اعمال ما صورت نادر گرفت

اقبال مرحوم نے بلاوجہ نہیں کہا کہ "سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"۔

حالات تو ضرور بدلے اور شعر سمجھنے کے خواہشمندوں نے دوسرے آستانے ڈھونڈ لیئے لیکن شعر و شاعری سے ہمارا رشتہ برقرار رہا۔ سچ ہے کہ چور چوری سے تو جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اسے عادت یا لت ہی کہہ لیجئے جس نے غالب جیسے شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کردیا ہے کہ ؎

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب ؛ مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

چنانچہ اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر ہم نے مشاعروں میں جانا شروع کیا۔ کیوں کہ کلام شاعر کو شاعر ہی کی زبانی سننے کا مزہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم نے مخدوم کی زبانی "پیلا دشالہ" سنا، شاہد صدیقی کی زبانی ؎

مرے خیال میں تخلیق دل کا راز ہے یہ ؛ کہ عشق وسعت کونین میں سما نہ سکا۔

جوش کی زبانی سنا ؎ اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی ؛ جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا"
جگر نے سنایا ؎ جو کوئی سن سکے تو نکہت گل ؛ شکست رنگ کی جھنکار بھی ہے
توفیق نے کہا ؎ رات کے پیچ و خم ستاروں سے ؛ زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
اور سلیمان خطیب کی زبانی سنا ؎ یاد بولے تو سنکیے میں گجرے کی باس ؛ جیسے کیوڑے کا کانٹا کلیجے کے پاس

اور مجاز، امجد، دہقانی، سرور ڈنڈا سے لے کر شاذ تمکنت تک کا کلام ان کی زبانی سنا ہے۔ کئی اچھے مشاعروں اور ادبی محفلوں کی یاد کو ہم ایک سرمایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہر خوشی کی طرح یہ خوشی بھی دائمی نہیں نکلی۔ مشاعرے بھی ہمیں راس نہیں آئے خصوصاً عام مشاعرے۔ جن میں بدذوق سامعین نے دہقانی جیسے شاعر کو جسے دکھنی زبان کا امام مانا جاتا ہے ہوٹ آوٹ کردیا اور بے معنی اور بے تکے اشعار پر مینڈکوں کی طرح اچھل اچھل کر داد دی۔ اچھے شعراء کی بے قدری اور ترنم اور خوش الحانی سے مشاعرہ مار لیجانے والوں کی قدردانی دیکھی نہ گئی اور مشاعروں میں ہمارا جانا بھی بند ہوگیا۔ دراصل یہ ہمارا نہیں بلکہ ہماری شعر فہمی کا قصور ہے۔

مشاعروں کے بعد جو پناہ گاہ ہمیں دکھائی دی وہ گانے کی محفلیں تھیں۔ خصوصاً غیر فلمی گانوں کی محفلیں لیکن یہاں بھی ہماری سخن فہمی بعض دفعہ آڑے آجاتی ہے۔ مثلاً حیدرآباد کی اکثر محفلوں میں ایک منقبت بہت مقبول ہے۔ بول ہیں ؎

"من بجوت نہر دم علی، علی ؛ تم شیر خدا کے مہابلی"

یہ سب جانتے ہیں کہ شیرِ خدا حضرت علی کا لقب ہے۔ یہ بظاہر ایک سیدھا سادہ شعر ہے لیکن ہے بہت نازک۔ ذرا سے زیر زبر کے فرق سے اس کے معنی بدل جاتے ہیں، چنانچہ ہوا بھی یہی۔ سوائے چند فنکاروں کے جو کہ شعر کو سمجھ کر گاتے ہیں میں نے اکثر کو بجائے "شیرِ خدا کے مہابلی" کے "شیر خدا سے مہابلی" گاتے ہوئے سنا ہے۔ جس سے شعر کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ لیکن صاحب آپ اسے ہماری ثابت قدمی کہیے یا ڈھٹائی کہ چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی۔

ایٹم بم سے پہلے دوسری جنگ عظیم کے دوران بمباری کے خطرے سے بچنے کے لیے زیر زمین پناہ گاہیں بنائی گئی تھیں۔ اور ساتھ ہی آگ لگ جائے تو بجھانے کے لیے پانی کے حوض بھی۔ چنانچہ آج بھی محلہ مغلپورہ کا ایک علاقہ اے آر پی حوض کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ذوق شاعری کی تسکین کے لیے ہمیں آخری پناہ گاہ فلمی گانوں ہی میں ملی۔ مجاز، ساحر، اور شکیل بدایونی وغیرہ نے فلمی گانوں کا رُخ تک بندی سے موڑ کر شعریت کی طرف پھیر دیا۔ اور ان کے کلام کو جب کسی ماہر میوزک ڈائرکٹر نے اپنی دھنوں سے سنوارا تو بامعنی فلمی گانوں نے جنم لیا جن کو سن کر انسان نہ صرف سات سُروں کے سحر میں ڈوب جاتا ہے بلکہ اس کے ذوق سخن کی بھی تسکین ہوتی ہے۔

لیکن صاحب بدبختی نے یہاں بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پہلے تو سریلی موسیقی کی جگہ "تکنیک" نے لے لی۔ لَے کی جگہ "یا ہو" نے لے لی۔ اور شاعری کی جگہ تک بندی نے۔ "جو میں جانتی بچھڑت ہیں سیاں" گھنگٹا میں آگ لگا دیتی کی جگہ "میں تیرا طوطا تو میری مینا" نے لے لی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ "آنکھوں میں بسی ہو تم تمہیں دل میں بسالوں گا ۞ دن رات تمہیں دیکھوں آئینہ بنالوں گا" تو کیا آپ پہلے مصرعے کا مزہ لیں گے یا سائنس کے اس معجزے پر حیرت کریں گے کہ آج تک جو آئینہ دیکھنے پر اپنی صورت نظر آتی تھی اب اس پر محبوبہ کی شبیہ نظر آنے لگی ہے۔

یا پھر کوئی آپ سے چاہے کتنے ہی اچھے سُروں میں پوچھے "تیری نانی مری تو میں کیا کروں" تو آپ کیا جواب دیں گے؟

ہم آخر میں یہی عرض کریں گے کہ جہاں شعر فہمی روح کی غذا ہے وہیں پچھتاوا بھی اس کا مقدر ہے۔ غالب کی لاثانی نصیحت تو آپ نے سنی ہوگی۔ فرماتے ہیں۔ ؎

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۞ میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے"

اب آگے اس خاکسار کی بھی سنیئے ؎

نادان جو بھی شعر کی چکر میں پڑ گیا ۞ کھانے کا اس کو شوق نہ پینے کا ہوش ہے
مجنوں بنا ہوا ہے جو لیلائے شعر کا ۞ ظلمت کدے میں اس کے شب غم کا جوش ہے
پچھتائے گا بہت جو تو سمجھے گا شعر کو ۞ جنگل میں جا کے بیٹھ یہ تیرا ہی دوش ہے

انوار انصاری
(رانچی)

گھوٹالہ

آج کل گھوٹالہ ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح گھوٹالہ کے ذریعے امیر ترین آدمی بن جائے اور دنیا کو اپنے پیروں تلے روند ڈالے۔ اسی لیے تو ہیرا پھیری کی جاتی ہے اور گھوٹالے کے ذریعے ایک اچھی خاصی رقم پیدا کی جاتی ہے۔

کچھ دنوں پہلے بازار میں چینی کی زبردست قلت ہوگئی تھی۔ چینی تو روز مرہ استعمال کی چیز ہے بازار سے دو چار دنوں کے لیے بھی چینی غائب ہو جائے گی تو لوگ چائے وائے کے بغیر تڑپنے لگیں گے۔ بچارے عوام کو اب کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ عوام تو ہوا، پانی اور چائے پی پی کر زندگی کے سنہرے دن گزار رہے ہیں۔ گھوٹالہ کرنے والے عوام کی نبض کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اسی لیے تو چینی کی مصنوعی قلت کا ہوا کھڑا کیا گیا تھا۔ جب ہر طرف شور شرابہ ہونے لگا تو اعلان ہوا کہ اب چینی کے کمی کے بحران پر قابو پا لیا گیا ہے۔ دو ہی تین مہینے کے اندر عوام کے کروڑوں روپیوں کا صفایا ہوگیا تب چینی کے گھوٹالے پر قابو پایا گیا۔

گھوٹالے سے کون انسان واقف نہیں۔ کسی اسکول کا سنگ بنیاد رکھنا ہو یا ہسپتال بنوانا ہو یا عوام کے لیے کوئی فلاحی کام کرنا ہو یا ملت کے نونہالوں کے لیے جدید قسم کی درس گاہ کی تعمیر ہو لوگ بڑھ چڑھ کر نیک کام میں حصہ لیتے ہیں مگر چند برسوں کے بعد اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ بھائی گھوٹالے کی وجہ سے تعمیر کے کام میں رخنہ پڑ گیا اور کام آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ عوام کے ان کاموں میں گھوٹالہ کرنے والے بھی نام کے چُنے ہوئے ممبر ہوتے ہیں جو موقع دیکھ کر گھوٹالہ کرتے ہیں اور موقع دیکھ کر دم دبا کر ان فلاحی کاموں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گھوٹالے کے بعد اس کا خمیازہ بعد میں آنے والے ممبروں کو بھگتنا پڑتا ہے جو گھوٹالے کا نیا موضوع تلاش کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔

دراصل گھوٹالہ ایسا منفعت بخش کام ہے جس کی بدولت آدمی بہت جلد مالی اعتبار سے مستحکم ہو جاتا ہے اسی لیے لوگ فلاحی انجمنوں میں شامل ہو کر اپنی قسمت آزمائی کرتے ہیں۔

گھوٹالے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اور ارباب حکومت کی ملی بھگت کی وجہ سے ہر

ہر شعبے میں گھٹالہ ہونے لگا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک دو سال کے اندر عوام کے چار ... کا زبردست گھوٹالہ ہوگیا ہے اور یہ گھوٹالہ پبلک سیکٹر انٹرپرائز میں ہوا ہے۔ یہی نہیں ہرشد مہتہ ا... نے مل کر بنکوں کا پچاس ہزار کروڑ روپیوں کا گھوٹالہ کر دیا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کثیر رو پیوں ... گھوٹالہ ہو جاتا ہے اخبارات میں خبریں شائع ہوتی ہیں۔ واویلا مچ جاتا ہے۔ چھان بین ہوتی۔ اور اس کے بعد معاملہ ٹائیں ٹائیں فش پر ختم ہو جاتا ہے۔

بنکوں میں، سرکاری دفتروں میں، پرائیویٹ کمپنیوں میں، فلاحی کاموں میں ہر جگہ گھو... داخل ہو چکا ہے۔ افسر اور دیگر افراد موقعے کی تاک میں رہتے ہیں اور موقع ملتے ہی گھوٹالہ کر بیٹھتے ہیں کہیں تو دفتروں میں سخت قانون نافذ ہوتا ہے وہاں گھوٹالے کی گنجائش نہیں رہتی ہے مگر جناب جن تما وہی پتے ہوا دینے لگے۔ ایسے حضرات جب محافظ بن کر ڈاکہ زنی پر اتر آئیں گے تو گھوٹالہ ناگزیر ہو ج...

خواتین خانہ بھی اکثر و بیشتر الم سید ھا حساب بتا کر اپنے شوہروں کی آمدنی سے گھوٹالہ کر... ہیں۔ چھوٹا موٹا گھوٹالہ تو شوہر بچارا سہہ لیتا ہے مگر جب گھوٹالہ زیادہ رقم کا ہوتا ہے تو شوہر کے کان کھ... ہو جاتے ہیں اور جب وہ بیوی سے حساب کتاب لینے پر اتر آتا ہے تو معاملہ نوک جھونک سے بڑھ کر ... تک پہنچ جاتا ہے۔ کچھ والدین ایسے ہوتے ہیں جو بچوں کو پیسے دے دے کر ان کی عادتیں خراب کرتے ... اور جب یہ بچے عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر والدین کے پیسوں کا گھوٹالہ کر دیتے ہیں تو والدین اپنا سر پیٹ... ہیں۔

ہمارے ایک کرم فرما ایک دن کہنے لگے کہ بھائی آج کل لوگوں کا ایمان بالکل خراب ہو چکا ہے۔ پیسہ ہضم کر جاتے ہیں اور پیشانی پر شکن بھی نہیں آتی۔ میں نے اپنے گھر بجلی لگانے کے لیے ایک پڑوسی کو سا... سو روپے دیئے اور پڑوسی نے وعدہ کیا کہ دو تین ماہ کے اندر بجلی لگ جائے گی۔ مگر تین چار مہینے گزرنے... جب بجلی نہ لگی تو میں نے پڑوسی کو ٹوکا تو پڑوسی نے صاف لفظوں میں کہا کہ بجلی کیسے لگتی۔ پیسہ دیجئے تب ہی تو بجلی لگے گی۔ بغیر پیسہ کے بجلی نہیں لگ سکتی۔ یہ سن کر میں نے اپنے کرم فرما کو تسلی دی کہ بھائی آ... کے پڑوسی نے چھوٹا سا گھوٹالہ کر دیا ہے۔ آپ بھی موقعے کی تاک میں رہیے اور اسی قسم کا ایک گھوٹالہ ک... کے ساتھ کر دیجیے حساب برابر ہو جائے گا۔

قارئین با تمکین ہوشیار رہ جائیے گھوٹالہ سے آپ کا سابقہ کبھی نہ کبھی ضرور پڑے گا۔

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ نامور ا... نگار و ناول نگار اور ادیب ممتاز مفتی کا ... میں انتقال ہوگیا۔ بی بی سی سے ان کے انتقال ... ایک خصوصی پروگرام بھی پیش ہوا۔ ادارہ شگوفہ ... اس منفرد ادیب کے انتقال پر ملال کا اظہار کرتا... مدیر

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

نومبر ۱۹۹۵ء

جلد ۲۸ — شمارہ ۱۱

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز: عابد معز (ریاض)
اوورسیز کمیٹی:
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (جدہ)
سعید شوکت (جدہ)
یس۔ ایم۔ حسینی (آسٹریلیا)
غلام نجیب الدین (دوبئی)

مجلس ادارت
مصطفیٰ مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

کتابت: محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

فی پرچہ: ۹ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ:-
شگوفہ، ۳۱۔ بیچلرس کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ فون: آفس 593716
مکان 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

اڑیں گے پرزے (خاکے)

مال مفت (انشائیے)

★ ★ ★

چورن (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن !

C/825. I. 4. سکنڈ فلور، لکشمی اسٹیٹ، عابد روڈ حیدرآباد 500001

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا اِدارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱) عزت بچاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ عزت بچاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی بک باندھنے، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو بیس 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بینک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے۔ اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار (6000/-) روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین کے لیے، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح 6% سود پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ (2) اسکیموں کے تحت مارچ 94ء تک 51935 افراد میں 302,000 ہزار روپے مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 22,05,000 ,4 روپے ہوتی ہے اور جاریہ سال میں اب تک 2644 افراد میں 1,23,56 لاکھ روپے مارجن منی قرض جن کی جملہ لاگت 584.44 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے! اس طرح یہ کارپوریشن اپنے قیام 1985ء سے اب تک 54579 افراد میں 1125.69 لاکھ روپے مارجن منی جس کی جملہ لاگت 4906.49 لاکھ روپے ہوتی ہے جاری کر چکا ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن گزشتہ سال سے اقلیتی طبقہ کے نوجوان افراد کو سالانہ فری ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ گزشتہ سال 2 لاکھ روپے کے صرفہ سے حیدرآباد میں 217 تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوانوں میں سے 119 کو موٹر ڈرائیونگ اور 98 کو کمپیوٹر کی تربیت دے چکا ہے اور اب اس کو اس سال توسیع دے کر نظام آباد، گنٹور اور کرنول میں بھی تربیتی مراکز قائم کئے گئے ہیں جس پر 10 لاکھ روپے کا صرفہ آئے گا جس سے 26 ہنر سکھائے جائیں گے۔ حیدرآباد میں (13) ہنر سکھانے کے لیے اس سال 248 نوجوانوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں 33 کو کمپیوٹر 28 کو ٹائپ رائیٹنگ 100 کو لائٹ ڈرائیونگ 11 افراد کو لیب ٹیکنیشین 7 کو بیوٹیشن 11 کو شارٹ ہینڈ، 10 کو الکٹریشن 5 کو ٹیلرنگ 13 کو ویڈیو گرافی 15 کو فیبریکشن 4 کو ہیوی موٹر ڈرائیونگ 5 کو ہیر ڈریسنگ 6 کو کارپنٹری کی تربیت دی جائے گی۔ گنٹور میں 218 نظام آباد میں 190 افراد کو تربیت کے لیے منتخب کیا گیا ہے اس طرح اس سال جملہ 1180 امیدواروں کو استفادہ کا موقع فراہم ہوگا۔

خواہشمند حضرات مندرجہ بالا پتہ پر رجوع ہوں۔

محمد لائق علی خاں
(مینیجنگ ڈائرکٹر)

یوسف ناظم

مغنیِ تبسم

پروفیسر مغنی تبسم میرے دوست ہوتے ہوتے رہ گئے۔ (وہ اچھی صحبت کے شوقین ہیں۔ ان سے جب بھی اور جہاں بھی ملاقات ہوئی پُر جوش ... اور پُر خلوص ہوئی۔ ہر ملاقات میں تھوڑی بہت علمیت کا بھی دخل رہا اور گو کہ یہ چیز مجھے راس نہیں آتی ہے۔ میں مروتاً اسے برداشت کرتا رہا۔ حیدرآبادی تہذیب کا یہی تقاضا تھا مرحوم جامعہ عثمانیہ کا بھی نام درمیان میں تھا جہاں میں طالب علم رہا۔ یہ وہیں صدرِ شعبۂ اردو ہیں ـــــ اس لیے کبھی یہ جسارت نہیں ہوئی کہ میں مغنی تبسم کے غلط نظریات کی تردید کرتا۔ غلط نظریات کو صحیح اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا جائے تو توجہ صرف اندازِ بیان پر رہتی ہے۔ چاروں طرف سے نظریات وارد ہوتے رہیں تو ادب میں جمود آ ہی نہیں سکتا۔ ہمارے یہاں ادب ہمیشہ سیال حالت میں رہا اور ادب کے قریب آنے والوں کو رقیق القلب بناتا رہا۔ کچھ لوگوں کو اس سیال ادب کی وجہ سے آبدیدہ ہوتے بھی پایا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی غفلت کی وجہ سے شب کے سناٹے میں ادب کی زد میں آگئے۔ بہتوں کا لہو بھی بہا مگر ع

شہیدانِ ادب کا خوں بہا کیا!!!

میں ایک عرصے تک مغنی تبسم کو مغنّی سمجھتا رہا اور اس شبہ میں مبتلا رہا کہ ان کا گھرانہ ہو سکتا ہے بڑے غلام علی خاں کے گھرانے سے ملحق ہو اور ان کا نام بھی الحاقی ہو۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کے نام کا تلفظ ہی الگ ہے اور اس پر تشدید نہیں لگانی چاہیے (شدت تو خود شخصیت میں موجود ہے) مغنی کے معنی لغت میں دیکھیے تو مزید ہیبت ہوئی غنیمت کہ تبسم کے لفظ نے بچا لیا۔

ادب میں چند لاحقے ... نام، تخلص بہت مقبول رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تبسم بھی ہے۔ اس لفظ میں خوبی یہ ہے کہ اس کے استعمال سے طبقاتی فرق مٹ جاتا ہے وہ اس طرح کہ اسے طبقۂ اناث بھی بصد شوق استعمال کرتا ہے اور طبقۂ خواص میں بھی یہ مقبول ہے۔ فرق یہ ہے کہ طبقۂ اناث میں اس کا استعمال بقول علم محترم جناب غالب "تبسم ہائے پنہاں" کے لیے کیا جاتا ہے۔ اصل میں غالب [illegible] کا شکار رہے اور اپنی کمزوری کے اظہار کے لیے انھوں نے "تبسم ہائے" [illegible]

ہیں لیا لیکن جہاں تک ہمارے ممدوح مغنی تبسم کے معاملات کا تعلق ہے وہ اپنے تخلصی نام سے بہر بدگمانی سے بے نیاز ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا تبسم خود ان کے لبوں پر نہیں دوسروں کے لبوں پر۔ میں تو جب بھی ان کے بارے میں سوچتا ہوں غائبانہ تبسم ضرور ادا کر لیتا ہوں۔ مغنی تبسم میرے حساب سے جواہر ہیں لیکن کے جواہر ذرا دیر سے کھلتے ہیں۔ لیکن کھلتے ضرور ہیں۔ وہ محفلوں کے بے کلاہ بادشا اس میں وقت کا تعین نہیں ہے۔ ان سے ملاقات کا صحیح وقت نصف النہار کے بعد ہے لیکن ان کا مزا آفتاب کے تابع نہیں ہے بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے مغنی تبسم کی روشنی طبع میں اضا ہے۔ حیدرآباد میں جہاں بجلی کی روشنی ہمیشہ محبوب کی کمر کی طرح رہتی ہے، مغنی تبسم کی روشنی طبع کیا۔ وہ ادبی محفلوں کی جان و ایمان رہے ہیں۔ ادبی نشستوں اور جلسوں میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ تقریر کا موقع آتے ہی سامعین کی تعداد دس پڑ چکی ہوتی ہے لیکن میں نے صرف مغنی تبسم کی تقریر سننے کی غرض سے لوگوں کو غروب آفتاب کے بعد بھی جوق در جوق آتے دیکھا ہے۔ اندرونی بھی ہوں بظاہر یہ ان کی دل فریب بلکہ دل نواز شخصیت کا تبسم آفریں پہلو ہے۔ نظریات کی حد معلوم نہیں کہ وہ مفاہمت کے قائل ہیں یا نہیں لیکن تحقیق کی مشق میں وہ صلح جو اور امن پسند واقع ہ اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ولی دکھنی اور ولی گجراتی کے قضیے میں توازن پیدا کرنے کی خاطر وہ دو کے درمیان پڑنے والے شہر سورت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت کے بعد یہ بحث ختم ہو گئی ولی دکھنی بھی رہے اور ولی گجراتی بھی۔

ان کا سورت سے تعلق یوں ہے کہ ان کے آبا و اجداد سورت ہی کے متوطن تھے۔ کئی سال پہ دادا حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ اس منتقلی کے بارے میں کئی روایتیں گردش میں ہیں۔ جن میں ایک نیا روایت یہ ہے کہ سورت میں ان کے دادا سے ان کے کسی ولی صفت دوست نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر ہیں کہ آپ کے خاندان میں کوئی پڑھا لکھا شخص بھی پیدا ہو تو اس کی امکانی صورت یہ ہے کہ آپ سے نقل مکانی فرمائیں اور حیدرآباد کو اپنا وطن ثانی بنائیں۔ اور آنے والی نسلوں نے دیکھا کہ ان کے دوست کا مشورہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ کہتے ہیں ان کے دادا کی دیکھا دیکھی اور بھی خا حیدرآباد میں منتقل ہوئے لیکن ان کے یہاں صرف اولادیں پیدا ہوتی رہیں کوئی مغنی تبسم نہیں یہ یہ سارے اہل سورت اگر اتفاق سے کسی جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو مغنی تبسم دل ہی دل میں خوش ہوتے کہتے ہیں:

غنیمت ہے کہ ہم سورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

مغنی تبسم کو جب بھی میں نے صدارتی تقریر کرتے سنا ہے جی خوش ہو گیا۔ افسانہ ہو یا شعر تنقیدی مضمون ہو یا اس قسم کی اور کوئی ناقص چیز، مغنی تبسم اپنے تبصرے اور تجزیے سے اسے با کر دیتے ہیں (مقرر کو بھی)۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے جب دلیل کمزور ہو ان کی آواز نسبتاً بلند تر ہے لوگ قائل ہو جاتے ہیں۔ متنازعہ فیہ مسائل پر جب بولتے ہیں تو سامعین کو شبہ ہو جاتے ہیں کہ کوئی بات نہ رہے گی اور ... نکل جائے۔ مغنی تبسم سے ... آدمی ہیں کس نے کب کیا لکھا تھا

ہے اور مشکل یہ ہے کہ یاد بھی ہے۔ علم سے شغف ہو تو ایسا ہونا ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غیر ضروری باتیں یاد رکھنے کے شوق میں وہ بہت سی ضروری باتیں فراموش کر چکے ہیں۔

پروفیسر کی حیثیت سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی مغنی تبسم نے مصروف رہنے کی راہیں نکالیں ورنہ وظیفہ یاب حضرات کو گھر میں بیٹھ جانے کی اتنی عادت ہو جاتی ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ دوسروں کے گھروں میں بھی بیٹھے رہتے ہیں تکلف نہیں کرتے۔ مغنی تبسم نے ادارۂ ادبیات اردو کا کایا کلپ کر دیا۔ اداروں کے بھی غدود ہوتے ہیں اور صرف اطبائے ادب ان غدود کو تندرست و توانا رکھنے کا گر جانتے ہیں۔ مغنی تبسم اپنی تشخیص اور علاج کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے ورنہ آج کل تو سرجن اور فزیشین جب بل پیش کرتے ہیں تو وہی مریض جسے انھوں نے چلنے پھرنے کے قابل بنایا تھا پھر بستر سے لگ جاتا ہے۔

اپنی زندگی میں آپ کئی پی ایچ ڈیوں سے ملے ہوں گے۔ میں بھی ملا ہوں۔ ان میں سے بہتوں کو سہنا پڑا ہے۔ بہتوں سے ربط ضبط رہا ہے۔ بعض کو دیکھ کر عبرت حاصل کی ہے اور بعض سے فیض۔ ان سب میں عجیب اتفاق ہے کہ میں نے مغنی تبسم کو صحیح النسب پی ایچ ڈی پایا۔ صحیح النسب پی ایچ ڈی اسے کہتے ہیں جس کی شین قاف درست ہو، املا ایسا ہو کہ رشید حسن خاں دم بخود رہ جائیں، انشا ایسی ہو کہ ہر سطر میں بین السطور پوشیدہ ہو اور شاعری، عروض اور اوزان کے لحاظ سے نپی تلی ہو۔ تقریر کیسی ہو وہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ پی ایچ ڈی حضرات صرف پی ایچ ڈی نہیں ہوتے گائیڈ بھی ہوتے ہیں۔ ایک معلم کی صحیح شناخت اس کا اپنا مقالہ نہیں بلکہ وہ مقالہ ہوتا ہے جو اس کی نگرانی میں لکھا گیا ہو۔ میں نے سنا ہے جو طالب علم بھی مغنی تبسم کی زد میں آ جاتا ہے۔ مغنی اس کی نگرانی ہی نہیں نگہداشت کرنے لگتے ہیں۔ ان کی رہنمائی تعاقب سے ملتی جلتی کوئی چیز ہوتی ہے۔ سنہ شاید ۱۹۷۵ء ہو گا جب مجھے بھی یہ شوق ہوا تھا اور مغنی تبسم نے مجھے گمراہ کرنے کا اتنا زبردست پلان بنایا تھا کہ یونیورسٹی سے فارم بھی بھیج دیئے تھے۔ بات شاید فیس کے معاملے پہ پھنس گئی تھی۔ مغنی تبسم تو فیس بھی ادا کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان دنوں میری حیثیت زندہ تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ رودِ موسیٰ میں دوبارہ طغیانی آئے۔ یہ بات بھی مجھے مغنی تبسم ہی نے سمجھائی کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایسے کسی شخص کو اسکالرشپ نہیں دیتی جو عمر کی ۴۵ منزلیں طے کر چکا ہو۔ ایسے ناکارہ شخص کو یو جی سی کی کفالت کرنی پڑتی ہے۔ دیکھا آپ نے کیسے کیسے قاعدے ہمارے یہاں رائج ہیں۔ ہمارے یہاں اسکالرز اتنی قلیل تعداد میں کیوں ہیں اب معلوم ہوا۔ لیکن پروفیسر مغنی تبسم کو میرے پی ایچ ڈی نہ ہونے اور ان کی نگرانی میں مقالہ نہ لکھنے پہ بددل نہیں ہونا چاہیے۔ میں انھیں یوں بھی اپنا نگراں تسلیم مانتا ہوں۔ اس کے لیے مقالہ لکھنا کیا ضروری ہے (اپنی عافیت مجھے کبھی عزیز نہیں رہی۔)

"سب رس" ماہنامہ ایک ایسا رسالہ ہے جو اہلِ نظر کو بتاتا ہے کہ اردو ناقابلِ تقسیم ہے یہ رسالہ حیدرآباد سے بھی شائع ہوتا ہے اور کراچی سے بھی۔ ہندوستان کے کئی ادبی رسالے یہاں سے وہاں لے جائے گئے۔ وہاں بھی ہے اور ایک آدھ رسالہ اب بھی چھپ رہا ہے۔ تر[illegible] نکالا۔ ان میں سے کچھ دونوں جگہ بند ہو گئے۔ لیکن سب رس نے پیٹھ نہیں دکھائی۔ اس کا [illegible]

شاہد یار کے مستحق ہیں تو مغنی تبسم بھی اس کے حق دار ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ کسی 'مرشد' کے دو سجادہ نشین ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اس کی تنہا مثال ہیں۔ مجھے یہاں کے اور وہاں کے ہر دو ایوانِ اردو میں سانس لینے کا موقع ملا ہے اور دونوں جگہ ایسا محسوس ہوا:

ہے ہوا میں زبان کی تاثیر

روزنامہ 'سیاست' میں جب بھی مغنی تبسم کی تصویر دیکھتا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کا وہ چہرہ آجاتا ہے جو وہ کار چلانے کے دوران استعمال کرتے تھے۔ اس چہرے پہ ہوائیاں اڑتی دکھائی دیتی تھیں۔ راہگیر ڈر کے مارے سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاتے تھے زیادہ محتاط لوگ فٹ پاتھ پر آتے تھے۔ سواریاں ان کے ہم نشینوں کی جان ان کی ہتھیلی پہ ہوتی۔ زندگی کی لکیر اتنی مدھم کہ تقریباً معدوم۔ جو بھی ان کی کار سے نیچے اترتا فوراً دو رکعت شکرانے کی ادا کرتا اور ان سے عرض کرتا کہ ہم دونوں کے تعلقات 'پیدل تعلقات' کی حد تک رہیں تو اس میں دونوں کی عافیت ہے۔

پروفیسر مغنی تبسم نے ایک کام ڈھنگ کا یہ کیا کہ اپنی کار بیچ دی۔ ڈاکٹر اقبال کے دوست ذوالفقار علی خاں کی کار "خروش" تھی مغنی تبسم کی کار میں کہیں کوئی سائیلنسر لگا ہوا نہیں تھا۔ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا آہ و بکا میں مصروف ہے۔ اس میں ہارن کی ضرورت نہیں تھی لیکن مغنی تبسم اسے تب بھی بجا دیتے تھے کہتے تھے۔ جب ہارن ہے تو اسے بجانا ہی چاہیے ورنہ لوگ سمجھیں گے میری گاڑی میں صرف ہارن ہی ہے جو نہیں بجتا ہے۔ دوسرا کمال یہ ہے کہ اس کی فروخت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں ان کی آبرو بڑھ گئی اور ضمناً شہر کی آبادی بھی۔ ع

بارے آرام سے ہیں اہلِ دکن اس کے بعد

مُشتاق یُوسفی

مہرِ دو نیم سے حرفِ باریاب تک

BCCI نے جن ادیبوں اور شاعروں کو خراب و خوار و خجل اور خوشحال کیا (بوسۂ مرگ) سے سلا دیا۔ ان میں افتخار عارف کا تیسرا نمبر ہے۔ دوسرے نمبر پر محبی و مشفقی جناب الطاف گوہر ہیں جو دورانِ قیامِ لندن، اپنے آقائے سابق الانعام فیلڈ مارشل ایوب خان کے کارناموں کو بزبانِ انگریزی رقم کر چکے ہیں۔ وہ اردو کے مانے ہوئے ادیب ہونے کے علاوہ عاقل و دور اندیش بھی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ کتاب اردو میں اس لیے نہیں لکھی کہ اندیشہ تھا کہ پڑھنے والے سمجھ جائیں گے..... اور پھر سمجھ لیں گے۔ ایسے نازک موضوعات پر ہاتھ قلم کروائے بغیر نثر میں کچھ کہنا مصنف کی چالاکی کے علاوہ جلاد کی نالائقی اور فرائض سے غفلت کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اگر خدانخواستہ ہاتھ قلم ہو جاتے تو پھر ہم جیسے عقیدت مندانِ قدیم اور افتخار عارف جیسے بیعت کنندگانِ جدید مرشد کے ہاتھ کی بجائے پیر کو بطور تبادل بوسہ گاہ چومتے۔ مگر وہ غلام اسحاق خان کے خلافتِ سلم" میں دستخطی اداریے کیسے لکھتے۔ وہ ہمارے لائق ترین اور واحد بیوروکریٹ ہیں جن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے دو PRESIDENTS کو جو اس کے باس رہ چکے تھے، ٹھکانے لگایا۔ ایک کو مخالفت کر کے اور دوسرے کو حمایت کر کے۔ جو خنجر و شمشیر سے نہ مرا، اسے KISS OF DEATH (بوسۂ مرگ) سے سلا دیا۔

اب اس خجل و خوشحال گھرانے کا پہلا نام کیا بتائیں اور کیسے بتائیں۔ زبان پہ آتے آتے رہ جاتا ہے۔ کسرِ نفسی "ہیں! ہیں!!" کرتی ہوئی منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شہرتِ عام اور رشکِ خواص و عوام کا اندیشہ بھی ہے۔ یوں بھی تعلیِ شاعرانہ کا رواج اب صرف سیاسی تقریروں تک محدود ہے۔ جسے داغؔ کہتے ہیں دوستو! اسی روسیاہ کا نام ہے۔

اگر آپ اس وقت لحاظ کر کے خاموش بھی رہیے تو باہر نکلتے ہی مجھ سے نہیں تو افتخار عارف سے ضرور پوچھیں گے کہ ان باتوں کا "حرفِ باریاب" سے کیا تعلق؟ اس تعلقِ خاص کی وضاحت ذرا آگے چل کر کروں گا۔ پہلے خوشحالی کی اس شاخِ ثمردار کی ایک جھلک دکھانے کو جی چاہتا ہے جس کی با جماعت خوشہ چینی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ BCCI کے دو سینئر افسروں کا انتقال ہوا تو بینک کے سیاہ و سفید و سرمئی کے مالک جناب آغا حسن عابدی نے ان کی بیواؤں کے نام ایک ایک ملین ڈالر کے مکانات منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک ملین ڈالر نقد ادا کیے گئے۔ یعنی ہر دو مدات ملا کر دونوں کو چھ چھ کروڑ روپے اور ایک ایک مرسیڈیز ادا کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سہاگنیں ان بیواؤں کو رشک کی نگاہ سے اور اپنے زندہ شوہروں کو قہر بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہم دونوں یعنی افتخار عارف اور فقیر شرمندہ شرمندہ سے پھرتے تھے کہ مرنا اگر یہی ہے تو جینا فضول ہے۔ BCCI کے در و دیوار زبانِ حال سے جان پر کھیلنے کی دعوت دیتے رہے۔

اے مردِ ناتواں تجھے کیا انتظار ہے؟

صاحبو! برکت اور منفعت بخش موت ہر کس و ناکس کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ یہ تمہید ہم نے برِبنائے تفنن نہیں باندھی۔ BCCI نے بیرونِ ملک جو رسید روزی و رسوائی فراہم کیا، اس کی سہولتوں اور فراغت فراواں کے طفیل ہمیں تین کتابوں کی سوغات ملی۔ افتخار عارف کی "مہر دونیم"، الطاف گوہر کی "ایوب خان"
اور تیسری کتاب ایک بار پھر افتخار عارف کی "حرفِ باریاب" جس کا معتدبہ حصہ لندن کے روز و شب کے جلی و خفی حوالوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں اس مجموعے کے ایک ایسے دلچسپ پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانی چاہوں گا جس کی طرف غالباً ابھی تک کسی کی توجہ نہیں گئی۔ ظاہری بات ہے، ان کی شاعری ان کی واردات قلبی ہے اور کیوں نہ ہو لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ان کے بظاہر عشقیہ اشعار سے بھی BCCI کی تاریخ ولادت و شفقت و وفات کے مادے نکلتے ہیں۔ ان کی اور عاجز کی آپ بیتی میں اس کی "باپ" بیتی کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ افتخار عارف تیرہ سال BCCI سے متعلق و منسوب اور وظیفہ یاب رہے۔ اس کی داستان لذیذ بھی ہے اور سبق آموز بھی! اس میں کچھ بالانشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ مگر ہم اس کو کسی نامناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم ایک جملے کے کوزے میں اس بحرِ تلخاب کو یوں بند کریں گے کہ بینک کو چلانے والوں نے بینک ڈپارٹ کو منافع سمجھا اور منافع کو اپنا ماہانہ معاوضہ سمجھ کر کھا گئے۔

افتخار عارف کو ایک لحاظ سے BCCI اور اس کے آقایانِ ولی نعمت اور غزنویانِ عالی مرتبت کا فردوسی کہا جا سکتا ہے۔ شعر اگر ہمارا وسیلۂ اظہار جلال و ملال ہوتا تو ہم بھی اپنے لیے یہی لقب تجویز کرتے۔ فرق اتنا ہے کہ روایت کے مطابق فردوسی نے انتقاماً محمود غزنوی کی ہجو اس وقت کہی جب اسے حسبِ وعدہ "شاہنامہ" لکھنے کے صلے میں اشرفیاں نہیں ملیں لیکن افتخار عارف اور ہم فردوسی سے زیادہ چالاک نکلے کہ ہم نے شاہ اور اس کے مصاحبوں، حواریوں اور درباری مداریوں کی مدح لکھے بغیر پوری اشرفیاں ماہ بماہ وصول کیں اور ہجو بھی کہی۔ اشرفیاں ہمارا حق محنت تھا۔ . . . . . وہ محنت جو تازہ بتازہ ہجو کہنے میں ماہ بماہ اور سال بسال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب محمود غزنوی کے گماشتے فردوسی کے گھر اشرفیوں کے توڑے لے کر پہنچے تو اس کا جنازہ نکل رہا تھا۔ لیکن موجودہ کیس میں جنازہ خود ممدوح کا نکلا۔ اس ضمن میں منتخب اشعار ہم آگے چل کر سنائیں گے۔

افتخار عارف اور ان کی شاعری پر میں تیسری بار مضمون پڑھ رہا ہوں۔ بظاہر اب صرف ایک کی اور گنجائش رہ گئی ہے۔ پرانے دوستوں کے بارے میں ہر بار دلچسپ اور سچی بات کہنا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ان سے دشمنی ہو جائے۔ میں نے ۱۹۸۳ء میں اردو مرکز لندن اور پھر ۱۹۹۲ء میں کراچی جمخانہ میں افتخار عارف کے بارے میں جو کچھ پڑھا، اسے ان کے دوستوں نے مدحیہ اور دشمنوں نے مزاحیہ سمجھا اور دونوں خوش خوش گھر لوٹے۔ خود افتخار عارف یہ دیکھ کر محظوظ ہوئے کہ بچھو اپنے پیاروں کو پیار بھی اپنے ڈنک ہی سے کرتا ہے۔

اس دفعہ بھی وقت کی کمی اور اپنے تساہل غیر عارفانہ کے سبب میں جہاں تہاں سے اپنے مضامین سے اقتباسات نئی ترامیم اور تازہ اضافوں کے ساتھ، پیش کروں گا جنھیں آپ اس طرح سماعت فرمائیے جس طرح پرانی گھسی پٹی فلم

کے شائقین اس کا نام نہاد نیا پرنٹ دیکھتے ہیں جس میں یہ تک نظر نہیں آتا کہ اسکرین پر جو دو سائے نظر آرہے ہیں ان میں سے ہیروئن کون ہے اور ہیرو کون .... تخیل کی آنکھ پہ حسرت کی عینک لگا کر ان کو یعنی اپنے ہی ماضی کو دیکھتے ہیں۔ جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں۔

سرقے کی بدترین اور سب سے بھونڈی شکل اپنے ہی فقروں کی تکرار اور اپنی ہی تحریر کی چوری ہے۔ جو صرف اس صورت میں جائز ہے کہ مصنف کو اللہ کی رحمت اور حاضرین کے حافظے کی کمزوری پر یقین کامل ہو۔ سو اسی اعتراف اور امید کے ساتھ گزارشات نویں پرانی تحریر کے پیوند جا بجا لگائے ہیں۔ یہ نہ مقالہ ہے نہ خطبہ عالمانہ، بلکہ سادہ پانی کا وہ گلاس ہے جو دیستوران میں اچھی چائے سے پیشتر مفت ملتا ہے۔ آپ رسماً چند گھونٹ لے لیں تو میں خود اسے اٹھا کر علیحدہ رکھ دوں گا۔ پھر بادہ عارفانہ کا دور چلے گا۔

جب کسی شخص کے دشمنوں کی تعداد میں یکایک اور بلاوجہ زبردست اضافہ ہو جائے تو جاننا چاہیئے کہ اس نے زندگی میں قابل ذکر، اور قریبی دوستوں کے لیے ناقابل برداشت ترقی کی ہے۔ یعنی اس کی اپنی تمنا سے کم، مگر حاسدوں کی تاب سے زیادہ۔ جب یہ منزل آجائے تو ترقی کی رفتار کو مخالفین کے رشک و حسد کے درجۂ شدت سے ناپا جا سکتا ہے۔ سو افتخار عارف اس دوست آزما مرحلے سے زخمی مگر سربلند گزرے ہیں۔ اندازاں کا فاتحانہ کم، فدویانہ زیادہ ہے۔ یہ ان کی شائستگی کا تقاضا، منصب کی مجبوری اور طبیعت کا ڈسپلن ہے۔ وہ مشاعروں میں جم کے پڑھتے ہیں اور کسی کو جمنے نہیں دیتے۔ اتنی کم مدت میں اتنی شہرت کمانے کے بعد کوئی شاعر اپنے ہم چشموں کا ہیرو نہیں بن سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ انہیں شہرت تو بہت ملی مگر اس کے نتیجے میں ملا کیا؟

اک خلعت دشنام و کلاہ سخن بد

تصور ان کا صرف اتنا ہے کہ اچھا شعر کہتے ہیں اور اس طرح پڑھتے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔ محترمی ظفر اقبال صاحب نے کہ آشنائے رموز شعر و شہرت و دشنام ہیں، ایک منہ پھٹی ردیف میں کیا حسب حال شعر نکالا ہے۔

گمنام جو بھی رہتا ہے، عزت اسی کی ہے ÷ مشہور ہوئے گا، تو بہت خوار ہوئے گا

شعر لاجواب ہے، مگر ظفر اقبال صاحب کو گمنامی کا ذاتی تجربہ نہیں۔ ہم کہ ایسے ازانبوہ گمنامان پاکستان ہیں، اپنے تجربے کی بناء پہ عرض کریں گے کہ بے عزتی تو گمنامی میں بھی ہوتی ہے، مگر اس طرح جیسے ایک روزہ دار دوسرے روزہ دار کو گالی دے۔

انہیں جو مقام، شہرت اور ستائش بال سفید ہونے سے پہلے ملی، وہ اردو شاعروں کو بالعموم مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ یادش بخیر، تحسین سروری ایک معروف ادیب گزرے ہیں۔ آخری ایام میں مفلسی نے گھر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کچھ اس کا سبب حالات تھے اور کچھ، بلکہ بہت کچھ وہ خود ..... احباب نے مشورہ دیا کہ رائٹرز گلڈ سے رجوع کرو۔ تحسین سروری نے اپنی درخواست میں لکھا کہ رائٹرز گلڈ میری وفات کے بعد، حسب ضابطہ و دستور، میری بیوہ کو ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ دے گی۔ میری استدعا ہے کہ مجھے اس کا نصف یعنی پانچ سو روپے زندگی میں ہی دے دیئے جائیں تاکہ اطمینان سے مر سکوں اور گلڈ دگنی زیر باری سے بچ جائے۔

٭ افتخار عارف کو بھی حکومت برطانیہ نے قبل از پیری، پنشن کا حقدار تسلیم کر لیا ہے۔

وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ جو لوگ کسی لحاظ سے واجب الاحترام نظر نہیں آتے، انہیں بھی ...... ادبا کا انہیں کو تعظیم دیتے ہیں جس شخص سے افتخار عارف غیر معمولی تواضع و تکریم سے پیش آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے مافوق الفطرت حد تک نالائق سمجھتے ہیں۔ پہلے پیر چھوا کرتے تھے، اب گھٹنے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ان کی گردن پکڑ سکیں۔ کہتے ہیں:

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سب اس کے رفیق ٭ جس کو اصول فرق مراتب آتا ہے

چار عناصر تو ان کے رقیب ہوگئے مگر ان سب کا مجموعہ شد یدگی .... انسان .... نہ کبھی کسی کا ہوا، نہ ہوگا۔ ہر ایک سے تپاک اور گرم جوشی سے ملنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کے دلوں میں خود کھوٹ ہے ان کو یار کے پیار میں بھی P.R. نظر آتا ہے۔ خود دنیوی اعتبار سے چوکس اور ہوشمند ثابت کرنے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کی مہر و مروت کو منافقت سے تعبیر کیا:

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے ٭ ہمیں تو لگے ہے وہ عیّار سا

افتخار عارف کے ذوق اور مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ ان کی پسند و ناپسند کی قطعیت اور تنوع سے ہوتا ہے آیئے، پہلے ان کی چڑ پر نظر ڈالیں۔

مفلس آدمی، شعر ناشناس باس، بینکرز، ہر قسم کی دال اور سبزی، سچے ساٹن کی قمیض، بدن کی ہر وہ جنبش اور حرکت جس پر ورزش کا گمان ہو، چھوٹی بحر اور پختہ عمر والوں کی صحبت سے پرہیز کرتے ہیں۔

اب ذرا ان کی مرغوبات ملاحظہ ہوں:

پہلے نمبر پر سیخ کباب، دوسرے نمبر پر شامی کباب، تیسرے پر بہاری کباب، پھر کسی بھی قسم کا کباب جو دستیاب ہو، اس کے بعد بریانی جس میں چاول برائے نام ہوں، تیز مرچیں اور گرم مصالحہ اور اسی خاصیت کے تازہ ترین اسکینڈل، نیز سا میٹھا جس میں شکر کے ساتھ کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب شکر خوری

مرزا کہتے ہیں کہ یورو پین "میٹھے" ذیابیطس کے مریضوں نے ایجاد کئے تھے۔ سیاہ رنگ بھی پسند ہے بشرطیکہ غلط جگہ لگا ہوا ہو۔ مطلب یہ کہ چہرے پر نہ ہو۔ کتاب سے عشق ہے۔ چنانچہ وہ چہرے بھی پسند ہیں جو اس سے مشابہت رکھتے ہوں، کتابی ہوں:

کر دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان کے برعکس مرزا کو کتابی چہرے سے چڑ ہے، مگر انٹلکچوئل خاتون کو قدر و شیفتگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بشرطیکہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہو۔ تین "خ" کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ TRIPLE "خ" مخفف ہے مراد: خوبصورت خواتین کے خاوند۔ واضح رہے کہ یہ بات ہم نے مرزا کے بارے میں کہی ہے اور صرف یہ دکھانے کے لیے کہ چڑ کی معقول وجہ نہیں ہوا کرتی! افتخار عارف کو بات گرے، تنگ گیپ، بند گلے کا سفید کوٹ، سرخ موزے، جوانی کے مجروح جذبات سے میچ کرتی ہوئی ٹائی، یعنی لہو لہان لال، زردی مائل سلک کی قمیض انہیں بھاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے خوب پھبتی ہے۔

زرد رنگ پر یاد آیا کہ ایک دن ہمارے دوست پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنی جمالیاتی ترجیحات اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں بھٹی رنگ، گدرایا ہوا سڈول پن، چکنی جلد اور گداز CONTOURS بہت پسند ہیں۔ اس پر مرزا عبدالودود بیگ بولے کہ یہ پانچوں خوبیاں "بدرجہ اتم" گولائی کے پپیتے میں پائی جاتی ہیں۔

کیسی شاعری اچھی ہوتی ہے اور کون سی بُری، اس کی وضاحت، مولانا حالی کی طرح بعض شاعر اپنے مقدمے کر دیتے ہیں اور بعض اپنے ہی اشعار سے یہ فرق ذہن نشین کروا دیتے ہیں۔ افتخار عارف نے نہ کمزور اور ڈھیلا شعر کہا، نہ ہماری طرح اپنا مقدمہ آپ لکھا کہ دوسرے تعریف کرنے میں بخل نہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "مہر دو نیم" کی ابتدا دو معرکۃ الآراء مقدموں سے ہوتی ہے۔ پہلے مقدمے میں فیض صاحب نے ان کی انفرادیت آہنگ عروض، لغت اور محاورے میں اجتہاد، ظلم و تعدی، جبر و زباں بندی کے خلاف احتجاج اور رزق کے امیروں کی محتاجی تنزیل پر بڑے جامع اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ اس مختصر مگر خوبصورت مقدمے کے ہوتے ہوئے، مخدومی و محبی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے عالمانہ اور بھاری بھرکم مضمون کی، بحیثیت مقدمہ ثانی، چنداں ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ بعض ادبی حلقوں میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان حلقوں کو دونوں ممتاز بزرگوں کی متفقہ تعریف بے مزہ کیا۔ لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ افتخار عارف اپنی وضع احتیاط اور رکھ رکھاؤ کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لکھنؤ میں یہ دستور تھا کہ بہو بیٹیاں، بالخصوص نئی نویلی دلہن، ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جاتیں تو رستے میں کہاروں کو مدعا نہیں بدلنے دیتی تھیں اور روانہ ہونے سے پہلے ڈولی میں ایک پتھر رکھوا دیتی تھیں تاکہ کہاروں کو اصل وزن کا اندازہ نہ ہوسکے۔ بعض کمزور دل والے فقط وزن پر ہی عاشق ہو جایا کرتے تھے۔ سو محب گرامی قدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ وہ بھاری پتھر ہے جو چوم چوم کر چھوڑنے کی بجائے ساتھ رکھنے کے لائق ہے کہ ہماشما کی نظر بد سے بچاتا ہے۔

یہ ڈولی میں پتھر والی بات جب لندن سے سینہ بہ سینہ اور حسینہ بہ حسینہ دلی پہنچی تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بہت بُرا مانا۔ حالانکہ، خدا گواہ ہے، ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ ایسی شاعری کسی سرٹیفکیٹ کی محتاج نہیں۔ عزیزم افتخار نے منہ سے تو کچھ نہ کہا کہ وہ ہماری محبت، خلوص نیت اور بھولپن پر یقین کامل رکھتے ہیں، مگر اس واقعے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ہم کوئی مضمون پڑھ رہے ہیں تو ایسی گونگی تالی بجانے لگے جس میں دونوں ہاتھ تو ملتے ہیں، آواز بالکل نہیں نکلتی۔ صبح ہم نے برادرم مشفق خواجہ سے اپنی الجھن اور دونوں عزیز دوستوں کی آزردگی کا ذکر مشورۃً کیا تو فرمایا کہ ان سے کہہ دیجیے کہ میں اب ڈولی سے یہ پتھر اس وقت تک نہیں نکال سکتا جب تک تم کسی دوسرے پردہ نشین کی ڈولی کا پتہ فراہم نہ کرو جس میں یہ پتھر رکھ سکوں۔

لندن کی اس خوبصورت اور یادگار تقریب میں میں نے اعتراف کیا تھا کہ میں نے کبھی شعر نہیں کہا، اور از بسکہ سارے کام نثر سے اچھے خاصے نکل جاتے ہیں، اس لیے آئندہ شعر کہنے کا کوئی احتمال بھی نہیں۔ میں نقاد بھی نہیں کہ اچھے اور بُرے شعر میں تمیز کر سکوں۔ نہ میری صحت اس کی اجازت دیتی کہ کسی بھی بڑے شاعر کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر سکوں۔ پوچھا گیا، یقیناً، ان ہی خامیوں کی بنا پر آپ نے مجھے اظہار رائے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اس دن یہ بھی عرض کیا تھا کہ دراصل مجھ جیسے نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کچھار میں شیر کو VEGETARIANISM کے فوائد و فضائل پر لیکچر دے۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں افتخار عارف ہی سے رجوع کرنا چاہیے کہ وہ اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر اور شاعر کے پارکھ بھی ہیں۔ وہ خراب شعر، نیم گرم دوستی، صبح سائرن اور ٹھنڈے احباب برداشت نہیں کر سکتے۔ خراب شعر، نثری نظم اور بے رس نثر لکھنے والوں کے بارے میں ایک زمانے میں افتخار عارف کا عقیدہ تھا کہ ان کی نماز جنازہ حرام ہے۔ یہ بھی پرانی تہذیب کی شائستگی، اور موجودہ کلچر کی مجبوری ہے

کہ بدکو جس نے خلق خدا کی زندگی عذاب کر دی ہو، کبھی زندگی میں روکتے تھے، نہ ٹوکتے تھے۔ اس کے غسلِ میت اور تجہیز و تکفین کے بعد اس کا جنازہ سامنے رکھا جاتا اور لوگ ہر طرح سے اطمینان کر لیتے کہ اب یہ اللہ کر ذلیل نہیں کر سکتا تو پہلی بار اس کے بارے میں سچ بولتے تھے اور نمازِ جنازہ حرام ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ پہلے ہم موت سے نہیں ڈرتے تھے مگر اب ہمیں محض افتخار عارف کے فتوے کی وجہ سے موت سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اس لیے کہ پشتو محاورے کے مطابق ہم اپنا مُردہ خراب نہیں کروانا چاہتے۔

اس زمانے میں خراب شاعر کے لیے افتخار عارف نے ایک اصطلاح وضع کر رکھی تھی "بکری شاعر"۔ شعر و شاعری سے بیزاری کی وجہ تو ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن بکری بیچاری میں پہلی نظر میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ افتخار عارف اس کے کباب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ داد افتخار عارف خراب شعر کی بھی دیتے ہیں کہ یہ ان کی شائستگی اور آدابِ سماعت کا تقاضا ہے۔ مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ اچھے شعر پر سینہ پہ ہاتھ رکھ کر سبحان اللہ سبحان اللہ! کہتے ہیں۔ بُرا شعر سُنتے وقت ان کے منہ سے کچھ عجیب و غریب آوازیں نکلتی ہیں جو داد سے مشابہ ضرور ہوتی ہیں، مگر ڈکشنری میں نہیں ملتیں۔ لگاتار خراب شعر سننے پڑیں تو وہ سر پیٹنے کی بجائے دائیں ہاتھ سے بار بار اپنا زانو پیٹتے ہیں۔ اگر شعر بہت ہی خراب ہو تو اٹھ کر اپنے مخصوص انداز میں شاعر کے گھٹنے پکڑ لیتے ہیں جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کہیں وہ شعر سنا کر بھاگ نہ جائے اور یہ اسے اپنی تازہ غزل بھی نہ سنا سکیں۔

افتخار عارف ایک لطیفہ ایک ذہین اور منہ پھٹ شاعر کے حوالے سے سناتے ہیں۔ اس نے ایک شاعر سے جو ۵۰ سال سے بڑی لگن اور مستقل مزاجی سے شعر کہہ رہے تھے، پوچھا کیا آپ کو کبھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ میں بھی اچھے شعر کہہ سکتا!

افتخار عارف لندن میں کوئی چودہ سال مشاعرے لوٹتے رہے۔ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں بھی برابر شبخون مارتے رہے۔ لندن میں ہم نے ان کی پذیرائی اور مقبولیت کا یہ عالم دیدہ رشک و حیرت سے دیکھا کہ جب ان کے اہل خانہ و خاندان لندن میں نہیں ہوتے تھے تو روزانہ ان کے فلیٹ کے دروازے پر کوئی فین، ٹفن کیریئر یا PLASTIC CONTAINER میں تازہ کھانا رکھ جاتا تھا۔ کبھی ایک سے زیادہ گھر سے آیا ہوا ڈبہ بھی دیکھا گیا۔ یہ غیبی سلسلہ مہینوں جاری رہتا۔ یہ تو ہم نے سُن رکھا تھا کہ حضرت موسیٰ کی ناشکری امت پر آسمان سے من و سلویٰ اترا کرتا تھا۔ اور یہ بھی سنا تھا کہ اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ لیکن یہاں تو شکر مع شکر دانی نازل ہو رہی تھی! ایک دفعہ ہم بھی تنہائی اور غذائی قلت کا شکار ہوئے تو ایک بھرا ہوا ٹفن کیریئر، سرخ ربن اور SCENTED پرچی سمیت جو ان کی دہلیز پہ رکھا تھا۔ چپ چپاتے اٹھا لائے کہ بھوک اور دوستی میں خیانت مجرمانہ جائز ہے۔ کیا عرض کروں ہر خانے میں ایک لذیذ ڈش اور ہر ڈش سے کھانے کی خوشبو کے علاوہ لبِ دفا کی لپٹیں بکثرت آئیں۔ شعر کی داد، نرگسی کوفتے اور شاہی ٹکڑے سے ملتی ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ہم لکھنے کے باب میں نہایت کاہل اور سست رفتار واقع ہوئے ہیں۔ بارہ سال بعد ہماری ایک کتاب آئی ہے۔ لیکن ہماری نثر کی تعریف میں اگر کوئی ہمیں اُردکی دال سے بھی نواز دے تو ہم روزانہ لکھنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا مطلب شکریے کا خط لکھنے سے ہے۔ اس پر یاد آیا کہ دال نہ صرف یہ کہ افتخار عارف کبھی نہیں کھاتے، گھر میں پکنے بھی نہیں دیتے کہ بگھار لگنے سے شعر کا نزول بند ہو جاتا ہے۔ سبزی کو صرف بیمار اور چوپایوں کا حق سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

انھوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں خود کو بارہواں کھلاڑی کہا ہے جو اس انتظار میں بیٹھا گیندیں گنتا رہتا ہے کہ

کوئی کھلاڑی زخمی ہو تو اس کے عوض اسے بھی کھیلنے کا چانس ملے۔ یہ بھی ان کی کسر نفسی ہے۔ ہیں تو وہ کسی طرف سے بارہویں کھلاڑی نظر نہیں آتے۔ ہر لحاظ سے جاوید میانداد ہیں۔

جہاں تک ان کے شعری شجرے کا تعلق ہے انھوں نے اپنا سلسلہ کرامت اکابرین ثلاثہ تک پہنچایا ہے۔

انیس، آتش، یگانہ محرمان عالم حرف
اور اب اس سلسلے کی آبرو ہم سے رہے گی

ایک اور سیاق و سباق میں ہم حریف حرف باریاب کو متوجہ کرتے ہیں۔

مرے مہرباں! کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھیے۔

ہم انہیں ان کی پسند کے عروضی اور معنوی رشتے جوڑنے سے منع نہیں کرتے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اچھے شاعر کا سلسلہ خود اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ افتخار عارف اپنے منفرد دلکش اور لہجے کی بناء پر اسی قبیلہ خود نگری و خود نسبتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ امر ان کے لیے باعث فخر ہونا چاہیئے کہ وہ بے استاد ہے پیر لے اور ادبی اعتبار سے غیر مقلد ہیں۔ غالب نے ایک خط میں مکتوب الیہ کے کلام کی اصلاح کرنے سے معذرت کراتے ہوئے بڑی خوبصورت تاویل پیش کی تھی۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضعیف ہوگیا ہوں۔ ہاتھوں میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی دم نہیں رہا۔ تم بھی اصلاح کے محتاج نہیں رہے۔ لکھتے ہیں: "شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے"۔ اسی استعارے کو جاری رکھتے ہوئے عرض پرداز ہوں کہ افتخار عارف جوان ہونے سے پہلے ہی شکار کھیلنے لگے تھے۔ اور شکار بھی بے اعانت شیر۔ بے اعانت شیر اس لیے کہ خود شیروں کا شکار کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اب انہی کی کھال پہ بیٹھ کر فکر سخن، یاد خدا اور ذکر بتاں کرتے ہیں۔

رہا اس سلسلے کی آبرو سلامت رہنے اور رکھنے کا سوال، تو اس میں کلام نہیں کہ افتخار اپنے سلسلہ عارفانہ اور منفرد طرز تغزل کی آبرو ہیں۔ اور اسی آبرو کو بچانے کی خاطر ہی وہ ایک ہاتھ سے اپنی دستار تھامے رہتے ہیں اور دوسرے سے دشمن کا گلا سہلاتے ہیں۔ اگر تیسرا ہاتھ ہوتا تو اس سے بھی مزید کچھ کام لیتے۔

حرف کو شائستہ شعر بننے میں بہت سے جانکسل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرجام سخن گوئی، یعنی شعر گوئی کے کمال کو غالب نے رگ گفتار سے خون جگر کشید کرنے سے تشبیہ دی ہے۔

خون جگر است از رگ گفتار کشیدن

علامہ اقبال نے مولانا گرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "جہاں اچھا شعر دیکھو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے"۔

افتخار عارف، اپنے فن کے آداب اور ہنر کے ڈسپلن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ بے اختیار آہ کو آمد اور ریاض کو درد نہیں سمجھتے۔ جذباتی اعتبار سے بھی انہوں نے کچھ منزلیں طے اور معرکے سر کیے ہیں۔ کوئز پروگرام "کسوٹی" والا جوان جو اپنی معلومات عامہ اور کتابی علم کے مارے بڑے بڑے بزرگوں کو چت کر دیتا تھا اور بیس سوالوں میں شخصیت کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیتا تھا، اب سیانا ہو کر خود بڑے بڑے سوال اٹھانے لگا ہے۔ وہ اکہرے بدن والا سالونا سلونا جوان جو اپنی پیشانی پر بڑی نخوت سے بکھرے ہوئے بالوں کو بار بار گردن کے جھٹکے سے بظاہر درست، مگر فی الحقیقت مزید بکھیرتا چلا جاتا تھا، ہمیں اس لیے اور بھی یاد ہے کہ ہمارے سر پر اس زمانے میں بھی فالتو بکھیرنے کے لیے تو بہت بعد کی بات ہے، کنگھا تک کرنے کے بال نہیں تھے۔ اب اس جوان کے بال زندگی کی دھوپ میں سفید ہو چکے ہیں۔

میں نے کہیں اور عرض کیا ہے کہ افتخار عارف کے پہلے مجموعے "مہر دو نیم" اور "حرف باریاب" کے درمیان دس سال ایک براعظم، ہزاروں میل کی مسافتیں، چند چاند چہرے ایک خواب نیم روز اور خود افتخار عارف حائل تھے۔ یہاں تک پہنچنے میں انہیں دنیا کا سب سے لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ یعنی حصار ذات سے نکل کر زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور جو کچھ دیکھا ہے وہ دوسروں کو دکھانے کی سعی مسلسل جو فنی اظہار و ابلاغ کی اصل غایت ہے۔ اس سفر نے ان کے لہجے کو نئی تاب و توانائی بخشی ہے۔ وہ اپنی بات جم کے کہتے ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ کہیں کہیں طیش و ملال سے آواز بھر آتی ہے، مگر اس کی گونج اور گمک نہیں جاتی۔ عجز کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ تو اپنی کلاہ کو کج ہی رہنے دیتے ہیں۔ مزاجاً ان کا ادبی رشتہ یگانہ سے ملتا ہے۔ وہ عزت نفس اور سربلندی کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ رجزیہ اور لہجہ احتجاجی ہے۔ ان کے ہاں صرف تراکیب اور دلکشی کا شکوہ ہی نہیں، لہجے کا شکوہ اور ایک شائستہ فن شعلگی اور ہمہمہ بھی ہے۔ ان کا لہجہ ان کے حرف کا اعتبار اور بھرپور ٹھاٹ ہے۔ جب لفظ اپنی چھل بل دکھا کر اپنا جانا پہچانا مفہوم بیان کرنے کے بعد ہاتھ باندھے چپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تب لہجہ بولنے لگتا ہے۔ پھر اس کے اتار چڑھاؤ، گونج گرج اور مدھم ٹھاٹ اور گندھار سے معانی اور اشارات کے نئے سوتے اور نئی دھیان دھارائیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ پھر شاعر اپنے باغ معانی کی بہار دکھاتا ہے۔

شعر ملاحظہ ہو:

جو ہوا کے رخ پہ کھلے ہوئے ہیں وہ بادباں تو نظر میں ہیں ۞ وہ جو موج خوں سے ابھر رہا ہے وہ حوصلہ بھی تو دیکھئے
یہ گلو گرفتہ و بستہ رسن جفا، مرے ہم قلم ۞ کبھی جابروں کے دلوں میں خوف مکالمہ بھی تو دیکھئے

صاحبو! یہ افتخار عارف ہی کا ہنر اور حوصلہ ہے کہ اتنی اضافتیں لگانے کے باوجود بیس بیس ہزار سامعین والے مشاعرے لوٹ لیتے ہیں۔

"مہر دو نیم" والا ناسٹلجیا جو انہیں ہر تیسری غزل اور نظم میں رہ رہ کر ستاتا تھا، اب سال بسال، کوچہ بکوچہ، چہرہ بہ چہرہ، یار بہ یار اور یاد بہ یاد کم ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے کرب حال اور فرحت امروز کو جگہ دے رہا ہے ہجر و فراق کے میٹھے میٹھے درد اور احساس محرومی و خود رحمی کی جگہ اب وہ کھل کر سرشاری شب گزشتہ اور نشاط وصل کی بات کرتے ہیں:

وہ بدن کہ بوسۂ آتشیں میں جلا بھی پھر بھی ہرا رہا
وہ بدن کہ لمس کی بارشوں میں دھلا بھی پھر بھی نیا رہا
وہ بدن کہ وصل کے فاصلے پہ رہا بھی پھر بھی مرا رہا

ہمارے ہاں جسم کوئی تقدس نہیں رکھتا۔ بدن کے شور انگیز تقاضوں کو غیر شاعرانہ، اسفل اور ناپاک سمجھا جاتا رہا ہے۔ وصل کے خیال سے معشوق کو اتنی خفت نہیں ہوتی جتنی کہ خود عاشق صادق کو۔ اس کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً خوف الہٰی و اہلیہ، شدت شرافت بسبب غلبہ پیری و ضرورت شری۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں بزرگوں کی موت اور محبوبہ سے ملاپ کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے...... وصال! افتخار عارف آج سے سترہ برس قبل جب لندن وارد ہوئے تو ان کی بیاض میں ایسے مہلتے ہلکتے شعر بھی تھے:

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں ۞ جان! بہت شرمندہ ہیں۔

یہ ADOLESCENT شعر کچھ دلاویز دف اور ناسمجھ خواتین میں بہت "ہٹ" گیا۔ اگر "سپھر" کی بجائے "سپھر" پڑھا جائے جو شعر کے سپھر کرنے میں تو شعر ایک بالکل نیا مزہ دے گا۔ یہ بات شرمندہ ہونے کی بات، سولہ ان کا ایک شعر اس شرمندگی کو دور کر دیتا ہے۔ ہم جیسے سادہ دل ادیبوں اور افتخار جیسے شاعروں کے عالمِ حیرت کا اندازہ کیجیے جب پہلے پہل ایسا انقلاب دیکھتے ہیں جو عوام کی بجائے:

جاہم کو سینے میں بیدار کر دے ؛ نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

سفر اور ایک سفرنامے کے بعد تو قلب ایسا آزاد ہو جاتا ہے کہ پھر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

بیماری کو شکایت ہے، کم آمیز ہے مومن

ملاحظہ کیجیے یہی شاعر چند برس بعد کیسے نازک مرحلے سے کس فن کارانہ ضبط سے گزر جاتا ہے:

مرا فروش خرام بلا کا تیز خرام تھا ؛ مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

سو صرف وہی شاعر کہہ سکتا ہے جو اس مرحلے سے گزرا ہو اور اس کی داد بھی دی۔ "بے خبرے" والا ۔ ے کا جس کا شہر نیورلٹ چھا ہے

کے یہاں سیاسی واقعات و حوادث پہ بھی گہرا، جامع اور اداس کر دینے والا کمنٹ ملتا ہے:

وہی ہے خواب جسے مل کے سب نے دیکھا تھا ؛ اب اپنے اپنے قبیلوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں

اس پر مرزا عبدالودود بیگ کا کمنٹ بھی سن لیجیے۔ کہتے ہیں، ملک کی تعمیر و ترقی کے کام کے لیے بڑی محنت اور نت درکار ہے۔ ملک بنانا اور اسے مضبوط کرنا تو بہت بڑی بات ہے، ہمارے بعض سیاست دان تو اتنے دوالق ہیں کہ ۔۔۔ تو وہ بھی نہیں سکتے جس کی وہ برسوں سے برابر کوشش کر رہے ہیں۔

افتخار عارف کا ذکر ہاجرہ مسرور، احمد ندیم اور لبیلے شاعر ساقی فاروقی کو درمیان میں لائے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ان کے ۔۔۔ سا شمار اردو ادب کے تاریخی معرکوں مثلاً انشا و مصحفی، نیاز منداں لاہور اور دہلوی گروپ، جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد ۔۔۔ میں ہونا چاہیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معرکہ یک طرفہ تھا۔ افتخار عارف شاعری میں مراقبتی انداز اور حزنیہ لہجہ اختیار کئے ہیں لیکن ۔۔۔ ان کا مجموعہ ۔۔۔ نہیں ہے، جب کہ ساقی فاروقی اپنے آپ سے بھی جنگ کرتے رہتے ہیں۔ خود کو کئی بار ۔۔۔ شکست دے چکے ہیں۔ بطور تعارف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ساقی اردو کے ایک نہایت خوبصورت، منفرد، جمیل اور غالباً سب سے بڑے جلالی شاعر ہیں۔ غالباً کی پخ اس لیے لگانی پڑی کہ ہم نے کسی اور جلالی شاعر سے بات ۔۔۔ ساقی پچیس تیس برس سے لندن میں مقیم اور دوستوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ جس کو دوست رکھتے ہیں، اسے پھر کہیں ۔۔۔ ۔ بلکہ وہ پھر ان کے لائق بھی نہیں رہتا۔ جدید مغربی شاعری اور ادبی رجحانات سے جو براہِ راست واقفیت رکھتے ہیں وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ خالص اور تازہ ترین مغربی CONTEMPORARY DICTION کے تنہا شاعر نہیں تو سب سے ممتاز شاعر ضرور ہیں۔

ساقی اپنی آسٹریلین بیگم کو پیار میں گنڈلی اور ROT TWEILER کتے کو ٹماٹر کے نام سے پکارتے تھے۔ کتا تو ۔۔۔ کے بچوں کو کتاب ۔۔۔ اگر یہاں بھی ہوگی۔ ۔۔۔ کے بعد وغیرہ پر بہت خوبصورت اور ۔۔۔ لکھی۔ ۔۔۔ سے کہ کسی ذی ادب سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے انھوں نے اعلان کیا

ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں ہو گئے ہیں۔ جس دن سے وہ ہم پر مہربان ہوئے ہیں، انھوں نے ذہن پر قلم رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا ہر قلم ہماری دستار فضیلت پر پڑتا ہے۔ نازک مزاج ایسے کہ بدنگاہی کے لیے خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جن دوستوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں ان کو خطوں میں القاب کے بجائے گالیاں لکھتے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہ ان سڑی گالیوں کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ ساقی اگر شریفانہ لہجے میں گفتگو کریں تو دونوں ہی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ محبی و مشفقی اسد محمد خان صاحب نے ساقی کے نام اپنے خط میں بڑے دکھ بھرے لہجے میں شکایتاً لکھا کہ سور! تم نے پچھلے خط میں مجھے گالیاں کیوں نہیں لکھیں! اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ساقی سور پر ایک نظم لکھ رہے تھے جو شائع ہو چکی ہے۔

اب ذرا شعر دیکھیے اور شاعر کے تیور دیکھیے: ؎

سفر میں رکھ، مجھے میری جدائیوں سے پرکھ ؛ فراق دے، مجھے خاک وصال میں نہ ملا
مجھ میں سات سمندر شور مچاتے ہیں ؛ ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے

جو شخص ایسا شعر کہہ سکتا ہے اس پر سات خون معاف ہیں۔ اس سے ہماری مراد سات خودکشیاں ہیں مگر اس غضب کے اور غضب ناک شاعر کے ہاتھ اپنے ہی جیتے جی خون میں رنگے ہوئے ہیں۔

چھ سات برس پہلے تک گلے میں چھوٹے بڑے، رنگ برنگے موتیوں اور منکوں کی مالا پہن کر ساقی گھن گرج کے ساتھ شعر پڑھتے تو لوگ شاعری سے چکا چوند ہو کر موتی گننے لگتے۔

حسن شعر خوانی میں جب جلالی لہجے اور اعلیٰ درجے کی اسکاچ وہسکی کی ملاوٹ ہو جائے تو شعر سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ پڑھت اس قیامت کی کہ ایک ایک لفظ کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ خرگوش، کیڑے یا مینڈک پر نظم پڑھتے ہیں تو بالکل وہی بننے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے ہیں! ایسی ڈرامائی طرز ایجاد کی ہے جس میں اپنے تمام اعضا استعمال کر کے سننے والے کے پانچوں حواس پر چھا جاتے ہیں۔ جیسے ڈوب کے شعر کہتے ہیں ویسے ہی ڈوب کر پڑھتے ہیں، اور بعض اوقات اتنی گہرائی یعنی شاعری باد گہرائی میں اتر جاتے ہیں کہ خود تو نکل آتے ہیں مگر ہم جیسے مداحوں کو یہ کہہ کر وہیں چھوڑ آتے ہیں کہ برادر عزیز! جہاں بھی رہو خوش رہو!

تو یہ ہیں ہمارے یار طرح دار ساقی فاروقی جن کی سرد جنگ افتخار عارف سے کوئی دس برس سے چلی آتی ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا جی میں آئی کہ اپنے دوست یعنی افتخار عارف کو ایک ۳۶ صفحوں کا خط لکھ ڈالا جس میں ان کی مبینہ بشری کمزوریاں ایک ایک کر کے گنوائیں اور اس فرد جرم کی ڈیڑھ دو سو کاپیاں انگلستان، پاکستان اور ہندستان کے احباب کو ارسال کر دیں۔ اگر ۳۶ صفحوں کے خط میں فی صفحہ ایک خطا بھی فرض کر لیں تو ہم جیسا تجربہ کار [illegible] حساب لگا کے بتا سکتا ہے کہ کتنی خطائیں ہوئیں۔

خط اتنا پر تاثیر تھا کہ جس نے پڑھا یہ جانا کہ یہ خرابی تو مجھ میں بھی ہے۔ بعضوں نے [illegible] گناہ سے یہ کہا کہ فلاں گناہ ہم سے کیوں نہ سرزد ہوا۔ [illegible] جوابا اپنے حریف پہ حملہ نہیں کیا۔ [illegible] کی تردید کی۔ کوئی بیان اپنی [illegible] نہیں دیا۔ [illegible]

اور انہیں ساقی مجازی کہتے ہیں۔ البتہ پھبتیوں کا تبادلہ ہم جیسے مشترک و مخلص دوستوں کے توسط سے ہوتا رہتا ہے۔ کبھی جنگ جلدی ہو بھی جاتی ہے تو یار لوگ اپنی طرف سے پھبتیاں گھڑ کے دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ذرا مفصل تعارف و پس منظر کے ساتھ اس لیے نقل کیا کہ اس سے افتخار عارف کے مزاج و ردِ عمل اور رکھ رکھاؤ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

ان کے بعض اشعار کی شانِ نزول خود ملازمت کا پتہ دیتی ہے۔ عشقیہ اشعار کی شرح وہ خود کریں کہ اپنی وارداتِ قلبی میں وہ بزرگوں کی شرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سرِدست، بی سی سی آئی ..... باعثِ رسوائی ..... سے سروکار ہے۔ افتخار عارف کے ذاتی تعلقات بینک کے اربابِ حل و عقد سے ہمیشہ مخلصانہ و برادرانہ رہے لیکن ان کے کھلنڈرانہ انداز اور ادارے کے خوشامدانہ اور تملق ساز ماحول سے وہ ہمیشہ بیزار اور شاکی ہی نظر آئے۔ لندن کے ابتدائی دور کا ایک شعر ہے جو افتخار عارف نے بڑی جرأت سے ان کی موجودگی میں بھی سنایا جن کے بارے میں کہا تھا

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ ؛ رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

پھر رفتہ رفتہ وہ اس ماحول کو گوارا کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ دل گرفتہ نظر آتے ہیں۔ مگر شکوہ گرفتہ نہیں لیکن اب شکایت اپنے آپ سے ہے۔

ہوس لقمۂ تر کھا گئی لہجے کا جلال ؛ اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی

اب انہیں یہ ملال ہے کہ

آسودہ رہنے کی خواہش مار گئی ورنہ ؛ "آگے" اور بہت آگے تک جا سکتا تھا میں

ان کی انا کو اس ملازمت سے زبردست دھچکا لگا۔

بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار ؛ جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

البتہ دوسرے مصرعے سے ہمیں اتفاق نہیں جس کا اعلان لازم ہے۔ بی سی سی آئی نے سب کو جن میں خاکسار بھی شامل ہے، دام جو مناسب تھے ان سے بھی زیادہ دیئے۔ اور فاضل ایکسچینج میں دیئے۔ بی سی سی آئی نے اپنے نمک خوارِ قدیم کی انا کا جنازہ ہمیشہ انہی کی بہت بڑی مرسیڈیز پر نکالا اور مرحوم کو ان کی گوری سیکریٹریوں نے بچشمِ بے اشک قبر میں اتارا۔ عجیب آزاد مرد تھے۔ حق شاید ان کی مغفرت کر دے۔ پاکستان اور پاکستانی کبھی معاف نہیں کریں گے۔

لندن کے تیسرے اور آخری دور میں "نان و نمک و عدۂ دیوار تحفظ" کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کھوکھلی دیوارِ زر اپنے زیرِ سایہ پناہ گزینوں پر گرتی ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن گرنا تھا لیکن وہ مرثیہ نہیں کہتے۔ ایک حقارت کے ساتھ وقائع نویسی کرتے ہیں۔

قیمتِ خلعتِ زر برسرِ بازار گری ؛ جس کے ہر پیچ میں نخوت تھی وہ دستار گری

کوئی دو برس قبل جب ہم بی سی سی آئی سے رخصت ہوئے تو انہوں نے یہ شعر پہلے پہل سنایا تھا۔

ایک درویش خوش اقبال کے جانے کی تھی دیر ؛ پھر تو وہ دھوپ کا بوجھ آیا کہ دیوار گری

پھر تو یہ احوال ہوا کہ بی سی سی آئی سے جو بھی گنہ گار نکالا گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ وہ درویش میں ہی ہوں۔

اور بھی بہت سے اشعار ہیں۔ اسے لیے نہیں پڑھوں گا کہ افتخار عارف کی سی آواز اور لہجہ کہاں سے لاؤں۔

ان کا مزاج کلاسیکی اور ڈکشن جدید ہے۔ المیہ کربلا اور اس سے متعلق امیجری کو انھوں نے بڑی پرکاری توانائی اور تازگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مزاجاً وہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔ یہی روایت اور اس سے وابستہ تلمیحات اور تمثیل کاری ان کے شعر کی رد تار بنت میں بار بار ابھرتی ہیں۔ وہ جب عمرے پر جانے لگے تو ہم نے انھیں دو نصیحتیں کی تھیں جن پر انھوں نے عمل بھی کیا۔ اول یہ کہ جس دوست یا واقف کار کا نام عمرے کی عبادات و مناسک کے دوران میں اتفاقاً بھی یاد آجائے۔ اس کے حق میں دعائے خیر ضرور کرنا۔ انھوں نے پختہ عہد کیا۔ ان کا بیان ہے کہ خانۂ کعبہ کے ملتزم پہ وہ گریہ وزاری کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ اچانک دو ایسے شاعروں کے نام یاد آگئے جن سے ان کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہے کہ ایک دوسرے کا منہ اٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ انتقاماً یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ ان حضرات کا کلام زیادہ خراب ہے یا کردار۔ اتفاق سے وہ دونوں شاعران دونوں بیمار تھے۔ جیسے ہی ان کے نام ذہن میں آئے لرز گئے، قدرے تامل کیا، پھر دعا مانگی کہ بار الہا! تو ان کی صحت تو بہتر کر دے، مگر کلام کو ویسا ہی رہنے دے۔

دوسری نصیحت ہم نے یہ کی تھی کہ عزیزم! جب بھی عمرے پر جاؤ کم از کم ایک گناہ سے توبہ کرو اور توبہ پر سختی سے عامل رہو۔ ایک گناہ سے تائب ہو کر پہلے عمرے سے بہت خوش خوش لوٹے۔ لیکن دوسرے عمرے کے بعد کچھ بجھے بجھے، حیرت زدہ اور ہم سے شاکی سے لگے۔۔۔۔ اللہ جانے گناہ پہلے ختم ہوئے یا فارن ایکسچینج' تیسری مرتبہ عمرے پر نہیں گئے۔ کہتے ہیں ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔

**

مجتبیٰ حسین

منسٹر کے بیٹے نے رشوت دی

یہ لطیفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ مرکزی وزیر توانائی مسٹر این کے پی سالوے کے فرزند نے دہلی کے محکمۂ بجلی کے ملازمین سے اپنا کوئی چھوٹا سا کام کروالینے کے لیے چار سو روپیوں کی رشوت دی۔ مسٹر سالوے کے فرزند دہلی کے وسنت وہار علاقہ میں رہتے ہیں۔ اور پچھلے کچھ عرصہ سے ان کے گھر میں لگے بجلی کے میٹر میں کوئی خرابی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے بجلی کا بل زیادہ آنے لگا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنا میٹر جلد از جلد تبدیل کروانے کی غرض سے محکمۂ بجلی کے ملازمین کو چار سو روپیوں کی رشوت دی اور ان کا کام بحسن و خوبی پورا ہوگیا۔

ہمارے سماج میں رشوت دینا اور لینا اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ مسٹر سالوے کے فرزند نے محکمۂ بجلی کے ملازمین کو رشوت دی تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کیونکہ ایسے کاموں کے لیے ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور دوسری طرف محکمۂ بجلی کے ملازمین نے رشوت لی تو یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اس معاملہ میں ایک غیر معمولی بات یہ ہوگئی کہ پچھلے ہفتے مسٹر سالوے کے فرزند نے یونہی باتوں باتوں میں اپنے والد بزرگوار سے اس رشوت کا ذکر کردیا۔ اس پر مسٹر سالوے بھی کچھ مجبور ہوگئے۔ اور اپنے بیٹے سے پوچھا "تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تم مرکزی وزیر توانائی کے بیٹے ہو؟" اس پر مسٹر سالوے کے فرزند نے کہا "وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے اور اسی لیے انہوں نے آپ کا احترام کرتے ہوئے رشوت کی رقم میں رعایت کردی تھی۔ جہاں انہیں دو ہزار روپے کی رشوت لینی چاہیے تھی وہاں انہوں نے مجھ سے صرف چار سو روپے وصول کیے۔ اگر میں آپ کا بیٹا نہ ہوتا تو مجھے بھی عام آدمی کی طرح دو ہزار روپے دینے پڑتے۔ یہ تو محکمۂ بجلی کے ملازمین کی ایمانداری، دیانتداری اور فرض شناسی ہے کہ انہوں نے آپ کا اس درجہ احترام کیا کہ مجھ سے رشوت کی رقم بھی کم لی اور کام بھی فوراً کردیا۔" ہمیں مسٹر سالوے کے فرزند سے شکایت ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ اس رشوت کا ذکر سالوے صاحب سے کردیا۔ دن بھر میں آپ سینکڑوں کام کرتے ہیں اور ایسے کاموں کی اطلاع آپ والدِ بزرگوار کو تھوڑی دیتے ہیں۔ ہماری ہی مثال لیجیے کہ ہم ہر روز صبح اٹھتے ہی دانتوں کو برش کرتے ہیں اور بالوں میں کنگھا کرتے ہیں۔ جب توفیق ہوتی ہے نہاتے بھی ہیں۔ ناشتہ بھی کرتے ہیں پھر چائے بھی پیتے ہیں لیکن ہم نے آج تک ازراہِ سعادتمندی ان کاموں کی اطلاع اپنے والد کو نہیں دی۔ ایسے کام معمولاتِ زندگی کہلاتے ہیں۔ بفضل تعالیٰ رشوت دینے اور لینے کا عمل بھی اب ایسا ہی ہے جیسے آپ نے دانتوں کو برش کرلیا یا بالوں میں کنگھی کرلی۔ [illegible]

سے ہر کس و ناکس کو واقف کرایا جائے۔ ہمیں احساس ہے کہ مرکزی وزیر توانائی مسٹر کے این کے پی سالوے کو اس بات سے یقیناً دکھ پہنچا ہوگا کہ ان کے بیٹے نے رشوت دی۔ عام آدمی رشوت دے تو کوئی بات نہیں لیکن ایک وزیر اور وہ بھی محکمہ توانائی کے وزیر کو رشوت نہیں دینی چاہیئے لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بجلی کا محکمہ صرف برقی توانائی سے نہیں چلتا بلکہ اس میں "توانائی" پیسے اور رشوت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک کسی کا ہاتھ گرم نہ کیجئے تب تک بجلی نہیں جل پاتی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ان دنوں جو ملازم رشوت نہیں لیتا اس کی دماغی صحت کے بارے میں شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے دوست حمایت اللہ اکثر ایک لطیفہ سناتے ہیں کہ ایک صاحب کی دو بیٹیاں تھیں اور انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں دھوم دھام سے کیں۔ ان کے ایک دوست نے ان کی دونوں بیٹیوں کا حال چال پوچھا کہ کیسی ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس پر ان صاحب نے کہا "بڑی بیٹی تو بہت مزے میں ہے۔ سونے سے لدی ہوئی ہے۔ گھر ہے، گاڑی ہے۔ غرض اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ البتہ دوسری بیٹی کا حال بہت خراب ہے۔ بڑی مشکل سے گزر بسر ہوتی ہے۔" دوست نے پوچھا "تمہارے دونوں داماد کیا کرتے ہیں؟" ان صاحب نے کہا "اتفاق سے دونوں داماد انکم ٹیکس کے انسپکٹر ہیں"۔ دوست نے کہا "یہ کیا بات ہوئی کہ دونوں داماد انکم ٹیکس کے انسپکٹر ہیں اور ان میں سے ایک کی حالت اچھی ہے اور دوسرے کی حالت خراب ہے۔" ان صاحب نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ ایک داماد رشوت لیتا ہے اور دوسرا داماد رشوت نہیں لیتا۔" اس پر دوست نے کہا "میاں اس میں قصور تمہارا ہی ہے۔ شادی سے پہلے تمہیں اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیئے تھی کہ دونوں داماد رشوت لیتے ہیں یا نہیں۔ جب ایک داماد رشوت نہیں لیتا تو تم نے اس سے اپنی بیٹی کا رشتہ پکا ہی کیوں کیا تھا؟"

جب رشوت ہمارے سماج کا لازمی حصہ بن جائے تو اسے لعنت کے طور پر نہیں بلکہ ایک نعمت کے طور پر قبول کر لینا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں بچہ بچہ تک رشوت لینے اور دینے میں یقین کرنے لگا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا بچہ نہایت خوبصورت اور ذہین ہے۔ ایک دن اس کی ذہانت سے متاثر ہو کر ہم نے اسے پیار کرنا چاہا تو اس نے ہمیں پیار کرنے سے منع کر دیا۔ ہم نے اسے لالچ دینے کی خاطر کہا "اگر تم ہمیں پیار کرنے دو تو ہم تمہیں دو روپے دیں گے" اس پر بچے نے مزید ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے میں صرف ارنڈی کا تیل پینے کے دو روپے ڈیڈی سے لیتا ہوں۔ آپ مجھے پیار کریں تو اس کا معاوضہ کم سے کم دس روپے تو ہونا ہی چاہیئے"۔

ذرا غور فرمایئے کہ جب ایک بچے نے بھی رشوت لینے کے نرخ مقرر کر رکھے ہیں تو پھر سرکاری ملازمین تو سرکاری ملازمین ہیں ان کے نرخ تو یقیناً زیادہ ہوں گے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک ریاست میں برسوں تک ایک سیاسی پارٹی برسر اقتدار رہی لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ انتخابات میں اس کو شکست ہو گئی۔ دوسری پارٹی کی سرکار بنی اور اس نے جیسے تیسے اپنی پانچ سالہ میعاد پوری کر لی لیکن جب پھر عام انتخابات ہوئے تو پہلی پارٹی کو پھر سے اقتدار حاصل ہو گیا۔ ہم نے ایک تاجر سے دوسری پارٹی کے ہار جانے اور پہلی پارٹی کے پھر سے اقتدار پر آ جانے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا "حضور پہلی پارٹی برسوں اس ریاست میں برسر اقتدار رہی اور اس کے دور میں ہر کام کروانے کے لیے رشوت کے نرخ مقرر ہو گئے تھے۔ کوئی ایجنسی لینی ہو تو اس کا یہ نرخ تھا۔ شراب کے ٹھیکے کا یہ نرخ تھا۔ گیس کی ایجنسی آنے روپیوں میں مل جاتی تھی۔ فلاں لائسنس کا یہ نرخ تھا۔ دوسری پارٹی کی جو سرکار بنی تو ایک عرصے تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ سرکار رشوت لیتی بھی ہے یا نہیں

پھر جب رشوت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے نرخ میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ ہم تو تاجر آدمی ہیں۔ کام سے مطلب رکھتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس غیر یقینی صورتِ حال سے بہتر تو یہی ہے کہ پرانی سرکار کو ہی دوبارہ برسرِ اقتدار لایا جائے تاکہ رشوت کے نرخ میں کوئی گھپلا نہ ہو۔

جب ساری قوم کا مزاج ہی رشوت لینے اور دینے کے خمیر سے اٹھا ہو تو اس میں ایسی شکایتیں کرنے کا کیا فائدہ۔ ایک اعدادیات یہ عرض کرتے چلیں کہ ہم نے آج تک کسی کو کوئی رشوت نہیں دی۔ رشوت لی اس لیے نہیں کہ ہم نے ہمیشہ ایسے عہدوں پر کام کیا جہاں رشوت لینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن جہاں ہمیں رشوت دینا چاہیے تھا وہاں بھی ہم انجان ہی بنے رہے۔ نتیجہ میں آج ہم جس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اسے اور تو سب کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ یوں بھی ہم جیسوں کے لیے یہ دنیا اب رہنے کے قابل نہیں رہی ہے۔

آخر میں این کے پی سالوے صاحب کے فرزند سے ہماری گزارش یہ ہے کہ مستقبل میں اگر وہ ایسا کوئی کام کریں تو اس کی اطلاع اپنے والد بزرگوار کو نہ دیا کریں۔ سعادت مند اولاد وہی ہوتی ہے جو اپنے والدین کو ذہنی صدموں سے دور رکھے۔ سالوے صاحب توانائی کے وزیر ہیں اور وہ ملک میں توانائی پیدا کرنے کے سو سو جتن کر رہے ہیں ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ان کے علم میں لا کر ان کی توانائی کو ضائع نہ ہونے دیں۔!

**

پروفیسر مسعود حسین

خانقاہِ عُمروی

(پروفیسر عمر الدین مرحوم جو پانچویں دہے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر تھے اور فاکر باغ کے محلے میں یونیورسٹی کے ایک مکان میں تنہا رہتے تھے۔ باوجود تنہائی پسندی کے اپنی شخصیت میں بڑی مرجعیت رکھتے تھے جس کے اردگرد یونیورسٹی کے احباب کا ایک حلقہ سا بن گیا تھا جو تقریباً ہر شام ان کے مکان پر جمع ہوتا اور نصف شب یا اس کے بعد تک گپ شپ کی صحبت رہتی۔ وہ اس حلقے میں "مرشد" کے نام سے یاد کیے جاتے۔ جو بات کم کرتے تھے لیکن جب کرتے قول فیصل صادر کرتے۔ ان کی کم گوئی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ دمے کے مریض تھے۔ اس صحبت کے خاص رکن میرے علاوہ احسان رشید صدیقی، ظفر احمد صدیقی، ابرار مصطفی خاں، وحید قریشی اور ناصر علی تھے۔ چائے کا دور مسلسل چلتا رہتا۔ کبھی کبھی "مرشد" کی تحریک پر اجتماعی ڈنر برپا کیا جاتا۔ مرغ مسلم کے علاوہ چڑیوں کے قیمے بھرے کریلے انہیں بہت مرغوب تھے۔ اسی صحبت کا ایک نقشہ ذیل کی ہجو ملیح میں کھینچا گیا ہے۔ میں نے اسے ۱۹۵۳ء[1] میں لکھ کر اور بزم مرشد میں سنا کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ اب جناب عابد رضا بیدار کے اصرار پر شائع کیا جا رہا ہے۔ (م ح)

اے کہ تیری خانقہ مرغوں کا گھر
مغفرت تیری ہے ان کے قتل پر

تیری ہمت پر مدارِ گاؤ و بز
تیری نیت سے دہن سب خشک و تر

مرگِ مومن تیری آنکھوں پر عیاں
مرگِ مرغاں تیرے دسترخوان پر

دیکھ کر ملت کی بے بال و پری
نوچ ڈالے تو نے بھی مرغوں کے پر

خانقہ کی تیرے کیا توصیف ہو
رنگ برنگے پنچھیوں کا مستقر

اور وہ گملے قطار اندر قطار
جیسے پیرس کی خزاں کا رہ گزر

سادگی پر تیری مر جائے نہ کون
مارتا ہے مرغ بے تیغ و تبر

تیری انگشتِ سیاست واہ واہ
تجھ سے بڑھ کر کون ہے بالغ نظر

اسلئے کہ تو مرغوں کا ہے مرزا ماند
اور میں بزمِ سخن کا شیرِ نر

---

[1] اس زمانے میں (۱۹۵۳ء) میں پیرس یونیورسٹی سے ریسرچ ڈگری لے کر واپس آیا تھا۔

رشکِ سودا، رشکِ غالب، رشکِ ذوق
مرغ کھانا پیشہ آبا مرا
ایک دو مرغوں میں کیا ہوگا بھلا؟
حبذا، تیری مروت مرشدا!
مرحبا، کرمرحبا، صد مرحبا!
مرغ و ماہی، کچھ کریلے کوفتے
پھر وہاں آتشیں تنور کا
صالح وایوب[۸] کی فن کاریاں
مرشدا! ساون بھری برسات میں
زلّہ برداروں کی ساتھ ایک فوج ہے
اس طرف عزیز وحیدی[۹] الامان!
با غلوئے معدہ میں موجود ہوں
دیکھیے پھر کوئی وحیدِ عصر کی
غلغلہ تحسین احساں کا ادھر
مرغ کھانے پر کڑک کر مانگیے
نسل مرغوں کی بڑھے اور اس کا ذوق

مرغ افگن بر شکن صاحب نظر
ہوں ازل سے میں حریفِ مرغ تر
غور کر، تو غور کر، تو غور کر!
ہم تقاضوں سے نہیں تھکتے مگر
بات تو جب ہے کھلائے اک ڈنر
کچھ کو نٹینہ کی کریم تر بہتر
روٹیاں اگلے بہ از شمس و قمر
دیکھنا ہے کچھ نفیسا[۳] کا ہنر
کس طرح سے کھاؤں میں لحم دگر
وہ علی ہیں، ایک احساں[۵]، ایک ظفر[۶]
اس طرف طبقات ناصر[۷] الحذر!
اور پھر موجود ہے تیرا پسر[۸]
گرمی گفتار اور ستی ظفر[۹]
اور ادھر احساس مرشد تیز تر
یہ دعا ہے اہلِ دل، اہلِ نظر
قتلِ مرغاں اس پہ واجب سربسر

---

[۱] Kenmentnel کی ڈیری کی کریم، جو مشہور تھی [۲] "مرشد" کا مکان احباب کے علاوہ پاکاروانکا ابدخند پر ایک کا بھی اڈہ تھا، جن سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی لہٰذا ان کے نان نفقے کا انتظام تھا۔ صالح و ایوب انھیں میں سے تھے [۳] نفیسا، ایک ریٹائرڈ پہلوان جو مرشد کی مالش بھی کرتا تھا اور مرغ مسلّم پکانے میں بھی یدطولیٰ رکھتا تھا۔ گویا دہان عمر علی اور محمد علی: عمر علی مرحوم شعبۂ ریاضی میں استاد تھے اور محمد علی مرحوم، امتحانات کے انچارج تھے [۵] احسان رشید صدیقی، استاد شعبۂ معاشیات جو مرشد کی بزم برہم ہونے کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں بڑے عہدے پر فائز رہے [۶] ظفر علی صدیقی مرحوم استاد شعبۂ فلسفہ محمد الدین صاحب کے طالب علم اور شعر و ادب کا بھرپور ذوق رکھتے تھے۔
[۷] وحید قریشی، سابق استاد شعبۂ تاریخ، طلاقتِ لسانی کے ماہر، بزم کی جان۔
[۸] ناصر علی مرحوم، شعبۂ سیاسیات کے استاد، کم گو مگر طنز و ظرافت کے ماہر۔
[۹] صلاح الدین، جو انجینئرنگ کی تعلیم سے فارغ ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے۔
[۱۰] ظفر صدیقی مرحوم جو بڑی محنت سے مرغ مسلّم کھاتے تھے۔

پروفیسر یداللہ مہدی

شوہری جزولیت از چمچہ گری

آج کل شوہر بننا بہت آسان ہے کیوں کہ فی زمانہ شوہر بننے اور نہ بننے میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔ بہرحال شوہر بننے کے لیے اب نہ تو اگلے وقتوں کی طرح سوئمبر میں حصہ لینا پڑتا ہے نہ دھنش توڑنے کی ضرورت پڑتی ہے اور دو بیل (D،U،E،L) لڑنے کی حاجت ہوتی ہے (توڑ پھوڑ اور لڑائی جھگڑا تو شادی کے بعد شروع ہوتا ہے) اب تو براہ راست سر پر سہرا باندھ کر قاضی صاحب قبلہ کے روبرو "قبول کیا میں نے" کا بانگ دہل اعلان کرکے یا پنڈت جی کی چھتر چھایا میں اگنی ساکشی مان کر با ہوش و حواس سات پھیرے لگا کر یا کسی محترم المقام پادری صاحب کے سامنے بلا جبر و کراہ "یس آئی ڈو" (I DO) کا اعتراف کرکے دنیا کا ہر عاقل و بالغ مرد پلک جھپکنے میں خود کو اچھا خاصا ثابت کرسکتا ہے یعنی کہ شوہر بن سکتا ہے۔ البتہ اور بات ہے کہ بیوی کی نظر میں اپنے آپ کو شوہر ثابت کرنے کے لیے کبھی کبھی ایک عمر بھی کم پڑتی ہے۔

شوہروں کا ایک بڑا طبقہ صدیوں تک اس مغالطے میں مبتلا رہا کہ مقدس صحیفوں اور آسمانی کتابوں میں شوہر کو مجازی خدا، پتی پرمیشور اور پتہ نہیں کیسے کیسے القابات اور درجات کا اہل قرار دیا گیا ہے لیکن یہ درجہ بندی بیویوں کی نظر میں کھٹکتی رہی کہ مٹی کے حقیر پتلے کو تو مجازی خدا کا رتبہ بخش دیا اور جس نازک ہستی کو اس مٹی کے مادھو کی پسلی سے پیدا کیا وہ مجازی خدا کے ٹائٹل کی بھی حقدار نہیں، چنانچہ بیویوں کی قوم نے اس ناانصافی کا بدلہ اس طرح لیا کہ پہلے تو ایک ایک کرکے مرد کی تمام دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا، پھر بڑی چالاکی سے مجازی خدا کی "خودی" بن بیٹھیں، وہی خودی جو مجازی خدا کو خدا سے جوڑتی ہے اگر خودی نیچ میں نہ ہو تو آدمی کا تب تقدیر سے اپنی مرضی کے مطابق تقدیر نہیں لکھوا سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ جو شوہر مجازی خدا کی حیثیت سے اپنی نصف بہتر کی چشم سیاہ فام کی ہتوں میں دل کی وسعتوں میں اور روح کی گہرائیوں میں براجمان ہوا کرتا تھا اس کی عملداری مانگ کے سیندور، گلے کے منگل سوتر اور ہاتھوں کی چوڑیوں تک محدود ہو گئی بلکہ بعض ہویات تو یہ بتاتے ہیں کہ سہاگ سے زیادہ اہمیت سہاگ کی نشانیوں کو دی جاتی ہیں اور ان پر جتنا وقت جتنی توجہ صرف کرتی ہیں اس کا عشر عشیر بھی بیچارے میاں کے حصے میں نہیں آتا، سہاگ کا اصلی ضامن تو سسکتا تڑپتا رہتا ہے اور سہاگ کی نقلی نشانیاں ان کی زلفوں کے سائے میں چمکتی دمکتی کھنکتی رہتی ہیں۔ چنانچہ فدوی قسم کے شوہر بیگم صاحبہ کی ہر جا و بے جا بات پر یہ کہہ کر سر جھکا دیتے ہیں کہ "سر تسلیم خم جو مزاج ناز میں آئے"، گویا شوہری اب پہلے کی طرح ذریعہ عزت نہیں رہی بلکہ چمچہ گری کے زمرے میں داخل ہوگئی ہے۔

شوہری جزولیت از چمچہ گری

تاریخ گواہ ہے کہ اگلے زمانے میں شوہر کہلانے کے لیے آدمی کا صرف مرد ہونا کافی ہوا کرتا تھا جبکہ آج منصب شوہری پر فائز ہونے کے لیے آدمی میں مردانگی کے علاوہ کچھ اور صلاحیتوں کو پایا جانا لازمی ہے۔ بالخصوص باربرداری و نیز رازداری کی شرط اس لیے کہ آج کی کنواریوں کی اکثریت کو خاتون خانہ سے زیادہ سجائی ہوئی بنے کا شوق ہے لہٰذا بجائے یہ پریاں "انڈور" (INDOOR) یعنی کہ درون خانہ ذمہ داریوں کو فضولیات میں شمار کرتی ہیں۔ چنانچہ شادی کے فوراً بعد امور خانہ داری کا پورٹ فولیو (PORTFOLIO) کمال ہشیاری سے شوہر نامدار کے حوالے کرکے خود کو آؤٹ ڈور (OUT-DOOR) یعنی کہ بیرون خانہ کی مصروفیات کے لیے پوری طرح وقف کر دیتی ہیں۔ گویا میاں جی کو مٹھو میاں کی طرح باورچی خانے کی کنگنائی میں محصور کرکے خود کٹی پارٹیوں، کلبوں اور مجلسوں کے جھرمٹ میں مسرور رہتی ہیں۔ کہیں کہیں کچھ بدنصیب خواتین البتہ غلطی سے خاتون خانہ کے ناپسندیدہ روپ میں نظر آجاتی ہیں لیکن اس میں بخلاف ان کی مرضی سے زیادہ حالات کی مجبوری کو دخل ہوتا ہے! اسی لیے یہ بے چاریاں اپنے شوہروں سے کم از کم اس بات کی توقع کرتی ہیں کہ میاں جی چاہے کھانا بنانے کی جھنجھٹ میں نہ پڑیں صرف برتن دھونے ہی میں ہاتھ بٹا دیا کریں۔ بے شک سارے گھر کو جھاڑو نہ لگائیں کم از کم فرنیچر کی دھول ہی صاف کر دیا کریں۔ علی الصبح اہلیہ محترمہ کی خدمت میں "بیڈ ٹی" (BED-TEA) پیش کرکے اپنے پتی ورتا ہونے کا ثبوت یقیناً دیں مگر اپنے جگر کے ٹکڑوں، آنکھ کے تاروں، راج دلاروں کو ادھر ادھر سے سمیٹ کر یکے بعد دیگرے انہیں "شوشو" کرا کے نہلا دھلا کے ناشتہ کرا کے اسکول کے لیے تیار کر دیا کریں۔ غرض یہ کہ چھوٹا موٹا دست تعاون دراز کرکے شوہر نامدار اگر چاہے تو اپنے باربردار ہونے کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی ہنستے ہنستے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے تو کوئی روتے بسورتے۔ لیکن باربرداری سے مفر بہرحال نہیں ہے کہ باربرداری آج متوسط طبقے کے ہر شوہر کا مقدر ہے۔!

دورِ حاضر کے شوہر کے لیے باربرداری کے فن میں طاق ہونا جس قدر ضروری ہے، نازبرداری کے باب میں ماہر ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے کیوں کہ فی زمانہ شادی کے بعد ہر شوہر کو بیوی کے ناز نخروں، فرمائشوں اور نت نئے نالوں کے ٹھکوں، جھٹکوں اور صدموں کو مسکراتے ہوئے سہنا پڑتا ہے بلکہ ہنستے ہوئے یہ کہنا بھی پڑتا ہے کہ

اُٹھائے جا ان کے ستم اور جیے جا ÷ یونہی مسکرائے جا، آنسو پیے جا

لیکن بدقسمتی سے موجودہ نسل کا ہر کنوارہ نوجوان مذکورہ شرائط پر پورا نہیں اترتا اور نہ ہی جمعہ جمعہ آٹھ دن میں ٹریننگ مکمل کرکے ان امور میں یدِطولیٰ حاصل کر سکتا ہے اس کے لیے برسوں کی کڑی ریاضت اور سخت مشقت چاہیے ویسے بھی امور خانہ داری کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ چٹکی بجاتے ہی آجائے جس طرح اردو کے تعلق سے حضرت داغ دہلوی نے فرمایا ہے کہ

آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اسی طرح امور خانہ داری میں مہارت بھی آدمی کو آتے آتے ہی آتی ہے لہٰذا اس ضمن میں ہم محکمہ تعلیمات کے ارباب مجاز سے گزارش کرتے ہیں کہ امور خانہ داری کو لڑکوں کے نصاب میں لازمی مضمون کے طور پر شامل کیا جائے بلکہ ان کی عملی تربیت کا بھی خاطر خواہ بندوبست کیا جائے۔ اس سلسلے میں کل ہند پیمانے پر ماہر فن باورچیوں، دھوبیوں اور حجاموں کو بحیثیت پروفیسر لیکچرر کے ان کی خدمات حاصل کی جائیں بلکہ آگے چل کر کالج و یونیورسٹی کی سطح پر مذکورہ بالا فنون میں مکمل دسترس حاصل کرنے کے مواقع بھی طالب علموں کو مہیا کیے جائیں اور پھر کامیاب طلبہ کو ڈاکٹریٹ کی باقاعدہ سند

ہے نوازا جاتا ہے جیسے "ڈاکٹر آف کنگ: ڈاکٹر آف چلڈرن ویلفیئر، ڈاکٹر آف ڈرائی کلیننگ، واشنگ اینڈ رفوگری و
اب رہا ناز برداری کے ہنر سے بہرہ ور ہونے کا معاملہ تو شہروں کی حد تک آج کی نئی نسل نے گرل فر
کے روپ میں بخوبی اس کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ گرل فرینڈ چونکہ ناز نخروں کی مکمل و مفصل شرح ہوتی ہے اس
اس کے توسط سے ایک کنوارا نوجوان غالب کی زبان میں اس سے واقف ہوتا ہے کہ

عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

بلکہ بعض دور اندیش نوجوان تو بہ یک وقت کئی گرل فرینڈز پال کر عشوؤں غمزوں اور اداؤں کے پس پردہ کار فر
اشاروں اور ابہام کے گورکھ دھندوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ بعد میں یہی تجربہ بیوی کی ناز برداری
میں قدم قدم پر ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ البتہ دیہات اور قصبات کے بیشتر کنوارے نوجوان چونکہ گرل فرینڈ کی
سے ابھی تک محروم ہیں لہٰذا اس ضمن میں ہمیں لکاتی کارپرکروں کے جنم داتاؤں سے ہماری درخواست ہے کہ جن
احباب نے یہ نعرہ دیا ہے، ہمیں لکات کی یہ کہانی گاؤں گاؤں میں بجلی، پانی، اسی طرح گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گرا
کی وبا کو عام کرنے کے لیے یہ نعرہ وضع کریں ہم گاؤں گاؤں میں ہو یہ کھیل، لڑکا لڑکی میں ہو میل۔
سچ کہتے ہیں اگر ہمیں لکات کے کرتا دھرتا ہمارے اس مشورے پر عمل کریں تو دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے کنو
نوجوانوں کی بڑی تعداد شہری نوجوانوں کے شانہ بہ شانہ چل کر ناز برداری کے فن میں طاق و مشاق ہو جائے گی۔ خیر یہ
کی طرف ایک جملۂ معترضہ تھی، ایک بار پھر ذرا پیچھے کی طرف لوٹیں تاکہ اس بہانے مذکورہ بالا امور کے تعلق سے ہماری
جہالت اور لاعلمی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے یعنی

نوحہ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی

بدقسمتی سے ہم ایک ایسے معاشرے کے پروردہ ہیں جہاں گرل فرینڈ کو زمین پر شجر ممنوعہ کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے
اس کا تصور تک معیوب قرار دیا گیا تھا خاندان کے جہاندیدہ ممبران سنسر بورڈ ہاتھوں میں قینچیاں تھامے اس حسین تصور
پر کاٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناز برداری کے باب میں ہم آج بھی اتنے ہی نابلد ہیں جتنے کے
کے وقت تھے بلکہ الٹا ہماری پرورش اس قدر بے جا لاڈ پیار سے کی گئی کہ ہم ناز اٹھانے کے بجائے ناز اٹھوانے کے عادی
اصل میں ہمارے خلاف یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی خاندان کے بزرگوں کی تاکہ ہم حسن و عشق کی آنکھ مچولی کے کھیل سے دو
جس معاشرے نے ہمیں معاملات دلبری و دلنوازی سے اس قدر جدائی سے دور دور رکھا وہ بھلا ہمیں امور خا
کی تفصیل میں جھانکنے کی اجازت بھلا کیسے اور کیوں کر دیتا، وہاں تو صرف گھر کی خواتین کی مکمل عملداری ہوا کرتی تھی چنانچہ
کھانا مدتوں من و سلویٰ کی طرح اترتا رہا اور ہم حضرت موسیٰ کی ناشکری امت کی طرح بنا ڈکار لیے ہی اسے ہضم کرتے ر
سچ پوچھیے تو بیرون خانہ مشغلوں نے ہمیں کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ بھولے سے بھی اندرون خانہ ذمہ داریوں کی
توجہ کرکے بار برداری و ناز برداری کے باب میں ضروری معلومات حاصل کرکے اپنی معلومات عامہ میں کچھ اضافہ کر لیتے اپنی
جہالت و غفلت کا شدید احساس اس وقت ہوا جب والدین کی مہربانی اور اپنی اسی نادانی کے کارن دولہا بن کر
اپنی تمام تر نااہلی کے باوجود ایک عدد اہلیہ کے اہل بنے یعنی شوہر بنے۔ سچ کہتے ہیں ازدواجی محاذ پر ہماری حیثیت اس
کی سی ہے جسے محض قربانی کے بکرے کی طرح بغیر کسی ہتھیار کے مورچے پر بھیج دیا گیا ہو۔ یہ کہہ کر کہ

چڑھ جائیے سولی پر رام بھلی کریں گے۔ بیگم صاحبہ یوں تو ہم سے ہمیشہ نالاں رہتی ہیں بلکہ ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے والے موڈ میں رہتی ہیں اور شکایتوں کا یہ رجسٹر طلسم ہوشربا کے بشمار دفتروں سے زیادہ ضخیم ہے جس کی تفصیل سن کر آپ کے صبر کا پارہ اور ہمارے ضبط کا یارا دونوں کے لٹ جانے کا خطرہ ہے۔ اسی لیے بطور نمونے کے صرف ایک ہی شکایت کی حکایت بیان کرتے ہیں۔

شادی سے پہلے ہمیں راتوں میں اٹھ اٹھ کر لکھنے کی عادت تھی جس طرح کچھ لوگوں کو نیند میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے شادی کے ابتدائی دو ایک ہفتے ہی چونکہ ہر نو بیاہتا جوڑے کا ازدواجی ٹائم ٹیبل امنگوں کی راتوں اور مرادوں کے دنوں سے مزین ہوتا ہے لہٰذا دور ہنی مون کے دوران ہم اس بیماری سے پوری طرح محفوظ رہے لیکن جیسے ہی ٹائم ٹیبل بدلا یعنی رات کے آنچل سے امنگوں اور دن کے دامن سے مرادوں نے اپنا رخت سفر باندھا ہمارے پرانے مرض نے نمونیا کی طرح پلٹ کر یلغار کر دی تاہم دو چار راتوں تک تو ہم محض اس خیال سے لکھنے کی خواہش کو تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہے کہ کہیں بیگم صاحبہ کی میٹھی نیند میں خلل نہ پڑے لیکن جب مرض کی شدت برداشت سے باہر ہو گئی تو ایک رات ہم نے اندھیرے ہی میں ٹٹول کر کاغذ قلم سنبھال لیا، مگر لکھنے کے لیے صرف روشنائی کی نہیں روشنی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ بڑی احتیاط سے لائٹ کا سوئچ آن کیا، ادھر کمرے میں چمک سے روشنی ہوئی ادھر جھٹ سے بیگم صاحبہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو حیرت سے ہمیں دیکھتی رہیں، پھر جھنجھلا کر بولیں "آدھی رات گئے یہ الوؤں کی طرح کاغذ قلم ہاتھ میں لیے کیا کر رہے ہیں آپ؟"

ہم نے فوراً تصحیح کی "کاغذ قلم الوؤں کے ہاتھ میں نہیں بیگم، شاعروں اور ادیبوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

منہ بنا کر بولیں "ہوتا ہوگا! ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ شاعر، ادیب اور الو تینوں رات میں جاگتے اور دن میں سوتے ہیں، چلیے لائٹ آف کرکے سو جائیے!"

ہم نے گڑگڑا کر کہا "اس وقت الفاظ کی فوج ظفر موج بغیر پیراشوٹ کے ذہن کی بلندی سے صفحۂ قرطاس پر لینڈ کرنے کے لیے پر تول رہی ہے بیگم!"

"محترمہ نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی "کیا الفاظ کی یہ فوج دن کے اجالے میں اترنے سے شرماتی ہے؟"

جھنجھلا کر جواب دیا "تم کیا جانو، رات کے سناٹے میں کیسے کیسے مضامین غیب سے خیال کی وادی میں اترتے ہیں۔"

بیگم نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ کسا "آدھی رات کو غیب سے مضامین نہیں، بھوت پریت اتر آتی ہیں، کان کھول کر سن لیجیے، اب آپ کی یہ شب بیداریاں، یہ بد پرہیزیاں بالکل نہیں چلیں گی۔ یوں بھی رات آرام کے لیے ہوتی ہے اور دن کام کے لیے"!

ہم نے چڑ کر پوچھا "پھر لکھنے کے لیے کون سا وقت ہوتا ہے؟"

"صبح اور شام کا وقت!" محترمہ نے برجستہ جواب دیا۔

ہم نے گڑگڑا کر کہا "صبح اور شام کا وقت تو اہلیان بمبئی کی روزمرہ زندگی کا سب سے خطرناک وقت ہوتا ہے کیونکہ اس وقت شہر کے نوے فیصد شوہر حضرات چمگادڑوں کی طرح لوکل ٹرین کے فٹ بورڈ سے چپکے، لوہے کے ڈنڈے سے چپکے ہوئے کسی بندے سے ٹکے ہوئے، اخوت بھائی چارے اور قومی ایکتا کا ثبوت دے رہے

چھتے ہیں: ایسی خطرناک صورت حال میں زندگی اور موت کے بیچ لٹکا ہوا آدمی اگر ٹرین کا ڈنڈا چھوڑ کر قلم کرنے کی حماقت کرے تو موت کا خونی پنجہ اسے جھپٹ کر دبوچ لیتا ہے۔ !!"

موصوفہ نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "آدمی ایسا شوق پالے ہی کیوں جو قدم قدم پر اس کی جان کا بیری بن جائے اگر کوئی اور شام شوق پالنا ہی ہے تو پھر رائٹنگ کے بجائے ٹائپنگ کیجئے، سنگنگ کیجئے، کوکنگ کیجئے، وقت بھی کٹے گا اور ساتھ پیسے کی آمدنی بھی ہوگی۔"

اس کے بعد محترمہ نے رائٹنگ کے نقصانات اور ٹائپنگ، سنگنگ اور کوکنگ کے روحانی، مادی اور معاشی فوائد پر مع مثالوں اور حوالوں کے اس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی کہ ہمارے ذہن کی بارہ دری میں مکمل بلیک آؤٹ (BLACK.OUT) ہو گیا۔

*

ڈاکٹر رؤف پاریکھ (کراچی)

بنام مالک مکان

(مرکزی خیال JUDITH VIORIST کے مضمون LETTER TO A LANDLADY سے ماخوذ)

(فکاہیہ)

محترم مالک مکان صاحب

السلام علیکم۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے مکان کو اسی حالت میں دیکھنے کے متمنی ہوں گے جس حالت میں آپ نے ہمیں کرائے پر دیا تھا، لیکن بہتر ہوگا کہ آپ اپنے مکان (جس کو ہم خالی کر چکے ہیں) کا معائنہ فرمانے سے پہلے آپ یہ خط پڑھ لیں تاکہ آپ کو کم سے کم صدمہ پہنچے۔

آپ کے مکان میں رکھی ہوئی لکڑی کی ایک میز (جو بقول آپ کے دو سو سال پرانی ہے اور انتہائی قیمتی ہے) اب بھی آپ کے مکان میں موجود ہے لیکن یہ ہے کہ اب وہ کسی کرنے کی بجائے چھت پر احتیاط کے ساتھ دھری ہے۔ اس قدیم اور نایاب میز کو چھت پر رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ درازوں کے بغیر یہ میز کچھ ادھوری ادھوری سی معلوم ہو رہی تھی۔ دراصل اس کی درازیں بچوں نے اپنے ایک کھیل میں استعمال کی تھیں۔ بچوں کا ایک ناول پڑھ کر، جو خزانے کی تلاش کے موضوع پر تھا، ہمارے بچوں کو ایسا ہی کوئی کھیل سوجھا اور انھوں نے آپ کے مکان کے پائیں باغ کو، جس میں آپ نے بڑی محنت سے ان گنت قسم کے پھول اگائے تھے، جگہ جگہ سے کھود کر اس نایاب میز کی ان قیمتی درازوں کو چھپا دیا۔ باغ کی تباہی کا صدمہ آپ کو یقیناً ہوا ہوگا لیکن یہ صدمہ آپ کو بہت معمولی محسوس ہوگا جب آپ کو یہ پتا چلے گا کہ اس کھیل میں خزانے کے طور پر جو چیزیں درازوں میں چھپانے کے لیے استعمال ہوئی تھیں ان کا بیشتر حصہ آپ کے ڈرائنگ روم میں رکھے گئے قیمتی گلدانوں، راکھ دانوں اور دیگر آرائشی اشیاء پر مشتمل تھا۔ اور ہاں! ایک ٹائم پیس بھی اسی روز سے نہیں مل رہا۔ (شاید اس کے لیے آپ کو باغ کے رہے سہے حصے کی کھدائی کرنی پڑے گی)۔

ظاہر ہے کہ ان تمام نادر و نایاب اشیاء کا نعم البدل فراہم کرنا ممکن نہیں لہٰذا ہم باوجود خواہش کے آپ کے اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتے۔ البتہ جن چیزوں کو بدلنا ممکن ہے انھیں ہم بدل دیں گے، مثلاً ڈرائنگ روم کے پردے۔ دراصل میری بیٹی اپنے سسرال سے چند دنوں کے لیے ہمارے ساتھ رہنے آئی تھی۔ اس کی بیٹی کو اسکول میں سلائی سکھائی جا رہی ہے، لہٰذا اس نے اپنی گڑیا کے کپڑے سینے کا ارادہ کیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اسے پردوں کا رنگ اور ڈیزائن

پہنا گئے۔ دراصل جالی کے کٹنے میں آسانی رہتی ہے۔ لہٰذا دوسرے کمروں میں لگے ہوئے جالی کے پردے استعمال کرتے رہے۔ اگر آپ اس کے بنائے ہوئے گڑیا کے سوٹ دیکھ لیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی ساری کوفت ختم ہو جائے گی۔ نمونے کے طور پر اس نے ایک سوٹ غسل خانے کے باہر زمین پر رکھ دیا ہے۔ آپ اسے وہیں ملاحظہ کر سکیں گے۔ دراصل غسل خانوں کے باہر رکھے ہوئے سارے پائنداز باورچی خانے وغیرہ کی صفائی میں کام آگئے۔ اگر ہم لوگ باورچی خانے کو یونہی گندا چھوڑ دیتے تو آپ کو کتنی اذیت ہوتی؟ ہے نا! اب تو آپ خوش ہیں۔

اور ہاں! میں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ اگلے ماہ ٹیلی فون کا جو بل آئے گا وہ اتنا بھاری بھر کم کیوں ہوگا۔ دراصل میرے بڑے بیٹے کے کچھ دوست چھٹیاں گزارنے ہمارے ہاں آئے تھے، ان میں شرط لگ گئی کہ امریکی صدر سے فون پر بات کرنا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ وہ بیٹھے ساری رات واشنگٹن فون ملاتے رہے لیکن یہ تجربہ ناکام ہی رہا کیونکہ صدر امریکہ ان دنوں کہیں اور گئے ہوئے تھے ـــــ اللہ کا شکر کریں کہ واشنگٹن والوں نے انہیں کیلیفورنیا میں صدر کے نمبر نہیں بتائے ورنہ آپ کا بل اور لمبا ہو جاتا ـــــ اور آپ بھی ـــــ شکر ہے آپ کے کچھ پیسے بچ گئے۔

رہا آپ کا شاندار قالین تو اس پر بنے ہوئے نشانات تجریدی آرٹ کے نمونے ہرگز نہیں ہیں، اگرچہ دور سے دیکھنے پر کچھ ایسا ہی شبہ ہوتا ہے۔ دراصل میں چائے لیکر مہمانوں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میری بیوی کو ایک مکھی قریب ہی بھنبھناتی نظر آئی۔ یہاں نے مکھی کو بھگانے کے لیے ایک زناٹے دار ہاتھ گھمایا۔ لیکن مکھی نے نشانہ خطا کر دیا اور میری بیوی کا ہاتھ چائے کے کپ پر جا پڑا۔ اگر آپ میں انصاف کا ذرا سا بھی مادہ ہوا تو آپ اتفاق کریں گے کہ اس میں سارا قصور مکھی کا تھا اور اس سلسلے میں میری بیوی کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ آپ ایسی نامعقول مکھیوں کو گھر میں نہیں آنے دیں گے۔

ویسے آپ کا مکان صرف تھوڑے سے رنگ و روغن سے درست ہو جائے گا کیونکہ میرے بچوں نے اس کی دیواروں پر جو تصویریں بنائی ہیں وہ اس میں آئل پینٹ استعمال نہیں کر سکے اور اگر آپ ان دیواروں کو یونہی رہنے دیں تو نہ صرف یہ کہ آپ کا بے جا خرچ بچے گا بلکہ یہ میرے بچوں کی اعلیٰ فنکارانہ صلاحیتوں اور آپ کے ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہوگا! ہنی فنکار بچوں نے آپ کے ڈرائنگ روم میں آویزاں مصوری کے شاہکاروں پر کچھ اصلاح بھی دی ہے۔ مانا کہ وہ سب کے سب شاہکار نامور مصوروں کے تھے لیکن غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے اور وہ تمام نامور مصور انسان ہی تھے۔

ہم کوشش کریں گے کہ گھر کی تمام نہیں تو نصف ٹیوب لائٹیں اور بلب تبدیل کرا دیں۔ دراصل گھر کے اندر کرکٹ کھیلنے کے فیصلے سے مجھے اتفاق نہیں تھا مگر بچوں کا دل رکھنے کے لیے مجھے بیگم کے اصرار کے آگے ہاں کرنی پڑی۔ لیکن بے فکر رہیے، ایک غسل خانے کا بلب ابھی تک سلامت ہے۔ باقی غسل خانوں کے بلب ہمیں ان جگہوں پر لگانے پڑے جہاں روشنی زیادہ ضروری تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان کو بھی نہ بچا سکا جس کی وجہ کرکٹ سیزن کا طول پکڑ جانا اور بچوں کی بیٹنگ کی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جانا بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بچوں کی صحت میں کھیلوں کی اہمیت کے پیش نظر اس کا برا نہیں منائیں گے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی بہترین کوششوں کے باوجود آپ کے فوم کے گدوں کو نہ بچا سکا۔ حیرت ہے کہ بچے

کے ذہن میں یہ بات کہاں سے آگئی کہ کشتی چلانے کا شوق غسل خانے میں پانی بھر کر گدّوں سے پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کم از کم بچوں کی ذہانت اور اختراعی طبیعت کی داد ضرور دیں گے۔

افسوس تو مجھے ان ٹائلوں کی تباہی کا بھی ہے جو ٹلّو میاں نے غسل خانے کے فرش سے اکھاڑلی تھیں اور ئیں نے انھیں احتیاط سے چھت پر ڈھیر کر دیا تھا۔ (بدقسمتی سے ایک ایک کر کے وہ ٹائلیں نشانے بازی کے ان مقابلوں میں کام آگئیں جو بچوں نے چھت پر منعقد کیے تھے۔) تعجب ہے کہ ایک چھے سال کا بچّہ ایک اسکریو ڈرائیور سے کیا کیا کام لے سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ غسل خانے کے فرش پر سمنٹ کا سادہ پلستر کروالیں۔ بے شک اس کے پیسے مجھ سے لے لیجیے گا۔

البتہ یہ معمّا آج تک حل نہ ہو سکا کہ محض ایک چھوٹی گاڑی کی ہلکی سی ٹکّر سے آپ کے مکان کا بیرونی پھاٹک اتنی آسانی سے کیوں کراکھڑ گیا۔ یقیناً یہ ٹھیکیدار کی کارستانی ہے۔ اس نے تعمیر کے وقت سمنٹ کم اور بجری زیادہ استعمال کی ہوگی۔ آپ اس سے ضرور جواب طلب کیجیے گا ـــــ اور ہاں! ـــــ گاڑی کی ٹکّر کے بعد پھاٹک لگنے سے آپ کے تمام گملے ٹوٹ جانے کی ذمے داری ظاہر ہے کہ میری بیوی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ مانا کہ گاڑی وہ چلا رہی تھی لیکن اگر گیٹ مضبوطی کے ساتھ لگا ہوا ہوتا تو گملے کبھی نہ ٹوٹتے۔ اس ٹکّر سے ہماری گاڑی کو خاصا نقصان پہنچا۔ اس کی مرمّت کا خرچ تقریباً اس رقم کے مساوی ہے جو مکان میں ہونے والے نقصان وغیرہ کی مرمت پر صرف ہوگی۔ لہذا ہمارا آپ کا حساب تو برابر ہوگیا۔ مجھے امید ہے کہ کمزور گیٹ لگانے کا ہرجانہ آپ ٹھیکیدار سے وصول کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور اس طرح آپ کے نقصان کی تلافی ہوجائے گی۔

آخر میں میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر چند حادثات اور واقعات جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں پیش نہ آتے تو آپ کے مکان میں ہمارا قیام مزید خوش گوار ثابت ہو سکتا تھا۔ بہر حال قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔

اگر اگلے سال گرمیوں کی چھٹّیوں تک آپ اس مکان کو ٹھیک ٹھاک کرالیں تو اسے اگلے سال دوبارہ کرائے پر لے کر ہمیں دلی مسرت ہوگی۔

امید ہے آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ فقط۔

آپ کا مخلص
رؤف پاریکھ

دلاور فگار

بجٹ اور جوتا

ایک خبر کی سرخی ہے کہ بجٹ میں صرف جوتا سستا ہے اور
ہر شے نسبتاً گراں ہے

ایک جوتی خور خوش ہو کر یہ بولا لو میاں
جوتا سستا ہے بجٹ میں اور ہر شے ہے گراں

ان بجٹ سازوں کو بھی اس بات کی تو ہے تمیز
جس سے میں پٹتا ہوں سستے دام مل جائے وہ چیز

جوتا سستا ہے بجٹ میں یہ تو اچھائی ہوئی
آں بجٹ سے ختم اپنی برہنہ پائی ہوئی

سستا جوتا لیتا ہوگا اس کے جب امکان میں
رات دن جوتا چلے گا قوم کے ایوان میں

سستے جوتے لے کے آیا بجٹ یہ جو نیا
جوتیوں میں دال بٹنے کا زمانہ آ گیا

کفش سازوں کو بہت اچھا لگے گا یہ بجٹ
ان کا جوتی سے جو ہو جائے سری طبلی آلٹ

جوتا ہے یہ جو بیاں اک رہنما کا سالہ ہے
اس بجٹ کے پردہ میں پبلک کے جوتا مارا ہے

سستے جوتے کی خبر بھی جس کو گزری ناگوار
ایسے جوتے والے کو تو لوگ یہ جوتی کی مار

وجہ راحت ہم کو یہ جوتے کی ارزانی ہوئی
جوتیاں چٹخاتے پھرنے کی تو آسانی ہوئی

جوتا سستا ہے تو سستی سے لڑے گی پبلک
جوتیاں توڑے گی اب محنت کرے گی بےوری قوم

سستے جوتے سے نہیں ہوگا صنعت کا زیاں
لے بجٹ ساز میرے سر پر تمہاری جوتیاں

سستا جوتا کام اس شوہر کے آئے گا مزید
بیوی کی جوتیاں کھا کر ہوا جو زن مرید

نکتہ چینی اس بجٹ پر مت کرو ورنہ کار کی
جوتیاں سمیت آنکھوں میں گھس جاؤ اس سرکار

بات یہ سچ کہہ گیا اک راشٹرا اخبار
یہ بجٹ ہے جوتیوں کا صدقہ اس سرکار

جوتیوں میں بیٹھنے والے بجٹ سے خوش نہیں
اپنی بیٹھک کے لیے اب وہ جگہ ڈھونڈیں کہیں

سستے جوتے کے بجٹ سے جان آئی جان میں
جوتا بیزار اب تو ہوگی قوم کے ایوان میں

ہاں جو مسجد میں نئے جوتے پہننے جاتے ہیں
سستے جوتے کی خبر کو سن کے وہ پچھتاتے ہیں

ظفر عمر زبیری

نیا فائل

آج کل ہر گھر میں دو، تین فائل ضرور ہوتے ہیں، بجلی کے بلوں کی ادائیگی کا فائل، کرایہ دار ہیں تو کرایہ کی رسیدیں اور مالک مکان کی دھمکیوں کا فائل، صاحب جائیداد ہیں اور ٹیکس وصول کرنے والوں کے نخروں کا فائل وغیرہ وغیرہ لیکن ہم نے اس طرح کے فائلوں کی موجودگی کے باوجود حال ہی میں اپنے یہاں ایک نیا فائل کھولا ہے اور اہل بصیرت کو دعوت ہے کہ وہ اگر مناسب سمجھیں تو ہمارے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش فرما سکتے ہیں ـــــــ اس نئے فائل کا عنوان ہے "موت کا فائل" ـــــــ لیجئے! آپ تو نام سن کر ہی کچھ خوف زدہ سے ہو گئے بھئی موت تو برحق ہے، مالک مکان کے دھمکی آمیز خطوط تو احتیاط سے ایک فائل میں رکھے جا سکتے ہیں مگر ملک الموت کے استقبال کے لیے کسی تیاری کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ مالک مکان تو گھر خالی کروانا چاہتا ہے۔

موت کا فرشتہ تو اس جہانِ فانی سے اٹھانے آئے گا اور کبھی کبھی تو یہ بغیر کسی نوٹس کے آجاتا ہے۔ رات ہی کھیلتے کھیلتے سو گئے، صبح آنکھ ہی نہیں کھلی۔ عصر اور مغرب کے درمیان قبر میں بھی اتار دیا گیا۔ گھر والوں پر تو یہ سب کچھ بیت گیا، اس سے پہلے لوگوں پر بیت چکا ہے۔ وصیت نامہ تلاش کیا جا رہا ہے، اس کا کہیں پتہ نہیں۔ کس کس بینک میں کن کن ناموں سے اکاؤنٹ کھول رکھے تھے، بیوہ تک کو علم نہیں ہے، کتنا قرض چھوڑا ہے، کتنا وصول کرنا تھا؟ بڑے بھائی صاحب قطعی یا ولیت کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔

نتیجہ، دسواں، چالیسواں بھی ہو گیا۔ اب اس کے بعد تو رازہائے درون پردہ سے پردہ اٹھنا شروع ہو گئے، جھگڑوں کا آغاز ہوگا۔ مقدموں کی تیاریاں ہونے لگیں گی۔ مرنے والا تو مر گیا، مگر بھائیوں اور بہنوں میں ٹھنا ٹھنی شروع ہو گئی اور الٹے سیدھے مشورہ دینے والوں کے تانتے لگنے لگے۔ تو ان سب بکھیڑوں سے بچنے کے لیے ہم نے ـــــ "موت کا فائل" ـــــ کھول لیا ہے جس کی اطلاع ہم نے اپنی بیوی کو دو دن بعد اس وقت دی جب سالی صاحبہ بھی ہمارے یہاں آئی ہوئی تھیں۔

ہمارا خیال تھا کہ اس نئے فائل کا عنوان سن کر بیگم اور سالی صاحبہ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ بیگم قمیص کی ترپائی میں مشغول تھیں اور سالی صاحبہ انگریزی اخبار کا مطالعہ فرما رہی تھیں۔ انہوں نے تو نظر اٹھا کر بھی ہماری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بیوی نے لاپروائی سے پوچھا "اس فائل میں کون کون سے کاغذات لگائے ہیں" ہم نے

انھیں بتایا کہ ایک وصیت نامہ تیار کر کے اس میں لگادیا گیا ہے، لیکن اس کا کچھ حصہ ابھی نامکمل ہے۔ اس کے بعد پتہ کا غذات لگا دیئے ہیں، اپنا اکاؤنٹ نمبر لکھ دیا ہے اور ایک صفحہ پر وہ تمام ٹیلیفون نمبر لکھ رہے ہیں جن پر ہمارے انتقال کی اطلاع دینا ضروری ہے۔ سالی صاحبہ نے اخبار سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا: گھر میں تو ٹیلیفون ہے نہیں، اور یار کے ٹیلیفون نمبر لکھ دیئے ہیں، کہاں سے کیے جائیں گے اتنے بہت سے فون، ہم نے کہا "پڑوسی کس دن کام آئیں گے۔ ایسے پر تو سب ہی ہاتھ بٹاتے ہیں"۔ بیگم بولیں "یہ بتایئے، پہلے اگر میں مر گئی تو کیا ہوگا؟" ہم بیگم کی ہمت کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہم نے کہا "اصل مسئلہ تو یہی ہے، آپ انتقال فرمائیں تو ہم کہاں جائیں گے؟" سالی صاحبہ نے لقمہ دیا "اتنا ہے، آرام سے رہیے گا" ہم نے کہا "مذاق چھوڑیں۔ دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اس گھر میں ہم دو میاں بیوی رہ گئے ہیں ہمارے انتقال کے بعد تو یہ تمہاری بہن تمہارے یہاں رہ سکیں گی۔ لیکن یہ اگر پہلے مر گئیں تو ہم کہاں رہیں گے؟" سالی صاحبہ نے نہایت فراخ دلی سے کہا "آپ بھی ہمارے یہاں آجایئے گا" ہمارا جواب تھا "نا بابا! یہ ہم سے نہیں ہو سکے گا۔ کتابیں پورے گھر میں پھیلی رہتی ہیں، ہم اپنی عینک اور گھڑی دن میں نہ معلوم کتنی مرتبہ ڈھونڈتے ہیں، جب لکھنے ہوتا ہے تو کبھی ڈرائنگ روم میں لیٹ کر لکھ رہے ہیں، کبھی ٹی وی لاؤنج میں پڑے ہوئے ہیں، کبھی بیڈروم کو ڈرائنگ روم میں تبدیل کر دیا، تم سے یہ سب کیسے برداشت ہوگا۔ تم ٹھہریں بہت سگھڑ"۔۔۔۔ بیوی نے جل کر کہا "تو کیا میں پھوہڑ ہوں؟"۔۔۔۔ ہم نے فوراً جواب دیا "آپ پہلے بہت سگھڑ تھیں، مگر ہماری اس تیس سالہ رفاقت نے کچھ نہ کچھ اثر آپ پر بھی ڈال ہی دیا ہے"۔ جواب سے مطمئن ہو کر کہنے لگیں "تو پھر کیا طے کیا آپ نے کہاں رہیں گے آپ اگر ہم پہلے مفارقت دے گئے"۔۔۔۔ ہمیں ان دونوں بہنوں کے انداز گفتگو سے غیر سنجیدگی کی خوشبو محسوس ہوئی تو کہا۔۔۔۔ "یہ بہت اہم مسئلہ ہے اور ہم نے جو نیا فائل کھول لیا ہے۔ یہ بہت اہم فائل ہے۔ آپ دونوں اسے مذاق سمجھ رہی ہیں"۔۔۔۔ سالی صاحبہ کہنے لگیں۔۔۔۔ "کیا کوئی نیا مضمون لکھنا ہے جو اس کی تیاریاں کی جارہی ہیں"۔ بیوی بولیں۔۔۔۔ "یہ ایسے ہی مضمون تیار کر لیا کرتے ہیں اور ہم دونوں کو خواہ مخواہ پریشان کرتے رہتے ہیں"۔ ہم سے نہ ہو سکا اور ہم فوراً اپنی الماری سے وہ فائل نکال کر لے آئے اور بیوی کے سامنے کر دیا جس پر لکھا تھا "موت فائل"۔۔۔۔ اور نیچے تحریر تھا ۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں ؎ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

بیوی نے جب وہ فائل دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سالی صاحبہ نے نہایت رقت آمیز لہجے میں کہا "آپ نے تو سچ مچ یہ فائل کھول لیا ہے"۔۔۔۔ ہم نے بھی اکڑ کر جواب دیا۔۔۔۔ "آپ دونوں ابھی تک مذاق سمجھ رہی تھیں۔ ہم نے واقعی اپنی موت کی تیاریاں شروع کر دی ہیں، پتہ نہیں کس وقت اس دنیائے فانی سے آب و دانہ اٹھ جائے اور ہم عالم بالا کی طرف پرواز کر جائیں"۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے ہماری بھی آواز بھیگنے لگی، لیکن

خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پرسوں جب ہم شیخ برکت علی کے جنازے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ اب ہمیں بھی اپنے معاملات نپٹانے چاہئیں اور سفر آخرت کی تیاری کرنی چاہیئے۔

سالی صاحبہ نے دریافت کیا —— "یہ شیخ برکت علی کون تھے؟" —— ہم نے انہیں بتایا —— "شیخ صاحب سوئمنگ کلب کے صدر تھے۔ جس کے ہم بھی ایک رکن ہیں! انہوں نے اپنی صحت کی بحالی کے لیے یہ کلب بنایا تھا، ویسے بھی تیرنا بہت مفید خیال جاتا ہے، خوب ورزش ہوتی ہے، جسم سڈول رہتا ہے، آدمی چاق و چوبند ہو جاتا ہے اور شیخ صاحب تھے بھی بہت صحت مند اور پھرتیلے، مگر حکم الہٰی سے وفات پا گئے۔ ذرا دیر نہیں لگی۔ رات کو سوئے بس سوتے ہی رہ گئے۔ کسی کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی تھی"۔ سالی صاحبہ بہت غور سے اس انتقال پُر ملال کا قصہ سن رہی تھیں اور ان کے چہرے پر بڑی تکلیف کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ہم نے قصے میں مزید اثر پیدا کرنے کے لیے کہا کہ "جب ان کا جنازہ قبرستان پہنچا تو ہر شخص کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا کہ آخری آرام گاہ تو قبرستان ہی ہے اور ہمارا ہر قدم اس کی جانب اٹھتا ہے۔ ہم تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے رک گئے اس لیے کہ دونوں بہنوں پر سکتہ طاری ہو چکا تھا جو ہمارا مقصد تھا۔ پھر ہم نے کہا —— "جب تک آدمی قبرستان میں رہتا ہے اسے موت کے سائے نظر آتے رہتے ہیں، لیکن جیسے ہی وہ مردے کو قبر میں اتار کر قبرستان سے واپس آتا ہے! اس پر سے موت کا اثر کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور پھر قطعاً بھول جاتا ہے کہ ایک دن اسے بھی دوسروں کے کاندھوں پر سوار ہو کر یہاں آنا ہے۔ اور مٹی میں مل جانا ہے"۔ —— بیوی نے سسکی بھرتے ہوئے کہا —— "ہاں واقعی موت کو یاد رکھنا چاہیئے" ہم نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا —— "جبھی تو ہم نے یہ فائل کھول لیا ہے تاکہ ہم اکثر و بیشتر موت کو یاد کرتے رہیں اور آپ کو بھی یاد دلاتے رہیں"۔ —— اس کے بعد ہم نے بیوی سے کہا —— "اس بات پر ایک پان تو کھلائیں۔ کہ شاعر بہت پہلے کہہ گیا ہے ؎

پان کل کے لیے لگاتے جائیں
یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں

آپ بجائے کل کے آج ہی پان کھلا دیں کہ پتہ نہیں جنت میں اس برگ سبز کے ہمراہ زردہ بھی میسر آئے گا یا نہیں"۔ یہ سن کر وہ دونوں ہنس تو پڑیں مگر اس ہنسی میں ہمیں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس ہو رہی تھی کہ سدا نام رہے اللہ کا ——!

"افکار" کراچی

**

ڈاکٹر راہی قریشی (گلبرگہ)

...... بہت ہے

کمروں میں یہ عریانی خطرناک بہت ہے / پاکیزہ جو مخلوق تھی ناپاک بہت ہے
بیگم نہیں محبوبہ، نہ محبوبہ ہے بیگم / شاعر ہو کہ شوہر ہو یہی "شاک" بہت ہے
شادی جسے کہتے ہیں خوش آغاز ہے لیکن / اس قصے کا انجام ہی غمناک بہت ہے
ہر بوسے کی ترسیل ہے پھونکوں سے ہوا میں / ہضم میں جو نوخیز ہے بے باک بہت ہے
بس ایک ہی دن یعنی فقط عقد کے دن ہی / دلہن کے لیے دیدۂ نمناک بہت ہے
بیگم ہیں بہت دور مگر گھر میں ہیں موجود / سچ یہ ہے کہ یہ قوتِ ادراک بہت ہے
اردو کا یہ اسکول ہے کیا بورڈ پہ لکھوں؟ / بس ایک چینے کو یہ اک چاک بہت ہے
پنڈت ہو کہ ملا ہو، منسٹر ہو کہ مسٹر / کردار تو کچھ بھی نہیں "بس ناک" بہت ہے
واعظ ہیں ہے وہی بنتِ عنب آج بھی عریاں / جو جام ہے شفاف وہ ناپاک بہت ہے
اُردو کے پرستار بھی کچھ کم نہیں لیکن / اردو کے لیے ایک ہی گوکاک[1] بہت ہے

دو چار حسیں روز چلیں ساتھ تو راہی
میرے لیے "ایسی ایوننگ واک" بہت ہے

O

[1] گوکاک کی طرف

غزل

وطن میں ہر طرف جیسے کمی محسوس کرتا ہوں / زمیں کم اور آبادی گھنی محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے گرم لوہے پر گرا ہو آب کا قطرہ / ترے بن اپنی حالت بھی وہی محسوس کرتا ہوں
کسی دن اتفاقاً گھر اگر تاخیر سے پہنچا / تو گردن اپنی بیگم کی تنی محسوس کرتا ہوں
جنھیں کل بند کمرے میں گلے ملتے ہوئے دیکھا / انھیں نیتاؤں میں باہم ٹھنی محسوس کرتا ہوں
ترے سالن کی خوشبو جب کچن سے باہر آتی ہے / میں اپنے پیٹ میں اک کھلبلی محسوس کرتا ہوں
تمہارا حسن ہے یا کوئی تھانے دار کا چہرہ / ہوا جب سامنا میں تھرتھری محسوس کرتا ہوں

اگر طنز و ادا کچھ تیز ہو تو لطف آ جائے
ترے اشعار میں بزمی کمی محسوس کرتا ہوں

حبیب الرحمن بزمی (دہلی)

بابو آر کے

(امریکہ)

سردی نامہ

ان دنوں سردیاں شباب پر ہیں۔ ہر کوئی ہاتھ جوڑے ہاتھ باندھے اس کے حضور ہتھیار ڈالے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ دانتوں کے ساز بجا رہا ہے۔۔۔۔۔ ستر پوشیاں، اعضا پوشیوں کے روپ دھار چکی ہیں۔ سویٹروں، مفلروں، شالوں اور ٹوپیوں نے مرد و زن کی شناخت مٹا دی ہے۔ شناساؤں کو پہچاننے کے لیے مفلروں، شالوں میں سے روپوش چہروں کو برآمد کرنا ہوتا ہے اور پھر بلغمی مزاج کی مزاج پرسی کرنی ہوتی ہے۔ سردی کے انہی دنوں میں عشاق اٹکھیلیاں کرتے ہیں تو حسینائیں شوخیوں سے پر انگڑائیاں لیتی ہیں۔ ہمارے روایتی شعرا و ادبا عموماً اور ریٹائرڈ حضرات خصوصاً اس موسم کو یونہی نہیں گنواتے بلکہ کھانس کھانس کر بے دم ہوتے ہیں۔ چھینک چھینک کر ہلکان رہتے ہیں۔

ادھر بازاروں میں سبتنی اور خیالی دوشیزائیں گرم کپڑوں کی دوکانوں پر بڑے خلوص کے ساتھ گٹھیاں بانٹتی نظر آتی ہیں۔ ان کے گرد مردوں کا میلہ سا لگا رہتا ہے۔ یہی وہ موسم ہوتا ہے کہ جس میں ہماری خواتین اپنے آنچل کو سروں کے ساتھ ساتھ کانوں، ناکوں پہ ڈال کر شرم و حیا کی پتلیاں اور خالص اسلامی بیبیاں بن جایا کرتی ہیں۔ اسی موسم میں گھر گھر بیویاں اپنے شوہروں سے محبت کا اظہار بڑے غصے کے ساتھ کیے جاتی ہیں۔ جس کے لیے انھیں زیادہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے۔۔۔۔۔ بس ایک عدد منفرد ڈیزائن (جو اپنے آپ بن جاتی ہے) کا اُونی سوئٹر بنانا پڑتا ہے۔

ہمارے ملک میں جتنے بھی امراء کے ساتھ مہربانی کا مظاہرہ ہوتا ہے ہو لیکن یہ مہربان سردیاں ہمارے مشاعروں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتی ہیں۔ اور شاید مشاعروں کو بھی یہی گلابی جاڑے راس آتے ہیں۔ اسی لیے تو اس موسم میں بستی بستی قریہ قریہ کامیاب مشاعروں کی محفلیں برپا ہونے لگتی ہیں۔ عرصہ دراز سے نامور شعراء کے ذریعے ہمارا بین مشاعرانہ یونیفارم یعنی شیروانی اور تنگ چوڑی دار پاجامہ کو پہنا جاتا، نیز

مشاعروں میں شمع کی حرارت، حقّہ کی حدت اور پانوں کی گلوریوں کی گرمی کا پایا جانا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ابتدا ہی سے ہمارے مشاعروں کے بازار سردیوں میں گرم رہتے آئے ہیں۔ کہتے ہیں اس موسم کے مشاعروں میں اکثر شاعرات طرحی مشاعروں کے مصرعہ ہائے طرح کی طرح ہی طرحدار لگتی ہیں اور مشاعرے کے ماحول میں گرمی اور حدت کا باعث بنتی ہیں۔ مذکورہ مشاعروں میں کم از کم ہمارے لیے تو یہ شاعرات زیادہ کشش اس لیے بھی رکھتی ہیں کہ ان کے پاس "تان روشن چراغ" اور کلام بلاغت نظام کے ساتھ ساتھ ایک عدد عمدہ کشمیری شال بھی ہوا کرتی ہے۔ مشاعرے کے یخ بستہ ماحول میں شاعرہ کی اسی شال کو اپنی شال کے اوپر ڈال کر دو شالے کی گرمی پانے کے ہمیشہ ہی خواہش مند رہتے ہیں۔ ان مشاعروں میں شعرا سے شیروانیوں کی طلب گارا س لیے بھی نہیں رہتے کہ شیروانی کے بٹن اور زلف یار کی گرہیں یکساں ہوتے ہیں۔ ..... انھیں کھولنے تک تو شاعرہ اپنے اختتام کو پہنچ سکتا ہے۔ بالفرض شاعر محترم کے جسم سے شیروانی اتروا کر بروقت حاصل کر بھی لی جائے تو ..... ٹھٹھرتے ہوئے ماحول میں شیروانی سے محروم شاعر کا بیدِ مجنوں بن کر اپنے اختتام کو پہنچنا یقینی ہوتا ہے ....

اردو طنز و مزاح میں " درگت " ایک اضافہ ہے ۔

قتیل شفائی

بی ۔ این راز کا شعری مجموعہ

درگت

جس کے پہلے حصّے "چھیڑ غالب سے" اور دوسرے حصّے "حماقت" میں قہقہوں کا
ایک سیلاب ہے

انتہائی دل چسپ اور دیدہ زیب

52 صفحات پر مشتمل آفسٹ طباعت قیمت ۱۰ روپے

خود کو اور دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے آپ اسے بار بار پڑھیں گے ۔

ملنے کے پتے :

۱ ۔ ماہنامہ "شگوفہ" معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

2 ۔ حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدرآباد

3 ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

4 ۔ کوٹھی نمبر ۱۲۹۵، سیکٹر ۱۵ پنچکولہ (ہریانہ) فون ۔ ۵۶۵۲۰۶

توفیق فاطمہ
(حیدرآباد)

یارِ وفادار

اٹھو بھی خالد میاں —— سارے زمانے میں دھوم سورج گرہن کی ہے اور آپ کا لحاف اترتا ہی نہیں۔ ہم با دلِ ناخواستہ اٹھ بیٹھے۔ معمول کے مطابق اٹھتے ہی ہمیں ضروریات کی فکر رہتی ہے پھر اس کے بعد سر پہ ڈیوٹی سوار ہو جاتی ہے اور ہم سب سے وداع ہو کر چل پڑتے ہیں —— لیکن آج گھر میں عجیب سا ماحول تھا۔ گھر کا ہر فرد جاگا ہوا تھا اور سب لوگ گھر کے بڑے کمرے میں ٹی وی پر آنکھیں جمائے بیٹھے تھے۔ ہم بھی آنکھیں ملتے ہوئے ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ بیڈ ٹی تیار کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ امی جان کی صدا تھوڑی، تھوڑی دیر سے بلند ہو رہی تھی بچو، صحن میں نہ جاؤ، گھر کے باہر نہ جاؤ۔ آسمان کی طرف نہ دیکھو میرے لاڈلو۔ بال آگہ سنتری بنی ہوئی تھیں۔ وہ بھی گن والی۔ ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ سورج جی کی سرکس دیکھنے کے لیے اور وہ ... کہہ رہے تھے۔

کبھی انکھیاں ملاؤں کبھی انکھیاں چراؤں ——

کیا میں نے کیا جادو۔

واقعی جادو والا نظارہ تھا اور سورج اپنے خالق کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھا۔ خیر چھوڑیے گلہ تو ہمیں اپنی قسمت سے تھا نہ کہ سورج سے کہ اتنا بڑا حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ گرہن کی وجہ سے دنیا میں اندھیرا ہونے والا ہے —— دن میں تارے بھی نظر آ سکتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ سڑکوں پر سواریاں نہیں ہیں ورنہ ٹرافک اندھیرے میں جام ہو جاتی —— حادثات ہوتے بھاگ کے اپنے گھونسلوں میں چلے جائیں گے —— اور تو اور ڈاکٹروں نے آگاہ کر دیا۔ سورج گرہن کو برہنہ آنکھ سے مت دیکھیے۔ اس کا عکس بھی پانی میں نہ دیکھیے۔ ورنہ آنکھیں خراب ہونے کا اندیشہ ہے —— الغرض اتنے خدشات کے باوجود —— ہمارے بہادر نوجوانانِ ہند نے سورج گرہن کے مکمل نظارہ کے لیے خاص قسم کی عینکیں خرید لی ہیں۔ کہیں ٹیلی اسکوپ نصب کیے گئے۔ کوئی شیشے پر کالک لگا کر دیکھ رہا ہے —— سب کچھ ہے لیکن تعطیل کا اعلان نہیں تھا۔ ورنہ ہماری امید ٹوٹ گئی۔

ہمارے ذہن میں دن کے وقت چوری کا تصور آیا تو کئی فلمی شعر ذہن کے پردے پر ابھرنے لگے۔ کیا نظارہ ہوگا دن میں تارے دیکھیں گے اور ہم گنگنا اٹھیں گے۔

یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی تیری اک ادا پہ نثار ہے ——

رم جھم ستاروں کا آنگن ہوگا —— کسی نے پکارا۔ "خالد میاں ہوش میں آؤ دن نکل گیا" ہم بھی تو مرد میدان بنے ہوئے تھے۔ شیشے پر کالک ملی اور دیکھنے کی تیاری شروع —— آدھی جان لاکھ منت کر رہی ہیں میکی ہم پتنگ اڑانے والے خودسر بچوں کی طرح شیشے پر کالک لگا کر بھاگ کھڑے ہوئے —— اور سورج کا نظارہ کرنے لگے —— وہ حسین نظارہ ویسا ہی پرکشش جب کوئی اپنے حسین خیالوں میں گم محبوب کو بلاتا ہو۔

دل دھڑک دھڑک کے کہہ رہا ہے آ بھی جا
تو ہم سے آنکھ نہ چرا تجھے قسم ہے آ بھی جا

آگے سنیے —— ہم نے سورج جی سے "آپ ہمارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے جیسا کہ لیلیٰ نے کیا تھا۔ لوگوں نے کہا تھا "کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو"

آپ بھی آفتابوں کے آفتاب سے دعا کرتے "میرا نظارہ کرنے والے کی بینائی محفوظ رکھ" —— اور یہ کہ ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا نہ چھا جائے کہ ملازمت کرنے والے اپنی ڈیوٹی پر نہ جاسکیں" لیکن یہی ہوا دفتر، اسکول، کالج، خورد و نوش کی دکانیں سب بند —— بسیں بند، آٹو بند —— پبلک نے بھی نعرہ لگا ہی دیا۔ سورج گرہن تو آفس کا بھی گرہن۔ بھلا خوف، تو دھا اور اندھیرے میں کون جائے ڈیوٹی بجا لانے۔ اجی صاحب ہوش کے ناخن تو پولس اسٹاف نے لے لیے تھے۔ جن کے جاگنے سے پبلک سوتی ہے۔ اپنی ڈیوٹی کی اہم ذمہ داری چھ کسی سب چھوڑ چھاڑ کر خود بھی" پبلک "بننے کو اندر بند کیے اندر بیٹھے رہے۔ اسی کو کہتے ہیں نفسا نفسی کا دور اور یہی تو ہے میدان حشر کا ریہرسل —— ہم نے آواز لگائی۔ اجی سنتری جی مہاشے باہر تو آئیے —— سنتری جی نے بڑی غصیلی آواز میں کہا —— "کون ہے جو ہمیں باہر نکلنے کا آدیش دے رہا ہے" —— پھر بولے ارے بھگیا وان اپنی آنکھوں کی سلامتی تجھے منظور نہیں —— جائیے جائیے گرہن ہے گرہن اپنی خیر منائیے۔ کیا ستم ہے پھر رہے ہو سڑکوں پر بسوں کے انتظار میں۔ کل کہہ دیا آفیسر نے ہم کہتے ہیں تو سب کچھ ہے۔ سورج سے آنکھیں ملاتا تو آپ کا اور ناتھیل کا چہرہ مبارک آج کیسے دیکھ پاتا؟

یہ کہا اور پولس قلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے زور سے کھڑکی بند کر دی —— اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ سمجھتے تھے کوئی تسلی بخش جواب دے گا۔ ہماری ہمت کی داد دے گا کہ سارے لوگ دروازے کے دروازوں کے پیچھے اور ہم جان واحد ڈیوٹی بجا لانے کی فکر میں بس کا انتظار کر رہے ہیں۔ —— سنتری کا عتاب اور بس کا انتظار برداشت کیے جا رہے تھے —— اور ہے کوئی جو ہمیں بہادری کا قومی یا بین قومی انعام دے یا کم از کم دو جملے تعریفی ہی کہہ دے —— خیر ہمیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔

سورج جی کا یہ کھیل کوئی ایک گھنٹہ چلتا رہا اور ہم بھی مزے لوٹتے رہے کھلی فضا میں ایسے موقعے بھلا بار بار کب آتے ہیں ـــــ اور جب سورج صاحب تھک گئے اور کہا بس کھیل ختم اب ہمارا دم گھٹ رہا ہے تو وہ کھلے میدان میں نکل آئے۔

ادھر ہمیں اپنے فرائض منصب کا خیال آیا اور جھٹ پٹ تیار ہو کر بڑے تپاک سے باہر نکلے جیسے کوئی بڑا قلعہ فتح کرنے جا رہے ہوں ـــ دراصل ہمیں اپنے کام پر پہنچنا اشد ضروری تھا۔ ملازمت اور لازمی حاضری کے ہمارے عہدے کی تفصیلات بتا کر ہم آپ کا قیمتی وقت برباد کرنا نہیں چاہتے۔

سڑک پر نکلے تو اپنا محلہ ہی اجنبی لگ رہا تھا۔ سڑک پر آدمی تو آدمی کتا بلی کا بھی دور دور تک پتہ نہ تھا۔ دوکانیں بند، گھروں کے دروازے بند جیسے زندگی معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ کہیں سے بس آجائے۔

لیکن معلوم ہوا کہ گرہن چھوٹا تو آر ٹی سی کو لگ گیا غصے سے ہم چیخ پڑے پھر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی سن نہ لے لیکن وہاں تھا ہی کون سننے کے لیے ـــ ہم رقص بھی کرتے تو ہمیں کوئی نہ ٹوکتا۔

لیکن ہم بھی اڑے رہے کہ دفتر جا کر ہی رہیں گے۔ لیکن وہاں تو کوئی سواری ہی نہیں تھی۔

ہمارا دل دھک دھک کرنے لگا کہ غیر حاضری پڑے گی۔ ہمارا ریکارڈ تھا کہ ہم ایسے ہی خطرناک موقعوں پر اپنی جان جوکھم میں ڈال کر سینہ تان کر رستم ثانی بنے نکلتے ہیں۔ ایسے دن رجسٹر میں ہماری حاضری ضرور رہتی ہے۔ ہم ایسے ہی وقتوں پر حاضری دینے کے لیے مشہور ہیں۔

آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ہماری محبوب بس "میں آؤں یا نہ آؤں میری مرضی" کہتی ہوئی آگئی اور ہم باعافیت اپنی منزل مقصود پہنچ گئے۔

ہم گیٹ کی طرف جا رہے تھے کہ ہمارے دوست نظر آئے۔ ہمیں لگا کہ پیاسے کو کنواں مل گیا ـــ لیکن یہ کیا انھوں نے ہماری بہادری، جواں مردی اور ان حالات میں ہماری حاضری کی تعریف میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے ہمارے جذبات میں آگ لگا دی ـــــ اور غصہ سے کہا آپ نے اخبار نہیں پڑھا آج چھٹی کا اعلان کر دیا گیا ـــــ میں تو کسی ذاتی کام سے باہر نکلا تھا۔ ورنہ سورج گرہن پر ہم کیا نکلتے ـــ یہ کہہ کر وہ گنگنانے لگے:

جس کو ہو دل و جاں عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

پھر ہم سے پوچھا ـــــ "لیکن آپ!"

ہم نے کہا خواہر ـــــ ملازم فادار جامعہ عثمانیہ

دوست نے کہا واہ رے خواہر ـــ آپ رہیے اپنی ڈیوٹی پر ـــ اور ہم چلے اپنے گھر ـــ اور ہم بڑبڑاتے رہ گئے۔

∞

قطعے

(۱) آصف آروی (بہار)

ہو درد سر میں مبتلا گھر کا کوئی بھی فرد
محسوس ہم کو ہوتا ہے خود اپنے سر میں ہے
ہم پر جب کسی دکھ تو کوئی پوچھتا نہیں
"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

○

دل ناداں تری ہی تشبیہ پر اس انجام کو پہنچے
حسینہ سے سر بازار کھا کر مار بیٹھے ہیں
ارے ظالم تو سینے میں اچھلتا کودتا کیا ہے
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بیگم کے نام

آصف آروی

اب سروس بیگم ختم ہوئی
دولت کی یہ چھم چھم ختم ہوئی
سب طاقت رستم ختم ہوئی
اب مجھ پہ تم یہ کرم کر دو
کچھ فیشن اپنے کم کر دو

تھی سروس کی کچھ بات عجب
وہ رشوت کی برسات عجب
کی فیشن نے حالات عجب
حالات میں خود کو ضم کر دو
کچھ فیشن اپنے کم کر دو

اب دیکھو میری پستی کو
مت یاد کرو اس مستی کو
اس پنشن والی ہستی کو
مت داخل رنج و الم کر دو
کچھ فیشن اپنے کم کر دو

اوقات نہیں اب ریشم کی
تھا انکم اچھی ساڑی دی
وہ بات کہاں اب پہلی سی
ہر شوق کو تم مدھم کر دو
کچھ فیشن اپنے کم کر دو

کٹتی اپنے سفر میں کار صنم
دشوار تھا پیدل ایک قدم
اب لوز میں خود پر اے ہمدم
یا رکشہ یا ٹم ٹم کر دو
کچھ فیشن اپنے کم کر دو

تم گہنے پہنو پیتل کے
مت بھرو کلائی چوڑی سے
سب ٹھیک تھا جب تک جیب بھری
سر نگوں ہر اک پرچم کر دو
کچھ فیشن اپنے کم کر دو

سب سن کر بولیں بیگم بھی
سرکار نے پنشن کم کر دی
ہے میری ڈیوٹی سبھی وہی
میں ان سروس ہوا ضم کر دو
مت کہو کہ فیشن کم کر دو

○

ایس اے رضوی
(حیدرآباد)

ایک گدھے کی ذہانتِ انسانی

ہمیں اور کوئی شوق بھلے نہ ہو لیکن اخبار بینی کا ہم بڑا ذوق رکھتے ہیں۔ ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ ہمارا اخبار والا کبھی بیمار ہو جائے اس لیے نہیں کہ ہمیں اس کی صحت کی بڑی فکر ہے بلکہ اب آپ سے کیا چھپائیں صرف اسی لیے کہ کہیں وہ ہمارا اخبار ناغہ نہ کر دے۔ چنانچہ معمول کے مطابق ایک دن جو ہم نے اخبار کھولا تو عقل دنگ رہ گئی۔ ویسے عام مضامین تو ہماری نظر سے اس طرح گزرتے ہیں جیسے لاڑ بانا رہے راہ رو۔ لیکن یہ جو مضمون تھا وہ ہمیں دم بخود کر دینے والا ثابت ہوا۔ واقعہ تو ایک کتیا کا تھا لیکن ایسی ویسی کتیا کا نہیں جو ہر ایرے غیرے پر بھونکتی رہتی ہو۔ یہ کتیا بڑی خاص الخاص تھی جسے ایک لڑکے کی عنقریب واقع ہونے والی افسوس ناک بلکہ دردناک موت کا اس طرح پتہ تھا جیسے اس نے علم نجوم گھول کر پی لیا ہو۔ خبر تھی کہ اس کتیا نے نہ پہلے کبھی بھونکا اور نہ بعد میں۔ بس ایک ہی وقت میں بھونکنے کا کام مکمل کر دیا تاکہ لڑکے کو موت کی لال جھنڈی نظر آ جائے اور وہ زندہ سلامت بچ جائے لیکن ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ سکندرِ اعظم جیسا بادشاہ جب نہ بچ سکا تو ہما شما کا شمار ہی کیا۔ نتیجتاً لڑکے نے کتیا کی پروا کیے بغیر جب باہر جانے کی ٹھان ہی لی حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اتنی بڑی خبر پڑھ کر بڑی دیر تک ہم کچھ سناٹے میں آ گئے کہ موت تو بھلے سے یقینی ہے مگر ایسی بھی کیا کہ کتیا کو علم ہو جائے لیکن انسان بے خبر رہے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر ایک معمولی کتیا وہ کام کر گئی جو بڑے بڑے طوطے والے نجومی نہ کر سکے۔ پھر ہمارے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور یک ملتا جلتا واقعہ یاد آ گیا جس پر ہم تو چونکے ہی تھے لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ بھی چونکنے سے محروم رہ جائیں۔ ت کچھ اس طرح ہے کہ شاید آپ کو بھی علم ہو، اور اگر نہ بھی ہو تو ذریعہ ہذا ہو جائے گا کہ میسور شہر اپنے دسہرہ ریب کے لیے سارے ملک میں اپنا جھنڈا گاڑنے والا شہر ثابت ہو چکا ہے۔ جہاں رنگا رنگی تقاریب میں ۔ عدد نمائش کا اہتمام بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ حسنِ اتفاق سے ایک بار ہمیں بھی اس نمائش میں شمولیت ا سعادت نصیب ہوئی جہاں ایک عقلِ حیوانی کے حیران کن مشاہدے سے آج بھی ہم حیران و ششدر ہیں۔

ہوا یوں کہ نمائش میدان میں ایک مقام پر اچھی خاصی بھیڑ لگی دیکھتے ہوئے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اُن سارے عام و خواص کے ساتھ ہم بھی ہو رہے واقعے کا مشاہدہ کر لیں۔ نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ لوگ حصار باندھے ساکت و صامت بلکہ با ادب با ملاحظہ ایستادہ تھے اور ان کے عین درمیان ایک مجہول سا انسان گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے ایک خوب صورت سے گدھے کے ہمراہ تماشہ بین خواتین و حضرات کی توجہ کا مرکز بنا ڈگمگا رہا تھا۔ پھر وہ بدمعاش شخص نے اپنے گدھے کے ذریعے ایسے ایسے انکشافات کیے کہ ہماری تو عقل انسانی دنگ رہ گئی۔ اس نے ڈھول پیٹا تاکہ حاضرین ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ پھر اپنے گدھے سے درخواست کی کہ وہ بتلائے کہ وہا کس خاتون نے لپ اسٹک چڑھائی ہوئی ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ جب گدھا سیدھے اس بعد لڑکی کے سامنے جا کر ٹھیر گیا جس نے اپنے سیاہ ہونٹوں پر بے تحاشہ لپ اسٹک تھوپ رکھی تھی۔ لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور ہماری تالی تو شاید کچھ زیادہ ہی دیر بجتی رہی۔ پھر شخص مذکور نے اپنے پیارے گدھے سے پوچھا کہ اے گدھے بتلا کہ یہاں سب سے کمسن انسان کون سا ہے۔ ہم ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گئے جب ہم نے دیکھا کہ گدھا سیدھے ایک ننھے منے معصوم بچے کے پاس کچھ اس طرح پہنچا کہ بچہ سہم کر اپنی ماں کی آڑ میں چلا گیا۔ غالباً اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا سامنا کسی انسان سے نہیں بلکہ چوپائے گدھے سے ہوا ہے۔ تیسری بار گدھے کے مالک نے پیار سے گدھے پر ہاتھ پھیرا اور با آواز بلند اس سے فرمائش کی کہ وہ کون خاتون ہیں کہ جن کے ہاتھ میں کالا پرس تھا ہے۔ گدھے نے پورے سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے اپنی بڑی بڑی دل فریب آنکھوں سے نظر دوڑائی اور خراماں خراماں چلتا ہوا ان کالے پرس والی محترمہ کے روبرو جا کر ایسے رکا جیسے فوری بریک لگانے پر ہماری اسکوٹر رکتی ہے۔ اس خاتون کی پریشان صورت ہمیں اب بھی یاد ہے جو ایسی پریشان کن نظروں سے گدھے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں کہ جیسے گدھا کسی اچکے کی طرح ان کی پرس پایاب جھپٹنے ہی والا ہو۔ وہاں ہمارے مشاہدے میں گدھے کی اور بھی ایسی ایسی شائستہ حرکتیں آئیں کہ آج بھی ہماری عقل گم ہے کہ ایک گدھا جو اسم بامسمیٰ بالکل گدھا تھا کیونکر انسانوں جیسی عقل سلیم کا مظاہرہ کر پایا۔ اور ہماری تازہ ترین مصدقہ اطلاع کے بموجب مذکورہ گدھا اپنی ذہانت الناس کا لوہا منواتے ہوئے آج بھی اسی نمائش میدان میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب میسور تشریف لے جانے کا قصد فرما رہے ہوں تو ان سے ہماری ادباً گزارش ہے کہ بھلے وہ میسور کے مہاراجہ کا مشہور محل نہ دیکھیں لیکن اس گدھے کا دیدار کیے بغیر واپس نہ لوٹیں۔ جناب تو یہ اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کل کو کوئی غیر ذمہ دار شخص ہم پہ دروغ گوئی کا الزام عائد کرے تو وہ ہماری صداقت کے گواہ رہیں۔

قلمی معاونین سے التماس:
اپنے مسودات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں
اور کاغذ کے ایک طرف پر تحریر کریں جو سیاہی سے خوش خط ہو۔

منظور وقار
(گلبرگہ)

مسٹر کھٹمل سے ملاقات

ہم بہت نگر جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو پتہ چلا ہماری مطلوبہ ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ تاخیر سے آنے والی ہے گویا ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ ریلوے اسٹیشن پر برباد کرنا تھا۔ ہم وقت کی اس بربادی کا فائدہ اٹھانے کے لیے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں داخل ہوئے اپنے آپ کو آرام کرسی میں دھنسا کر اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک ناقص ادبی رسالے کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ہماری نظر ایک جدید (تجریدی ٹائپ) افسانے پر ٹک گئی۔ ہم کوشش کرکے اس افسانہ میں موجود علامتوں کو اپنی گرفت میں لینے ہی والے تھے کہ ہمارے سینے پر ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ چھاتی جس پر ہمیشہ ہمارے دوست واحباب اور رشتہ دار مونگ دلا کرتے ہیں۔ ان پر آج ایک عجیب و غریب قسم کی سرسراہٹ محسوس کرکے ہم بے چین ہوگئے۔ بنیان کے اندر ہاتھ ڈالا تو ایک تر و تازہ خون سے مالا مال خورد کھٹمل ہمارے ہاتھ آیا۔ ہم نے اس کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان پکڑ لیا جیسے بعض وقت ٹاڈا کا قانون بے قصور لوگوں کو صرف شک کی بنیاد پر ہتھکڑیوں میں جکڑ لیتا ہے۔ کھٹمل کا چہرہ ہمارے روبرو رکھ کر ہم نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ارے مسٹر کھٹمل! تم ہو؟؟ ادھر چند برسوں سے تم لوگ نظر ہی نہیں آتے۔ تمہاری نسل جیسے ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو لوگ تم کھٹملوں کو بھول ہی چکے ہیں ورنہ ایک دور تھا گھر ہو یا بنگلہ، جھونپڑی ہو یا ہوٹل، مسجد ہو یا مندر ہر جگہ تمہاری حکومت تھی۔ تم لوگ رات بھر لوگوں کو جگائے رکھتے تھے۔ رات کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ جاگ جاگ کر آنکھیں سرخ ہوجاتی تھیں۔ مکانات کی دیواریں تمہارے خون سے رنگین ہوجاتی تھیں۔ ایک کھٹمل کو رگڑنے کے بعد سو کھٹمل جنم لیتے تھے۔" جب ہماری بات پوری ہوئی تو کھٹمل شرم سے سر جھکا کر ایک لنگڑی مسکان ہونٹوں پر پھیلاتے ہوئے بولا "ہاں صاحب میں تسلیم کرتا ہوں کہ آج کل ہماری نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری نسل کو مٹانے کے لیے تم لوگوں نے نت نئے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ زہر آلود دوائیں چھڑک کر ہمیں مٹایا گیا۔ صرف اس لیے کہ ہم کھٹمل انسانوں کے جسم سے

چند قطرے خون چوس لیتے ہیں جبکہ تم انسان ہو کر خود اپنے ہی بھائیوں رشتہ داروں اور دوستوں کا خون بڑی شراب سمجھ کر پی جاتے ہو۔ باوجود اس گناہ کے تم لوگ سماج اور سوسائٹی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنی شان و شوکت اور شرافت کو برقرار رکھتے ہو۔ اس لیے کہ تم اشرف المخلوقات ہو۔ ہم کھٹملوں کو مٹانے کے لیے کی جانے والی تگ و دو کے باوجود ہماری پوری نسل ختم نہیں ہوئی۔ اب بھی خاصی تعداد میں ہم مختلف مقامات پر پناہ حاصل کر چکے ہیں مثلاً سرکاری ہسپتال، بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشن، سینما تھیٹرس میں ہم نے پناہ لی ہے۔ چند کھٹمل اسمبلی اور پارلیمنٹ کے خوب صورت اور چکنے فرنیچر تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔

مسٹر کھٹمل تم لوگ آج کل غریبوں کی جھونپڑیوں، سرکاری ملازمین کی گندہ کالونیوں میں کیوں نظر نہیں آتے؟" جواب میں مسٹر کھٹمل نے بتایا۔ "مزدوروں اور محنت کشوں کا خون خود ان کے مالک ہی چوس لیتے ہیں۔ ہمیں چوسنے کے لیے ان کے لاغر جسموں میں خون کا ایک قطرہ بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ جبکہ تیسرے درجے کے سرکاری ملازمین کی کالونیوں میں رہنے والے اکثر بیماری ٹی بی اور جنسی امراض کا شکار رہتے ہیں۔ ہمیں ایسے بیمار اور ناکارہ لوگوں کا خون پی کر اپنی صحت تھوڑے ہی کھونی ہے۔ میں خود اس ریلوے اسٹیشن کے تھرڈ کلاس ویٹنگ روم میں نہیں رہتا کیونکہ وہاں مسافروں کے پچکے گال۔ اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں جب سے اس فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں آیا ہوں مجھے لگتا ہے میں وزیر ہوائے غذا بن چکا ہوں۔ میری صحت قابلِ رشک ہو چکی ہے"۔ ہم نے پوچھا "مسٹر کھٹمل تمہارے دیگر ساتھیوں کا کیا حال ہے؟" کھٹمل کا جواب تھا۔ "صاحب آج کل میرے چند ساتھیوں کی حالت اچھی نہیں۔ چند کھٹمل جو بس اسٹاپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ریلوے اسٹیشن میں بستے ہیں۔ وہ مسافروں کا خون چوس چوس کر بے چینی اور نفسیاتی امراض کا شکار ہو چکے ہیں۔ کیونکہ مسافروں کی اکثریت نفسیاتی مرض اور بلڈ پریشر میں مبتلا ہوتی ہے۔ صبر اور سکون ان میں نام کو نہیں ہوتا۔

بس ہو یا ٹرین پہنچنے میں پانچ منٹ کی تاخیر بھی ہوتی ہے تو مسافر پانچ منٹوں میں پچاس بار گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں۔ ادھر ادھر بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سگریٹ کے دو پاکٹ پی جاتے ہیں۔ محکمہ ریلوے کی کارکردگی پالیسی کے افسروں کو پانچ پھوہڑی گالیوں سے نوازتے ہیں۔ میرے جو ساتھی سینما تھیٹر میں موجود ہیں انہیں نیم عریاں جسم اور جنسی مناظر دیکھنے کے عادی نوجوانوں کا خون چوسنے کو ملتا ہے۔ کھٹمل بھی ان نوجوانوں کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طرح جنسی مناظر دیکھنے کی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ کھٹمل تھیٹر میں اس وقت تک موجود رہتے ہیں جب تک کہ اسکرین پر ہیجان انگیز جنسی مناظر چلتے رہتے ہیں۔ ادھر اسکرین پر کوئی اصلاحی یا اخلاقی منظر آگیا کہ یہ کھٹمل نوجوانوں کے ساتھ تھیٹر کے باہر نکل آتے ہیں۔ میرے جو ساتھی اسمبلی میں رہتے ہیں ان میں اکثر اراکانِ اسمبلی کی طرح سونے یا اونگھنے کے عادی ہو چکے ہیں چند کھٹملوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیاداری سے بے خبر ہو کر گیروا رنگ کے کپڑے زیب تن کرنے والے سادھو، سنتوں کے جسموں میں پناہ لی تھی کہ ریاضت اور تپسیا کے ذریعہ بھگوان تک رسائی حاصل کر سکیں۔ لیکن اب وہ کٹر فرقہ پرست بن چکے ہیں۔ جو کھٹمل مرشدوں کے خانقاہوں میں پناہ لے چکے ہیں وہ اندھی عقیدت اور نفرت کا شکار ہو چکے ہیں۔ جو کھٹمل لائبریریوں میں پناہ حاصل کر چکے ہیں ان میں سے چند کھٹمل شاعر بن چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

...... تو چند کھٹمل علامتی اور تجریدی افسانے لکھ رہے ہیں۔

ہم نے مسٹر کھٹمل سے ایک اہم سوال پوچھا —— "اردو کے ادیبوں، شاعروں اور استادوں کا خون چوس کر آپ نے کیا محسوس کیا؟"

آنکھیں بند کرنے کے بعد گہری فکر میں ڈوب کر کھٹمل نے جواب دیا۔ "پہلے تو ادیبوں اور شاعروں کے بدن میں خون نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو بڑا بدمزہ کیونکہ اکثر تخلیق کاروں کے خون میں حسد، کوتاہ ذہنی، اور انانیت کے جراثیم ہوتے ہیں۔ انھیں اردو زبان کی ترقی و ترویج سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بس وہ چاہتے ہیں کہ ادب میں ان کی ساکھ بنی رہے۔ اور ادبی شہرت کی ہوس نے انھیں پاگل بنا رکھا ہے۔"

ہم نے کھٹمل سے آخری سوال کیا "کیا تم نے کبھی بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا ہے؟" کھٹمل کا جواب تھا "صاحب میں خالص ہندوستانی ہوں۔ میں ہی کیا ہماری نسل خالص ہندوستانی ہے۔ ہم لوگ کبھی اپنے ملک کو چھوڑ کر بیرونی ممالک نہیں جاتے۔ ہم لوگ انسان تھوڑے ہی ہیں جو منسٹر بنتے ہی بیرونی ممالک کے دورے پر نکل جاتے ہیں۔ سردی زکام کا علاج کروانا ہو تو امریکہ اور لندن پہنچ جاتے ہیں۔ ہم محب وطن ہندوستانی کھٹمل ہیں۔ اسی ملک میں پیدا ہوتے، اسی ملک کے لوگوں کا خون چوستے اور اسی ملک کے لوگوں کے ہاتھوں مرتے ہیں۔"

ڈاکٹر محمد کوثر اعظم

مہمان

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب کسی کے گھر ہفتہ عشرہ تک اگر مہمان نہ آئے تو وہ خود کو اس روئے زمین کا سب سے بدنصیب انسان سمجھا کرتا تھا واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کے دسترخوان پر جب تک کوئی مہمان شریک نہ ہوتا آپ انتظار کرتے رہتے اور کھانا تناول نہ فرماتے ٹھیک اس کے برعکس آج کا دور ہے۔ کہ لفظ 'مہمان' سنتے ہی ذہن کو ایک جھٹکے کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہوش و حواس پر بجلی گر پڑی اور دن میں تارے نظر آنے لگے۔ گویا یہ وہ مخلوق ہے جو بغیر سینگ کے ضرر پہنچاتی ہے۔ دورِ جدید کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ 'پدرم سلطان بود' والے دن ہمارے اب رہے نہیں ورنہ ان دنوں حضرت مہمان کا استقبال اس طرح کیا جاتا تھا گویا کہ وہ گھر کا ایسا تازہ ترین داماد ہو جو شادی کے بعد پہلی دفعہ اپنی سسرال تشریف لایا ہو۔ یہی نہیں ہفتہ عشرہ سے قبل اگر کوئی مہمان لوٹنا چاہتا یا لوٹ جاتا تو گھر والے اپنی بے عزتی سمجھتے آج جب تک مہمان ٹل نہیں جاتا تب تک گھر والے "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ مہمانوں کی تو چھوڑیئے آج کا ہمارا جدید معاشرہ بوڑھے والدین کا خرچ برداشت کرنا بھی گوارا نہیں کرتا اور انہیں گھر کی بے کار چیز اور out dated سمجھ کر گوشے میں پھینک دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔

مہمانوں کی ایک معقول شکل 'دل کے مہمان' کی ہے۔ جن کے لیے لوگ اپنی پلکیں بچھائے منتظر رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مہمان کے لیے گھر میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوا کرتی بلکہ خوب صورت، وسیع اور کشادہ مکان بھی خود صاحب خانہ کو تنگ اور لائق رہائش نظر نہیں آتا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

'ماں نہ ماں میں تیرا مہمان والا مہمان' بے شرمی کی قبا اوڑھ کر خانہ، مالک پر حاوی ہو جاتا ہے اور مجبوراً خانہ، مالک کو ان کی مہمان نوازی کے طفیل میں کبھی کبھی ساہوکاروں کے دروازے تک کھٹکھٹانے پڑ جاتے ہیں۔

مہمانوں کی ایک قسم آج کل بہت ہی مشہور ہے یعنی مہمانِ خصوصی۔ بڑی سے بڑی یا چھوٹی سے چھوٹی کوئی

بھی تقریب ہو خواہ وہ عقیقہ ہی کیوں نہ ہو بغیر مہمان خصوصی کے رنگ جمتا ہی نہیں اور اس نیک کام کو انجام دلانے کے لیے کچھ اہم شخصیتوں کے دروازے کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور ان کے لواحقین کی ڈانٹ پھٹکار سننی اور جھیلنی پڑتی ہے۔ تب کہیں جاکر آپ کی تقریب کامیابی سے ہمکنار ہوپاتی ہے۔ اور اکثر مہمان خصوصی کے ساتھ ایک یا کئی دم چھلے لازمی طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ جنھیں طفیلی کہا جاتا ہے۔

مہمانوں کی ایک ترقی یافتہ شکل بھی آج کل بڑے بڑے شہروں میں سامنے آگئی ہے جسے paying guest کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مہمانوں کی یہی وہ واحد قسم ہے جو قابلِ رحم ہے بلکہ مظلوم بھی کیوں کہ صحیح معنوں میں ہوتی تو میزبان ہی ہے لیکن کہلاتی مہمان ہے۔

وقتی مہمان کی ایک خاص الخواص قسم 'دستر خوانیہ' کہلاتی ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر مولوی حضرات (ویسے جو عمل سے کوسوں دور ہوتے ہیں) شریک [...] ہیں۔ مولوی اور مرغ کے رشتے سے کون واقف نہیں؟ چنانچہ اکثر میلاد کی محفلوں میں شرکت کے لیے بعض مولوی حضرات نذرانہ کے علاوہ 'مرغ و ماہی' والی شرط سے بھی ضرور آگاہ کردیتے ہیں۔ بقول سید محمد جعفری:

ہے مولوی کے لیے مرغ کی طلب ہر دم
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اس 'خوش خوراکی' کی وجہ سے آپ نے مولوی حضرات کو دبلا پتلا کم ہی دیکھا ہوگا۔ ایک آدمی نے کسی مولوی صاحب سے مرغ سے رغبت (دشمنی زیادہ) کی وجہ پوچھی تو وہ اس طرح بلند آواز میں گویا ہوئے:

"ہمارے دائرۂ اختیار میں حضرتِ مرغ کا بے جا دخل (اذان سے قبل اور بعد اذان دینا) ہم لوگوں کو قطعی پسند نہیں، لہٰذا انتقاماً ہم لوگ اس کی نسل در نسل کو لقمۂ تر بناتے آئے ہیں"

بعض فری اسٹائل مہمان بھی ہوتے ہیں جن میں اکثریت نئی نسل کے نوجوانوں کی ہے۔ ایسے ہی کسی مہمان سے ایک ادھیڑ عمر کے میزبان بہت نالاں تھے۔ ایک دن فرمانے لگے۔ "پہلے کوئی کسی کے گھر مہمان آتا تو تہذیب سلیقہ اور آداب کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ نوجوان بالکل فری اسٹائل میں آفتِ ناگہانی کی طرح نازل ہوجاتے ہیں۔ آپ ان کے لیے طعام و قیام کے ساتھ لنگی، تولیہ، کنگھی اور رومال کا بھی انتظام کیجیے۔ یہ حماقت اور بدتمیزی نہیں تو اور کیا ہے؟"

مہمان حضرات کی مختلف اقسام میں ایک جماعت "بے تکلف" مہمانوں کی ہوتی ہے جو بغیر کسی جھجک خانہ مالک کے سر اپنی بے جا فرمائشیں بھی تھوپتے رہتے ہیں۔ یعنی صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کے 'مینو' اور 'عملیات' (سگریٹ، تمباکو، بیڑی، چائے اور پان وغیرہ) سے بھی خانہ مالک کو نہ صرف یہ کہ آگاہ کردیتے ہیں بلکہ کھانے سے متعلق بیزاری اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ آرام دہ بستر، مچھر دانی اور تکیے کی فرمائش کے ساتھ رخصت ہوتے وقت ناقابلِ واپسی قرضہ حاصل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

-o-

جمیل صدیقی بدایونی

(خاکہ)

تذکرۂ مدیر و ادیب
فی احوالِ ڈاکٹر اسحٰق طبیب

ہماری اور ڈاکٹر صاحب کی دوستی کو زیادہ مدت نہیں گزری۔ دیدہ و شنیدہ تو پہلے سے تھی لیکن رہ
راہ آنند نرائن ملّا کے اس شعر کے مصداق تھی :

اک سلام اک مسکراہٹ اک سوال اک شکریہ
وہ بھی یونہی راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے

مگر ان کی شخصیت کا جادو ہمارے سر چڑھ کر بولتا رہا۔ ان کی عادات و اطوار میں کچھ ایسی مقناطیسیت تھی کہ دل خود بخود ان کی جانب کھنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب متوسط القامت، متناسب الاعضا، گندم گوں اور نہایت جامہ زیب انسان ہیں خصوصاً ان کا فاختئی رنگ کا سفاری سوٹ ان کی شخصیت کا ایک جزو بن گیا ہے۔ وہ متانت سنجیدگی کی چلتی پھرتی مورت تو ہیں ہی، اس کے ساتھ ساتھ خوش خلقی خوش اطواری، خوش خرامی اور خوش مزاجی جیسی صفات نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی شفیق سی مسکراہٹ چہرے کے لامتناہی سکون سے مل کر مریض تپ و لرزہ سے لے کر بیمار شعر و ادب تک کو نوید شفا ہوتی ہے۔ ان روشن اور بڑی بڑی آنکھوں میں اعتماد کی جھلک نیم بسمل نبض حیات کو تجدید زیست کا مژدہ سناتی ہے۔ چہرے پر سکون ایسا جو درد و الم کو مٹا دے، لبوں پر وہ تبسم جو تپتے زخموں میں ٹانکے بھر دے اور لہجہ میں وہ اپنائیت جسے مرہم جراحت کہیں تو بجا ہے۔

ابھی ہم نے ڈاکٹر صاحب کی خوش خرامی کا ذکر کیا تھا۔ خدانخواستہ آپ اس کا غلط مطلب نہ سمجھیں۔ دراصل خوش خرامی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔ جتنا ہمیں ان کی خوش خرامی نے متاثر کیا ان کی دیگر خصوصیات نے نہیں۔ جب ہم ڈاکٹر صاحب کو دولت کدہ سے کلینک کی جانب پاپیادہ جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی مرد مومن پل صراط پر نہایت سبک خرامی سے گزر رہا ہو اگرچہ یہ پل صراط نہ تو بال سے باریک ہے اور نہ تلوار کی دھار کی طرح تیز بلکہ کافی کشادہ ہے مگر اس پر سخت مقام آتے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو ڈاکٹر صاحب کا قدم جادۂ مستقیم سے سرِ مو لغزش کر جائے۔ اسی پل

ہفت خواں میں غالباً پہلا مرحلہ گھر سے کلینک جانے کے لیے مقررہ وقت پر باہر آنا ہے۔ ہمیں تو بڑا استعجاب اس پر ہے کہ ایک عدد شریکِ حیات کے ہوتے ہوئے بھی ڈاکٹر صاحب ٹھیک صبح نو بجے کس طرح گھر سے باہر آ جاتے ہیں۔ جبکہ ہماری بیوی نے کبھی دس بجے سے پہلے چلنا نہیں چلایا۔ یہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ روزے کی نیت کر کے گھر سے نکلتے ہوں۔ ہفت خوانِ دوئیم تا ہفتم کی آفات کا ہمیں صحیح علم نہیں لیکن لیکن اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ ان منازل میں انھیں شاعروں، ادیبوں اور سکیٹروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور چوں کہ ان منازل میں ردوبدل ہوتا ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب بھی وثوق سے کچھ بتانے میں قاصر ہیں۔

بہرحال جب ڈاکٹر صاحب اپنی خوش خرامی کی بیمہ تھپتھپاتے ہوئے چھٹے مرحلے پر پہنچتے ہیں تو ان کی پابندیٔ اوقات کی روایت دم توڑتی نظر آتی ہے۔ استاد ذکی تالگانوی دفتر سہ ماہی "ابر" کے تینوں طبق والے چشم براہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب استاد کے پہلو میں براجتے تو اس طرح ہیں کہ شب مذاکرہ کے چراغ لودینے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن دفتر کی کلاک کی بانگ پر یوں کھڑے ہو جاتے ہیں گویا:

نسیم جاگو کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے۔

ساتواں مرحلہ کلینک میں پیش آتا ہے۔ روز کی طرح مریضوں کی قطار میں سب سے آگے مولانا طاہر لاہوتی تشریف فرما ہوتے ہیں۔ مولانا ڈاکٹر صاحب کے نامزد مشیر اور رجسٹرڈ مریض ہیں۔ انھیں انواع اقسام کی مزمن اور بیماریاں اپنے شکنجے میں جکڑے رہتی ہیں اور وہ بلاناغہ ادویات استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کیمیادی رزق کی بدولت ان کی پرواز میں اتنی کوتاہی آگئی ہے کہ اپنے مکان سے ڈاکٹر صاحب کے کلینک تک محدود ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہایت صبر و ضبط سے ان کے پند و نصائح کے ساتھ ساتھ ان کی تکالیف کا قصۂ طولانی سننے اور ان کی مکمل تشفی کر دینے کے بعد تقریباً نصف گھنٹے بعد دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ہفت خواں ڈاکٹر صاحب کی خوش مزاجی کے طفیل بخیر و خوبی طے ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی خوش فہمی کا تعلق ہے اس میں انھیں ہم سے فروعی اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر اختلاف نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب غضب کے خوش فہم واقع ہوئے ہیں۔ ان کی خوش فہمی کا ایک شکار تو ہم ہیں۔ ہم اکثر و بیشتر نزلہ زکام جیسے موذی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب ہم علاج کی نیت سے ان کے روبرو پیش ہوتے ہیں تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ماشاءاللہ آج تو آپ کے چہرے پر بڑی رونق ہے۔ کیا کوئی نیا مضمون لکھا ہے؟"

ہم رونی آواز میں اپنی تکلیف بیان کرتے تو ڈاکٹر صاحب ہماری جانب کوئی خاص توجہ نہیں دیتے دوسرے مریضوں سے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں ہم کئی بار کھانس کر اور کھنکار کر یہ جتانے کی سعی لاحاصل کرتے رہتے ہیں لیکن کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کہ انھیں اپنے مرض کی سنگینی سے آگاہ کرنے کی

جب آخری مریض بھی رخصت ہو جاتا تو بڑے اطمینان سے ریش مبارک پر ہاتھ پھیر کر ہماری ط
توجہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ حسب معمول اس طرح کا جانب دارانہ برتاؤ کرنے
بعد متوجہ ہوئے تو ہم نے کہا:

"سنیے، رات ایک شعر ذہن میں آیا تھا۔ اندھیرے میں لکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ازاربند میں گرہ لگائی تھی۔ صبح دم جب ازاربند پر نگاہ گئی تو فوراً شعر یاد آگیا۔"

"بھئی واہ - ارشاد" ڈاکٹر صاحب ہمہ تن گوش ہو کر بولے۔

تو سنیے:

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے طنز کو سمجھ گئے اور فوراً میز کی دراز سے کچھ کیپسول نکال کر ہمارے ہاتھ پر رکھ دیے۔ کیونکہ ولی را ولی می شناسد۔ اگر وہ شاعر مزاج ہیں تو ہم بھی اس میدان میں گھاس نہیں کا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خوش فہمی اس حد تک تو قابل برداشت ہے لیکن سہ ماہی "چہل پہل کے مدیر" ادارت کے سلسلہ میں ان کی خوش فہمی خود ان کے لیے بلائے جان بن گئی ہے۔ "چہل پہل کا مدیر" یوں تو سہ ماہی ہے لیکن شہر کے اکلوتے کاتب کی مہربانی سے ششماہی تو روز اول سے ہی ہو گیا تھا۔ اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ کہیں وہ بارہ ماسہ نہ ہو جائے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کے صبر ایوبی کی داد بھی دینا پڑتی کہ بجائے حرفِ شکایت زبان پر لانے کے کاتب کی مردہ و خفتہ رگِ شرافت کو اخلاقی مالش سے گرما کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ کاتب کے مکان کے چکر پر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ پہلے تو وہ حضرت دستیا ہی نہیں ہوتے اور سوئے اتفاق سے مل گئے تو ڈاکٹر صاحب فوراً یہ کہہ کر ان کی تشفی فرما دیتے ہیں۔

"ارے بھئی ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمھاری خیریت ہی معلوم کر لوں۔"

اور وہ گرگِ باراں دیدہ بھی بڑی خندہ پیشانی سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی روبہ زوال صحت قصہ بیان کرنے لگتے ہیں مگر کیا مجال جو مسودہ کی کتابت کا ذکر درمیان میں آجائے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو بارہا سمجھایا کہ حضور کوئی متبادل ذریعہ کھوجیے۔ آپ کے کاتب صاحب اسکول ٹیچر تو پہلے سے ہیں ہونے پر سہ اب شاعر بھی ہو گئے ہیں اور آپ بخوبی واقف ہیں کہ اسکول میں ٹیچر اور دنیا میں شاعر کیا کرتے ہیں! لیک افسوس ہمارے سمجھانے کے باوجود ان کی خوش فہمی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب ایک سند یافتہ معالج اور ایک سجے سجائے کلینک کے مالک ہیں۔ جس میں ہر وقت مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس پیشۂ چارہ گری و نشتر زنی میں انھیں سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی لیکن آفریں ہے کہ خدمت خلق کے دوش بدوش شعر و ادب کی نبض پر بھی انگلیاں رہتی ہیں۔ بعض اوقا تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مریض کو نسخہ لکھ رہے ہیں۔ بعد میں انکشاف ہوتا ہے کہ مریض موصوف شاعر ہیں او ڈاکٹر صاحب آئندہ منعقد ہونے والے کسی مشاعرے کا مصرع طرح دوا کے پرچے پر لکھ کر دے رہے

ویسے یہ ضروری نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نسخہ لکھیں ہی۔ ہمارا علاج تو وہ بغیر نبض دیکھے اور بغیر آلۂ قلب لگائے ہی کر دیتے ہیں۔ خدا نے ان کے دست مبارک میں اتنی شفا دی ہے کہ ہم صحت یاب بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنے کسی مرض کے علاج کی خاطر دواخانے پہنچے وہاں حکمت استاد ویزیڈر پرشاد سکسینہ کی ادبی اور غیر ادبی خدمات کا ذکر چھڑ گیا اور ہم ڈاکٹر صاحب کی جادو بیانی سے اتنے مسحور ہو گئے کہ اپنی تکلیف بھول گئے۔ جب لوٹ کر گھر آئے تو یاد آیا کہ دوا تو لائے ہی نہیں۔

اب ہمیں کچھ کچھ یقین ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس طبابت کے پیشے کو اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھیں تو خدا نے شعر و ادب کی تخلیق کے لیے تخلیق کیا تھا۔ مزاحیہ شاعری میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اصنافِ سخن میں طنز و مزاح کی راہ بال سے باریک ہوتی ہے۔ اس راہ میں ذرا پاؤں پھسلا نہیں کہ ابتذال کے چاہِ عمیق میں جا گرے لیکن ہمیں فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس راہ میں پھسلنا تو دور رہا قلانچیں بھر رہے ہیں۔ تبرکاً یہاں ہم ان کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے شجاع خاور کے مصرع پر گرہ لگائی ہے،

سگانِ شہر یہ اعلان کر کے سوئے ہیں
"ہمیں جگایا تو نیندیں حرام کر دیں گے"

بخدا ہمیں ڈاکٹر صاحب کی دل آزاری منظور نہیں۔ لیکن ہماری نیندان کے تخلص نے حرام کر دی ہے۔ ویسے ہمیں تسلیم ہے کہ تخلص قطعاً ذاتی معاملہ ہے۔ اس پر کسی کو معترض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ہم کئی ایسے شاعروں سے واقف ہیں جن کا پیشہ کچھ اور تھا مگر تخلص سے وہ کچھ اور ہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک صاحب پیشے سے جیلر تھے "اسیر" تخلص کرتے تھے۔ ایک صاحب معلم تھے تخلص نادان تھا اور ایک صاحب تو پیشہ قصابی سے منسلک لیکن تخلص بسمل تھا۔ محترم دلاور فگار کو ہی لیجیے شاعر مزاح ہیں لیکن تخلص سے زخم و جراحت کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ متذکرہ بالا حضرات اپنے پیشے کو مدِ نظر رکھ کر تخلص رکھتے تو جیلر صاحب کو صیاد معلم صاحب کو استاد اور موخر الذکر کو جلاد رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ طبابت کے پیشے سے ہیں اس لیے طبیب سے بہتر تخلص اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں طبیب کا تصور کرتے ہی قبیلہ بقراط و جالینوس کا دھیان آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شربتِ بنفشہ، جوارشِ جالینوس اور خمیرۂ گاؤ زبان کے مرتبان اور بوتلیں نظروں میں گھوم جاتی ہیں۔

اردو شاعری میں ڈاکٹر صاحب نے فن سہرا گوئی کو حدِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ وہ دولہا کے فن و شخصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سہرا تخلیق فرماتے ہیں۔ اگر کسی ماہر علم الکیمیا کا سہرا لکھیں گے تو آکسیجن سے لے کر لافنگ گیس تک کی خوشبو سے سہرے کو مہکا دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک سہرے کا شعر ملاحظہ ہو:

زلف سائنس میں خم ہو تو میں سہرا لکھوں
آکسیجن بھی بہم ہو تو میں سہرا لکھوں

علاوہ ازیں اگر کسی کاتب یا خطاط کا سہرا ہوا تو مسطر و قلم سے لے کر روشنائی و قلمدان تک سہرے کی

لڑیوں میں سجادیتے ہیں ۔

یہ کیا شئے والعصے روشنائی میں ملا ڈالی
دعائیں گا رہی ہیں ٹھمریاں سہرے کی لڑیوں میں

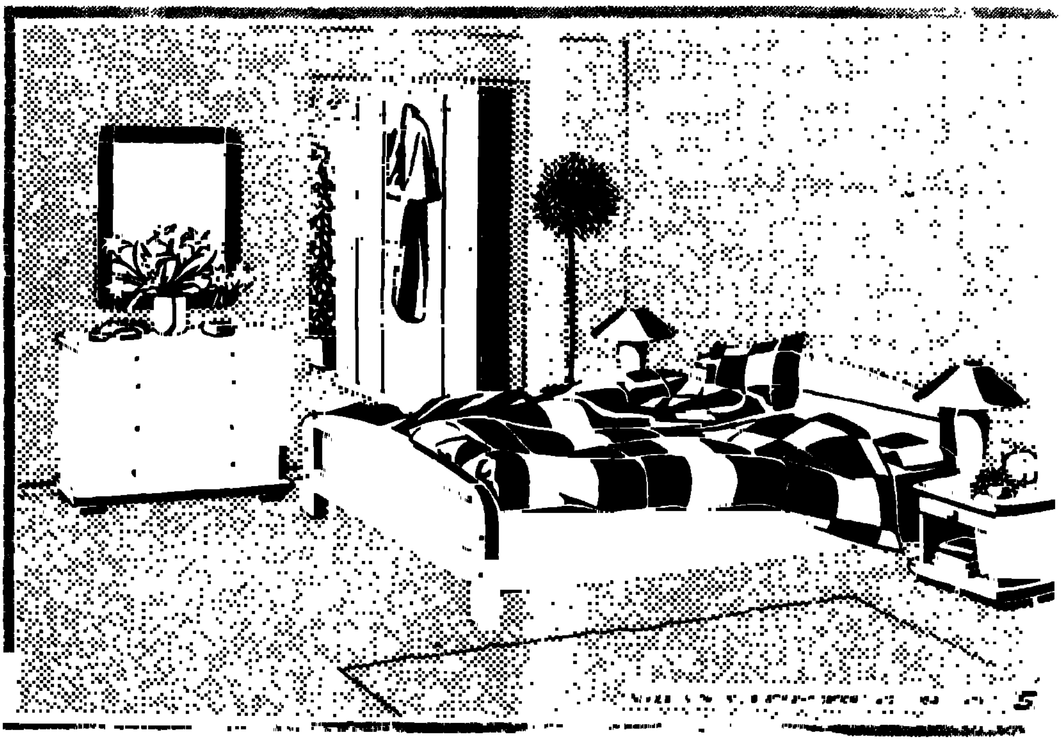
ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس سہرا گوئی سے سخت اختلاف ہے کیونکہ اندیشہ ہے اگر انھوں نے اس کارِ خیر زیادہ دل چسپی لی تو نان بائیوں، جوتہ فروشوں اور خوانچہ والوں کی جانب سے بھی سہرے کے آنڈر موصول ہونے لگیں گے اور چونکہ وہ سہرے میں نوشہ میاں سے متعلق جملہ خصوصیات کے بیان کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کی تحقیق میں کافی وقت ضائع ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کد و کاوش میں انھیں طبابت جیسے فنِ شریف اور ظرافت جیسے رنگِ لطیف سے ہاتھ دھونا پڑجائیں ۔

اداریہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب اس بار بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر نومبر میں منعقد نہ ہوسکیں اب یہ تقریبات اپریل ۹۶ء میں منعقد ہوں گی۔ اسی طرح پٹنہ میں منائے جانے والے جشن واہی کی تاریخیں بھی تبدیل ہوگئیں۔

شگوفہ کا آئندہ شمارہ رشید احمد صدیقی نمبر ہوگا۔ نامور محقق و نقاد پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اس خصوصی اشاعت کے مہمان مدیر ہیں ۔ یہ شمارہ یکم جنوری ۹۶ء کو شائع ہوگا۔ جس کے سالنامہ کی اشاعت ختمِ جنوری تک عمل میں آئے گی ۔ قلمی معاونین اور قارئین شگوفہ سے ان خصوصی شماروں کی اشاعت میں تعاون کی درخواست ہے ۔

حیدرآباد کے کہنہ مشق شاعر جناب نظیر علی عدیل اور دکن کے ممتاز مزاحیہ شاعر گلیم میدگی، کا پچھلے دنوں انتقال ہوگیا ۔ گلیم میدگی عرصہ تک زندہ دلانِ حیدرآباد سے وابستہ رہے ۔ وہ مزاحیہ مشاعروں کے مقبولِ عام شاعر تھے ۔ اپنے خاص دکنی لب ولہجہ میں شعر کہتے اور سناتے تھے ۔ ادارۂ شگوفہ ان بزرگ شاعروں کے انتقال پر اپنے گہرے ملال کا اظہار کرتا ہے ۔



عکس تحریر رشید احمد صدیقی



اتوار – ۲۲ ستمبر ۱۹۷۴ء ذاکر باغ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

عزیز گرامی۔ سلام مسنون۔ آپ کی کتاب
(رشید احمد صدیقی۔ شخصیت اور فن) ملی
آنکھوں کی تکالیف کے باوجود جستہ جستہ ورق
گردانی کر گیا۔ اسمیں ۸۰ ٪ ہر جگہ آپ
۔ تعریف نہیں۔ لیکن تنقید تھی بھی تو
جسے سب نے تسلیم کر لیا۔ دل بہت ا
وسعت تو رہتی ہی چاہیے!

آپ کے کرم کا شکر گزار ہوں۔
ہماری تہذیب کے کھلے یا بڑے جیسے تقاضے رہی ہوں
ذکر و فکر کچھ سو ہے ... کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ
کسی مصنف یا شاعر پر اسکی زندگی ہی میں کسی
شریف النفس طالب علم کو تحقیقات کرنا میں
شامل کرنا چاہیے۔ اسمیں ۸۰ ٪ اسکی شرافت النفس
زیادہ تحقیق کرنے دیگا

اگر ہو سکے تو آپ تنقید پر غالب آتی رہتی ہے
امید ہے آپ بخیرت و خوش ہونگے

مخلص

رشید احمد صدیقی

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۸
شمارہ ۱۲
دسمبر ۱۹۹۵ء

رشید احمد صدیقی نمبر

کتابت : محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت : دائرہ الکٹرک پریس، چھتہ بازار
قیمت : ۱۵ روپے
سالانہ خریداری : ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
۲۱۔ فخار ز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔۱
فون آفس: 595716 رہائش: 521064

رشیدیات
(فہرست)

مہمان اداریہ

رشید احمد صدیقی بلند پایہ ناقد ، بے مثال مرقع نگار اور معتبر انشاء پرداز بھی تھے اور ایک منفرد طنز و مزاح نگار بھی ۔ بلاشبہ انھیں اردو
کی آبرو کہا جاسکتا ہے ۔ رشید صاحب نے اپنی حیات میں ، اپنی شخصیت اور فن پر لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی ، ادبی جرائد کو اپنے بارے میں
شائع کرنے سے منع کیا اور اپنے خطوط کی اشاعت کے تو وہ حد درجہ مخالف تھے ۔ رشید صاحب کی شخصیت تھی ایسی کہ لوگوں نے آبگینے کو ٹھیس
جانے ان کی خاطر کو ملحوظ رکھا ۔ رشید صاحب اس خصوص میں ، ہمت افزائی نہ کرتے کم از کم خاموشی ہی اختیار کرلیتے تو آج " رشیدیات " کا سرما
ان کے انتقال (۱۵ / جنوری ۱۹۷۷ء) کے بعد ڈھیرے ڈھیرے کفر ٹوٹنے لگا ہے ۔ ان کے مکاتیب کے مجموعے بھی شائع ہورہے ہیں ۔ آئے
مضامین لکھے جارہے ہیں اور اب ان کی پیدائش کے صد سال مکمل ہونے پر سیمناروں اور جشن وغیرہ کے انعقاد کا سلسلہ جاری ہے ۔
طنز و مزاح کے لیے وقف برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد جریدہ ہونے کے باعث " شگوفہ " کے لیے ضروری تھا کہ رشید صاحب کو ا
تقاریب کے موقع پر خراج تحسین پیش کرے ۔ اوائل مئی میں دہلی یونیورسٹی میں رشید صاحب پر سیمنار میں شرکت سے واپس ہوتے ہو
میں توقف کے دوران اپنے عزیز دوست ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب سے اس کا تذکرہ رہا ۔ انہوں نے " شگوفہ " کے رشید احمد صدیقی نمبر کے لیے
ظاہر کردی اور اصرار کیا کہ میں اس کے مہمان مدیر کا فرض انجام دوں ۔ میں ایسے جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن مصطفیٰ کمال صاحب سے
رشید صاحب سے تعلق خاطر کے باعث اس پیش کش کو قبول کرنا پڑا ۔
محدود صفحات کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ اس نمبر میں رشید صاحب کے طنز و مزاح کے سلسلہ میں " شگوفہ " کے قارئین کو مطمئن
طنز و مزاح کے بارے میں رشید صاحب کا یادگار مضمون اور چیدہ چیدہ خیالات ۔ ان کے مضامین ، رشید صاحب کے طنز و مزاح پارے ، رشید
طنز و مزاح کے بارے میں مشاہیر کے آراء ، رشید صاحب کا سوانحی خاکہ ، رشید صاحب کے لطیفے اور تحریری انٹرویو ، جو میں نے ۱۹۶۲ء میں
------ ایسا نہیں کہ مجھے مہمان مدیر کی ذمہ داری سونپ کر کمال صاحب نے چپ سادھ لی ہو ۔ انہوں نے مجھے کم تکلیف دی اور خود ز
رہے ۔ ظاہر ہے میزبان ، میزبان ہی ہوتا ہے ۔ میں ان کا کیا شکریہ ادا کروں ۔
استاد محترم پروفیسر مسعود حسین صاحب کا نہایت احترام کے ساتھ تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر ر
کے طنز و مزاح کے بارے میں میرے موسومہ خط میں اپنے خیالات سے نوازا ۔ یہ مکتوب بعینہٖ شامل ہے ۔ مسعود صاحب کی عنایات ہمیشہ م
حال رہیں اور لکھنے لکھانے کے لیے تقویت کا باعث بھی ! میں محترمہ سلمیٰ صدیقی صاحبہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے تاثرات سے

یقین ہے رشید صاحب کے طنز و مزاح کے بارے میں " شگوفہ " کے اس نمبر کی رشید صاحب کے پرستاروں اور طنز و مزاح کا شستہ
والے حلقوں میں پذیرائی ہوگی اور اردو ادب میں بھی یہ نمبر ہمیشہ اپنا مقام رکھے گا ۔

سلیمان

مرد پتی
۱۹ / ڈسمبر ۱۹۹۵ء



۱/ اکتوبر ۹۵ء

محبی سلیمان اطہر جاوید صاحب،
تسلیم

یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ ماہ نامہ "شگوفہ" کا آئندہ شمارہ "رشید احمد صدیقی نمبر" کے طور پر آپ کی اعزازی ادارت میں شائع ہو۔ ہر چند آپ اور مصطفیٰ کمال صاحب دونوں میں "شگوفہ پن" بہت کم ملتا ہے۔ (مصطفیٰ کمال صاحب میں تو بظاہر بالکل نہیں) تاہم دعا ہے کہ آ یہ سعی مشکور ہو۔

میرے نزدیک رشید صاحب بنیادی طور پر ایک صاحب طرز ادیب ہیں، جن کا کلاسکی انداز میں رچا ہوا اسلوب تحریر اردو کے ادیبوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ابتداء میں اس اسلوب تحریر میں انہوں نے طنز و مزاح کے بے شمار خار اور شگوفے تراشے ہیں اور وہ اسی حیثیت سے جانے پہچانے گئے۔ بعد کو حالات اور صحت کی ناسازگاری نے ان سے شگفتگی چھین لی تو وہ ادبی فقرہ طرازی پر اتر آئے۔ اور آخر آخر میں تو وہ علی گڑھ کے "ذکر" بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے آخری دور کے مضامین اور خطبات اس کے شاہد ہیں۔

وہ ایک نہایت ذہین اور فطین انسان تھے۔ صاحب بصیرت تھے اور ایک فنکار تھے جو غالب کی طرح زندگی کی تمام ستی و تلخی کو ہموار کر لیتا ہے۔ انسان دوست تھے۔ جس کی انسانیت کے سرچشمے اسلام کی بنیادوں سے پھوٹتے ہیں۔ سرسید کے ادارے سے قلبی وابستگی کے باوجود وہ سید احمد خاں کی ملیت پسندی سے دور رہے۔ علی گڑھ کے عاشق زار تھے، اسی کے تصور سے ان کے یہاں رعنائی خیال تھی جو مرتے دم تک قائم رہی۔

وہ پھولوں میں جئے اور کانٹوں میں زندگی بسر کی۔ رشید احمد صدیقی کے ان "کانٹوں" کی تفصیل اب کوئی نہیں جان سکے گا۔ ہم لوگ جو ان کے قریب رہے ہیں صرف قیاس کر سکتے ہیں!

زندگی کے اس مسافر کا جب کوئی آبلہ پا پھوٹتا تھا تو کبھی کبھی جذبات میں بہہ نکلتے اور ایک آدھ فقرہ ان کی نوک زباں پر آجاتا! بہت سی باتیں ان کے ساتھ دفن ہو گئیں، بہت سی باتیں میں اپنے سینے کے دفینے میں لے جاؤں گا۔

میں تو بس حالی کے اس شعر کا ورد کر کے بار بار انھیں یاد کر لیتا ہوں۔

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

خیر طلب
آپ کا
مسعود حسین

منزل، جامعہ اردو روڈ
دودپور
علی گڑھ 202002



ذاکر باغ،
یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۵/ دسمبر ۱۹۹۵ء مکرمی سلیمان اطہر جاوید صاحب، تسلیم

آپ کی فرمائش ہے کہ میں شگوفہ کے لیے رشید احمد صدیقی مرحوم کے بارے میں اپنے تاثرات عرض کروں، میں کیا کہوں سوائے اس کے کہ بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا...... اور یہہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں بیشتر جاننے والے، اور مجھ سے بہتر جاننے والے موجود ہیں، ان کے ادب کے میں ان کے معاصرین ان کی زندگی میں بھی تنقید کرتے رہے ہیں اور بعد میں بھی یہہ ادبی سراغرسانی جاری ہے، اس لیے اس گوشے کی پردہ کشائی بھی میرا منصب ہے، ان کی شخصیت کے بیشتر پہلو البتہ ایسے ہیں خصوصاً ذاتی اور گھریلو جن سے میں کچھ کچھ واقف ہوں، کچھ کچھ اس لیے کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو زندگی بسر کرنے کے اپنے طور طریقے بھی، وہ پند و نصائح سے ہمیشہ گریز کرتے تھے، کہ ناصحانہ لہجہ ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا، وہ بہت مدھم سر انسان تھے، شہرت، مقبولیت، دوستی، تعلقات، التفات، ملاقات، کسی میں بھی دھوم دھڑکے کے قائل نہیں تھے، ایک نہایت غیر معمولی زندگی، انہ نہایت معمولی طور پر بسر کی، اپنے متعلقین خصوصاً بال بچوں سے بھی انہوں نے باوجود انتہائی قربت کے ایک فاصلہ ہمیشہ قائم رکھا، ایک ایسا باوقار فاصلہ افراد خانہ کے روزمرہ کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے، اولاد سے محبت کسے نہیں ہوتی لیکن ابامیاں نے تو جیسے اپنی زندگی کا ایک نہایت اہم اور بڑا حصہ اولاد کے کر دیا تھا، ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو وہ ایسے بے قرار اور مضطرب ہوتے کہ ہم لوگ اپنی بیماری بھول کے ان کی پریشانی اور سراسیمگی سے سہم جاتے۔ افراد خانہ کی تیمارداری میں جیسے سلسلۂ روز و شب بھی بھول جاتے، جب بھی کسی بیمار کی آنکھ کھلتی انہیں اپنے قریب پاتا۔ دعا، دوا، غذا، پرہیز، آرام اور تمام ہدایات پر ایسا عمل کرتے کہ مریض کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ وہ جلدی سے تندرست ہوجائے، لیکن خود بیمار ہوتے تو تیماردار کی ا کرتے اور اسطرح اس کی خیریت عافیت معلوم کرتے جیسے خود وہ نہیں تیماردار بیمار ہو۔

گھروالوں کے بعد انہیں گھر سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ گھریلو معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے تھے لیکن گھر کی دیکھ بھال میں بیشتر اوقات مشغول باغبانی کا شوق گلاب سے عشق اور پھولوں سے شغف، انہوں نے کسی قومی، سماجی یا تہذیبی مشغلے یا شہرت کے لیے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ یہہ ان کی فطرت تھا، شوالے کے اس ابتدائی زمانے سے جو نرم گوشہ گیندے اور کنیر کے پھولوں کے لیے جاگا تھا وہ آخری عمر تک گلاب کی خوشبو میں رچتا بستا رہا۔ ان کی تحر شگفتگی، بالیدگی، تازگی و توانائی ہے اس میں، ان سمن اور گلاؤں کی مہک بھی شامل ہے جو بچپن کی معصوم فضا میں ایک پرانے قصبے کی دھوپ چھاؤں رہے۔

آپ کو یہہ سعادت حاصل ہے کہ آپ نے رشید احمد صدیقی کے آخری دور کے، اپنے ابتدائی دور میں جو "احوال" رقم کیے، وہ ان کی سوانحی زندگی کوشش اور نقاب کشائی تھی۔ حال میں میں نے آپ کی مرتب کردہ اور ساہتیہ اکیڈیمی کی شائع کردہ تصنیف کا مطالعہ کیا جس میں آپ نے اپنے سمندر کو اک کوزے میں محفوظ کردیا ہے، حالات زندگی اور کارکردگی کے بارے میں یہہ مختصر کتاب بہتوں کے کام آسکتی ہے۔

حیدرآباد کا ذکر آتا ہے تو بہت سارے چہرے اور یادیں، ذہن میں جھلملانے لگتی ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد کس حال میں ہیں؟ ان سب کو اور خصو پر مصطفیٰ کمال صاحب کو میری یاد دلادیں۔

امید ہے آپ مسرور و مطمئن ہوں گے (آج کے عہد میں یہہ فقرہ محاورہ بھی ہے اور دعا بھی)۔

خیر طلب سلمیٰ صد

مالک رام

حیاتِ رشید

"حضرت، آپ کا سالِ ولادت کیا ہے؟ کوئی ۱۸۹۸ء لکھتا ہے، کوئی ۱۸۹۹ء، کوئی ۱۸۹۴ء، ایک صاحب نے ۱۸۹۲ء بھی لکھا ہے۔ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟"

"۱۸۹۲ء" [1]

"مہینا؟"

"دسمبر"

"تاریخ؟"

"۲۴"

"سبحان اللہ! آپ تو حضرت یسوع مسیح سے بھی ایک دن پہلے پیدا ہوئے!"

چونکہ یہ فقرہ ان کے مذاق کے مطابق تھا، اس پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص انداز میں کھل کر مسکرا دیے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے، یہ گفتگو میرے اور جناب رشید احمد صدیقی مدظلہ کے درمیان [illegible]

---

[1] رشید صاحب نے مالک رام صاحب کو ۱۸۹۲ء کہا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے سوال نامہ میں کچھ اور لکھ دیا۔ کسی نے کچھ اور کچھ دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب کا سنہ پیدائش ۱۸۹۴ء ہے۔ جس کی اساس پر دسمبر ۱۹۹۴ء [illegible] ۱۹۹۵ء رشید صاحب کی صد سالہ تقاریب منائی جا رہی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کے لیے بھی یہ [illegible] ہے اور میرے لیے بھی۔ اس لیے کہ میرے ہاں رشید صاحب کا سنہ پیدائش انہی کی تحریر میں موجود ہے۔ ہوا یہ [illegible] رشید صاحب کے سوانحی مواد کی تلاش میں مجھے ان کی تاریخ پیدائش کسی رسالے میں درج ملی۔ میں نے [illegible] انہی دنوں اکتوبر ۱۹۶۳ء میں رشید صاحب حیدرآباد آئے۔ [illegible] استاد محترم پروفیسر مسعود حسین خاں [illegible] ایما پر جو میرے تحقیقی کام کے نگراں تھے میں نے اپنے مقالے کے سوانحی باب کا مسودہ رشید صاحب کو [illegible] واقعات، تواریخ، ناموں یا اسی نوعیت کی چیزوں میں اگر کہیں کوئی غلطی ہو تو درست فرما دیں۔ [illegible] نے بڑی توجہ سے پڑھا اور از راہ عنایت بعض مقامات بدل دیے اور [illegible] پیدائش کو قلم زد کر کے ۲۵ دسمبر ۱۸۹۴ء تحریر کیا۔ میرے لیے یہ تاریخ اس لیے مستند ہے [illegible]

[illegible] صدیقی کی تاریخ ولادت ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء ہے۔ اس کے بہت دن بعد [illegible] اپنے پہلے کے کاغذوں میں کسی اور عزیز کی کوئی یادداشت ملی تھی، اس میں بھی [illegible]

[illegible] کے ضلع جونپور کا ایک قصبہ مڑیاہو ہے۔ یہ جونپور سے ۱۱ میل دور ہے اور تحصیل کا [illegible] حضرت پیر زکریا داتا کا مزار یہاں کا بہت مشہور تاریخی مقام ہے۔ یہی حضرت پیر زکریا ہمارے [illegible] صاحب کے جد اعلیٰ تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ سترھویں صدی میں تبلیغِ دین کی غرض سے ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے چند دن پنجاب میں قیام کیا۔ جب وہاں کے حالات نے مجبور کیا تو دہلی اور الٰہ آباد ٹھہرتے ہوئے جونپور پہنچ گئے اور بالآخر مڑیاہو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کی اولاد حکومت وقت کی ملازمت میں داخل ہو گئی۔ اور بعض نے فوج اور سپہ گری کے پیشے کو ترجیح دی۔ انھیں میں رشید صاحب کے اسلاف بھی تھے۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے والد جناب عبدالقدیر صاحب پولس کے محکمے میں ملازم تھے۔ وہ مدتوں بلیا، غازی پور اور جون پور کے اضلاع میں تھانیدار رہے۔ قیام جونپور کے آخری زمانے میں وہ کوتوالِ شہر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ پولیس کا محکمہ اپنی سخت گیری اور بدعنوانیوں کے لیے مشہور، بلکہ بہت حد تک بحال موجودہ بدنام ہے لیکن عبدالقدیر صاحب کی نیکی اور دین داری کا شہرہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور شہرۂ زمانہ صوفی حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (ف ستمبر ۱۸۹۵ء) کے مرید تھے۔ اسی سے ان کے عام رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

عبدالقدیر صاحب کا نکاح بھسڑی (ضلع بنارس) کے سید باسط علی کی صاحبزادی سے ہوا تھا۔ ان کے بطن سے [illegible] اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ سائرہ، طاہرہ، آمنہ، عبدالصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی، نذیر احمد صدیقی۔

جناب عبدالقدیر اپنی ملازمت کے سلسلے میں بیریا (ضلع بلیا) میں تعینات تھے، جب خدا نے انھیں بیٹا دیا، جس کا نام انھوں نے رشید احمد رکھا۔ یہی ہمارے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ ان سے بڑے بھائی عبدالصمد صاحب وکیل تھے۔ ان کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے جناب نیاز احمد صدیقی ابھی [illegible] تھے۔ بفضلہ حیات ہیں۔ سب سے چھوٹے نذیر احمد کم عمری ہی میں [illegible]

[illegible] میں بہت کمزور اور نحیف الجثہ تھے۔ مدتوں مختلف عوارض [illegible] اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ لیکن ان کی [illegible] جیسے ان کی تعلیم بھی دیر میں شروع ہوئی کیونکہ اندیشہ تھا [illegible] پڑھانے کے قابل نہیں جیسا کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے [illegible] گھر ہی پر اور وہ بھی دینیات اور عربی فارسی سے شروع

ہوئی۔ اس دور میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی کچھ کتابیں [illegible]
اسباق اور قرآن شریف پڑھا۔ جب یہاں سے فارغ ہوتے تو [illegible]
مقامی پرائمری اسکول میں چلے جاتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس اسکول میں جو مدرس [illegible]
اردو سے بالکل نابلد تھے، اردو میں ان کی ساری کائنات دستخط [illegible]

اگرچہ ان مدرس کو نہ پڑھنے سے کچھ تعلق تھا نہ پڑھانے سے [illegible]
لیکن بہ حیثیت انسان بہت بلند تھے، شریف النفس اور خادم [illegible]
آتا (اور یہ ہر سال ہی آتا تھا) تو مدرسہ اپنی عمارت سے [illegible] مندر میں [illegible]
کی روزانہ کی صحبت اور سال بسال اس مندر میں مہینوں بسر کرتے [illegible]
بھی سر انجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ رشید صاحب کے دل میں [illegible] تمام مذاہب [illegible]
رواداری کے جذبات پیدا ہو گئے اور خوش گوار لینت اور نرمی [illegible] ان کے مزاج کے [illegible]
ترکیبی بن گئے۔

پرائمری اسکول سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible]
یہاں سے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ یہ سند تو انھوں نے [illegible]
کرلی لیکن ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ جہاں اور تمام مضامین میں ان کا نتیجہ ہمیشہ اچھا رہا، ریاضی میں [illegible]
فیل ہوتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں ریاضی اور حساب کتاب سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں [illegible]
اب سوال تھا آئندہ کا۔ چنانچہ جونپور چلے آئے۔ جونپور میں بیشتر پرانے گھرانے شیعہ عقائد کے تھے۔ [illegible]
صاحب کے ساتھ پڑھنے والے انھیں خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ساتھ یہ ان کے گھر [illegible]
ان سے محبت اور شفقت کا سلوک ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ وہاں انھیں شعرا کا کلام [illegible]
سوز اور سلام سننے اور پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس سے گویا ان کی [illegible] بڑی [illegible]
کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ وسط شہر میں دریائے گومتی بہتا ہے۔ اس کے کنارے ایک
میں ایک اچھا خاصا کتاب خانہ تھا۔

رشید صاحب باقاعدگی سے اس کتاب خانے میں جاتے اور گھنٹوں وہاں [illegible]
ناول اور افسانے پڑھا کرتے۔ یوں رہی سہی کسر اس مطالعے نے پوری کر دی [illegible]
حصے سے واقف ہو گئے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب سے بے تکلفانہ ملنے کا موقع ملا ہے [illegible]
ان کے شوق و شغف کے موضوع تین رہے ہیں۔ اسلامیت [illegible]
دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد ان کے قیام جونپور [illegible]
اور دوست احباب سے تبادلہ خیالات، نیز تہذیب کے [illegible]
سے ان میں موضوعات کے زمانہ حال سے تقابل اور ان کے بار [illegible]
غرض جونپور کے یہ تین چار سال ان کی زندگی اور ذہنی [illegible]

[illegible] اسکول سے دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد اب مستقبل کا مسئلہ درپیش تھا۔ گھر کی مالی حالت [illegible] تھی کہ ان کی کالج کی تعلیم کا بار برداشت کر سکتی۔ مجبوراً نوکری کرنا پڑی۔ خوش قسمتی سے اس کے [illegible] جاتا تھا، وہیں جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک مقرر ہو گئے۔ یہ ملازمت عارضی تھی اور مشاہرہ [illegible] زیادہ نہیں تھا۔ اگرچہ سب لوگ ان کے ملازم اور گھر کا کماؤ فرد بن جانے پر مطمئن اور خوش تھے لیکن رشید صاحب خود اس سے سخت بیزار تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر سال بھر بعد وہ نوکری ترک کر [illegible] علی گڑھ کا رخ کیا۔ یہ ۱۹۱۵ء [illegible] کا واقعہ ہے۔

اسکول کے زمانے میں انھیں کھیل کود کا چسکا تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ان کے دل پسند کھیل تھے اور اسکول کی ٹیموں کے کپتان تھے۔ علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کھیل کود پر خاص توجہ تھی اور یہاں کے طلبہ کی اس میدان میں دور دور شہرت تھی۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، رشید صاحب دراصل علی گڑھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے تھے جتنا یہاں کے کھیل کا چرچا سن کر۔ لیکن یہاں کوئی ان کا پرسان حال نہ ہوا۔ اس زمانے میں یہاں ان کھیلوں کے کھلاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور کالج میں ان کا ایک سے ایک اچھا کھیلنے والا موجود تھا۔ ناچار انھوں نے ٹینس پر توجہ کی اور رفتہ رفتہ اس میں بھی بہت اچھی مہارت پیدا کر لی۔ کھیلوں میں انھیں برج کا بھی شوق رہا ہے۔

علی گڑھ کالج میں وہ چھ برس پڑھے، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک، ۱۹۱۹ء میں بی اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم اے۔ اس زمانے میں یہ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں کے طلبہ کو وہیں کا نصاب پڑھایا جاتا اور وہیں جا کر امتحان دینا پڑتا تھا۔ رشید صاحب نے بھی یہ امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیے تھے۔

طالب علمی کا زمانہ مالی پہلو سے بہت پریشان کن رہا۔ والد پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور ان کی پنشن ایک بڑے کنبے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ان کی تعلیم کے مصارف بھی برداشت کرنے سے قاصر تھی۔ اس کا حل رشید صاحب نے یہ نکالا کہ ہر سال گرمی کی لمبی تعطیلات میں نوکری سے اتنا کما لاتے کہ پھر کسی قدر سال بھر کے خرچ کے لیے کفالت کرتا۔ کالج میں ۵ اپریل سے ۵ اکتوبر تک تین مہینے گرمی کی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہ ان ایام میں بنارس جاتے اور وہاں دیوانی کی کسی عدالت میں کلرکی کرتے۔ ان کا کام بیشتر نقلوں [illegible] کا تھا۔ یہ اسی زمانے کی مشق کا نتیجہ تھا کہ رشید صاحب زود نویس بھی ہو گئے اور خوش خط بھی۔ یہ مشقت [illegible] تک جاری رہی۔ جس صبر و شکر سے انھوں نے یہ زمانہ بسر کیا اور جس آن بان سے انھوں نے تمام مشکلوں [illegible] کا مقابلہ کیا، وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

[illegible] ایک درس گاہ نہیں تھا بلکہ ایک تہذیبی ادارہ ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک [illegible] مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہاں ملک کے ہر گوشے سے [illegible] خدمت کے لیے تیاری کرتے۔ رشید صاحب جب یہاں پہنچے تو [illegible] کا ایک [illegible] حسن اتفاق سے ان کی اس سے پہلے کی ساری تعلیم و تربیت نہ [illegible] بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ معراج ہوتا ہی علی گڑھ کو چاہیے تھا۔ [illegible] احباب میں اقبال احمد خاں سہیل (وفات نومبر ۱۹۵۵ء) بھی تھے۔

سہیل اردو، فارسی کے فاضل اور برگزیدہ شاعر اور غیر معمولی طور پر ذہین و فطین شخص تھے۔ رشید صاحب اور سہیل مرحوم کا تقریباً چار سال تک ساتھ رہا، دن رات کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، رہن سہن ایسا کہ من تو شدم، تو من شدی کا مضمون ہو گیا۔ بلا خوف تردید و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب کی شخصیت کے ابھارنے اور اجاگر کرنے اور بڑھانے میں سہیل مرحوم کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ رشید صاحب اپنے جونیئر کے زمانہ طالب علمی ہی میں نثر لکھنے لگے تھے۔ شاہ نذیر فاروقی پھری اس زمانے کے اچھے لکھنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے نوجوان رشید صاحب کی رہنمائی کی اور انھیں ادب میں راہ راست پر لگا دیا۔ علی گڑھ آئے تو یہاں سہیل نے انھیں اس اسلوب تحریر کی راہ دکھلائی جس کے لیے وہ ازل سے منسوب ہو چکے تھے۔ یعنی طنز و مزاح کا اسلوب۔

رشید صاحب پہلے کالج یونین کے سکریٹری مقرر ہوئے اور پھر علیگڑھ منتھلی (کالج کا سرکاری جریدہ) کے مدیر۔ یہ ماہنامہ دو زبانوں (انگریزی اور اردو) میں شائع ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے عہد میں اس کا نام منتھلی سے بدل کر "میگزین" رکھا گیا۔ ان سے پہلے دونوں حصوں کے الگ الگ مدیر اسٹاف میں سے ہوا کرتے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ انگریزی اور اردو دونوں کی ادارت ایک ہی شخص اور وہ بھی ایک طالب علم (رشید صاحب) کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب دونوں حصوں کے مضمون لکھا کرتے تھے۔ اردو میں اپنے نام سے اور انگریزی میں "بوہیمین" (آوارہ گرد) کے نام سے۔ سہیل ہی نے انھیں سب سے پہلے طنزیہ مضامین لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں علی گڑھ میں ان کا قیام کچی بارک نامی ہوسٹل میں تھا۔ رشید صاحب نے اس سے متعلق ایک سلسلہ مضامین "محل منزل" کے عنوان سے لکھا۔ یہی مضمون ان کے طنز و مزاح کے سفر کا نقطہ آغاز تھا۔

کالج میں ایک ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) قائم تھی۔ اسے سرسید کی زندگی ہی میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (ف جنوری ۱۹۳۰ء) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں (۱۸۹۰ء) شروع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد کالج کے نادار لیکن ہونہار طلبہ کی مالی امداد کے لیے مستقل سرمایہ جمع کرنا تھا۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ جو طلبہ . . . . روپیہ جمع کرنے کو باہر جائیں وہ کالج کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔ رشید صاحب اس انجمن کے ممتاز رکن تھے۔ اس انجمن کے وفد ہر سال تعطیلات کے ایام میں ملک کا دورہ کرتے تھے۔ وہ چندہ بھی جمع کرتے اور تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعے سے کالج کے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ رشید صاحب نے انجمن کے ۱۹۱۰ء کے وفد کے ساتھ شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ برما میں پیگو تک کا سفر کیا۔ واپسی پر انھوں نے "سیاحت برما" کے عنوان سے چند مضامین لکھے جو میگزین میں شائع ہوئے تھے۔

ڈیوٹی سوسائٹی کی خط و کتابت بھی بہت مدت تک رشید صاحب کے سپرد تھی۔ نیز مختلف موضوعات پر مضامین اور خطبے اور کتابچے بھی لکھنا پڑتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں کتنا فائدہ پہنچا . . . . . . ان کی تحریر اور اسلوب میں کیسی پختگی پیدا ہوئی۔ کالج کے زمانہ طالب علمی میں ایک اور بات نے بھی ان کی مدد کی۔ ان کے انگریزی

انعام اللہ خاں صاحب تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت ممتاز اور ماہر انگریزی داں سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انگریزی ایسی مرصع اور مسجع اور ثقیل بولتے تھے کہ سننے والوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ رشید صاحب پروفیسر انعام اللہ خاں کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بیشتر انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ انھیں کا کیا ہوا ہے۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دسمبر ۱۹۲۱ء میں عارضی طور پر صرف تین مہینے کے لیے اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں "اردو مولوی" کہلاتا تھا۔ اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ جگہ مستقل نہیں تھی اور معلوم نہیں تھا کہ اصحاب مجاز کس دن، کس بات سے ناراض ہو کر نکال باہر کر دیں۔ اس کے بعد جب یونیورسٹی بنی اور اس میں اردو لیکچرر کی جگہ نکلی تو انھوں نے بھی درخواست دی۔ بعض اصحاب نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح کے اعتراض کیے۔ ان کے اس مستقل اسامی پر تقرر کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی۔ اس پر اتمام حجت کے لیے انھوں نے مقالہ "طنزیات و مضحکات" لکھا جو پہلے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے سہ ماہی رسالے ہندوستانی میں بالاقساط چھپا اور پھر کتابی شکل میں بھی وہیں سے شائع ہوا۔ خیر قرعۂ فال ان کے نام پڑا اور وہ عارضی طور پر مقرر ہو گئے۔ بڑے جوڑ توڑ اور سفارشوں کے بعد کہیں ۱۹۲۹ء میں وہ مستقل لیکچرر (مدرس) مقرر ہوئے منجملہ اور اصحاب کے علامہ اقبال نے بھی ان کی سفارش کی تھی۔ نو سال بعد ترقی ملی اور ریڈر ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں پروفیسر، جو کسی یونیورسٹی میں گویا نقطۂ معراج ہے۔ یہیں سے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ جب سے آج تک علیگڑھ میں مقیم ہیں۔ یہاں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان کے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے بھی جو ان سے تین برس پہلے ۱۹۱۲ء میں کالج میں آ چکے تھے بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اس بات پر افسوس کیا کرتے کہ اردو میں معیاری رسالے ناپید ہیں اور پھر خود ایک بہترین رسالہ جاری کرنے کی اسکیم مرتب کرتے۔ دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کا نام "شمع" ہو یا "سہیل" کہ دونوں میں روشنی کا تصور ہے اور وہ نہ صرف خود روشن ہیں بلکہ اپنے چاروں طرف بھی نور کی بارش کر دیتے ہیں۔ اسی سے خیال کیجیے کہ ان کے نزدیک پرچے کا مقصد اور معیار کتنا بلند تھا۔ تو خیر ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے اور پروفیسر محمد حبیب مرحوم (ف جولائی ۱۹۷۱ء) نے بعض احباب کے تعاون سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا نام شمع رکھ دیا۔ رشید صاحب نے سنا تو افسوس کیا کہ وہ جو دو ناموں میں کسی ایک کے انتخاب کرنے میں لذت تھی وہ ہاتھ سے جاتی رہی لیکن انھیں اطمینان تھا کہ خیر سہیل تو ہے ہی جب پرچہ جاری کریں گے اس کا یہ نام رکھ لیں گے۔

اس زمانے میں سید سجاد حیدر یلدرم (ف اپریل ۱۹۴۳ء) یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوا کرتے تھے۔ ایک دن رشید صاحب ان سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ اردو میں اچھے پرچے کم ہیں۔ ایک پرچہ سہیل کے نام سے نکالنے کا خیال ہے تو یلدرم مرحوم نے کہا کہ ہاں یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے۔

رشید صاحب یہ سن کر گھبرائے کہ شمع تو ہاتھ سے گیا ہی تھا اگر یلدرم نے سہیل پر بھی ہاتھ صاف

کر دیا تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے ذاکر صاحب بھی یورپ میں ہیں ان سے کسی اور نام کے لیے مشورہ کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ عنقریب سہ ماہی "سہیل" شائع ہونے والا ہے۔

"سہیل" انجمن اردوئے معلی، مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی آرگن کی شکل میں ۱۹۲۶ء کے آغاز میں جاری ہوا لیکن آج تک کسی اچھے پرچے کو الا ماشاء اللہ اردو والوں اور اردو حلقوں کی فضا راس نہیں آئی نہ ان کا تعاون ہی حاصل ہوا۔ یہی حشر "سہیل" کا بھی ہوا۔ سب نے اس کے مضامین کے بلند معیار، اعلیٰ کتابت و طباعت، دیدہ زیب شکل و صورت کی تعریف کی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے صرف چند شمارے شائع ہوئے اور وسط ۱۹۲۷ء میں اس نے مالی مشکلات کے باعث دم توڑ دیا۔

رشید صاحب نے اس پر بھی ہار نہیں مانی۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں انھوں نے پھر اسے جاری کیا۔
اب کے اعلان کیا کہ یہ ہر سال کے آخر میں یعنی دسمبر میں ایک مرتبہ شائع ہوا کرے گا۔ لیکن افسوس کہ دسمبر ۱۹۳۵ء کا یہ شمارہ اس نئے سلسلے کا بھی اکلوتا پرچہ ثابت ہوا۔

رشید صاحب آج بجا طور پر اردو ادب کے مسلمہ اور مایہ ناز نثر نگار اور طنز و مزاح کے منفرد مصنف ہیں۔
انھوں نے اپنے بیشتر مداحوں اور پڑھنے والوں کو خوش وقت کیا ان کی زندگی کی دُکھ اور بے کیف گھڑیوں کو مسرت و انبساط سے رنگین کیا ہے۔ وہ خود بہت کم آمیز اور کم سخن ہیں لیکن انھوں نے دوسروں کو آپس میں ملنے جلنے کا سلیقہ اور شائستہ بات چیت کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ یوں اگر ان کی طویل تصنیفی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! اگر آپ وسیع و عریض کھارے سمندر کو متھ کر اس میں سے خالص شیریں امرت کا ایک گھونٹ بھی پیدا کر لیں تو اس کی ابدی کیفیت پر سمندر کی ناپیدا کنار کمیت سو مرتبہ قربان کی جا سکتی ہے۔ یہی مثال رشید صاحب کی نگارشات پر صادق آتی ہے۔

ان کی ادبی فتوحات کی جو پذیرائی اور قدر اور خود ان سے ملک کے اہل علم و فن طبقے نے جو محبت کی ہے اسی کی آواز بازگشت "پدم شری" کا وہ اعزاز ہے جس سے حکومت ہند نے انھیں یوم جمہوریہ ۱۹۶۳ء کے موقع پر نوازا تھا۔

●●

مجتبیٰ حسین

رشید احمد صدیقی
کی یاد میں

پچھلے دنوں پروفیسر نعیم احمد، صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا خط آیا کہ میں رشید احمد صدیقی کی یاد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی صد سالہ تقاریب میں شرکت کروں اور علیگڑھ والوں کے ساتھ مل کر انھیں جب توفیق یاد کروں۔ میں نے انھیں لکھا کہ جب اتنے سارے لوگ مل کر رشید صاحب کو یاد کر رہے ہوں تو یہاں میرا کیا کام میری دلی خواہش تو یہ ہے کہ میں ان تقاریب میں شرکت کروں جو آج سے سو سال بعد ان کے دو سو سالہ جشن کے موقع پر منعقد کی جائیں گی۔ جواب آیا "مانا کہ آپ مثالی صحت رکھتے ہیں لیکن مثالی صحت اور خیالی صحت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کار خیر کے لیے آپ مزید سو سال تک کہاں انتظار کریں گے۔ ابھی آجائیے۔"

بات دراصل یہ ہے کہ میں رشید صاحب کو کسی مقررہ وقت پر یاد کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ وہ تو مجھے ہر دم، متواتر اور لگاتار یاد آتے رہتے ہیں۔ جو آدمی اردو میں مزاح نگاری کرے گا وہ رشید صاحب کو یاد نہیں کرے گا تو پھر کیسے یاد کرے گا۔ رشید صاحب کے تعلق سے علیگڑھ والوں کی یادیں اور میری یادیں فرق صرف اتنا ہے کہ علیگڑھ والوں کو شاید پہلے رشید صاحب یاد آتے ہوں اور پھر علیگڑھ یاد آتا ہو اور تب کہیں جاکر ان کے شہرہ آفاق فقرے اور جملے یاد آتے ہوں۔ مگر میرا معاملہ الٹا ہے۔ مجھے پہلے ان کے خیال انگیز فقرے اور چونکا دینے والے جملے یاد آتے ہیں اور پھر بعد میں خود رشید صاحب اور علیگڑھ کا خیال آتا ہے۔ علیگڑھ والوں کی یادوں میں رشید صاحب کا جسمانی وجود بھی شامل رہتا ہوگا جو کبھی سرگرم عمل اور متحرک تھا۔ مگر رشید صاحب کے تعلق سے میری یادوں کا معاملہ صرف خیال اور تصور پر مبنی ہے۔ ان یادوں کو میں چاہے بھی کوئی شکل نہ عطا کر سکوں، کوئی نام نہ دے سکوں لیکن یوں لگتا ہے جیسے یہ یادیں میرے اپنے مزاج کا، میرے اپنے شعور کا بلکہ میرے اپنے سارے وجود کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رشید صاحب کے تعلق سے میری یادوں کا سلسلہ ان کے فنکارانہ وجود سے ہے۔ ان کے شخصی اور جسمانی وجود سے نہیں۔ میں یہ یاد کرنے کا محتاج نہیں کہ میں رشید صاحب سے کب، کہاں اور کن حالات میں ملا تھا۔ البتہ مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ رشید صاحب کا پہلا مضمون میں نے کب، کہاں اور کن حالات

میں پڑھا تھا اور اسے پڑھنے کے بعد مجھ پر کیا بیتی تھی۔ شاید میں وہ نہیں رہا تھا جو مضمون کو پڑھنے سے پہلے تھا۔ مجھ میں ایک شخصی کمزوری یہ ہے کہ میں جس کسی کا صد درجہ پرستار ہو جاتا ہوں تو اس ہستی کے اور اپنے درمیان احترام اور عقیدت کا ایک لمبا فاصلہ قائم کر لیتا ہوں، اس سے نہ ملنے کے لیے ہی نہیں بلکہ اس ہستی سے دُور رہنے کے سو سو جتن کرتا ہوں۔ احترام کا جذبہ غالباً وہ واحد جذبہ ہے جس کا تعلق بس محسوس کرنے اور محسوس کرکے پھر سے محسوس کرنے سے ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتوں کو آدمی کا غذ پر نہیں اتارتا کیوں کہ ایسی شخصیتوں کو قرینے سے سجا کر رکھنے کے لیے دل کے ایک گوشہ میں ایک الگ جگہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب کی زندگی کے آخری چار پانچ برسوں میں کئی بار علیگڈھ جانے کے باوجود میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی ان کا دیدار نہیں کیا۔ ایک بار ایک دوست کے ساتھ ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ دوست نے بتایا "پروفیسر رشید احمد صدیقی یہاں رہتے ہیں؟" اور میں نے اس کے جواب میں کہا تھا "رشید صاحب جہاں بھی رہیں خوش رہیں"۔ اس پر میرے دوست نے کہا تھا "عجیب آدمی ہو تم بھی۔ علیگڈھ آئے ہو تو ان سے مل کیوں نہیں لیتے؟" میں نے کہا "بھیا! رشید صاحب ان دو ایک قابلِ احترام ہستیوں میں سے ہیں جن کے بُت ہم نے اپنے ذہنوں میں بٹھا رکھے ہیں۔ اب ان بتوں کو گوشت اور پوست کے انسان کے رُوپ میں دیکھنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ یہ ہمارے ذہنوں اور احساس میں بالکل ٹھیک جگہ کھڑے ہیں۔ انھیں وہیں کھڑا رہنے دو"۔ اس کے بعد میں نے عقیدتاً رشید صاحب کے گھر پر نظر ڈالی۔ میری نظر اچانک چند پودوں پر پڑ گئی۔ یاد آیا کہ رشید صاحب کو باغبانی سے بھی شغف رہا ہے۔ اس کے خیال کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب احساس مجھ میں یہ پیدا ہوا جیسے میں کوئی فرد نہیں بلکہ رشید صاحب کے باغ میں لگا ہوا ایک پودا ہوں۔ بھلا کی اس لطافت نے کتنی ہی دیر تک مجھے سرشار رکھا۔ رشید صاحب کے تعلق سے بس ایسی ہی یادیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

یادش بخیر! ۱۹۵۲ء میں ایک نصابی کتاب میں رشید صاحب کا مضمون "ارہر کا کھیت" پہلی بار پڑھا تھا۔ اس کے بعد رشید صاحب کی تحریریں جہاں اور جیسے بھی ملیں انھیں وہیں اور اسی حالت میں پڑھا۔ ان کے بے شمار فقرے یوں یاد ہو گئے تھے (اور آج بھی یاد ہیں) جیسے یہ نثر کے فقرے نہ ہوں غالب اور میر کے شعر ہوں۔ لوگ کسی مزاح نگار کے بیان کیے ہوئے مزاحیہ واقعات اور لطیفے تو یاد رکھ لیتے ہیں لیکن کسی مزاح نگار کے لکھے ہوئے فقروں کا ذہن میں محفوظ ہو جانا اور ان سے لطف و انبساط کا ہر بار ایک نیا عالم خلق ہو جانا یہ رشید صاحب کا ہی حصہ ہے۔ رشید صاحب کی تحریریں پڑھتے ہوئے چالیس پینتالیس برس بیت گئے۔ انھیں ہر عالم، ہر موسم اور ہر تیور میں پڑھا اور ہر بار کیف و سرور کے ایک نئے ذائقہ سے روشناس ہوا۔ نوجوانی میں ان کے فقروں کا مطلب کچھ اور سمجھ میں آتا تھا۔ اب اپنی تاریخ پیدائش سے دور اور اپنی تاریخ وفات سے قریب ہوتا جا رہا ہوں تو ان کا مطلب کچھ اور سمجھ میں آتا ہے۔ رشید صاحب ایک وقت پڑھنے کی چیز نہیں ہیں۔ بلا مبالغہ سیکڑوں مرتبہ ان کی کتابیں پڑھی ہیں لیکن ہر بار انہیں پڑھتے ہوئے کوئی نہ کوئی نیا گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ ذہن کی کھڑکیاں کیسے کھلتی ہیں، اور ذہن میں گوندا کس طرح لپک جاتا ہے اس کا اندازہ رشید صاحب کے مضامین پڑھنے سے ہی ہوا ورنہ ہمیں تو پتہ بھی نہیں تھا کہ ہمارے ذہن میں بھی کھڑکیاں ہیں اور یہ کہ یہ کھل بھی سکتی ہیں۔

رشید صاحب نے علیگڈھ کی نظر سے دنیا کو دیکھا بلکہ علیگڈھ ہی کو کل کائنات سمجھا۔ ہم جیسوں نے دنیا کی نظر سے رشید صاحب اور علیگڈھ دونوں کو دیکھا۔ رشید صاحب تو سمجھ میں آگئے لیکن علیگڈھ آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ میں کئی بار علیگڈھ گیا ہوں۔ ہر بار حیران ہو کر یہاں سے جاتا ہوں کہ آخر کس طرح رشید صاحب نے اس جگہ کے ... (تحریر ۲۱، ۶، ۱۹۹۲ء)

کر لیا تھا کہ یہ سمٹ جائے تو دل عاشق بن جائے اور پھیلے تو زمانہ۔ مگر اس میں بھی خوبی رشید صاحب کی نظر آتی ہے۔ ایک بار برسات کے موسم میں یہاں آنا ہوا۔ شہریار میرے ساتھ تھے۔ سڑک پر چلنے لگا تو ایک مرحلہ پر مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا لہٰذا رک گیا۔

پوچھا "کیا رشید صاحب علیگڑھ کی ان ہی گلیوں پر نثار تھے؟"

بولے "رشید صاحب کا علیگڑھ یہ نہیں ہے۔"

علیگڑھ سے گزرتے ہوئے تانوں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک نے میری آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ شہریار سے پوچھا "اس دھول کا رشید صاحب کے علیگڑھ سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟" بولے "رشید صاحب کا علیگڑھ تو آپ کو یونیورسٹی کیمپس کے اندر ملے گا۔" تھوڑی ہی دیر بعد یونیورسٹی کیمپس میں ایک پروفیسر سے ملاقات ہوگئی جنھوں نے اپنی عالمانہ باتوں کے ذریعہ میری جہالت میں خاصا اضافہ فرمایا۔ پوچھا "کیا یہ بھی رشید صاحب کے علیگڑھ کا حصہ ہیں؟"

شہریار نے چپ ہو کر مجھے رشید صاحب کے ہی ایک فقرے سے قائل کرانے کی کوشش کی کہ "مسخرے کو معلم بنانا ستم ظریفی ہے لیکن معلم کا مسخرہ بھی رہ جانا بدتوفیقی ہے۔" پھر بولے "کسی کی بدتوفیقی کی ذمہ داری رشید صاحب پر کس طرح عائد ہو سکتی ہے!"

میں نے کہا "پھر مجھے رشید صاحب کے علیگڑھ کو دیکھنے کی توفیق کب عطا ہوگی؟"

تنگ آکر بولے "بھیا! یہ کیا آپ علیگڑھ کے پیچھے پڑے ہیں۔ آخری دنوں میں رشید صاحب کے علیگڑھ کے حدود اربعہ ان کے گھر کے حدود اربعہ میں سمٹ آئے تھے۔ اس لیے تو زندگی کے آخری دنوں میں اپنے علیگڑھ میں رہنے کی غرض سے وہ اپنے گھر سے باہر کہیں نکلتے تھے۔"

سچ پوچھئے تو رشید صاحب کا علیگڑھ "عمارتوں، سڑکوں اور گلیوں سے عبارت نہیں تھا بلکہ ان باسیوں سے عبارت تھا جو کبھی ان عمارتوں میں آباد تھے اور یہاں کی سڑکوں پر چلتے پھرتے تھے۔ شہر سڑکوں اور عمارتوں سے نہیں بنتا۔ ان افراد سے بنتا ہے جو اس شہر میں آباد ہوتے ہیں۔ یوں بھی رشید صاحب کا علیگڑھ تو ایک زاویۂ نگاہ تھا، ایک طرز زندگی تھا، ایک انداز نظر تھا، جینے کے ایک نئے ڈھنگ کا عنوان تھا۔ رشید صاحب کے علیگڑھ کو سڑکوں اور عمارتوں میں محدود کرنا بدتوفیقی ہے۔ ان کا علیگڑھ تو فکر و نظر کی نئی راہوں سے عبارت تھا۔ علم و دانش کے کھلے ہوئے نئے نئے ایوانوں سے تھا۔ اس علیگڑھ میں علیگڑھ بھی تھا اور ساری کائنات بھی تھی۔ یہ قصبہ بھی تھا اور براعظم بھی۔ رشید صاحب کو بھی اس کا احساس تھا کہ ان کا علیگڑھ بدل رہا ہے۔ آج سے سینتیس (۳۷) سال پہلے لکھے ہوئے ایک مضمون میں انہوں نے کہا تھا کہ "میرا علیگڑھ سرسید کے عہد سے قریب تھا اور آپ کا علیگڑھ سرسید کے عہد سے بہت دور آگیا ہے۔"

رشید صاحب زندگی بھر تین باتوں کے لیے پریشان رہے۔ اردو، علیگڑھ اور مسلمان۔ اردو اور علیگڑھ کے بارے میں مجھ سے بہتر لوگ کچھ کہیں گے۔ میں یہاں مسلمانوں کے بارے میں خود رشید صاحب کی ایک تحریر کو نقل کر کے اپنی بات کو ختم کرنا چاہوں گا۔ رشید صاحب نے یہ تحریر لگ بھگ پچاس برس پہلے لکھی تھی۔

"ہندوستانی مسلمانوں میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ نماز کے اتنے قائل نہیں رہے جتنے جانماز کے۔ وہ بیماری کو علاج، صبر دپرہیز سے دور کرنے کے بجائے اس کو پروپگنڈہ بنانا زیادہ مفید سمجھنے لگے تھے۔ وہ جنگ کے لیے ہتھیل کانٹے سے تیار ہونے کے بجائے دشمن کو اکسانے پر زیادہ قائل تھے۔ اس سے بڑھ کر نا عاقبت اندیشی

اور کیا ہو سکتی ہے"؛

غور فرمایئے کہ رشید صاحب کا یہ بیان ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ زندگی پر بھی کتنا صادق آتا ہے اور کیا عجب کہ آئندہ بھی صادق آتا رہے۔

معاف کیجئے۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی سنجیدہ باتیں کرنے لگ گیا۔ میرا منصب بھی نہیں ہے۔ مسخرے کا معلم بن جانا تو ستم ظریفی ہے ہی لیکن ایک مسخرہ عالمانہ باتیں کرنے لگ جائے یہ بھی کچھ کم ستم ظریفی نہیں ہے۔ لہٰذا میں اپنی بات کو مختصر کرنا چاہوں گا۔ حضرات! وہ ہستی جس نے اردو ادب کو ایک نیا اسلوب اور ایک نیا آہنگ عطا کیا تھا، سو برس پہلے ہمارے درمیان پیدا ہوئی تھی اور میری تمنا یہ ہے کہ آج سے سو سال بعد بھی اردو ادب کے اس محسن کو اسی طرح یاد کیا جائے جس طرح آج ہم انھیں یاد کر رہے ہیں۔ کم از کم ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے آنے والے برسوں پر محیط کوئی لمبی چوڑی بات کہتے ہوئے نہ جانے کیوں زبان لڑکھڑا سی جاتی ہے۔ آج کی حد تک اگر ہم رشید صاحب کو یاد کرنے کے بہانے اس علیگڈھ کی بازیافت کر سکیں جو رشید صاحب کے مضامین میں نظر آتا ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ رشید صاحب کو یاد کرنا ضائع نہیں گیا۔ میں اردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز اور مزاح نگار کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ■□

طنز و مزاح پارے — رشید احمد صدیقی

- ★ "لیڈروں کے اقسام اور ہندوستان کے امراض کا کون احاطہ کر سکتا ہے"! (مضمون: لیڈر)
- ★ کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریز کیک اور ہندوستانی سردی کھاتا ہے۔ (مضمون: لُر)
- ★ "نعرہ کا اصول یہ ہے کہ الفاظ مختصر سے مختصر ہوں، مطالبہ زیادہ سے زیادہ اور خلوص کم سے کم"۔ (مضمون: بات میں بات)
- ★ "مرد اپنی شرافت کا اتنا قائل نہیں ہے جتنا عورت کے شباب کا"! (مضمون: جھوٹ بولنا)
- ★ "صاحب، عام طور پر اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو صبح آنکھ کھلتے ہی بغیر کُلّی کے چائے پی لیتے ہیں اور دوسروں کی بیوی کا اپنے باپ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ جتنا بڑا صاحب ہوگا اتنا ہی اس کا بیت الخلاء اس کی چارپائی کے قریب اور بھائی بند دور تر ہوں گے"!... (خنداں)
- ★ گنگا دین کے پاس چند مویشیاں بھی تھے جن میں اس کے اپنے بیل اور بیوی بچے بھی شامل تھے۔ جہاں تک ہندوستانی کسانوں کا تعلق ہے یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ ان کے بال بچے مویشیاں ہیں یا مویشیاں بال بچے۔ (مضامینِ رشید)

یوسف ناظم
(بمبئی)

رشید احمد صدیقی
کی
ظرافت نگاری اور موجودہ صورت حال

اردو میں نثری ظرافت کا سرمایہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کی زبانوں میں سب سے کم سن زبان کے پاس اتنا بڑا خزانہ کہاں سے گیا اور یہ خزانہ کوئی لوٹی ہوئی یا اہلِ غرض کی طرف سے احسان اقتدار کو دی ہوئی دولت نہیں ہے۔ اس گنج گراں مایہ کے پالنے والوں میں اسد اللہ خاں غالب کا نام سر فہرست ہے۔ نثری ظرافت کے باب الداخلہ کا اطلسی فیتہ انھوں ہی نے کاٹا تھا۔ اس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں صرف کام اور کارنامے ہوا کرتے تھے رونمائی اور نقاب کشائی کی تقاریب نہیں ہوا کرتی تھیں۔ میں چونکہ نقاد نہیں ہوں اس لیے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اگر غالب نے شاعری نہ بھی کی ہوتی اور صرف خطوط لکھنے ہی پر اکتفا کی ہوتی تو ان کی شہرت آج وہی ہوتی جو انگریزی ادب میں سوئفٹ کی ہے اور لطف یہ ہے کہ غالب نے اردو ظرافت کو جو کچھ دیا وہ بالکل نادانستہ طور پر دیا۔ ان کی نیت صرف ذاتی اور نجی نوعیت کے خط لکھنے کی تھی۔ اور انھیں خبر نہ تھی کہ وہ اردو نثر میں ظرافت نگاری کی داغ بیل ڈال رہے ہیں اور ہم آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بیل خوب منڈھے چڑھی۔ غالب کو بالکل پتہ نہ تھا کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے چند حرفی خط آگے چل کر اردو ادب کا شاہ کار بن جائیں گے۔ ان کے دل لخت لخت کا مجموعہ آج دیوانِ غالب سے کسی طرح کم وقیع نہیں ہے۔ یہی ظریفانہ نثر جب پنجاب، دلی، لکھنؤ اور علی گڑھ پہنچی تو یہ نوخیز و نوخاستہ سرسبز و شاداب بیل، پوری کی پوری خوش رنگ پھولوں سے لد گئی۔ ظرافت کو بیل داپیڑی ہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اس میں لچک اور ملائمت ہونی چاہیے۔ بیل میں کانٹے نہیں ہوتے اور اگر کسی بیل میں ہوتے بھی ہیں تو یہ بھی اسی کے جگر گوشے ہوتے ہیں۔ چبھتے بھی ہیں تو ان کا اثر مسرت بخش سسکی کا سا ہوتا ہے۔ اسے آپ طنز کہہ لیجیے جو مزاح کا پروردہ ہوتا ہے لیکن شوخ اور چلبلا سا ظرافت کو ببول کا درخت نہیں ہونا چاہیے۔

علی گڑھ اور ادبی ظرافت کا ذکر آئے گا تو ظاہر ہے رشید صاحب کا ذکر بہر حال آئے گا۔ بلند تلفظ زبان کے بوسے لے یا نہ لے دل میں ایک لہر سی ضرور پیدا ہوگی۔ فرحت و انبساط کی لہر۔ جس طرح حالی

اور اقبال کو اپنے اپنے میدان اور طنز شاعری میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح رشید صاحب کو ایک مخصوص قسم کی ظرافت نگاری میں جو شگفتگی اور شائستگی کے حریری لباس میں ملبوس اور علمیت سے لبریز ہو اولیت حاصل ہے۔ رشید صاحب کے علاوہ جن ادیبوں نے (جو ایک لحاظ سے ان کے ہم عصر بھی تھے) اس طرزِ نگارش کو اپنایا اور اسے مالا مال کیا ان میں سید محمد آزاد، بمبوق اور سلطان حیدر جوش کے نام آتے ہیں اور ان میں محفوظ علی بدایونی کو سر سید کی طرح محفوظ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس زمانے کا شاید ہی کوئی تنقید نگار اور انشا پرداز ایسا ہوگا جس نے محفوظ علی بدایونی کو خراجِ عقیدت نہ پیش کیا ہو۔ اس زمانے میں صحافت بھی ادیبوں کے ہاتھ میں تھی۔ قاضی عبدالغفار نے ایک جگہ لکھا ہے "مزاح نگاری کا ایک ایسا معیار "ہمدرد" نے قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا۔ بمبوق اور محفوظ علی (دونوں علی گڑھ کے) اس فن کے استاد مانے گئے اور آج بھی جو اچھے مزاح نگار ہیں انھوں نے "ہمدرد" کی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔"

رشید صاحب نے انھیں ان الفاظ میں سراہا ہے کہ "محفوظ علی بدایونی نے روایات و مناسبات سے مبصرانہ ظرافت کی تخلیق کی اور ظرافت کے تانے بانے میں طنز کی ایسی بوقلموں چھاؤں پیدا کر دی کہ فن کی ترقی کے امکانات وسیع ہو گئے"۔ میں جانتا ہوں کہ میرا موضوع رشید صاحب کی ظرافت نگاری ہے اور میں علی گڑھ کی "روایتی اور ظرافتی" خصوصیات کا ذکر صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ رشید صاحب تک پہنچنے کا راستہ ہموار ہو جائے۔ رشید صاحب نے صرف طنزیات و مضحکات لکھ کر اپنا تنقیدی کام مکمل نہیں کیا۔ ظرافت نگاری کے بارے میں ان کے ارشادات ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں جو ان کے نظریۂ ظرافت کے سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں لیکن تھوڑی بہت۔ اس تھوڑی بہت کی وضاحت میں اگلی سطور میں پیش کروں گا۔ محفوظ علی بدایونی کی ظرافت کے تعلق سے انھوں نے جو کچھ کہا وہ بجائے خود ایک نظریۂ ظرافت ہے۔ اُن کے ایک 'اقتباس' کے بعد میں رشید صاحب کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔ محفوظ علی بدایونی کی ظرافت نگاری کے تعلق سے ان کی رائے ہے۔

سید صاحب کی ظرافت میں ایک طرح کی Buoyancy ملتی ہے۔ بعضوں کی ظرافت، ٹھوس اور ٹھس جیسے پانی میں سیسے کا ٹکڑا اگر کر تہہ نشین ہو جائے۔ بعضوں کی سیال ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر پھیل کر فضا میں غائب ہو گئی۔ . . . سید کی ظرافت کی مثال کنول کے پھول سے دے سکتے ہیں۔ پانی کا اتار چڑھاؤ کیسا ہی ہو یہ پھول برابر شگفتہ، جھومتا اور تیرتا رہے گا۔" (گنجہائے گراں مایہ) اس رائے میں رشید صاحب نے خود لفظ Buoyancy کا اردو ترجمہ نہیں لکھا۔ میں چونکہ ان کا درافتادہ مقلد ہوں اس لیے میں بیہودگی، کو خوش دلی اور ندرت کہوں کہوں اور کہوں اپنے پسماندہ ہونے کا ثبوت دوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ رشید صاحب "ظرافت نگاری" کے لیے جن لوازمات اور تلازمات کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس لفظ سے ظاہر ہیں۔

رشید صاحب کی تصنیف "طنزیات و مضحکات" کو اردو ظرافت کی بوطیقا کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اور "مضامین رشید" کو اردو ظرافت کا سنگ میل ماننے میں کوئی تکلف۔ رشید صاحب کو

ظرافت کے بے خانے کا پیر مغاں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی جسے دیا اس کے ظرف کے مطابق دیا۔ بسیار نوشتوں کو تو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا۔ اپنے آپ کو ظرافت نگاری کے معاملے میں اتنا منضبط و محتاط رکھا کہ اردو ادب کو ایک ہی کتاب دی۔ مضامین رشید جو کیفیت، کمیت اور قدر و قیمت کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں علمیت اور وقار کو بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے ساتھ مزاح کے روپ پیش کیا گیا اور یہ کام صرف ایک صاحب طرز انشا پرداز سے ممکن ہے۔ رشید صاحب کی ظرافت نگاری صلائے عام نہیں ہے۔ یوں بھی ادبی ظرافت کی کوئی سبیل نہیں لگائی جا سکتی۔ رشید صاحب کی ظرافت اہل ذوق کے لیے ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان کے یہاں جو بھی ملتا ہے وہ سب کا سب "دقیق" ہے لیکن ہے اونچی سطح پر۔ اب یہ قاری کی کمند پر منحصر ہے کہ وہ کہاں جا کے ٹوٹتی ہے۔ رشید صاحب کی ظرافت نگاری کا ذکر کرتے ہوئے تنقید نگار حضرات نے بالعموم ان کی دو مزاحیہ کتابوں کا ذکر کیا ہے جب کہ میرے نزدیک ان کی صرف پہلی کتاب "مضامین رشید" ان کی نمائندہ کتاب ہے۔ "خنداں" کو انشائیہ کی کتاب کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ لفظ انشائیہ بجائے خود گمراہ کن ہے اور اس پر مستزاد انشائیہ کی تعریف جو اب تک متعین نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے اور اس میں دخل دینا پولیوشن کا شکار ہونا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ ہم اب تک یہ تصفیہ نہیں کر سکے ہیں کہ طنز و مزاح اکائی ہے یا نہیں۔ میں شخصی طور پر طنز و مزاح کے لیے ظرافت کا لفظ استعمال کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہوں ویسے جہاں تک اصول ظرافت کا تعلق ہے مزاح اور طنز دو علاحدہ خصوصیات ہیں۔ مزاح کا تعلق فرد کے مزاج سے ہے جب کہ طنز کا تعلق شعور سے ہے یہاں وزیر آغا کے اس نظریے کی نفی ہوتی ہے۔ جس کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ خالص مزاح کی نشوونما کے لیے سکون و عافیت کی ایسی فضا درکار ہے جس میں لوگ ماحول سے بدظن نہ ہوں۔ اگر اسے مان لیا جائے تو مزاح صرف عرش بریں کی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ مزاح خوش طبعی کی پیداوار ہے اور جیسا کہ حالی نے کہا ہے وہ ہوا کا جھونکا ہے۔ ہمارے یہاں طنز و مزاح کی بحث ہی پریشانی کا سبب رہی ہے اور رشید صاحب صاحب کے فن پر بحث کرتے ہوئے سبھی تنقید نگار مذبذب نظر آتے ہیں اور اسی لیے میں نے اوپر کی سطور میں عرض کیا تھا کہ خود رشید صاحب نے ہماری مدد تھوڑی ہی بہت کی ہے۔ اگر وہ خود بھی زندگی ہی میں تصفیہ کر دیتے کہ وہ اول مزاح نگار ہیں اور بعد میں طنز نگار یا اول طنز نگار ہیں اور بعد میں مزاح نگار تو ان کی شخصیت اور ان کے فن پر تحقیقی کام کرنے والوں کو ان پریشانیوں میں مبتلا نہ ہونا پڑتا جن میں وہ جان بوجھ کر مبتلا ہوئے ہیں۔ رشید صاحب نے بھی اپنے آپ کو اس جنجال میں گرفتار پایا ہے کیونکہ ان کی رائے ہے کہ طنز کے لیے مزاح کی ضرورت نہیں ہے اور طنز کو صرف طنز ہونا چاہیے۔ انتشار کی یہ کیفیت اب بھی برقرار ہے اور اس کا حل صرف یہی ہے کہ ہم طنز و مزاح کو ایک اکائی مان لیں اور میں رشید صاحب کو اسی اکائی کا نمائندہ مانتا ہوں۔ وہ تحریر کے بادشاہ ہیں اور قول محال کے فرزند۔ قول محال کی نثر میں وہی حیثیت ہے جو شاعری میں سہل ممتنع کی ہے۔ رشید صاحب پر اب تک جو لکھا جا چکا ہے اس میں اضافہ کرنے کی بات سوچنا بجائے خود ظرافت بلکہ ستم ظریفی ہے۔ لیکن اقوال محال جو مشکل سے کسی ادیب کو نصیب ہوتے ہیں۔ رشید صاحب کے یہاں ارہر کے کھیت کی طرح پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی چارپائی کے نیچے بکھرے نظر آتے ہیں۔ مثلاً: تجنیس حروف کی فطرت اور

پاسبانی اس کی عادت ہے۔ یا یہ کہ دنیا کی نصف مصیبتیں محض اس لیے ہیں کہ بابا آدم اپنی سالم پسلیوں کے ساتھ سپردِ خاک نہیں ہوئے، اور شاعری کے بارے میں ان کا قول ہے۔ "شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔"
رشید صاحب تراکیب کے بھی خالق ہیں۔ مثلاً: اچھا تو یہ صفحہ معترضہ تھا۔

رشید صاحب کے اسلوب کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے نہایت دیانت داری سے رائے دی ہے۔ جہاں ان کے اسلوب کے بارے میں انھوں نے عظمت و رفعت، دل نشینی اور دل آسانی کے الفاظ استعمال کیے ہیں وہیں یہ بھی کہا ہے کہ "کہیں کہیں ان کی تحریر میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے اور الفاظ کے طلسم میں حسن کی تلاش مشکل ہو جاتی ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص شعریت ہے۔ اس میں حکیمانہ نکتہ سنجی بھی ہے اور شاعرانہ لطف و انبساط بھی۔"

رشید صاحب نے باتوں باتوں میں ظرافت کے اصول مقرر کر دیئے ہیں۔ پطرس اور فرحت اللہ بیگ کے تعلق سے انھوں نے دو ٹوک بات کہی تھی کہ اگر پطرس لکھتے رہے اور فرحت اللہ بیگ نے لکھنا کم کر دیا تو ظرافت نگاری کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ (بہت فائدہ پہنچے گا کے الفاظ میرے ہیں۔ لیکن ماخذ رشید صاحب کی رائے ہے) اور غالباً شوکت تھانوی کے تعلق سے ان کی رائے تھی کہ ان کی تحریر میں شگفتگی ہے اور وہ شگفتہ نگاری تک پہنچ سکتے ہیں۔

خاکسار سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ طنز و مزاح کی موجودہ صورت حال کے تعلق سے بھی کچھ عرض کیا جائے۔ رشید صاحب، مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری کا حوصلہ کس میں ہے کہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں مخلصانہ اور بے باکانہ رائے دے سکے۔ نیاز فتح پوری نے تو رشید صاحب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کا دماغ تھک گیا ہے اور رشید صاحب کا ظرف دیکھیے کہ اس رائے کو انھوں نے اس ترمیم کے ساتھ قبول کر لیا تھا کہ دماغ کے ساتھ قلم کو بھی شامل کر لیا جائے۔

مجھے یہاں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ہندوستان میں ظروف سازی کی صنعت بھی متاثر ہوئی ہے۔ اور میں خود کے ظرف پر غور کر کے کہہ سکتا ہوں کہ تنقید یعنی اچھی تنقید سننے کا حوصلہ اب لوگوں میں رہا نہیں ہے۔ تنقید کا بھی حال کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے اور یہی صورت طنز و مزاح کی ہے۔ مایوس کن تو نہیں ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ روبہ کمال ہے۔ خاص طور پر شاعری کاسۂ سوال لیے کھڑی ہے کہ ہے کوئی سخی جو مجھے آسودہ کر دے۔ طنز و مزاح کے لیے آج موضوعات کی کمی نہیں ہے لیکن یا تو ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے یا عجز بیان نے ان موضوعات کو مزاح نگاروں کی دسترس سے دور رکھا ہے۔ انشا پردازی جو ظرافت نگاری کی شرائط میں سے ایک اہم شرط ہے ہم اس کے تقاضے پورے نہیں کر پا رہے ہیں۔ تحریر میں طنز کی شدت تو ابھر کر سامنے آتی ہے لیکن مزاح ہوا کے جھونکے کی طرح کہیں دور ہی سے ہوا ہو جاتا ہے۔ طنز و مزاح کا وہ حسین امتزاج جو اعلیٰ ظرافت کا نمونہ ہو، اس نخلستان کی طرح کم یاب ہے جس کی تلاش ریگ زاروں کے مسافر کو ہوتی ہے۔ کتابوں کا اضافہ ادب میں اضافے کا باعث ہو تو بات بنے۔ طنز و مزاح کے اچھے نمونے بھی ہیں لیکن وہ نمونے ہی کیا جو انگلیوں پہ گنے جائیں۔ یہاں میں پھر انشائیے کی بات چھیڑ دوں گا۔ اگر "Essay" کا ترجمہ انشائیہ ہے تو پھر مضامین رشید کو ہم کس شق میں شامل کریں گے۔ اب مشکل

یہ بھی سچ ہے ہندوستان اور پاکستان میں ادبی نظریئے بھی مختلف ہوگئے ہیں۔ پاکستان میں انشائیہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں مزاح کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یوں آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ جبکہ ہندوستان میں انشائیہ، نکاہیہ اور مزاحیہ تینوں مترادفات ہیں۔ ہمارے مدیرانِ رسائل جس مضمون کو چاہیں انشائیہ عنوان سے شائع کردیں اور جسے چاہیں مزاحیہ لکھ دیں۔ طنز و مزاح کی موجودہ صورتِ حال پر اس صورتِ حال کا بھی اثر پڑتا ہے۔ ویسے سب سے اچھا اصول یہ ہے کہ جب اچھے لکھنے والوں کا کال ہو تو کم برا لکھنے والوں کو اسی قدر و منزلت کا مستحق قرار دینا چاہیے جو اچھا لکھنے والوں کے لیے مختص ہے۔

(یہ مضمون رشید احمد صدیقی کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر علی گڑھ یونیورسٹی کے سیمینار منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں پڑھا گیا۔

طنز و مزاح پارے

○

" زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی تھا۔ یہ باتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لیے روا رکھی جاسکتی ہیں "

(اپنی یادمیں)

○

مجھے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بڑی بے اطمینانی تھی۔ ان میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے تھے وہ نماز کے اتنے قائل نہیں رہے جتنے جانماز کے "

(اپنی یادمیں)

○

میں جس دنیا کو چھوڑ کر یہاں آیا ہوں اس میں بہت سے لوگ ایسے تھے اب بھی یقیناً ہوں گے جنھوں نے کبھی کوئی قابلِ فخر بات نہ کی لیکن ان کی ہر بات اور ذات پر فخر کیا گیا "

(اپنی یادمیں)

○

جو کتنا ہی بڑا جی ہو میاں بیوی کے جھگڑوں میں پڑنے سے گریز کرتا ہے۔

(مضامینِ رشید)

○

قانون اور قاعدے سے ان کا اتنا ہی مس تھا جتنا نئی روشنی کی بیویوں کو اپنے مہذب اور مصلحت اندیش شوہروں سے "

(مضامینِ رشید)

○

تندرست تھے لیکن شکل بالکل ہندوستانی دواخانہ

(مضامینِ رشید)

احمد جمال پاشاؒ

تنقید بہ طرز رشید احمد صدیقی

کپور۔ ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ (پیروڈی)

جو ادیب طنز نگار ہیں اُن میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے یہ حضرت کپور کی گرفت مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک مزاح نگار ایک طنز نگار ہیں اور اس سب کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور ہم آپ ہوتے ہیں، تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی بُرا مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس کیسے پسند ہوتے ہیں اُلٹی چیز سیدھی یا سیدھی اُلٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے کیوں کہ طنز کا تقاضا ہے وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے۔ مگر مجھ سے پوچھا جا کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا۔ غالبؔ، اقبالؔ، اور کپورؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی خطا اس وقت معاف کیجئے اور کپور کی بات کیجئے، جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہمراز دمساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں مولوی یا لیڈر ہوگا! خود جل کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس لیے طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات کبھی بھول جانی چاہیئے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے یہاں وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں۔ جو انھوں نے ابھی کہی کہی ہیں ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہو سکتا ہے۔ خون زیادہ خرابہ کم ایسے ہی مضامین پر میں سر دُھنا کرتا ہوں، یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا طنزیات و مضحکات میں طنز کا "یہ تصوف دوام" مبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انھوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کر سکتا ہے جن کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کپور ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی استاد وارد ہو جائے، کپور دُو اور دُو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو مجھے گوارہ ہے۔"

سلیمان اطہر جاوید

رشید احمد صدیقی کے مکاتیب میں طنز و مزاح

رشید احمد صدیقی نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات طنز و مزاح سے کیں۔ من بعد تنقید کی طرف توجہ دی اور اس کو تخلیق کا درجہ دے دیا، مرقع تسوید کئے کہ شخصیات چلتی پھرتی محسوس ہوئیں اور علیگڑھ کے پس منظر میں تہذیبی اور ثقافتی مضامین لکھے اور بتا دیا کہ معاشرہ کس سمت جا رہا ہے اور اس کو کس سمت جانا چاہیئے لیکن انہوں نے خواہ کچھ لکھا، ان کی تحریروں میں انشائیہ نگاری ہر جگہ اپنا جلوہ دکھاتی، نکھری ستھری ملتی ہے، طرحداری اور تہہ داری لیے ہوئے۔ رشید صاحب کے مکاتیب بھی انشاء پردازی کی یہی دلکشی اور دلآویزی لیے ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے کچھ کم عرصہ ہوا ہوگا غالب نے مکتوب نگاری کو اردو ادب کی ایک آبرومند صنف بنا دیا اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رشید صاحب نے اس صنف کی آبرو میں کچھ اور اضافہ کیا ہے۔ اس کو ایک نیا رنگ دے دیا ہے۔ اُن کے مکاتیب میں تہذیب و ثقافت پر بھی اظہار خیال ملے گا، کہیں کہیں مرقع نگاری بھی، شعر و ادب پر جہاں تہاں تنقید بھی اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی ــــــ رشید صاحب نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے، معرکہ آراء اور بے مثال، لیکن جس طرح اپنے ملنے والوں سے وہ بہت کم کھلتے اور ان میں بھی بہت کم سے شوخ بیانی خوش طبعی اور طنزیہ و ظریفانہ انداز روا رکھتے۔ ان کے بہت کم مخاطبین ایسے ہوں گے جن کے موسومہ مکاتیب میں انہوں نے خوش مزاجی اور شوخیٔ تحریر سے کام لیا ہے۔ ویسے جہاں کہیں بھی، وہ اور ان کا قلم کھلے ہیں لفظ لفظ منور ہو گیا ہے، سطر سطر رنگین ہو گئی ہے اور ورق ورق مہک گیا ہے! انہوں نے بہت زیادہ خطوط لکھے اور اپنے موسومہ مکاتیب کا جلد سے جلد جواب دینے والوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے لیکن خط لکھنے یا جواب دینے میں انہوں نے کبھی بھی روا روی سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے مکتوب نگاری کو ایک فن شریف کا درجہ دے دیا، ایک آرٹ بنا دیا اور کوئی آرٹ جس ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے رشید صاحب نے مکتوب نگاری میں ایسی ہی ریاضت سے کام لیا، اس فن کا احترام بھی کیا اور اس کی لی کے لیے اہتمام بھی۔ انہوں نے اطمینان خاطر، ذہنی سکون اور دلجمعی کے ساتھ مکتوب نگاری کی۔ یوں بے توجہی، چلتے چلاتے اور بے اطمینانی سے خط لکھنا اُن کے نزدیک کوئی پسندیدہ عمل نہیں۔ امت المسعود کے موسومہ مکتوب میں انہوں نے تو یہاں تک

لکھ دیا ہے :

"بے اطمینانی سے کسی کے خط کا جواب لکھنا اس شخص کی توہین ہے جس کو خط لکھا جائے"۔[۱] رشید صاحب کے مکاتیب میں ترشے ترشائے فقرے، قولِ محال کے سے جملے اور ڈھلی ڈھلائی عبارتیں جو ملتی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے مکاتیب پر اس سے زیادہ توجہ دی جو اُن کا حق تھا جہاں جہاں انہوں نے طنز و مزاح سے کام لیا صورتِ حال جادو جگا گئی ہے۔

مکاتیب میں طنز و مزاح میں رشید صاحب کا ہدف تک جھگ وہی کردار ہیں جو اُن کے مضامین میں ملتے ہیں۔ بیوی، مولوی، شاعر، ترقی پسند اور لیڈر وغیرہ لیکن رشید صاحب کا مقصود محض ان کرداروں کا مضحکہ اُڑانا اور ظرافت پیدا کرنا نہیں بلکہ ہماری معاشرتی اور گھریلو زندگی کی ناہمواریوں، پیچ و خم اور زیر و زبر کی سمت اشارے کرنا ہے اور ان واقعات کی طرف توجہ دلانی ہے جن کو ہم گوارا نہ کرتے ہوئے بھی گوارا بنا چکے ہیں، نباہ نہ کرتے ہوئے بھی نباہ کر رہے ہیں۔ رشید صاحب کے مکاتیب میں اسلوب کا وہی رچاؤ ملتا ہے۔ الفاظ کی اُلٹ پھیر، بات میں بات پیدا کرنا۔ یہاں الفاظ کی نشست و برخاست پر غور فرمایئے کتنی جہت اور بے محل ہے۔ مکتوب بنام اُمت المسعود میں اپنی اہلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اس وقت میرے پہلو میں ذرا فاصلے پر کافی اونچائی پر بیٹھی ہوئی کپڑے قطع کر رہی ہیں اور رہ رہ کر میری طرف اس طور پر دیکھتی ہیں کہ ذرا غافل ہوں تو وہ کپڑے کے ساتھ ان جائز ناجائز تعلقات کو بھی قطع کر دیں جو میرے اُن کے درمیان اُس زمانے سے چلے آتے ہیں جب وہ بالغ تھیں اور میں عاقل نہ تھا"۔[۲]

اور یہاں دیکھئے اہلیہ کے مزاج پر جو روشنی ڈالی جاتی ہے :

"کبھی کبھی بغاوت پر بھی آمادہ ہوتی ہیں تو میں اُن کو سمجھا دیتا ہوں کہ تم کو کس چیز کی کمی ہے۔ خدا کے فضل سے بچوں کی کمی نہیں، شوہر کی زیادتی نہیں، دوستوں میں مسز مشرف، بزرگوں میں بیگم محمود، کھانے کو آم، پہننے کو ساری، غصہ اور نظر اتارنے کے لیے یہ خاکسار، چلنے کے لیے ملیگڑھ کی سڑکیں، مدعو کرنے کے لیے لیڈی مسعود، پوچھنے کے لیے اُن کی والدہ، نماز پڑھنے کے لیے تمہاری والدہ، آخر کیا نہیں ہے"۔[۳]

یہ مکتوب موسومہ مِس اُمت المسعود، مورخہ یکم فروری ۱۹۴۰ء۔ رشید صاحب نے کمال کر دیا، اسلوب کی دلآویزی، بات میں کیسے بات پیدا کی ہے۔ نشانہ اہلیہ نہیں، اہلیہ کی والدہ ہیں۔ نیز یہ کہ کیسے تجاہلِ عارفانہ سے چلایا جا رہا ہے :

"اہلیہ قریب ہی بیٹھی ہوئی گاجر چھیل رہی ہیں اور اپنی والدہ کے آنے کا مژدہ سُن کر باغ باغ ہو رہی ہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ گاجر کو دکش پر چڑھایا جائے یا چاقو سے چھیلا تراشا جائے۔ میں نے بے خبری کے عالم میں کہہ دیا۔ والدہ تمہاری یا۔ مجھے کیا معلوم تم کیا سلوک کرنا پسند کرو گی۔ میں تو انہیں دونوں کا مستحق سمجھتا ہوں"۔[۴]

---

۱ لطیف الزماں خاں "خطوط رشید احمد صدیقی"، مجلس ادبیاتِ مشرق، کراچی ۱۹۸۸ء، ص۲۰۔
۲ خطوط رشید احمد صدیقی ص۲۳، ۲۲ ۳ خطوط رشید احمد صدیقی ص۲۹ ۴ خطوط رشید احمد صدیقی ص۳۰

اور یہاں بھی مکتوب ات المسعود ہی کے موسوم اور نشانہ ہوئی، لیکن اپنی نہیں کسی کی بھی۔ شوخی و شگفتگی اور طنز و مزاح اپنا جواب آپ:

"نینی تال کا نام آگیا تو غالب کا یہ مصرعہ بھی یاد آگیا" اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے"! یہ تو میرا حال ہے جو ہمیشہ بیوی کے ساتھ پہاڑ پر جاتا ہے اُن کا کیا عالم ہوگا جن کی خود پہاڑ جیسی بیوی ہوتی ہے اور پہاڑ ہی جیسے دن رات میدان میں کاٹنے پڑتے ہیں"۔[1]

مُلّا اور مولوی تو اردو شاعروں کے طنز و تحقیر کا نشانہ بنے ہیں بہت زیادہ! طنز و مزاح نگاروں نے بھی ان پر کم توجہ نہیں کی۔ رشید صاحب نے اپنے کئی مضامین میں مولویوں کا خوب خاکہ اڑایا ہے، اچھی خبر لی ہے۔ مکاتیب میں بھی ایک عالم ہے کہ دیکھتے رہیے۔ تحفے تحائف اور نذر نذرانوں کے سلسلے میں مولویوں کی یاد آنی ہی چاہیئے کیوں کہ ان کا خمیر ہی نہیں ان کا ضمیر بھی انہی تحفے تحائف سے بنا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر (میسور) کے موسوم مکاتیب سے یہ دو اقتباسات۔

پہلا مکتوب ہے مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۴۷ء:

"شہد کی بوتلوں کا پارسل کل تک تو یہاں موصول نہیں ہوا۔ ممکن ہے آج کل میں آجائے۔ تحفہ لینا دینا بڑی اچھی بات ہے لیکن اپنے طالب علموں سے تحفہ لینا میرے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں آدمی نہیں، مولوی ہوں"۔[2]

اور یہ مکتوب ہے مورخہ یکم جولائی ۱۹۴۹ء:

"میں نے اپنی زندگی میں اپنے لیے دوسروں کا یہ مظاہرۂ محبت و مرحمت پہلے کبھی نہ دیکھا نہ پایا۔ اس کی مجھے تھوڑی سی تکلیف بھی ہے۔ مولوی ہوتا تو شریفوں کے لیے مستقل عذاب بن جاتا۔ مولوی نہیں ہوں اس لیے جہاں شرمندگی سے زمین میں گڑا جاتا ہوں وہاں زندگی کے شرفِ سعادت سے اپنے آپ میں بڑی توانائی محسوس کرتا ہوں"۔[3]

تخلص بھوپالی کے موسوم مکتوب مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۳ء کا یہ اقتباس۔ مولوی کی شخصیت کیسی اُبھر کر سامنے آتی ہے! اس کو رد کرنا تو کجا، مولوی اس سے محظوظ ہی ہوں گے ملاحظہ ہو:

"کھانے پینے میں کسی مولوی کو نیچا دکھانے کی کوشش مت کیجیے اس وادی میں خود مولوی کسی مولوی کا مقابلہ نہیں کرسکتا"۔[4]

مولوی ہو کہ شاعر یا لیڈر، رشید صاحب کو ان میں کافی خصوصیات مشترک محسوس ہوتی ہیں۔ بات وہی تحفے تحائف کی ہے اور زد میں ہیں مولویوں کے ساتھ شاعر۔ مکتوب موسوم پروفیسر عبدالقادر مورخہ ۳۱ اگست ۵۷ء کا یہ اقتباس:

"پارسل ملا جس میں آپ کے بھیجے ہوئے تحائف تھے۔ تین بٹن اور دو تسبیح تحائف کا لفظ میں نے اخلاقاً استعمال کیا ہے۔ ورنہ اصلاً یہ میری فرمائش تھی۔ فرمائش کو تحفے میں منتقل کرلینا مولویوں اور شاعروں کا شیوہ رہا ہے۔ میں

---

[1] "خطوط رشید احمد صدیقی"، ص ۲۵ [2] پروفیسر محمد عبدالقادر "حنائے علیگڑھ"۔ میسور ص ۵۵

[3] "حنائے علیگڈھ" ص ۶۱

[4] ڈاکٹر محمد نعمان۔ "بھوپال ادب کے آئینہ میں"، سن اشاعت ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۷۔

کیسے گوارا کر لوں گا۔ ان کی قیمت میرے ذمہ رہی"۔ ۱؎

ایک اور مکتوب جوامت المسعود کے موسومہ ہے، مولوی اور لیڈر ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیسا شستہ انداز کیسا لطیف طنز اور کیسا لطیف مزاح۔

"ایک دن تو ایسا ہوا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی لیکن ہوا کے جھونکوں میں گرد شامل تھی! بارش ختم ہوئی لیکن فضا، ایسی ہی مکدر اور ناصاف رہی جیسے مولوی یا لیڈر آنسو بہائے لیکن دل میں غبار اور کثافت جوں کی توں باقی رہے"۔ ۲؎

ترقی پسندوں کی رشید صاحب نے کبھی شدت سے مخالفت نہیں کی ہو، ترقی پسند رشید صاحب کے کبھی محبوب بھی نہیں رہے۔ رشید صاحب نے جب بھی موقع ملا کبھی سنجیدہ انداز میں، کبھی طنزیہ و مزاحیہ پیرایہ میں ترقی پسندوں پر وار کیا۔ کبھی بالواسطہ کبھی بلا واسطہ۔ بنگلور اور میسور کی آب و ہوا اور سیر و سیاحت کا تذکرہ ہے لیکن بات پہنچی ترقی جوانی تک! ترقی پسندی نشانہ بن جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر کے موسومہ مکتوب ہے:

"کبھی آپ کی نواح کی سیاحت کا خیال آتا تھا یا آپ اصرار کرتے تھے تو کتنی ساری فرضی معذوریاں اور بہانہ جوئی سامنے آتی تھی۔ اب آتا ہے تو حقیقی معذوریاں سد راہ ہوتی ہیں۔ پہلے علیگڈھ میں آپ کی طرف کی فضا کا لطف مل جاتا تھا۔ اب اندیشہ ہے کہ میسور اور بنگلور میں بھی یہیں کی صبح و شام ہوگی۔ بیماری بھی کتنی "ترقی پسند" ہوتی ہے کہ خوب و زشت کی تمیز اٹھا دیتی ہے"۔ ۳؎

رشید صاحب بظاہر گوشہ نشین اور تنہائی پسند دکھائی دیتے ہوں لیکن انہوں نے زندگی اور زمانے کو دیکھا، برتا اور آزمایا مختلف المزاج لوگوں سے اُن کے مراسم رہے اور اگر مراسم نہ بھی رہے ہوں تو کہیں نہ کہیں ان سے اُن کا سامنا ہوا، معاملہ رہا۔ رشید صاحب کی ژرف بیں نگاہ ہوں نے اُن افراد کو سمجھا اور اپنے زاویے سے ان کے بارے میں رائے قائم کی۔ اپنے مضامین کے علاوہ مکاتیب میں بھی اس کا اظہار کیا۔ غالباً کسی یونیورسٹی کے رجسٹرار رہا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے موسومہ مکتوب میں اِن رجسٹرار صاحب کی شخصیت کیسے برا فگندہ نقاب ہوتی ہے۔ صرف رجسٹرار ہیں جہاں کہیں ایسے آدمی ہوں۔ مکتوب مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء کا یہ اقتباس:

"رجسٹرار کو لکھنا بیکار ہے۔ وہاں سے کوئی جواب نہیں آتا۔ یہ میرا سالہا سال کا تجربہ ہے۔ اگر وہاں وہی رجسٹرار ہیں جو پان بہت کھاتے تھے اور اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے جن کے تصرف مرث یا لوتی ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں کہیں ایسا آدمی دیکھئے یقین کر لیجئے کہ نکما ورنہ ناقابلِ اعتبار ہوگا"۔ ۴؎

رشید صاحب کو روزانہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی مزاح کا پہلو نکال لینے میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ خوش طبعی کہئے، مزاح کی ہلکی سی لہر مسعود صاحب کے موسومہ مکتوب مورخہ ۸ رجولائی ۱۹۷۰ء میں تحریر کرتے ہیں:

۱؎ "حنائے علیگڈھ" ص ۱۰۵   ۲؎ "خطوط رشید احمد صدیقی" ص ۲۴
۳؎ "حنائے علیگڈھ" ص ۱۰۱
۴؎ مالک رام (مرتبہ [illegible])، دہلی ۳۴، ص ۲۰۰

"کیا معلوم تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی لیکن اس کی خوشی ہے کہ میرے دعا مانگنے سے پہلے آپ صحت یاب ہو گئے جیسے خدا نے میری دُعا کو ANTICIPATE کر کے آپ کو اچھا کر دیا ہو۔"[1]

واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب کی تحریریں قہقہہ بردوش نہیں، تبسم برلب ہوتی ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے قاری آپ اپنے محسوسات اور تخیلات کی دُنیا میں کیف و کم کی کیفیت سے دو چار ہوتا، مسکرانے لگتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کا مزاح اتنا لطیف ہوتا ہے کہ اس کو صرف اور صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا ہی اقتباس ہے پروفیسر عبدالقادر کے موسومہ مورخہ ۹ جولائی ۵۳ء کے مکتوب سے۔ لطافت میں بے مثال:

"آپ نے میرے لباسِ فاخرہ کے لیے کوئی کپڑا بھی بھیجا ہے۔ . . . . . قادر صاحب، آپ یہ کیا کیا کرتے ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کبھی توفیق ہونی چاہیے کہ آپ کے لیے کچھ کروں بارہا یہ خیال آیا کہ یہ بھیجوں گا وہ بھیجوں گا۔ وقت آنے پر معلوم ہوا کہ کچھ نہ کر پاؤں گا، خیر پھر دیکھا جائے گا۔ اگر صرف اچھی نیت اور نیک ارادے کا ثواب ملتا ہو تو قادر صاحب آپ یقین فرمائیں مجھ سے زیادہ شاید ہی کسی نے ثواب کمایا ہوتا۔"[2]

ان خطوط میں شوخی کی بس ایک زیریں سی لہر ملتی ہے۔ جب کہ ایک اور مکتوب میں یہ لہر واضح ہے۔ خدائے پاک پر بھی "طنز" ہے اور عورت پر بھی۔ ان دونوں پر طنز ہو اور مکتوب ہو مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام تو ایسے مکتوب کے کیا کہنے۔ مکتوب مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۰ء سے:

"ایسے معمولی INVESTMENT پر اتنا زیادہ DIVIDENT۔ ایسے کاروبار کو کیا کہا جائے۔ مثلاً۔

اللہ دے اور بندہ لے

یہ فقرہ شل کے اعتبار سے جتنا غلط استعمال کر رہا ہوں۔ امرِ واقع کے اعتبار سے اتنا ہی صحیح ہے۔ فقرہ کے تیور سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عورت نے تصنیف کیا ہے اس طرح کی ملی جلی طنز و تحسین وہی کر سکتی تھی۔ کیا معلوم ہماری طرح اللہ میاں بھی عورت کی اس طرح کی باتوں کو ENJOY ورنہ انگیز کرتے ہوں۔"[3]

رشید صاحب نے خواہ قومی ہوں کہ بین قومی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اُن کے خطوط میں یہ اظہارِ خیال کہیں کہیں طنز یہ انداز اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے موسومہ مکتوب مورخہ ۱۸ ارمئی ۱۹۶۲ء میں وطنِ عزیز میں فرقہ وارانہ فسادات پر کتنا بلیغ طنز ہے:

"عید کا چو تھا دن مبارک ہو۔ دیر سویر کا خیال نہ کیجیے گا۔ مسلمانوں کا ہو یا ہندوؤں کا، جو تہوار خیریت سے گزر جائے مسلمانوں پر اس کا شکرانہ دوسرے تہوار تک واجب رہتا ہے (اس خط میں خوشگوار ظرافت کی ایک جھلک بھی دیکھتے چلیے۔) بتایا گیا کہ آپ کئی بار تشریف لائے میں مکان پر موجود نہ تھا! آئندہ

---

[1] پروفیسر مسعود حسین "رقعاتِ رشید صدیقی"، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۷ء ص ۱۸۹
[2] "حنائے علیگڑھ" ص ۷۹
[3] "مکاتیبِ رشید احمد صدیقی" ص ۷۵۔ ص ۱۷۴

کے لیے دُعا ہے۔ غالب سے معذرت کے ساتھ ؎

آئے وہ یوں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں[۱]

اور دیکھیے نظامِ معیشت کے بارے میں ان کا اظہارِ خیال۔ مکتوب اپنے بڑے لڑکے اقبال رشید کے موسومہ مورخہ ۱۲ اپریل کا یہ اقتباس۔ کیا کاری طنز ہے:

"آج کل مہنگائی اور TAXES کی وجہ سے جان اور آبرو، دونوں کا یکجا رکھنا بڑا مشکل ہو گیا ہے"[۲]

رشید صاحب کے مکاتیب کے تاحال پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مکاتیب میں طنز و مزاح کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن رشید صاحب کے مکاتیب لکھنے کی جو رفتار رہی ہے اس کی روشنی میں اُن کے خطوط کے اور کئی مجموعوں کی توقع کی جا سکتی ہے خصوصاً اُن کے بے تکلف احباب کے موسومہ اُن کے مکاتیب کے مجموعے اگر شائع ہوں تو اُن میں بلاشبہ طنز و مزاح کی دھوپ چھاؤں کہیں زیادہ ملے گی۔ رشید صاحب نے تنقید کی ہو، مرقع نگاری کی ہو اور تہذیبی و ثقافتی مضامین لکھے ہوں اور آگے چل کر طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے کم بلکہ برائے نام کر دیئے ہوں لیکن اُن کے درون کا طنز و مزاح نگار سدا بیکتا اور مہکتا رہا اور اس نے اپنے اظہار کی گنجائش کہیں نہ کہیں نکال لی۔ مکاتیب میں بھی۔

رشید صاحب کے مکاتیب کا یہ ایسا امتیازی پہلو ہے کہ ان کے مکاتیب کی اہمیت اور قدر و قیمت روز افزوں ہوتی جائے گی۔

★ "چٹاگانگ میں ایک مسلم بورڈنگ ہاؤز میں قیام کرنا پڑا۔ جہاں سونے کے لیے تخت اور مبتلا ہونے کے لیے ہیضہ موجود تھا۔" (آشفتہ بیانی میری)

★ حکومت کے قوانین کی طرح تھرڈ کلاس میں سفر کی صعوبتیں سب کے لیے یکساں ہوتی ہیں۔ (آشفتہ بیانی میری)

★ "جھوٹ بولنے کی وہاں ضرورت پڑتی ہے جہاں آپ سچ بولنے کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں۔" (خنداں)

★ "یہ زمانہ بیروزگاری اور روشن خیالی کا ہے۔" (خنداں)

---

[۱] سلیمان اطہر جاوید "مکاتیب رشید احمد صدیقی"، نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد ۱۹۸۰ء صفحہ ۹۳ و ۱۹۲۔
[۲] "خطوط رشید احمد صدیقی" صفحہ ۵۵۔

رشید صاحب کا طنز و مزاح مشاہیر کی نظر میں

ظ انصاری

"رشید احمد صدیقی نثر میں اول درجے کے طنز نگار تھے اور وہ اس لیے تھے کہ جن قدروں، عقیدوں، اداروں اور ارادوں کو اپنا آدرش بنائے ہوئے تھے ان کی پسپائی یا رسوائی برداشت سے باہر ہو گئی۔ یہی کڑھن، یہی بے تابی اور کڑواہٹ ان کے بلیغ یا تیکھے جملوں اور مصرعوں میں سمائی ہے۔ بیان کی قدرت اور لطیف اشاروں نے اسے کہیں میٹھی چھری بنا دیا ہے۔ کہیں چرایتے کا گھونٹ۔"

یوسف ناظم

"وہ مزاحیہ شگفتہ نگار ہیں۔ رشید صاحب کے ہاں خیالات کی گہرائی اور ظرافت کے موقع محل کی شناسائی ہے۔ اور جہاں تک ادبی ظرافت اور نکتہ سنجی کا تعلق ہے۔ رشید صاحب بہت آگے ہیں۔"

مشتاق احمد یوسفی

"اردو ادب کی تاریخ میں تین اہلِ قلم ایسے گزرے ہیں جن کی ذاتی شرافت و شائستگی اور عظمت و برگزیدگی ان کی تحریر سے بھی جھلکتی ہے۔ یہ تینوں اپنے مزاج و اقدار کی بلندی، شیرینی اور شائستگی کو اپنے الفاظ میں سمو دیتے ہیں اور اپنے لہجے میں اپنے کردار کا سارا حسن لے آتے ہیں۔ یہ ہیں خواجہ الطاف حسین حالی، رشید احمد صدیقی اور فیض احمد فیض۔

پروفیسر آلِ احمد سرور

"اکبر (الہ آبادی) کے بعد اردو میں طنزیاتی روح سب سے زیادہ رشید صدیقی کے یہاں ہے۔ ان کی سمجھ بوجھ بہت اچھی ہے اور ان کا تخیل خلاق ہے۔ وہ معمولی باتوں میں مضحک پہلو بہت جلد دیکھ لیتے ہیں۔ وہ قولِ محال paradox کے ماہر ہیں اور الفاظ کے الٹ پھیر سے خوب کام لیتے ہیں۔ ان میں بیک وقت سوئفٹ کی تیزی، برنارڈ شا کی بت شکنی، چسٹرٹن کی تباعی، تینوں کے نمونے ملتے ہیں۔"

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

"انھیں (رشید احمد صدیقی) تقریباً ہر نقاد نے ہماری زبان کا بہترین طنز نگار تسلیم کیا ہے۔ ان کی فلسفیانہ نظر، خیال انگیزی، موضوعات کی وسعت، نفسیاتی لاتعلقی، ان کی انسانیت اور ہمہ گیر ترحمت

اور آسودگی کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ رشید صاحب نے اپنے مضامین میں ہندوستانی زندگی کے اہم دور اور اس کے پیچیدہ ترین مسائل کو جس وسعت اور تنوع کے ساتھ اپنی فکر و نظر کا محور بنایا ہے اس کی مثال اردو کے طنز و مزاح میں ملنی مشکل ہے۔ تہذیب، معاشرت، تعلیم، شعر و ادب، سیاست اور حکومت، اور قومی تحریکات، افراد اور اداروں پر ان کا طنز انھیں نہ صرف ایک طنز نگار بلکہ ایک تمدنی نقاد کی حیثیت دیتا ہے۔"

عزیز احمد

"رشید احمد صدیقی نے فقرہ، متضاد اور علیگڑھ کو ترتیب دے کر ایک بہت اچھے اور اچھے خاصے ذہنی معیار کا ظریفانہ رنگ تیار کیا ہے۔"

پروفیسر تنویر احمد علوی

"رشید صاحب کے مزاح سے لطف اندوز ہونے اور اس کی روح میں پیر جانے کے لیے بھی ایک شائستہ و باسلیقہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا انداز گہرے طور پر علمی ہے۔ تاریخ، شعر و ادب علوم و فنون اور سیاست و سماج پر رشید صاحب کی نظر بڑی گہری ہے۔ اور گیرائی کے ساتھ بڑی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا طنز اور ان کی ظرافت جو اپنے پیرایہ اور پیرہن میں اس لطیف اشاریت اور رمزیت کو لیے ہوئے ہوتی ہے اس میں ایک بڑی بھرپور کیفیت ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر سید عابد حسین

"رشید احمد صدیقی ہمارے طنز نگاروں کی محفل میں صدر انجمن مانے جاتے ہیں۔ ان کے طنز میں غصے کی گھرکی یا نفرت و حقارت کے زہر خند کی جگہ ایک مزے دار مسکراہٹ ہوتی ہے جس میں ظرافت کے نمک اور نصیحت کی تلخی کے ساتھ محبت کی مٹھاس بھی گھلی ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان سادگی اور ظرافت کا پیچیدہ مجموعہ ہے۔ اکثر بات کو باتیں پیٹتے اور الجھاتے چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایک صاف اور دو ٹوک چبھتے ہوئے فقرے میں بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔"

پروفیسر خلیق احمد نظامی

رشید صاحب نے جب مزاح نگاری کی ابتدا کی تو ان کی تحریریں پڑھنے والے ہنستے اور وہ خود زیر لب مسکراتے تھے لیکن آخری زمانے میں ان کے "خندہ زیر لب" کی جگہ "چشم پرنم" نے لے لی تھی۔ وہ مزاح نگار سے زیادہ اخلاق و انسانیت کے مبلغ بن گئے تھے۔ ان کے کمیت "کیف" سے ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا تک کا سفر انھوں نے سن و سال کے سہارے نہیں بلکہ احساس کی ان بیتابیوں کے ذریعے کیا تھا جو ان کی روح کی گہرائیوں تک اتر چکی تھیں۔ زمانے کی تیزی سے بدلتی قدروں اور حالات گرد و پیش کی ناسازگاری نے ان میں "اجنبیت" کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ علی گڑھ کی یادِ ماضی کے سہارے گزارا تھا۔ اور وہ بھی کبھی "سخن ہائے گفتنی"

سے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔"

مجروح سلطان پوری

"شیخ سعدی کے بعد (اردو میں) غالب اور ان کے بعد رشید صاحب ایسے صاحب طرز ہیں جن کے کتنے ہی جملے مصرعوں کی طرح یوں مشہور ہیں کہ لوگ انھیں تحریر و تقریر میں اپنی تائید کے طور پر دہراتے ہیں۔ طنز و مزاح کے ذریعہ زندگی کے لیے نقاط نظر اور صحیفہ اخلاق مرتب کرنے کا ہنر جنھیں آتا ہے ان ناموں میں رشید صاحب کا نام مشرقی زبانوں کی حد تک شاید پہلا ہو۔" (خبرنامہ اتر پردیش اردو اکادمی جنوری ۸۲ء)

مالک رام

"رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کی دو خصوصیات اہم اور قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ ان کی ظرافت تبسم زیر لب کی ظرافت ہے نہ وہ خود کھلکھلا کر ہنستے ہیں (قہقہہ مارنا تو بہت دور کی بات ہے) نہ وہ کسی کو کھلکھلا کر ہنسنے کی دعوت دیتے ہیں۔ سخت گرمی کے موسم میں اگر بالکل ہلکی ہلکی سی ہوا چلنے لگے تو آپ کا رواں رواں فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت رشید احمد صدیقی کے مزاح کی ہے۔"

(تحریر دہلی۔ دسمبر ۷۵ ص۱)

نیاز فتح پوری

"رشید صاحب اردو کے تنہا مزاح نگار ہیں جو فکر انگیزی کو مزاح کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ جو کہ اور مزاح نگاروں میں بنیادی فرق یہی ہے۔" (تحریر دہلی، دسمبر ۷۵)

ڈاکٹر محمد حسن

"رشید صاحب کے مزاح کے موضوعات متنوع اور رنگا رنگ ہیں لیکن ان کے اسلوب کی گہری ادبیت ان کا منفرد رنگ ہے۔ اسی لیے رشید صاحب کا مزاح پطرس کی طرح نہ زود ہضم ہے نہ ہلکا پھلکا۔ رشید صاحب کے مزاحیہ اسلوب میں کلاسیکی روایت کا رچاؤ اور رومانیت کی رنگینی اور ادب کی فکر خیزی، خیال انگیزی اور ہزار شیوگی موجود ہے۔" (تحریر دہلی دسمبر ۷۵ ص۹۳)

اسلوب احمد انصاری

"اردو ادب میں طنز و ظرافت کا نام لیجیے تو وزن و وقار، گہرائی اور معنویت، نفاست اور پرکاری کے اعتبار سے سب سے پہلے ہماری نظر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرف جاتی ہے۔"

(تحریر دہلی دسمبر ۷۵ ص۱۱۱)

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

"رشید صاحب ایک اعلیٰ درجے کے صاحب طرز ادیب تھے اور بالخصوص طنز و مزاح کے میدان میں

ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اردو میں طنز و ظرافت پر ان کی کتابیں کلاسیکی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں گزشتہ ساٹھ سال کے علیگڑھ اور ہندوستان کی علمی سیاسی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی ملتی ہے "۔
(رشید احمد صدیقی آثار و اقدار)

پروفیسر وحید اختر

"ان (رشید صاحب) کی ظرافت اور طنز دونوں کا محرک زندگی کی طرح گمبھیر اور اسلام کے تہذیبی آدرش کی طرح ارفع ہے۔ ان کے یہاں طنز ابتدائی مضامین میں نہ ہونے کے برابر ہے اور بعد کے مضامین میں کہیں کہیں تھوڑی سی نشتریت لیے ہوئے ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ان کی ظرافت میں علی گڑھ کی فقرہ بازی اور ناگواریوں کو مضحک و گوارا بنانے والا رویہ ملتا ہے۔ کچھ انھوں نے علی گڑھ کی پرانی زندہ دلی سے فیض اٹھایا کچھ بعد کے علی گڑھ نے ان کے انداز کو اپنایا۔ اس طرح ان کا اسلوب ظرافت اور فقرہ تراشی علی گڑھ کے کردار کا اظہار بن گئی "۔
(رشید احمد صدیقی آثار و اقدار)

ڈاکٹر سید عبد اللہ

"وہ رعایت لفظی سے کام لیتے ہیں۔ واقعات سے زیادہ لفظی ہیر پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور اس لفظی ہیر پھیر کے ساتھ ان کے یہاں ایک خاص ادیبانہ اور فاضلانہ قسم کا انداز بیان بھی ہے جو ابوالکلام کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے رشید احمد صدیقی کی مزاحیہ تصویروں میں سے بہت کم ایسی ہوتی ہیں جن کو مکمل دور کی بھرپور تصویروں کا درجہ دے سکیں۔ وہ تصویروں کے خاکے اور خاکے کی لکیروں سے تصویریں بناتے ہیں "۔
(رشید احمد صدیقی آثار و اقدار)

مجنوں گورکھپوری

"سنجیدگی اور مزاح کو باہم گھلا ملا کر ایک مزاح بنا دینا رشید احمد صدیقی کا ایک خاص فن ہے "۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی

"رشیدیات سے لطف اٹھانے کے لیے خود بھی اچھا خاصا پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں "۔

(انشائے ماجد (جلد اول) ص ۲۸۵)

رشیدالدین
(حیدرآباد)

رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری

انگریزی زبان میں ایک لفظ ہے [illegible] جس کا اردو مترادف ہے "ذہین" ہر چند اپنے کثرتِ استعمال اور ہر کس و ناکس پر اس کے اطلاق کی وجہ سے اس لفظ یا اصطلاح نے اپنی اہمیت کھو دی ہے۔ لیکن اس دور میں رشید احمد صدیقی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس پر اس کا اطلاق نہ کرنا بڑی زیادتی ہوگی۔ اس سے رشید صاحب کی توقیر نہیں ہوگی۔ البتہ اس لفظ یا اصطلاح کا برمحل استعمال ضرور ہوگا۔

رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر ایک مزاح نگار تھے۔ اور ظرافت کے بغیر ذہانت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ظرافت ہمیشہ ذہانت کی انگلی پکڑ کے چلتی ہے اور جہاں یہ انگلی چھوٹی مزاح نگار پھکڑپن یا پھر لچرپن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہلکا پھلکا اور شگفتہ مزاح لکھنے کے لیے لکھنے والے کا زندہ و تابندہ اور تر و تازہ ہونا ضروری ہے اور رشید صاحب کی شخصیت میں یہ صفات موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ واقعات سے زیادہ اپنے اسلوب اور زبان و بیان سے مزاح ... پیدا کرتے ہیں اور اپنی تحریر کو دلکش اور متاثر کن بناتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی صرف ایک مزاح نگار ہی نہیں تھے بلکہ ایک تنقید نگار اور خاکہ نگار بھی تھے جہاں "مضامین رشید" اور "خنداں" میں وہ ہمیں ایک مزاح نگار کے طور پر ملتے ہیں وہیں "آشفتہ بیانی میری" پڑھتے ہوئے ہماری ملاقات ایک انشائیہ پرداز سے ہوتی ہے۔ اور جب ان کی کتاب "جدید غزل" یا "طنزیات و مضحکات" مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ایک نقاد کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں اور "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسانِ رفتہ" ان سے ہمارا سامنا ایک خاکہ نگار کے طور پر کراتے ہیں۔ اس طرح رشید احمد صدیقی اپنی ذات سے ایک انجمن ہو جاتے ہیں۔

رشید صاحب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ آپ ان کی کوئی تحریر اٹھا لیجیے۔ اور کہیں سے پڑھ لیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ رشید صاحب بول رہے ہیں۔ کوئی مزاحیہ مضمون ہو یا خاکہ، انشائیہ ہو یا سنجیدہ مضمون، بیانیہ ہو یا تذکرہ ان کا طرز یکساں رہتا ہے۔ چنانچہ غزل کے تعلق سے وہ اپنے مقالہ یوں شروع کرتے ہیں:

غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے۔ شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے۔"

اردو غزل کی عمر خاصی طویل ہے اور صدیوں کا احاطہ کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ادیبوں اور شاعروں کی تعداد آج بھی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اس طرح رشید احمد صدیقی کا یہ ایک بہت بڑا وصف ہے۔

خاکہ نگاری یا مرقع نگاری بڑا مشکل فن ہے۔ سوانح نگاری کے لیے عموماً بصارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مرقع نگاری کے لیے بصیرت بھی شرط ہے۔ اس میں جز میں کل کا تماشہ دکھانا پڑتا ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے جس دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہر شخص کے پاس کہاں ہوسکتا ہے۔ باریک بینی حسن شناسی اور تہذیبی و سماجی زندگی کا گہرا مطالعہ اور مردم شناسی، مرقع نگاری کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری یا مرقع نگاری کے میدان میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام سب سے زیادہ روشن ہے۔ انھوں نے "نذیر احمد کی کہانی ۔ کچھ ان کی کچھ میری زبانی" میں اپنے استاد اور اردو کے مایہ ناز نثر نگار نذیر احمد کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس فن میں نہ صرف یکتائے زمانہ ہے بلکہ اس سے ان کے فن کے اصولوں کا تعین بھی ہوتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے علاوہ چراغ حسن حسرت، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی اور محمد طفیل (مدیر ماہنامہ "نقوش" لاہور) خاکہ نگاری میں شہرت رکھتے ہیں۔ حال ہی میں حیدرآباد سے دو اور ناموں کا اس میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک عوض سعید اور دوسرے مجتبیٰ حسین جن کے خاکوں کی تصانیف بھی موجود ہیں۔ خاکہ نگاری سے راقم الحروف کو بھی دلچسپی رہی ہے اور ایک تصنیف "ذکر رفتگاں" اس ضمن میں موجود ہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی واضح شکل بیسویں صدی کے پہلے ربع میں ملتی ہے۔ اس سے قبل اردو میں سوانح نگاری کی داغ بیل پڑ چکی تھی مگر شخصیت نگاری مفقود تھی۔ اردو میں قدیم شاعروں کے جو تذکرے ملتے ہیں انھیں ہم خاکہ نگاری نہیں کہہ سکتے۔ وہ یا تو تنقید کے دائرے میں آتے ہیں یا پھر سوانح کے۔ اور وہ بھی جانب داری اور شخصیت پرستی کی کمزوریوں کے ساتھ۔ چنانچہ قدیم شعرا کے کسی تذکرہ میں آپ کو نظیر اکبرآبادی کا نام نہیں ملتا۔ کیوں کہ ان کی عوامی شاعری کو اس زمانے میں شاعری کے زمرہ میں شامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" جیسی اہم تصنیف بھی ان کمزوریوں سے پاک نہیں ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے استاد ذوق کو نہایت بلند درجہ دیا ہے۔ اور ان کے ہم عصر غالب کو ثانوی درجہ دیا ہے۔

جہاں تک رشید احمد صدیقی کا تعلق ہے وہ ایک مزاح نگار اور انشا پرداز کی طرح خاکہ نگاری کے فن میں بھی ماہر نظر آتے ہیں۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے "گنج ہائے گرانمایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے مضامین کا مجموعہ "خنداں" کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بھی بعض خاکے موجود ہیں۔ لیکن وہ کسی حقیقی شخصیت کے

نہیں ہیں بلکہ فرضی خاکے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ" میں پندرہ اور "ہم نفساں رفتہ" میں سات خاکے شامل ہیں جبکہ "خنداں" میں کوئی ایک درجن خیالی خاکے موجود ہیں۔ اس کتاب کا نام "خنداں" ایک خاکے کے نام پر ہی ہے۔ میں جو ایک شاعر کا خاکہ ہے جس کا تخلص خنداں ہے۔

ان تینوں میں خاکہ نگاری کی حیثیت سے "گنج ہائے گراں مایہ" کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔ اس میں جو رعنائی، چاشنی، شگفتگی اور تازگی ہے وہ دیگر دو کتابوں کے خاکوں میں مفقود ہے "گنج ہائے گراں مایہ" نہ صرف اس میں موجود شخصیتوں بلکہ رشید صاحب کے بے ساختہ اندازِ بیان اور طرزِ نگارش کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

اور اس کا نام جتنا متاثر کن ہے اس کے خاکے بھی اتنے ہی دل کش ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ" میں جن شخصیتوں پر مختصر خاکے لکھے گئے ہیں ان میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد شبیت فاروقی، اصغر گونڈوی، محمد ایوب انصاری، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا احسن مارہروی، سید محفوظ علی بدایونی، سید نصیر الدین علوی، سید سجاد حیدر یلدرم، سر شاہ سلیمان، شیخ حسن عبداللہ، جگر مرادآبادی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق شامل ہیں۔ "ہم نفسانِ رفتہ" میں جن پر خاکے لکھے گئے ہیں۔ ان میں شفیق الرحمٰن قدوائی، مولانا سلیمان، افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق، نواب محمد اسمٰعیل خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر احمد شاہ بخاری اور کندن (علی گڑھ یونیورسٹی کا چپراسی جس کا کام گھنٹی بجانا تھا) شامل ہیں۔ "خنداں" میں جو خاکے ہیں ان میں خنداں، شیخ پیرو، ایڈیٹر، کنوینر، دیہاتی ڈاکٹر، مقرر، لیڈر، بالو، ہیرا، بجرو اور ملاح شامل ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے دوستوں، شناساؤں اور علمی و ادبی شخصیتوں کے جو خاکے لکھے ہیں ان میں قربت کی آنچ علانیہ محسوس ہوتی ہے۔ ان سے شخصی روابط اور ربط ضبط کی وجہ سے رشید صاحب ان کے شب و روز سے آگاہ رہے ہیں۔ چنانچہ بہت سی نامور شخصیتوں کے ایسے چھوٹے موٹے واقعات (مگر جو اہم ہیں) جو عام طور پر دستیاب نہیں ہیں اور جنھیں کوئی یاد رکھنے اور قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ انھیں رشید صاحب نے کمال خوبی سے ضبط تحریر میں لایا ہے۔ مشہور ہے کہ انسان دو چیزوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک تو وہ کتابیں جنھیں وہ پڑھتا ہے اور دوسرے وہ دوست اور ساتھی جن کے ساتھ وہ رہتا ہے۔ اس طرح ان شخصیتوں کے مطالعہ کے دوران اس شخص کا خاکہ بھی خود بخود ہمارے ذہن میں تیار ہو جاتا ہے جس نے ان شخصیتوں کی قلمی تصویریں کھینچی ہیں۔

اس طرح رشید احمد صدیقی اپنے خاکوں کے ذریعے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے روزمرہ کے معمولات ان کی پسند ناپسند، زندگی کے بارے میں ان کے نظریات، سماج کے بارے ان کے خیالات اور ان کی شخصیت کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں اور دیگر چیزیں . . . جن کا صحیح اور طرح سے ہمیں علم نہیں ہو سکتا تھا۔ رشید صاحب خود ان خاکوں میں موجود ہیں۔ آپ ان تمام خاکوں کو پڑھ جائیے ان کا خاکہ خود بخود آپ کے ذہن میں آ جائے گا

ان خاکوں میں جہاں آپ کو مشاہیر ادب کی جھلکیاں ملتی ہیں اور رشید صاحب کی انشا پردازی کا کمال نظر آتا ہے وہیں بہت سی بڑی کام کی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خاکے میں یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جو قومیں کسی بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑی ہوتی ہیں وہ تھوڑی سی کوشش سے جلد رہائی پا جاتی ہیں لیکن جو اپنے ہی بنائے اور اختیار کیے ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوں وہ بڑی مدت میں بعد ہزار خرابی بسیار ان سے نجات پاتے ہیں۔"

عام طور پر لوگ خاکہ نگاری میں کسی شخص کا صرف ایک ہی پہلو سامنے رکھتے ہیں جو عام طور پر اچھا ہوتا ہے بعض لوگ تضحیک کے لیے صرف برے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سعادت حسن منٹو مصنف "گنجے فرشتے" خاصے بدنام ہیں۔ لیکن رشید صاحب کے خاکے یا مرقعے اس عیب سے پاک ہیں۔ وہ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس انداز سے کہ صاحب خاکہ کا کردار مسخ بھی نہ ہونے پائے چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کے خاکے میں لکھتے ہیں :

"محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔"

اسی طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خاکہ میں لکھتے ہیں :

"مولوی صاحب میں بے شمار خوبیوں کے علاوہ کچھ کمزوریاں بھی تھیں جو اس مزاج اور ماحول کا خلاصہ تھا جو مولوی صاحب کا تھا۔"

رشید صاحب ایک صاحب طرز ادیب اور بے مثال انشا پرداز تھے۔ ان کی کوئی بھی تحریر ان کا اپنا مخصوص رنگ اور طرز بیان رکھتی ہے۔ ان کے خاکوں میں بھی یہ خصوصیت آپ کو ملے گی۔ چنانچہ مولوی عبدالحق کے خاکے کی یہ عبارت ملاحظہ ہو :

"کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سر نہ ہوئی۔ اس کے لیے دیوانوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اردو کی وادیٔ پرخار اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کے لیے ہمیشہ کسی آبلہ پا کی منتظر رہے گی اور مولوی صاحب جیسا بے زنہار آبلہ پا آج تک اس وادی سے نہیں گزرا۔"

رشید صاحب نے ان خاکوں میں جہاں متعلقہ شخصیتوں کی خامیوں کی جانب اشارہ کیا ہے وہیں بعض اوقات اپنی خامیاں بھی نہیں چھپائیں اور ان کا بلا کم و کاست اظہار کر دیا۔ چنانچہ یہ بات آپ کو خاص طور پر اصغر گونڈوی کے خاکے میں ملتی ہے۔ اصغر صاحب علیل بلکہ فریش تھے اور رشید صاحب ان سے ملنے الہ آباد پہنچے۔ شام میں وہ علیگڑھ واپس ہونے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ اصغر صاحب انہیں کسی طرح چھوڑنے تیار نہ تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ کل صبح چلے جائیں۔ لیکن رشید صاحب حسب عادت ضد کر کے نکل گئے۔ اتفاق سے اسی رات اصغر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بارے میں رشید صاحب لکھتے ہیں :

"میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھ جاتی ہے کہ شاید اپنے ہم نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔"

رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری میں واقعات کم اور انشا پردازی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ واقعات سے کم مضمون بیان سے زیادہ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہی چیز آپ کو ان کے خاکوں میں بھی ملے گی۔ ان کے خاکے متعلقہ شخصیت کے متعلق واقعات کا طومار ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں منفرد انداز میں شخصیتوں کا تجزیہ ملتا ہے۔ اس کی بہترین مثال محمد علی جوہر پر لکھا ہوا ان کا خاکہ ہے:

"ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا شکار خود منتخب کرتی ہے۔ محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ شخصیت بنا دیا انعم وارجمند۔"

آپ سارا خاکہ پڑھ جائیے۔ آپ کو کہیں کوئی واقعہ نہیں ملے گا۔ صرف یہی انداز ہے۔ حتیٰ کہ اختتام آجاتا ہے، "ملک وملت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح وشکست تو اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ فتح وشکست ہوتی رہے لیکن جنگ آزما کہاں جو شہادت کس کو کہ نصیب ہوگی۔ ایسا حسینؓ کہاں جس کی یزید کو تلاش ہو۔ آئیے جہاں فاتح مقدس نے سر جھکایا تھا وہاں محمد علی کی معراج منائیں۔"

غرض رشید احمد صدیقی کے خاکے بڑے دل چسپ اور پر اثر نہیں اور جن کرداروں کے خاکے انھوں نے کھینچے ہیں وہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے سامنے چل پھر رہے ہوں۔ لیکن جہاں ان خاکوں میں اتنی ساری خوبیاں ہیں وہیں ایک خامی بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ ہے رشید صاحب کا "میں"۔ ان کے ہر خاکے میں ان کی شخصیت قاری کا علاقی کا پیچھا کرتی ہے اور بعض جگہ غیر ضروری طور پر بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اچھے خاکے کی خوبی یہ ہے کہ مصنف پیچھے رہے اور شخصیت سامنے۔ رشید صاحب کے پاس اکثر صاحب خاکہ اور خاکہ نگار دونوں پا بہ پا ہوتے ہیں اور بعض دفعہ تو ان کی شخصیت صاحب خاکہ سے بھی آگے نظر آتی ہے۔

اس ایک خامی سے قطع نظر ان کے خاکے ہر طرح فن خاکہ نگاری پر پورے اترتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سب سے اچھی کتاب خود انسان ہے۔ اگر آپ اسے پڑھ سکیں۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے خاکوں میں ان انسانوں کو پڑھا ہے اور پڑھ کر ادب میں ڈھالا ہے، کاغذ پہ اتارا ہے، ان کا قلمی مرقع تیار کیا ہے۔

ادب اور اس کے مسائل

رشید صاحب سے چند باتیں!

جولائی ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ ایم۔ اے میں کامیابی کے بعد میں نے پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ کی درخواست دی۔ داخلہ مل گیا۔ میری تحقیق کا موضوع طے پایا "رشید احمد صدیقی، شخصیت اور فن" اپنے تحقیقی کام کے نگراں استاد محترم پروفیسر مسعود حسین صاحب کی ہدایت پر رشید صاحب اور دیگر اصحاب سے ملاقاتوں اور قدیم جرائد وغیرہ کے مطالعہ کے لیے مجھ کو دہلی اور علی گڑھ جانا تھا۔ رشید صاحب سے نیاز حاصل کرنے سے قبل میں نے مناسب سمجھا کہ جہاں تک ممکن ہو اُن کے خیالات سے آگہی حاصل کرلوں۔ چنانچہ میں نے یہ سوالنامہ روانہ کیا۔ ہر چند کہ رشید صاحب کی شخصیت اور فن کی تفہیم اس سے کما حقہٗ ممکن نہیں تاہم اُن کے میلانات و افکار کا تھوڑا بہت اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ان کے لطیف مزاج کا بھی۔ و نیز ان چند سطور میں بھی رشید صاحب کا دلنواز اور دلدار اسلوب جھلکتا ہے جس کے باعث وہ اردو کے ایک ممتاز انشاء پرداز قرار دیے جاتے ہیں۔

میں اپنی اس گفتگو میں "شگوفہ" کے قارئین کو بھی شریک کرتا ہوں۔

(سُلیمان اطہر جاوید)

سوال: آپ نے لکھنا کیوں شروع کیا؟

جواب: بالکل نہیں معلوم کہ ایسا کرنا کیوں شروع کیا۔

س: آپ کو لکھنے پر کونسی کیفیت مائل کرتی ہے؟

ج: کوئی خاص کیفیت نہیں مائل کرتی۔ جب ضرورت سمجھتا ہوں یا عزیزوں کا اصرار مخل عافیت ہونے لگتا ہے تو لکھ لیتا ہوں۔ میں نہ شاعر نہ صوفی نہ عطائی۔ اس لیے مجھ پر نہ کوئی حال طاری ہوتا ہے نہ طاری یا ظاہر کرنے کی کبھی ضرورت سمجھی!

س: آپ اپنے نظریات اور احساسات کے اظہار کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ بھی اختیار کرسکتے تھے مثلاً شاعری؟

ج: نظریات اور احساسات کے لیے ذریعہ وہ "تلاش" کرے جو کوئی اپنا مشن رکھتا ہو اور اپنے کو خدا یا قوم، ورنہ خود اپنی طرف سے "مبعوث" یا "مامور" سمجھتا ہو۔ میں اسی طرح کی تمام حرکات سے محروم ہوں خاص طور پر شاعری کے فن سے۔

س : کس ادبی تحریک نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیوں ؟

ج : میرے زمانے میں ایسی کوئی ادبی تحریک نہیں تھی جس سے واقف یا متاثر ہوتا ممکن ہے اس قسم کی کوئی تحریک رہی ہو لیکن میرے علم میں نہیں آئی۔

س : "اسلامی ادب" "قومی ادب" اور "ترقی پسند ادب" ـــــــ ان اصطلاحوں کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے ؟

ج : اسلامی ادب، قومی ادب، ترقی پسند ادب ان کے علاوہ اور جو ادب ہوتے ہیں سب اپنی اپنی جگہ ہر ایک حیثیت اور مقام رکھتے ہیں البتہ ان کے علمبردار جو ہیں وہ ادب اور زندگی دونوں کے صالح تقاضوں، شرافت اور سلیقے کو مدِ نظر رکھ کر کہیں کوئی ادب ہو اس میں ادبیت کا ہونا ضروری ہے۔
کسی تخلیق کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ کس سطح سے پیش کی گئی ہے شعر و ادب کا مستند معیار عوام نہیں خواص مقرر کرتے ہیں۔ شعر و ادب میں عوام و خواص کا امتیاز دولت و اقتدار سے نہیں کرتے انسانی خصائل اور شاعرانہ و ادیبانہ قابلیت سے کرتے ہیں "عوام پسند" ادب یا شاعری نہ عوام کے ساتھ کوئی اچھا سلوک ہے نہ شعر و ادب کے ساتھ یہ نعرہ خود چاہے جتنا مفید مطلب ہو!

س : آپ کی نظر میں ایک ادیب کے لیے کونسی خصوصیتوں کا حامل ہونا ضروری ہے ؟

ج : کہیں عرض کر چکا ہوں کہ اچھے شاعر اور ادیب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدمی بھی اچھا ہو۔ اگر ادب میں شخصیت کا کوئی بھی شائبہ ہوتا ہے تو اس اصول کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

س : آیا ادب کو سیاست کا ساتھ دینا چاہیئے اگر دینا چاہیئے تو کس حد تک ؟

ج : ادب کو سیاست سے پیوند دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ بشرطیکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے آلۂ کار نہ بنائے جائیں۔ اپنی قوم اور ملک کی اصلاح و فلاح میں ادیب کو اپنی خدمات سے دریغ نہ کرنا چاہیئے اس لیے کہ وہ ملک اور قوم سے باہر نہیں ہو سکتا۔ سیاست اور ادب میں کبھی اختلاف ہو تو کوئی تعجب نہیں اس لیے کہ دونوں کے مقاصد ایک لیکن وسائل مختلف ہو سکتے ہیں دونوں کے رشتے آپس میں اس طرح ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں کہ ان کو آسانی سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی توضیح آ... حد تک نمبر ... ملے گی۔ یہاں بعض اقدار کی بحث آجاتی ہے۔ میں بذاتِ خود بعض کو اقدارِ مطلق سمجھتا ہوں اس لیے سیاست اور ادب دونوں کو ان کا تابع رکھنے کی تائید کروں گا۔ دوسرے ایسا نہیں سمجھتے ان سے جھگڑنا بھی نہیں چاہتا۔

س : کسی نظامِ حکومت میں ادیب کا مقام ؟

ج : اس کا جواب ماقبل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔
یہاں بحث اس کی آجاتی ہے کہ ادیب کس مرتبے کا ہے اور نظامِ حکومت کی نوعیت کیا۔
اور یہ بحث اتنی آسان اور مختصر نہیں ہے کہ دو چار سطروں میں آجائے۔

س : ادب اور زندگی میں کیا تعلق ہے ؟

ج : ادب اور زندگی میں جو تعلق ہے اس کو اوپر کے بیانات سے کسی نہ کسی حد تک اخذ کیا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی مثال کچھ اس طرح کی ہے۔ اسلام میں شوہر اور بیوی کے تعلقات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا لباس ہیں جس کا مفہوم ذاتی طور پر میں سمجھا ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کو آرام پہنچائیں حفاظت کریں۔ عیب کو چھپائیں اور زیبائی میں اضافہ کریں۔

س : طنز نگار سماج کی اصلاح میں کیا حصہ ادا کرسکتا ہے؟

ج : اس کا تمام تر مدار اس پر ہے کہ طنز نگار خود کیسا ہے۔ اس میں کینہ و کمینہ پن ہے یا عظمت ہے اور وسعتِ نظر ہے۔ سماج کی اصلاح میں ہمیشہ بڑائی سے کام لینا پڑتا ہے۔ کینگی و کمینگی سے سماج میں اور زیادہ خلل راہ پاتا ہے طنز بڑا خطرناک آلہ ہے۔ اس لیے اس کا استعمال ایسے شخص کو کرنا چاہیئے جو مخلص ہو اور فن کے رموز و آداب سے واقف ہو۔

س : علیگڑھ کو آپ کی تحریروں کا "مرکزی خیال" کہا جاتا ہے۔ آخر اس کی بنیادی وجہ ــــ؟

ج : اس کا جواب مختلف مواقع پر متعدد مضامین میں دے چکا ہوں۔ اگر وہ مضامین دستیاب نہ ہوں تو اس کا تھوڑا بہت جواب "آشفتہ بیانی میری" میں مل جائے گا۔

س : بعض لوگ علیگڑھ کو آپ کی "کمزوری" قرار دیتے ہیں۔ کیا ادیب کو اپنا دائرہ اتنا چھوٹا کرلینا چاہیئے؟

ج : اس کا جواب اصغر کے اس شعر سے دیا جاسکتا ہے۔

یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا میخانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

"چغلی کھانا غذا بھی ہے اور ورزش بھی۔ آج کل حال ایسا ہو رہا ہے کہ غذا ناپید ہو رہی ہے اور ورزش بڑھتی جارہی ہے۔ اس لیے اس چیز کی مانگ بڑھ گئی ہے جو غذا اور ورزش دونوں سے نجات دلا سکے۔ چغلی ایسی غذا ہے جس کے بغیر ہماری سوسائٹی کا دسترخوان پھیکا اور ویران رہتا ہے۔ جس طرح کھانے کا راز وٹامن میں ہے۔ سوسائٹی کی آبرو چغلی سے ہے۔"

(چغلی کھانا)

طنز و مزاح

رشید صاحب کی نظر میں

○ "طنز و ظرافت کی مثال سفلی عمل کی سی ہے۔ اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

● ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں ظرافت کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ظرافت، طنز سے مشکل فن ہے۔ ظرافت کے لیے خوشدلی اور مرحمت درکار ہوتی ہے۔ طنز میں جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

(علیگڑھ میگزین مارچ ۱۹۴۴ء، ص ۲۴)

○ ہنسنا ہنسانا بھی ایک عبادت ہے اور اس کا اجر اتنا ہی ہے جتنا کسی عبادت کا ہو سکتا ہے۔

● طنز و ظرافت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ محض کتابیں پڑھنے، دوسروں کی نقل کرنے، بے وقوف بننے، بھدے ملکے فقرے کہنے، بپھرنے اور پینترے بدلنے سے نہیں آتی۔

○ ظرافت نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے گزرے، مجبور ہو کر نہیں خوشی، فراخدلی، حوصلہ اور خلوص کے ساتھ۔ ظرافت کی کوئی کان نہیں ہوتی جہاں یہ مسلسل مدتوں ملتی رہے۔ یہ جواہر پارے ہر مقام پر ہوا اور حرارت کی مانند فضا میں سرایت کئے ہوئے ملیں گے۔

○ طنز و ظرافت کسی کی آبروریزی یا اپنی نالائقی کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ معاشرہ کی اصلاح و ارتقاء کے لیے ہوتی ہے۔

(عزیزان علیگڑھ ص ۳)

● طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔ یہی کچی بارک اور ڈائننگ ہال علیگڑھ سے باہر کہیں نصیب ہوئے ہوتے تو کچھ تعجب نہیں طبیعت یا تو طنز و ظرافت کی طرف مائل ہی نہ ہوتی یا پھر اس کا وہ انداز میسر نہ آتا جو یہاں آیا اس لیے کہ ان کے محرکات ہی سے جن کا بہت کچھ دارومدار ماحول اور مطالعہ پر ہوتا ہے اُن کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ علیگڑھ اور متعلقہ ادارے رفتہ جن میں ڈائننگ ہال بھی ہے ایک زندہ قوم کی امیدوں اور عزیمتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ان اداروں میں اگر کوئی خلل راہ پائے گا تو وہ نوجوانوں میں بیزاری یا بد اطواری پیدا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کی طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اصلاح کرانے میں معین ہوگا۔ جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے اسی حد تک اس کی بڑائی دوسری قوموں میں مسلم ہوتی ہے۔

(آشفتہ بیانی میری ص ۱۳۵)

رشید احمد صدیقی

طنز و ظرافت کی رفتار

"کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا!" بچپن میں یہ مصرعہ بزرگوں کی زبان سے اکثر سنا لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مطلب کیا ہے۔ خود بزرگ ہوا تو یہ مصرعہ اپنی شہرت بہت کچھ زائل کر چکا تھا لیکن بات سمجھ میں آگئی اور آتی چلی گئی۔ طنز و ظرافت کا یہی حال ہے۔ ایک محترم دوست نے فرمائش کی کہ ریڈیو کے لیے کچھ طنز یہ سنا دیجئے۔ عرض کیا "جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا۔ ایسی "حالت میں" کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا اور دوست موصوف کی وجہ سے "بن کہے رہا نہیں جاتا"!

طنز و ظرافت کچھ تو "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" قسم کی چیز ہے۔ اس کے بعد بڑے ریاض کا فن ہے جس کا لحاظ بہت کم کیا جاتا ہے۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ خدائے بخشندہ کی بخشش پھولتی پھلتی نہیں اگر اس پر ریاض نہ کیا جائے۔ طنز و ظرافت میں کرپشن جیسی کشش ہے۔ دانش مندوں نے ہدایت کی ہے کہ زمانہ خراب ہو تو ایسی باتوں کے اختیار کرنے میں بڑی احتیاط برتنی چاہیے جس میں غیر معمولی کشش ہو۔ آج کل کا زمانہ عیاری اور بے اعتباری کا ہے۔ اس میں طنز و ظرافت سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے لیکن دشواری یہی ہے کہ قانون اور تعاون کا کاروبار کرنے والوں میں sense of humour اور اس پر اسپورٹس مین شپ sportsmanship جس کا لوگ کا پہلو ناتر جمہ ذوق و ظرف کی شگفتگی و کشادگی کرسکتے ہیں وہ ذرا کم ملتی ہے۔ طنز و ظرافت کے بستر میں نیچ اونچ ہو جائے تو فن کار سوختنی رہ جاتا ہے نہ فروختنی! یہ وہ پل صراط ہے جہاں ذرا قدم ڈگمگائے اور کہیں کے نہ رہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ ہر جگہ ہر حال میں رہ لیتے ہیں۔ یہ فن کچھ اس طرح کا ہے کہ دریا کی گہرائی میں تختہ بندی کی فرمائش کرتے ہیں اور دامن تر نہ کرنے کی فہمائش۔

آج کل جانوروں کو جنگل یا جنگلوں میں اس طرح اور اس لیے رکھتے ہیں کہ نہ وہ کسی کا شکار کر سکیں نہ ان کا کوئی شکار کر سکے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی نمائش بھی ہوتی رہے اور نسل بھی منقطع نہ ہونے پائے۔ "جانوروں کو بچاؤ" کی مبارک تحریک اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے دوسری تیسری کڑی ممکن ہے اور یہ بھی "انسان کو بچاؤ" "یا انسان سے بچو" وغیرہ۔

رشید،

ایسے موقعے بھی آتے رہتے ہیں جب خطرناک اور عجیب الخلقت جانوروں کی طرح طنز ظرافت والوں کو بھی نگرانی میں رکھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان کا کوئی شکار کرے تو مضائقہ نہیں یہ کسی کا شکار نہ کرسکیں ان کی قطع نسل یا افزائش نسل کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ اپنی نسل کی طرف سے وہ خود مطمئن معلوم ہوتے ہیں اس لیے کہ اس میں برابر ترقی ہے۔ تنزل بالکل نہیں۔ البتہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی نسل تعداد کے اعتبار سے بڑھ رہی ہے یا قدر و قیمت کی رو سے۔ کبھی جنگ کا خدشہ ہوتا ہے یا سرکاری آمدنی اور خرچ کی چول نہیں بیٹھتی تو بعض کاروبار یا صنعتوں کی مانند طنز و ظرافت کو بھی پرائیوٹ سیکٹر سے پبلک سیکٹر میں منتقل کردیتے ہیں لیکن گھریلو صنعت کی مانند طنز و ظرافت پرائیوٹ سیکٹر میں زیادہ پنپتی ہے۔ پبلک سیکٹر میں یا جہاں کہیں اس کا رویہ جبر و صبر کے ہونے لگا اور اس پر بے جا نیز بے محل پابندی عاید کی گئی تو شعر و ادب کی طرح یہ بازیچۂ اطفال رہ جاتی ہے۔

اب طنز و ظرافت کا ڈھنگ کچھ اس طرح کا ہو گیا ہے جیسے کسی محکمے میں داخلے کے لیے فارم چھپوائے ہوں۔ ان کی خانہ پری کر کے کسی اخبار یا رسالہ میں بھیج دیجیے۔ بوالیسی ڈاک طنز یا ظرافت نگاری یا دونوں کا سرٹیفکیٹ یا ڈپلوما مل جائے گا۔ اس سرٹیفکٹ یا ڈپلوما میں یہ رعایت یا خاصیت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد یہ ڈگریوں میں تبدیل ہوتے ہیں اس کو چند مثالوں سے واضح کرسکتا تھا لیکن،

"دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا"!

فارم میں کچھ اس طرح کے اندراجات ہوتے ہیں مثلاً آپ کے گھریلو معاملات کتنے ناشدنی یا ناگفتنی ہیں، بیوی کس لب و لہجہ میں اپنے مطالبات پیش کرتی ہے، میکے چلے جانے کی دھمکی یا اپنی ماں کو بلانے کا آپ کو یقین دلا سکتی ہے یا آپ کے مایوس الحال آرٹسٹ یا شاعر ہونے اور گھر میں روٹی کپڑا نہ ہونے کا طعنہ دیتی ہے۔ بنیے اور مالک مکان کا آپ کہاں تک اعتبار کھو چکے ہیں اور غالب کی طرح آپ ان کی دی ہوئی ذلت کو کہاں تک ہنسی میں ٹال سکتے ہیں۔ آپ کے دوست کسی طرح موقع بے موقع اپنی دشواریاں بیان کر کے اپنا جی اور آپ کی جیب ہلکی کرتے رہتے ہیں یا لکھنؤ کے بگڑے تعلقداروں، رئیسوں اور ان کے مصاحبوں میں کس قسم کی بے سر و پا گفتگو ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کی نسل اب منقطع ہو چکی ہے۔ سرکاری یا غیر سرکاری محکموں میں کیا ہیر پھیر ہوتا رہتا ہے وغیرہ۔ اس فارم کا بھر لینا آسان ہے اس لیے کہ اس میں یہ کہیں نہیں لکھا ہوتا کہ ان موضوعات پر کس سلیقے سے گفتگو کرنا چاہیے اور آپ میں اس کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔

طبیعت کے اعتبار سے میں کچھ سادھارن قسم کا آدمی واقع ہوا ہوں اور ایسے سجنوں سے ڈرتا ہوں جن کی نیت میں فتور اور رسائی دور دور ہو۔ اس لیے طنز ظرافت کی کوئی ایسی ٹوپی تیار کرنے میں پس و پیش کرتا ہوں جس کے بارے میں کوئی احمق آمادۂ فساد ہو کہ وہ اس کے سر پر ٹھیک آتی ہے۔ البتہ اس خیال سے ڈھارس بندھتی ہے کہ اس قبیلہ نے اب ٹوپی ہی پہننا ترک کردیا ہے۔

طنز و ظرافت میں فن کار کو دوسروں ہی پر نہیں اپنے پر بھی چھینٹا اڑانے کا ظرف ہونا چاہیے۔ طالب علمی کے زمانے میں کالج میں میرے ایک ساتھی تھے، جو بغیر کسی تکلف یا تامل کے سب کو گالی دیا کرتے تھے۔ لیکن سب سے

پہنچے اور سب سے زیادہ اپنے کو گالی دیتے۔ روز کے بندھے ٹکے مشاغل سے اکتا جاتے تو مزہ منہ کا بدلنے کے لیے گالی سننے کے لیے ہم ان کے کمرہ کا رخ کرتے، پھر دیکھیے انداز گل افشانی دشنام!

گھومتے پھرتے ہر روز وہ ہر جگہ پہنچ جاتے۔ یہ عادت ان سے کبھی چھوٹ جاتی تو ہم ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوتے۔ اس خیال سے کہ خدا نخواستہ مزاج دشمناں علیل تو نہیں ہو گیا یا کالج کے مطالبات ادا کرنے سے دانا پانی تو نہیں بند کر دیا گیا ہے یا شاید گھر والوں کا خط آیا ہو کہ لڑکی والے شادی کا تقاضا کر رہے ہیں۔ ایسا ہوتا تو ہم سب ایک زبان ہو کر ڈائننگ ہال کے منتظمین، اکاونٹ، اس کے عملے، ان کی ہونے والی بیوی کے میکے اور سسرال کے رشتہ داروں کی نا عاقبت اندیشی کو اپنی اپنی رسائی طبع کے اعتبار سے ناگفتنی اور موصوف کو ناشدنی کہتے تو وہ اپنے آپ کو بھی انھیں میں شامل کر کے ہمارے ہمنوا ہو جاتے اور ممبرانِ وفد کو بھی فرمودات عالیہ سے سرفراز فرماتے۔

موصوف حسب عادت امتحان میں فیل ہو گئے۔ اکثر فرمایا کرتے پڑھنا لکھنا ٹھیک ہے۔ پوردنگ میں بسر کرنا اس سے بھی بہتر ہے۔ لیکن امتحان دینا "اسد اللہ خاں قیامت ہے۔" ممدوح کا نام اسد اللہ خاں نہیں تھا۔ البتہ جن اسد اللہ خاں کی طرف آپ کا ذہن گیا ہوگا وہ بھی اپنے تنقید نگاروں کو ملائم الفاظ میں یاد کرنے کے عادی نہ تھے!

ایڈریس پیش کرنے کے لیے نیاز مندوں کا وفد حاضر ہوا جس میں امتحان کے تمام چھوٹے بڑے منتظمین گورنمنٹ گزٹ ڈائننگ ہال سب کو دل کھول کر برا بھلا کہا گیا تھا۔ اس زمانے میں اور شاید پہلے بھی طلبا میں شورش بپا ہے جس چیز پر ہوتی، ڈائننگ ہال کے کھانے کی شکایت اس میں ضرور شامل کر لی جاتی اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ جس بات پر لوگ آمادۂ فساد ہوتے تھے وہ تو جہاں کی تہاں رہ جاتی کھانا کچھ دنوں کے لیے بہتر ملنے لگتا۔ مثلاً یہ کہ طلبا فلاں لیڈر کو مدعو کرنا چاہتے تھے۔ اتھارٹیز نے اجازت نہ دی۔ طلبا پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ فلاں موقع پر طلبا نے تعطیل دی جانے کی درخواست کی تھی وہ نامنظور ہو گئی۔ اس سے حکام نے طلبا کے پیدائشی حقوق کو نظر انداز کر دیا۔ اسی طرح یہ شکایت کی گئی کہ نماز میں فرائض کے علاوہ ..... سنتوں کی بھی حاضری لی جانے لگی۔ پرسر آفس اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس نے پیری نماز سے عدم حاضری کا جرمانہ وصول کر لیا۔ کرکٹ کپتان جس کو چاہتا ہے فرسٹ الیون میں لے لیتا ہے یا توڑ لے جاتا ہے۔ اس سے بعض مستحق کھلاڑیوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جہاں یہ دھاندلی ہو وہاں کھانا کیسے اچھا مل سکتا ہے۔ ڈائننگ ہال میں برا تو ویسا ہو رہا ہے۔ اس شورش کا بھی وہی حشر ہوتا جو پہلی کا ہوا تھا۔ یعنی تمام شکایات اپنی جگہ پر رہیں کھانا کچھ دن اچھا ملنے لگا۔ آخر میں اپنے دوست عزیز کو دشنام النطق کا خطاب پیش کیا گیا۔ اس پر خاص طور پر خوشی منائی گئی کہ موصوف کو یہ خطاب Posthumous (بعد از مرگ) نہیں دیا گیا۔ شکریہ کی جوابی تقریر میں موصوف نے حسب معمول اپنی شیوہ بیانی سے کام لیتے ہوئے فرمایا تم سب مطمئن رہو۔ میں تمھاری وفات کے بعد بھی تم کو اسی طرح یاد کروں گا جس طرح اب تک کرتا آیا ہوں اگر اس سے زیادہ نہیں!

بعضوں کا خیال ہے کہ مغرب سے وہاں میں زیادہ انہیں فضا میں کم۔ زندگی کی دوسری سرگرمیوں سے قطع
اردو طنز وظرافت کے بارے میں میرا ذاتی خیال کچھ اس طرح کا ہے کہ جہاں شعر وادب کی بہت سی کمیں مکو
تجارت، اسمگلنگ وغیرہ کے راستے سے ہمارے شعر وادب میں داخل ہوئیں وہاں مغرب کی اعلیٰ طنز وظ
کی طرف ہم نے بہت کم توجہ کی۔ اسمگلنگ کا نام لینے سے آپ چونکئے یا بدحظ نہ ہوں، دراصل بات یہ
ہے کہ اسمگلنگ چوری چھپے کی جائے تو قابل دست اندازی پولیس ہے لیکن اگر بندوبست کی جائے تو
پھر اور چیز ہو جاتی ہے۔

طنز وظرافت ہی نہیں ہر اعلیٰ کا خمیر بالآخر کسی ادنیٰ سے جا کر مل جاتا ہے چاہے وہ نسل
آدمی کا ہو، جانور کا ہو، معیشت، معاشرت، سیاست کا ہو، مذہب، اخلاق یا ینعال واہرمن کا ہو۔ غور کریں تو
معلوم ہوگا کہ تہذیب میں بھی جاہلیت کی کھلی چھپی نشانیاں آج تک موجود ہیں اور شاید ہمیشہ رہیں۔ اگر ا
کو زندہ رکھنا منظور ہے تو دوسری کو ماننا ناگزیر ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دنیا کے اچھے لوگوں نے ہمیشہ اس
کوشش کی ہے کہ اعلیٰ ادنیٰ کی طرف مائل نہ ہونے پائے اور یہ انہیں بزرگوں کا تصرف ہے۔ یہ جو
مجموعی بھلائی برائی پر غالب آ کر رہتی ہے ورنہ یہ ترقی یا ناترقی یافتہ دنیا کب کی ختم ہو جاتی۔ تنگ نظر
خود غرض اس کو نہیں مانتے اس لیے دنیا ہمیشہ خطرے اور حادثے کا شکار یعنی اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف جھکتی رہتی
ہے۔ یوں بھی ہر چیز قدرتاً اپنے اصل کی طرف رجوع کرتی رہتی ہے۔

یہ باتیں اس لیے عرض کرنی پڑیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ طنز وظرافت کے مورث اعلیٰ ہجو، پھکڑ، فق
اور مسخرگی ہیں۔

طنز وظرافت کی سمت ورفتار یہی رہی ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اردو طنز وظرافت نے مغ
طنز وظرافت کی بلندیاں چھو لی ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال بھ
ذہن میں آیا ہے کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں طنز وظرافت کا وہ ذخیرہ یا معیار ابھی یا نہیں جو اردو م
ملتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو تعجب ہوگا۔ سبب یہ ہے کہ باہر سے آنے والے ادبی اثرات نیز ملک کے اندر بو
جانے والی زبانوں کے تصرف سے اردو کا دامن بہت وسیع ہو گیا۔ اردو لکھنے بولنے اور سمجھنے وا
ہندوستان کے ہر گوشے میں موجود تھے۔ آج بھی ہیں، اس لیے اردو نے یہاں کی ہر زبان سے فائدہ اٹھایا۔
چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں لسانی اور ادبی اثر ورنگ قبول کرنے اور ان کے حسن کو اپنے حسن میں نکھارنے
جو غیر معمولی صلاحیت ہے وہ کسی اور زبان کے حصے میں نہ آسکی اس لیے کہ اردو کے سوا تقریباً تمام ہند
زبانیں متعینہ جغرافیائی حدود میں اسیر ہیں لیکن اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ ریڈیو پر یک طرفہ
بحث درست نہیں!

جب سے چین اور ہندوستان میں ان بن ہوئی اور ایمرجنسی کا نفاذ ہوا، طنز وظرافت کا درجہ
ماند پڑ گیا ہے۔ سونا، سنار اور اسمگلنگ کا بھی یہی حال ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب سنار خود سونے میں
کر دیا کرتے تھے تو سب ٹھیک تھا لیکن جب حکومت نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس میں ان کی مدد کر

چاہی تو کہرام مچ گیا۔ ستاروں نے تو خودکشی کر کے تھوڑا بہت کام بنا لیا۔ مسخروں نے "اور راہ نکالی ثواب کی" طنز و ظرافت والے کیا کریں؟ ستاروں کی طرح خودکشی کرنے کی نہ ان میں صلاحیت نہ ہمت نہ فرصت! ثواب کا راستہ ان پر پہلے ہی بند رہا ہے!

پھر دونوں سے طنز و ظرافت کا رنگ کچھ اس طرح کا دیکھنے میں آ رہا ہے کچھ تعجب نہیں۔ جب تنگ آ کر لوگ ان فن کاروں کے گھر یا آفس کے معائنے پر دھرنا دے کر ان سے "ہری کاری" کا مطالبہ کریں یا خون کے مار ڈالنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن چند مصلحتوں کے پیشِ نظر ایسا نہ کریں حالانکہ مصلحت ہی کو ملحوظ رکھ کر فارسی کی یہ مثل مقبول ہوئی ہے کہ "مصلحت بین و کار آسان کن" کار آسان کا ایک مفہوم یا مقصود یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کام تمام کر دو۔

پچھلے زمانہ میں شعر و ادب کے عالم یا کسی فن کے باکمال کو گردشِ روزگار کا سامنا ہوتا تو وہ کسی ذی حیثیت قدرداں کی تلاش میں نکلتا، قسمت ساتھ دیتی تو اس کے درِ دولت سے وابستہ ہو کر زندگی کے دن آسودگی سے گزار دیتا۔ اب فن کاروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور رئیس راجاؤں کی ختم ہو گئی ہے۔ پھر مطلب براری کیوں کر ہو، بقول غالب:

کہ گھر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو؟

اس شعر کے پہلے مصرعہ پر نہ جائیے۔ فراق اور وصال کا جو تصور غالب کے عہد میں تھا ختم نہیں تو اب قابلِ لحاظ نہیں رہا۔ کچھ دنوں سے شعر کی ہیئت و حیثیت میں جو تبدیلی آئی ہے اس سے متاثر ہو کر اب میں ایک مصرعہ کو پورا شعر اور طرح طرح کے چند مصرعوں یا ٹکڑوں کو یکجا دیکھ کر مکمل غزل یا نظم سے تعبیر کرنے لگا ہوں۔ نئے ڈھنگ کی اردو شاعری سے اور زیادہ کیا مفاہمت کی جا سکتی ہے! اس طرح کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ ان پر کوئی طنز و ظرافت کارگر نہیں ہو سکتی اس لیے کہ یہ براہ راست شاعری پر مکمل طنز و ظرافت ہوتی ہے۔ روزگار ملنے کا اتنا نہیں جتنا اس کے ڈھلنے کا جو حال ہے، اس کے پیشِ نظر فن کی نمائش اور فاقہ کشی کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فن کار کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ جہاں آج کل قسم قسم کی یونیورسٹیوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے وہاں ایک جیل خانہ یونیورسٹی کیوں نہ قائم کی جائے۔ قانون کے فن کاروں کو دیکھتے ہوئے جن میں فریقینِ مقدمہ، ان کے وکلا، بابو، حکام، چپراسی، پٹواری سبھی شامل ہیں۔ ان سب کے نشیب و فراز کو ہموار و یکجہت کرنے کے لیے جس کو انگریزی میں شاید Streamline کہتے ہیں، جیل خانہ یونیورسٹی کا قیام، قوم اور ملک کے بعض اہم تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے

اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے میں نے ابتدائی سروے Survey کا کام شروع کر دیا اور اپنے حلقہ کے جیل خانہ پہنچا جو خوش نصیبی سے قریب ہی واقع تھا، یونیورسٹی اور جیل خانہ کے درمیان اتنا کم فاصلہ شاید ہی کہیں اور دیکھنے میں آئے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر قریب رکھنے میں یقیناً کوئی مصلحت ہوگی۔ ممکن ہے کبھی کوئی ایسا وقت آ جائے جب ایک دوسرے کا کام انجام دینے لگے۔ جیل خانے کے لوگوں نے جن میں سبھی طرح کے اشخاص تھے اشتیاق و امید سے

رسید میر

میرے سراپا کا مطالعہ شروع کردیا کہ شاید اشتہاری مجرموں سے میرا حلیہ ملتا جلتا ہو۔ مجرموں کی گرفتاری کے لیے چھوٹے بڑے انعامات مقرر تھے لیکن مایوس ہوکر خشمناک لہجے میں پوچھا کہ میں کیسے آیا تھا۔ جب وہ دن رشتہ دار قیدیوں سے ملنے کا نہ تھا۔ ساتھ ہی اس امر کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ گرہ میں کچھ ہو تو اس کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ میں نے بڑی بے دلی سے عرض کیا۔ "یاں گرہ میں مال کہاں"!

اتنے میں جیلر کی خبر ایسی پاٹ دار آواز میں سنائی دی کہ پاس کے پیپل پہ بیٹھے چند طرح طرح سے چہچہا رہے تھے یکبارگی اُٹھ گئے ان کے ساتھ میرے اوسان بھی۔ جواب طلب کرنے پر اپنے حلیہ اور نقل و حرکت کی معذرت چاہی اور کہا کہ میری نیت بخیر ہے۔ جیلر صاحب نے بات کاٹتے ہوئے درشت لہجہ میں فرمایا "نیت کہیں اور دیکھتے ہوں گے یہاں انجام بھگتنا پڑتا ہے۔ عرض کیا ایک اسکیم برائے لینے حاضر ہوا ہوں۔ وہ یہ کہ جس طرح ہندوستان میں اور بہت سی یونیورسٹیاں ہیں اسی اصول و انداز کی ایک جیل خانہ یونیورسٹی کیوں نہ قائم کی جائے۔ اس سے قوم، ملک، شعر و ادب کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اور آپ کے قیدی اچھے آزاد شہری ہو سکیں گے۔ جناب جیلر صاحب نے مجھے اور اپنے آپ کو باری باری نیچے سے اوپر تک دیکھ کر پہلے تو اس کا اطمینان کیا کہ دونوں بقید حواس ہیں۔ پھر بولے آپ گمراہ ہیں اور ناعاقبت اندیش بھی۔ جن کو آپ آزاد شہری کہتے ہیں وہی تو ہمارے Potential متاع یا سرمایہ ہیں۔ قیدیوں کو آزاد شہری بنانے کا کام جیل خانہ سے نہیں پاگل خانہ سے لیجیے تو بہتر ہوگا۔ ممکن ہے یونیورسٹی کا نام سنتے ہی بہت سے پاگل حواس میں آجائیں اور Shock Treatment سے بچ جائیں۔ جیل خانہ کا مقصد تو یہ ہے کہ جہاں یونیورسٹیوں کا کام ختم ہو وہاں سے جیل خانہ کا شروع کردیا جائے۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا جیل خانہ کا مقصد اور اس کی صنعتیں دونوں ختم ہو جائیں گی جن کو ہم بعض مصالح کی بنا پر نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ایمرجنسی میں جیل خانہ کے پروگرام میں مداخلت Essential Service میں مزاحمت ہوگی جو کسی طرح گوارا نہیں کی جاسکتی۔ ملک میں ڈسپلن کی آخری جائے پناہ جیل خانہ ہے۔ تعلیم کو سیاست اور سیاست کو طالب علموں نے جس حالت کو پہنچا دیا ہے اس کا آخری علاج جیل خانہ ہے جو اس وقت over time کام کر رہا ہے۔ جیلر صاحب کی اس صاف بیانی سے جس میں جہاں تہاں بدزبانی سے کام لیا گیا تھا میں بد حظ ہوا اور لوٹنا چاہا۔ موصوف نے بہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "آپ اچھے خاصے معصوم معلوم ہوتے ہیں" دلی کا یہ طرز تخاطب مجھے بالکل پسند نہ آیا لیکن انھوں نے سلسلہ کلام منتقل فرمایا۔ کہنے لگے ایسی بے سر و پا اسکیم پر اپنا عزیز وقت نہ گنوائیے۔ میں نے کہا جب آپ بے تکلفی پر اتر آئے ہیں تو عرض کروں گا کہ وقت عزیز ہوتا نہیں میرے نزدیک اس کا گنوانا ہی بہتر ہے! جیلر صاحب نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور فرمایا تمھارے ہی جیسے خیالات کے کچھ لوگ ہم نے بند کر رکھے ہیں ان کا مسلک بھی یہی ہے لیکن جیل خانے میں وقت عزیز گنوانے کا طریقہ کچھ اور ہے اگر ان سے ملنا چاہو تو بلواؤں، میں گھبرا گیا اور نہایت عاجزی سے بولا کہ آپ مجھے معاف کردیں۔ میں ان سے واقف ہوں آتے ہی وہ اپنی کوئی نظم یا حقیقت پسند افسانہ سنانے لگیں گے۔ جیل خانہ کے باہر ان کی نظم یا کہانی سننے کی مجھ میں سکت نہ تھی تو جیل خانہ کے اندر انھوں نے معلوم نہیں کیا کیا لکھ ڈالا ہوگا!

یہ کہتا ہوا جیلر کو خدا حافظ کہے بغیر جلد جلد وہاں سے چل دیا۔

طنز و ظرافت کے راستے پر کبھی ٹریفک کی آمد و رفت تھی۔ کبھی اس قسم کی جیسی جیلر کی جیب کی گلی میں ہو جایا کرتی تھی یعنی فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔ لیکن اب طرح طرح کے ٹریفک کا اتنا زور ہے اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ اس راستے پر چلتے ڈرنے لگا ہوں۔ چنانچہ غبار خیر کی طرح دور ہی بیٹھا رہتا ہوں اور یہ نہ ادب برائے ادب ہے نہ برائے عشق بلکہ تمام تر برائے تحفظ جان و مال و آبرو ہے!

میرا کچھ اس طرح کا خیال ہے کہ مختلف بہانوں سے مرنے یا مارے جانے والوں کے لیے آخرت میں انعام و اکرام کی سزا یا جزا مقرر ہوگی لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہونے والوں کا آخرت میں کس طرح سواگت کرتے یا گت بناتے ہیں۔ یعنی وہاں کے [illegible] تشریفات کے آئین و روایات کیا ہیں۔ بعض حلقوں میں جو خبریں سننے میں آتی ہیں وہ تو چنداں امید افزا نہیں ہیں اور یہ سمجھ میں آنے کی بات بھی ہے۔ اس لیے کہ وہاں کا ٹریفک یکطرفہ ہے۔ ایسے سہل ... کے لیے سہولتیں دنیا میں فراہم ہیں آخرت میں نہیں ہیں۔ فارن ایکسچینج کی بھی دشواریاں ہیں۔

ٹریفک کا شکار ہونے سے اس لیے بھی گھبراتا ہوں کہ فوراً ہی جاں بحق نہ ہو سکے تو آخرت کو پہنچنے سے پہلے ہسپتال میں قرنطینہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کو جھیل جانا اور وہاں کے چھوٹے بڑے خدام حکام عالی مقام سے سرخرو ہونا شریفوں یا مفلسوں کے بس کی بات نہیں۔ پہلے کبھی خدام صرف مزاروں یا درگاہوں پر ہوتے تھے۔ لوگ دعائیں مانگتے تھے یہ نذرانے وصول کرتے تھے۔ اب یہ ہسپتالوں پر حاوی ہیں۔ درگاہوں پر جو وصولی ہوتی ہے وہ نذر و نیاز ہے اور قابل دست اندازی پولیس نہیں۔ محکموں میں نذر و نیاز کا کاروبار دوسری طرح کا ہوتا ہے جس کے بتانے کا یہ موقع نہیں۔

لیکن اتنا کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ غرض مند اپنی غرض کو ہر بات پر مقدم رکھتا ہے چنانچہ بعض سر پھرے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دنیا والوں کو نذر نیاز دینا آخرت والوں کو دینے سے زیادہ پکا اور جلد سے جلد نفع دینے والا بیوپار ہے۔ اس لیے وہ "اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے" کے نقد سودے کو عاقبت کے ادھار اور یک المیعاد سودے پر ترجیح دیتے ہیں۔ قصہ مختصر اور تکلف برطرف میں آخرت کا سفر ٹریفک اور ہسپتال کے راستے نہیں کرنا چاہتا۔

بعضوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ نیکی بدی لکھنے والے فرشتے بھی ٹریفک اور ہسپتال کے اڈوں سے بچنے کے لیے بڑے بڑے شہروں کے تراہے چوراہے پر گزرنے والے اشخاص کے شانوں سے احتیاطاً اتر پڑتے ہیں۔ جس طرح کبھی کبھی ریلوے کا پھاٹک بند ہونے کی وجہ سے ادھر کی سواریاں ادھر اور دوسری سمت کی دوسری سمت اتر جاتی ہیں لیکن انتظار کی تاب نہ لا کر پھاٹک کے نچلی دراڑوں سے نکل کر ایک طرف سے دوسری طرف چلی جاتی ہیں۔ اور تانگہ، رکشا یا ٹیکسی بدل لیتی ہیں ہوشیار دار فرشتے بھی یہی کرتے ہیں۔ مثلاً آپ حیدرآباد کے کسی چوراہے سے جانب ... گزر رہے ہوں تو آپ کے کندھے پر سے فرشتے اتر پڑیں گے اور آپ دوسری طرف بخیریت تمام پہنچ گئے تو اس طرف کی

رسنیدہ

سواری کے کاندھے سے اترتے ہوئے فرشتے آپ کے شانے پر فروکش ہو جائیں گے۔

یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ خواتین کا نیک و بد اور سزا و جزا کا تصور مردوں کے تصور سے جدا ہوتا ہے اس لیے ان کے افکار و اعمال کی پرکھ اور پڑتال کے لیے شانہ نشین فرشتے بھی مردوں کے شانہ نشین فرشتوں سے مختلف ہوتے ہوں گے اور یہ اس لیے کہ فرشتوں میں جنس کا امتیاز نہیں ہوتا۔ یہ راز یوں کھلا کہ ایک بار شوہر اور بیوی کے اعمال نامے بدل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیوی کے اعمال نامے پر مرد کو سزا دے دی گئی اور شوہر کے اعمال نامے سے عورت کو رہائی کا پروانہ ملا۔

اس طرح ہر چوراہے پر فرشتے اسلحہ بدلتے رہتے ہیں۔ ٹریفک جاری رہتا ہے اور اعمال نامے مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد آخرت کے کسی بڑے محاسب خانے میں اعمال ناموں کے اندراجات کی کھتونی ہوتی ہے اور جو گناہ یا ثواب جس کے حصے کا ہوتا ہے اس کے بیلنس شیٹ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ خدانخواستہ کوئی راہ چلتا ٹریفک کی زد پر آ گیا تو اس کا شانہ نشین فرشتہ سڑک کے ادھر یا ادھر۔۔۔ مضروب کے ساتھ اخلاقاً بھی ہسپتال نہ جائے گا۔ اس لیے کہ ہماری آپ کی طرح وہ فرشتہ بھی ٹریفک کی زد سے کہیں زیادہ مہلک یا ناقابل برداشت ہسپتال کے عذاب کو سمجھتا ہے۔ ٹریفک کے سانحے اتفاقی ہوتے ہیں، ہسپتال کے فنی یا تادیبی۔ فرشتہ اس اندیشہ سے ہسپتال نہیں جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مضروب تو وارڈ میں رہ جائے اور فرشتہ پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا جائے۔ آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ ہسپتال اور شفا خانوں میں کام کی اتنی کثرت ہے کہ ہر طرح کی بھول چوک وقوع میں آسکتی ہے۔ اب مرض کی تشخیص میں زیادہ کاوش نہیں کرتے اس لیے کہ آخر میں مرض کا پتہ پوسٹ مارٹم سے لگ ہی جاتا ہے۔ پھر تشخیص کا دردِ سر کیوں مول لیا جائے۔ بات اصول کی ہے۔ مرض کا پتہ اتنا مریض سے نہیں چلتا جتنا مُردے سے اس لیے مردے کو مقدم رکھنا چاہیے۔

ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب میرا قیام طعام اکثر ہسپتال میں رہا کرتا تھا۔ ان دنوں چوراہے کی ٹریفک کی مانند ہسپتال کا ٹریفک بھی مرغجان مرغ قسم کا ہوتا تھا اس لیے ہسپتال اور چوراہے دونوں پر شرح اموات کم ہوتی۔ اس عہد میں اردو کا املا کچھ اس طرح کا تھا یا اس قسم کے اردو داں ہوتے کہ ایک صاحب کے بارے میں عدالت نے فیصلہ دیا کہ سائل کو خبط ہے۔ لیکن خود سائل اس خبط کو ضبط پڑھتے تھے۔ پوچھا گیا ضبط کیوں تو بولے یوں کہ مجھ میں ضبط کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح کچھ دنوں سے ایک صاحب برابر پوچھتے رہتے ہیں کہ خبط تولید کا مسئلہ اخباروں میں کیوں چھیڑا ہوا ہے۔ بتایا گیا کہ خبطِ تولید نہیں ضبطِ تولید معرض بحث میں ہے تو اکتا کر فرمانے لگے ہیں مجھے اس سے کوئی علاقہ نہیں میں تو اردو رسم خط کا شیدائی ہوں حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ رسم خط کا مسئلہ اتنا نہیں ہے جتنا ہمارے آپ کے اخلاق و عادات کا!

اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی مجھے ہسپتال میں اکثر کافی دن گزارنے پڑے۔ زیادہ دن نہیں گزرے ایک عزیز کی تیمارداری میں ایک مشہور ہسپتال کے بڑے مہنگے وارڈ میں قیام کرنا پڑا۔ پہلے ہی دن کیا دیکھتا ہوں کہ مریض کے کمرے سے باہر بھنگن اور میٹرن میں بلند بانگ بے تکلفی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور کمرے کے اندر دو ڈاکٹر اسی طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ڈیڑھ دو

ہر لمحہ کی بلندی سے ہوائی جہاز کمرے کی چھت کے اوپر سے گزرتا۔ ڈاکٹر کے ہاں فریاد لے کر پہنچا تو وہ ایک محب قوم و ملک کو اپنے دولت خانے پر کچھ کھلا پلا رہے تھے اور اس زبان میں ان کو خوش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جس میں اب تک ہندوستان میں صرف دو کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ ایک وید مقدس دوسری دیوانِ غالب۔ مریضوں کے دوست اور رشتہ دار اس طرح دھوپ، دھول اور لو میں باہر کھڑے تھے جیسے خیرات بٹنے والی ہو اور فقرا و مساکین یا راشن پانے والے کا راشن کی دکان پر ہجوم ہو!

ذکر کر رہا تھا فرشتوں کا بات پہنچی ہسپتالوں تک جیسے کبھی کبھی قیامت کا ذکر کرتے کرتے بات کسی کی جدائی تک پہنچ جاتی ہے تو پھر بات کو آگے کیوں بڑھائے۔!

○

انگریزی کے دو لفظ کرپٹ اور کلیشن کو اردو ہی نہیں ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں کو بے تکلف قبول کر لینا چاہیے جن میں سبھی مبتلا ہوں اس کو سمجھنے یا قبول ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

(اردو ادب شمارہ ۳ ۱۹۶۹ء)

○

ہم کو اس کی سخت کوفت ہوتی تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صدی تک ہماری باتیں کاپی یا تول کے مقابلہ میں مان لی جاتی تھیں۔ ریاضیات میں آخر کیا سرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک نقطہ تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اقوام متحدہ (یونائیٹڈ نیشنس [illegible]) قسم کا کوئی ادارہ نہیں تھا ورنہ ہم اس مسئلہ کو وہاں ضرور لے جاتے، کوئی فیصلہ ہو جاتا یا نہیں مشاعرہ تو ہوتا رہتا۔"

(آشفتہ بیانی میری)

○

اخبار نویس کو بعض حواس کی بالکل ضرورت نہیں۔ مثلاً آنکھ اس کے لیے بالکل زاید ہے۔ اس کا کام کان سے لیا جا سکتا ہے۔ بس جو سنا لکھ دیا۔ گو ایسی حالت میں اکثر ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ اڈیٹری شروع کرتے وقت کانوں کا جو سائز ہوتا ہے وہ اڈیٹری ختم کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے۔ . . . .

اخبار نویس کو اس اصول پر چلنا چاہیے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے اخبار کو بہ ہر قاعدہ پہنچتا رہے۔ اخبار نویس کو کوئی ایسا موقع نہ دینا چاہیے جس سے اس کے دوست یا دشمن خوش ہوں بلکہ اس کے اخبار کے ذریعہ دشمنی اور دوستی دوسروں پر تقسیم ہوتے رہیں۔ اخبار نویسی شروع اس طور پر کرنی چاہیے جیسے دین خطرہ میں ہے، قوم فنا ہو رہی ہے، حکومت ناشکری اور ناقابل برداشت ہو گئی ہے، لیکن ختم یوں کر دکھایا تو سے دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کر دیا اور بنک میں حساب کھول دیا۔"

(خنداں)

رشید احمد صدیقی

ارہر کا کھیت!

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائیڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض فطری حوائج اور معاشرتی حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائیڈ پارک کے خطیب مشہور ہیں لیکن لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس کی داغ بیل ہندوستان کے ارہر کے کھیت ہی میں پڑی تھی۔

پارلیمنٹ اور کونسلوں کی ہیر پھیر اور چیز ز جواب "رقص پروانہ" اور "پرفشانی شمع" سے زیادہ گرمیٔ محفل کا باعث تصور کی جاتی ہیں وہ صدا ہائے بازگشت ہیں جو شاید سب سے پہلے کسی آلۂ مکبر الصوت نے ارہر کے کھیت سے بلند کی تھی۔ ہائیڈ پارک کی جوشش فصلیاں اکثر آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ارہر کے کھیت کی عریانیاں اکثر واٹرلو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ کی پیشرو گزر چکی ہیں۔ یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔ دونوں لڑتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ مفید کام کر جاتے ہیں، جس سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہندوستانی اراکین پارلیمنٹ وہ کرتے ہیں جس سے ان کو اور ہندوستان دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک قضائے حاجت کرتا ہے اور دوسرا ایجی ٹیشن۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں کچھ آلودہ ہو کر پھیلنے لگتا ہے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔ کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں گویا دونوں ایک ہی مسئلہ پر غور کر رہے ہوں۔ یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا یا جھڑکی [illegible] کے مقابلے میں دن کی محنت ہر حیثیت سے بلا ورد تھی اور وہ سب دن کی مشقت خوشی خوشی [illegible] مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے، کسان کی بیوی، اس کے بچے، بھائی [illegible] جو نمبر ۲ کسان کے لیے

اتنا ہی عزیز ہوتے ہیں جتنا خود مویشی کسان کے لیے کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے نشیب و فراز سے بے خبر یا مستغنی ہوتے ہیں، غرض کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو وہ آج کل کے روشن خیال میاں بیوی سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ خوش قسمت نہیں آسودہ سہی!

لیکن وہ دیکھیے گاؤں کے قریب والے کنوئیں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے ایک طرف ٹرمٹا سا ہے جس میں کھاد پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک ببول کا کھوکھلا پرانا درخت ہے جیسے کوئی کہن سال وکٹوریہ کراس تمغہ یافتہ جس پر ایک آدھ شب زندہ دار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں جیسے جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ کے بعض فرزندانِ قسمت شاخ زریں پر بیٹھے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے عورتوں کی کچھ تعداد جمع ہوئی یہاں کچھ دیر تک کسی کا انتظار کیا گیا ان میں نوجوان تھیں پُر شباب لیکن بے خطر کنوئیں کی جگت پر تھیں۔ پاؤں لٹکائے ہوئے کچھ گنگناتی ہوئی اور بوڑھیوں کی دعوت تہدید و عتاب دیتی ہوئی کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی ہوئی کراہ رہی تھیں۔ گالیاں دے رہی تھیں اور کھانستی جاتی تھیں۔ اتنے میں ایک اور گروہ آ پہنچا، نوجوان جگت پر بیٹھنے والیوں نے اپنی ہمجولیوں کا شوخی و طراری سے اور بوڑھیوں کو کوسنے گالی اور کھانسی سے خیر مقدم کیا۔ اکہری قطار میں ایک دوسرے کے پیچھے یہ مجمع کھیت کی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ جسموں کو تولتے ہوئے نوجوان لڑکھڑائیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمین دار اور کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا موسم، پاس کا لڑکا یا لڑکی یا قہقہہ لگانے والی عورت گالیاں سنتی۔ یہ مہم چلتے چلتے ایک تاریک ناقابلِ گزار، اندیشہ ناک اور خار زار سرزمین کے سامنے رک گئی۔ یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

برسوں گزرے ہیں اسی دشت کی سیاحی میں
لیکن بعض ثقافت جس کا شاید نام لینے سے گھبرائیں ——— ارہر کا کھیت!

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے ہم جوتیاں یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں حفظانِ صحت کے جراثیم ملتے ہیں۔ یہاں آنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔ کسی کا "آرامِ جاں" اور "مونسِ قلب" بچھڑ گیا ہے وہ اس کے لیے افتاں و خیزاں یہاں تک پہنچا ہے کسی سے وعدۂ دید وا آمد کے مزید قول و قرار ہیں۔ وہ سراپا شوق چلا آ رہا ہے اور ——— کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آ پہنچا ہے کہ یہ اس بھول بھلیاں کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر پڑتا ہے۔ یا خود گدھا کسی محبوبہ کے پہلو میں۔ آخر یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں ماسکوریڈ یا جشنِ نقاب، یہی تو تھا جس پر یورپ والے ناز کرتے ہیں اور ہم روتے ہیں یا گالیاں دیتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لیے موزوں ہے، مہابھارت یا ارہر کا کھیت، مہابھارت تو شاید اختتام پر ہے سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا اور انتظار ہے۔

جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں چڑھانے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے، ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے اکثر شفاخانے میں ورنہ جیل خانے میں۔ جیل خانے کا راستہ اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گزرتا ہے اور شفاخانے کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جن پر سے موٹر بھی گزرتے ہیں اور مولوی بھی یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اس کے نوجوانوں نے اسراف شباب کے لیے شفاخانوں کو جیل خانوں پر ترجیح دی۔ زندگی کے آثار پریشاں حال کے نشتر سے زیادہ جیل خانے کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفاخانے سے زندگی اور جیل خانے سے موت گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع انتہائی بے کیف ہے جیسا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، مانا کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں، لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرا سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جائے ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتظار "دشمن ایمان و آگہی" یا رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا ـــــ!

لیکن یہ تم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولے سے کام لیتا ہے اور عدالت نہ سے خبر لیتی ہے۔ کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا انتہائی دلچسپ منظر ہے جتنا شاید عبرت آمیز کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا!

دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الا عورت شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک پولیس اور دولت حق و قائم ہیں اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے الا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے۔ اور کشاکش حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کے لیے اس نے چوپائی اور ایالو تعمیر کیا ہے دیہاتی پناہ اور آرام چاہتا ہے، شہری صرف غم غلط کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی کے یہاں محنت، دیانت اور عورت ہے شہری بھی عورت کا طالب ہوتا ہے لیکن محنت و دیانت سے نہیں بلکہ مکر و دولت سے آج چوپائی اور ایالو دریا برد ہو جائیں تو وہ جلد سے جلد کرنی اور چوپائی اور ایالو تعمیر کرلے کسان کے جھونپڑے پر یہ آفت آئے تو یہاں سطح آب پر ایالو اور چوپائی کی خس و خاشاک یا گندگی نظر نہیں آسکتی بلکہ موجوں کے ساتھ ایک خفیف سی ہلکی رنگین تحریر!

چوپائی اور ایالو کی تعمیر دولت اور شین سے ہوتی ہے یہ ایک لحظہ میں تعمیر ہوتے ہیں اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حسن کی مانند ایک لحظہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ادھر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے، کونسل اور اسمبلی کا صور یہیں سے پھونکا گیا تھا، گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ سب یہاں معرض بحث میں آتا ہے فلاں کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے، دارو غہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکھیا کے بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا اور سکھیا کو حمل کیسے ٹھہرا۔ ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی۔ دوسری بولی پہلوٹی کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھا ہوگا۔ اس پر اختلاف آرا ہوا اور ہندوستانی لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ ہم دراصل کس شغل میں مصروف تھے اور اب کیا ہو رہا ہے۔

اندھیرے میں گالی گلوج موثر نہیں ہوتی، دونوں آگے بڑھیں، ایک کا پاؤں دوسری کا ہاتھ۔ حقوق حفظان صحت پر پڑا اور پڑتے ہی غصہ کا سیلاب دوسری جانب مائل ہو گیا۔ دونوں یک لخت اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ منیا کے لڑکے مکندیا کا فعل تھا، دونوں نے مکندیا کو بیانگ دہل کوسا، یہ گویا منیا کو اعلان جنگ تھا۔ منیا نے بیٹھے ہی بیٹھے للکارا۔ مکندیا گھبرا کر اپنی ماں کی تلاش میں بھاگا تو فریقین اول میں سے کسی کے اوپر جا گرا۔ دونوں چیخ پڑیں۔ منیا نے مار ڈالا۔ اب کیا تھا سب نے اپنا اپنا شغل جہاں کا تہاں چھوڑا۔ نہ خشک طہارت کا خیال رہا نہ تر نجاست کا ایک غوغا بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے لوگ نکلنے لگے۔ مرد۔ عورت۔ بچے۔ گیدڑ۔ کتے۔ بٹیریں۔ لومڑی۔ نیولا۔ بن بلاؤ — گویا اسمبلی میں بم گرا!۔

ایک روز ہم کو یک لخت معلوم ہوا کہ ہم کوئی نصف گھنٹہ مقررہ وقت سے پہلے کلاس پہنچ گئے ہیں یعنی بحیثیت لکچرار کلاس میں تنہا پایا جانا۔ پانے والوں کے لیے اتنا ہی بصیرت افروز اور دلچسپ ہے جتنا کسی آثار قدیمہ دریافت کرنے والوں کو ایک لاکھ برس قدیم آنجہانی گینڈے کا ڈھانچہ ملنا۔ ایسی صورت میں ہر اس گزرنے والے کو مخاطب کرنا اور طوعاً و کرہاً اس سے اظہار خلوص یا برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری حیثیت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گزرا اور ہم نے بیٹھے ہی بیٹھے ایسی ڈانٹ بتائی اور آمادۂ نقض امن ہوئے گویا اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے استیصال کے لیے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ اتنے میں ایک بہشتی گزرا اور ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا کیوں اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو طے مسافت میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اس نے نہایت انکسار اور متشکرانہ انداز میں حامی بھری۔ ابھی یہ رسمی تکلفات ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا سامنے آ گیا۔ بولا میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہو گیا۔ خوانچہ کے اندر جو کچھ سری مرا رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے یہ لیجیے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ حکام یونیورسٹی نے معلمین کے لیے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا لازمی کر دیا ہے لیکن ابھی ہمارا غصہ اور سکوت دا لچر والے اور بریلی کے تحفہ امرود کے درمیان پورے طور پر متوازن نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک طرف سے حاجی بلغ العلیٰ گنگناتے ہوئے اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کنگھی اور داڑھی کے علاوہ:

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلیٰ" اور فارسی "جریب زعفرانی" ہے کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد"

اور جناب "ابوالجنون" کہتے ہیں کچھ دنوں "خشت البزایہ" پر نصرالا بتصرہ ہے ان دنوں قانون مسعودی کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں کہ اب جنون کی کیا حالت ہے۔

ملتے ہی فرمانے لگے، جلدی سناؤ جلدی۔ میں نے کہا کیا۔ فرمایا کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا سنیے:

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل پڑے
یہ میری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

گردن ہلا کر "بجلوہ ریزی" کمل و "بہ پریشانی" ریش اپنے سکوت کا ثبوت دیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتلایئے تو مضمون لکھوں، فرمایا:۔

"ارہر کا کھیت"

میں نے دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دوں یا کمل کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اٹھا کر مولانا "کاتبین" پر ڈال دیا۔ (میں نے سہولت کی خاطر ان تسمیہ یافتہ بزرگوں سے نام علیحدہ کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان کے نام ونشان، حسب نسب، وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ مجھے امید ہے کہ نیاز صاحب باب الاستفسار کے جن نمبر میں اپنی پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بالا استفسار اور جن نمبر میں بھی کراماً کاتبین کے مانند مجھ سے کچھ غلط مبحث سرزد ہو رہا ہے) فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے میں نے کہا کون نواب مزمل اللہ خاں صاحب، کیا یہ شعر سنایئے گا۔ کہنے لگے نہیں جی وائس چانسلر صاحب، نواب مسعود یار جنگ بہادر، میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ شعر سنایئے گا:

ترا کہ زور بیازوے تیغ نان باقیست   بگیر تیغ کہ آں حسرت کہن باقیست

فرمایا: یہ کیا۔ میں نے کہا یہ ہے:

من آں علم و ہنر را با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ گھبرا کر کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا۔ ارے میاں، یہ سب تو ہوا، اب کیا کہوں، آج تمہاری کلاس میں بیٹھ جاؤں، ذرا تمہارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا، اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا۔ فرمایا، السلام علیکم۔

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

(۱) اگر مضمون اچھا ہے تو میں ذمہ دار
(۲) اگر عنوان برا ہے تو حاجی صاحب ذمہ دار۔
(۳) اگر کتابت وغیرہ کی غلطی ہے تو نیاز صاحب ذمہ دار
(۴) اگر کل برا ہے تو ناظرین ذمہ دار

خط وکتابت و ترسیلِ زر میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے۔

رشید احمد صدیقی

پامالِ اشعار

جہاں مذہب کا چرچا ہوگا وہاں اولاد کی کثرت ہوگی۔ اور جہاں یہ دونوں ہوں گے وہاں شاعری کی وبا پھیلے گی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں جہاں آبادی کی کثرت ہوگی وہاں روزی کی قلت ہوگی اور جہاں روزی کم ہوگی وہاں شعرا زیادہ ہوں گے اور جہاں ایسا ہوگا وہاں روس یا امریکہ کبھی ہوگا۔ اس لیے کہ روس میں شاعری کا دخل نہیں اور امریکہ میں روزی کی کمی نہیں۔ ایسے موقع پر ہم غیر مذہبی جمہوریہ نژادوں کو بے اختیار یا تو خدا یاد آتا ہے یا اردو کے اشعار۔ کبھی کبھی دونوں مثلاً یہی ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

شعر ہماری زبان پر ایسے ہی بے تکلف یا بے لگام آتا ہے جیسے جھوٹ معلوم نہیں کس پلان یا شرم دان کی زد میں آکر ہم نے کبھی شعر گوئی یا شعر خوانی شروع کی تھی کہ بقول اقبال (با ندک تصرف) ؎

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں شعر ؛ دشت و در میں کوہ میں، گلشن میں ویرانے میں شعر

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے زندگی اور ادب میں شعر پڑھے لکھے بغیر سانس لینا محال ہو۔ "دنیا جہان میں" شاید ہی کوئی ایسی قوم یا ادب ملے جس کے اعصاب پر اشعار اس طرح سوار ہیں جیسے ہمارے ہاں۔ اسی اعصاب پر سوار ہونے کو دیکھ لیجیے کن کن دشواریوں سے اقبال کے مشہور شعر کو یہاں پڑھنے لکھنے سے اپنے کو باز رکھ سکا ہوں۔ جہاں انہوں نے عورت کو یہاں کے شاعروں اور صورت گروں پر سوار بتایا ہے کچھ اسی طرح جیسے اردو کی پرانی جنتریوں میں "نوروز عالم افروز" موش یا مینڈک پر سوار عالم غیب سے برآمد ہوتے دکھائے جاتے ہیں۔ لباس کا رنگ کچھ ہوتا ہے۔ رخ کسی جانب ہوتا ہے اور دونوں ہاتھوں میں بھی کچھ "متفرقات" ہوتے ہیں جناب نوروز کو اس عالم میں دیکھ کر اختر شناس کچھ اس طرح کا حکم لگاتے ہیں کہ کہاں لڑائی ہوگی کہاں قحط پڑے گا طلبہ کس طرح نعرے لگائیں گے۔ والدین کتنے فاقے کریں گے اور مزدور کیسے فلمی گاتے گائیں گے۔ عشاق بنگلے سے اور ہم آپ روس یا امریکہ سے کیا فیض پائیں گے شعر خوانی کے اسی آشوب سے بچنے بچانے کے لیے اب اس طرح کے اشعار کو رواج دیا جا رہا ہے جن کے لیے نہ شاعر کو اعصاب کی ضرورت پڑے نہ سامع کو مثلاً آزاد نظم وغیرہ۔

معلوم نہیں وہ کونسی ساعت تھی جب کسی نے چند ایسے بدنصیب اشعار کہہ دیئے جن کو بعد میں آنے والوں نے اس طرح چرخ پر رکھا کہ مقررہ ساعت یا موقع کے آنے کے ساتھ اس شعر کا لازم یا اعلان خود بہ خود ہونے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ موقع اور موضوع کی صرف جھلک مل جائے مقررہ شعر کہیں کسی حال میں ہوگا کھینچ بلایا جائے گا اور "عرض" کردیا جائے گا، یہ مرض لکھنے ہی میں نہیں بات چیت کرنے میں بھی نمایاں ہے آپ تھوڑی سی توجہ سے کام لیں تو تحریریں کم سے کم آٹھ دس سطر پہلے اور تقریریں دو تین منٹ پہلے بتا دیں گے کہ مقالہ نگار یا مقرر کونسا شعر لکھنے یا پڑھنے والا ہے جس کے لیے یہ تمام چہرہ باندھا جارہا ہے اگر اس موقع پر آپ کے ذہن میں ایک سے زیادہ اشعار آئیں تو یقین رکھیئے کہ وہی شعر استعمال میں آئے گا۔ جو نسبتاً زیادہ پامال ہوگا۔

اس طرح کی حرکت بات چیت میں بھی ملے گی اچھے خاصے "پڑھے لکھے" لوگ پامال شعر اور کلمات اس فخر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جیسے ان کے مصنف وہ خود تھے اور ان کو استعمال کرنے کے بعد وہ دوسروں سے بڑھا ہوا ممتاز ہو گئے۔ دراصل یہ بڑے اچھے اشعار ہوتے ہیں۔ لیکن سطحی ذوق رکھنے والوں کے ہاتھوں رسوا ہو جاتے ہیں جس طرح شریفوں کی محفل میں نامعقول اور نا ملائم الفاظ کا استعمال بُرا ہے! اسی طرح ان کی صحبت میں بے تکے اشعار پڑھنا اور اسی طرح فقروں کو کام میں لانا بھی بدمذاقی ہے۔ البتہ میں ان لوگوں کا احترام کرتا ہوں بلکہ ان پر رشک کرتا ہوں جو غیر معروف اور تقریباً ان سنے اشعار اس درجہ برمحل استعمال کرتے ہیں کہ پہلے سے اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان میں اتنی جان تھی! بڑائی اس میں ہے کہ اپنے ذوق و ذہانت سے گمنام کمزور اور معمولی اشعار میں جان ڈال دی جائے نہ یہ کہ اپنی بدتوفیقی سے (جو نادانستہ بھی ہو سکتی ہے) اچھے اور مشہور اشعار کو سربازار بے وقعت کردیا جائے۔

تقسیم ملک کے بعد بعض تحریکوں کا بروئے کار آنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً "آوارہ گرد اشعار" کا پتا لگانا کہ یہ کس شاعر کے ہیں یا کس شاعر سے منسوب ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ "آوارہ گرد اشعار کے ساتھ شعرا بھی کیا تم نہیں دیکھتے وہ شعرا وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں" آوارہ گرد ہو جاتے ہیں اور ہمسایہ ملکوں میں ان کی نقل و حرکت اور روٹی کپڑے کا مسئلہ بین الاقوامی پیچیدگی کا موجب بنتا جارہا ہے۔ اس کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ان آوارہ گرد شعرا کا قبیلہ بنی اسرائیل کے بعض قبیلوں کی طرح بے پتا ہو جائے اور ان کا سراغ لگانا تاریخ یا بشریات کے طالب علم کے لیے دردِ سر بن جائے۔

اب جب کہ لاسلکی، ہوائی جہاز، کلچرل کو یلگیشن اور انفلوئنزا نے دنیا کی طنابیں کھینچ کر ہر قوم اور ملک کو ایک دوسرے کا پڑوسی بنا دیا ہے ایک دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کا حق پیدا ہو گیا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ طاقتور ہمسائے کے ہاں "مردے از غیب" کی طرح حق ناحق سے برآمد ہو جاتا ہے اور "کارے بکند" شعرا کی درآمد برآمد پر ہر ملک پابندیاں عائد کرنے پر یوں مجبور ہے کہ دنیا کا کوئی قانون شعر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ شاید اس لیے کہ شعرا کا سب کچھ پہلے سے بگڑا ہوتا ہے اور خود یہ دنیا کے جس قانون کو چاہیں بگاڑ دیں اس خطرے کا احساس کرکے بعض حلقوں میں ایسے بدمذاقوں

کی مانگ بڑھ گئی ہے جو کسی شاعر کے شعر کو بار بار اور بے ضرورت پڑھ لکھ کر اس شعر کے اثر اور اس کے مصنف کی حیثیت کو یکسر غارت کر سکتے ہیں اس طرح آپ دیکھیں گے کہ شعرا یا شاعری کی سمیت کو سوسائٹی کے نظامِ جسم میں باطل کر دینے کے لیے وہی اصول برتا جانے لگا ہے جو انجکشن کا ہے یعنی ہر مرض کے فرعون کے لیے اسی کا موسیٰ نظامِ جسم میں پیدا کر دیا جائے!

یہ تو رہا اشعار اور شاعروں کا قصہ۔ تقسیم ملک کے بعد اور اس کے نتیجے کے طور پر ایک تحریک اور برسرِ کار ہے یعنی جس طرح مغویہ عورتوں کا پتا لگا کر ان کے وطن اور ورثا کے ہاں پہنچا دیتے ہیں اسی طرح زبانوں میں اس کا پتا لگایا جائے کہ کون کون سے اور کتنے الفاظ ایسے ہیں جن کو اغیار یا اقربا بھگا لے گئے ہیں یا لے بھاگے ہیں یا جنھوں نے خود کچھ شعور تھوڑا بہت نیم شعور اور بقیہ لاشعور کی زد میں آ کر غیر کنبے سے ناتا جوڑا۔ ایسوں کو بھی دھوپ دھونی دے کر اپنانے کی کوشش کی جائے ورنہ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔

کسی شاعر کی اہمیت اور شہرت کا اندازہ اس سے بھی کرتے ہیں کہ کس کے کتنے اشعار زبان زد ہو گئے ہیں اسی طرح ان اشعار کی بدنصیبی کا بھی اندازہ کیا جاتا ہے جو بے شمار ایسے لکھنے یا تقریر کرنے والوں کا تختۂ مشق بن گئے ہیں جن کے خوش مذاق ہونے کے بارے بمشکل کلمۂ خیر کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہماری ذہنی کم مائیگی کی دلیل ہے کہ خود سوچنے اور نئی راہیں دریافت کرنے کی بجائے ڈھرے پر لگے رہنے کے خوگر ہو گئے ہیں جس طرح نوجوان لڑکے لڑکیاں مشہور ایکٹر ایکٹرسوں کی سج دھج لباس اور اس قسم کی دوسری باتیں اختیار کر کے "نقل مطابق اصل" نہیں بلکہ "اصل مطابق نقل" کے قائل ہو جاتے ہیں اسی طرح معمولی یا مشہور شعرا کی نکالی ہوئی زمین یا ان کے اختیار کیے ہوئے عنوان کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرتے ہیں اور ہم آپ سے پوچھے بغیر یقین کر لیتے ہیں کہ انھوں نے ان شعرا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ لیکن اس پر غور کرنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہوتے کہ وہ خود دوم یا سوم درجے کے شاعر نہ ہوتے تو اول درجے کے شعرا کی نقل کیوں کرتے۔ اس کہنے سے یہ مقصد نہیں کہ ایک ہی بحر، قافیہ، ردیف یا موضوع پر دو یا زائد شاعروں کو طبع آزمائی نہ کرنا چاہیے۔ اس طرح کی مثال صفِ اول کے شعرا کے یہاں بھی ملتی ہے۔ اور کثرت سے ملتی ہے، بڑے شعراء کی پیروی کرنا بھی بری بات نہیں کہنا صرف اتنا ہے کہ اس طرح کی پیروی کو نہ تو پیشہ بنانا چاہیے نہ اپنے بارے میں غلط رائے قائم کر لینا چاہیے۔

جوش کی مشہور نظم پروگرام "زنداں میں ملے گا، ایواں میں ملے گا" لوگوں کو ابھی بھولی نہ ہوگی اس کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے ہر طرح کے شعرا طبع آزمائی یا قسمت آزمائی کے لیے اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح ڈھور کے کھانوں پر ندیدے گرتے ہیں بالخصوص لکھے پڑھے کھاتے پیتے ندیدے اور سب نے اس یقین کے ساتھ فکرِ سخن فرمایا کہ اس کے بعد تمام دوسرے شعرا (جوش سمیت) منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جائیں گے لیکن ہوا صرف اتنا کہ ثانی کی نظم کے سوا جو ان کے رنگ میں منفرد تھی بقیہ تمام شعراء کی نظموں کا "طعامِ غنیام" کسی قدر کے حافظے میں چند دنوں تک بھی نہ رہ سکا۔ شاید ان کی اپنی نظموں کا خود ان کے حافظے میں بھی!

اقبال کا وہ شعر ہم سب کو یاد ہے جس میں "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" کرنے کے لیے نرگس کو ہزاروں

سال سے رونے پر مامور کر رکھا ہے۔ مقرر یا مقالہ نگار جن صاحب کو بڑا دکھانا چاہتے ہیں (جس میں کبھی خود اقبال بھی شامل کر لیے جاتے ہیں) ان کی شان میں شعر پڑھ یا لکھ دیتے ہیں اور وہ صاحب رات ہی بھر میں کیمل نہ سہی دیدہ ور تو بن گئے ہوں غریب نرگس کے رونے کی ہزار سال مدت میں کوئی تخفیف نہیں کی جاتی۔ لکھنے والا اور اس کا ہیرو دونوں ہی کتنے گئے گزرے کیوں نہ ہوں یہ شعر ضرور پڑھا جائے گا اس لیے کہ کسی دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پامال شعر سے زیادہ بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے!

دس گیارہ سال ہوئے جب ملک میں سیاسی ہیجان و طغیان انتہا کو پہنچ چکا تھا اقبال کے دو اشعار کا بڑا چرچا تھا۔ ایک تو وہ جس میں انہوں نے بندوں یا نوجوانوں کو کچھ اس قسم کی بشارت دی تھی کہ وہ اپنی خودی کو بلند کر لیں تو خدا ہر تقدیر سے پہلے ان کی رضا حاصل کر لیا کرے گا۔ نوجوانوں نے اس بشارت کی کہاں تک پابندی کی یہ تو نہیں معلوم ہوا۔ البتہ یہ محسوس ہونے لگا کہ یا تو نوجوانوں نے اس شرط کا لحاظ کرنا ترک کر دیا تھا یا پھر خدا نے شرط واپس لے لی تھی۔ بات تعجب کی نہ تھی۔ اس لیے کہ لڑائی کے زمانے میں ارباب حکومت اور محکمہ تعلیمات دونوں تعلیم و تربیت کا معیار اور مدت کم کر دیتے ہیں تاکہ کام کرنے والے جلد جلد اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں میسر آ سکیں۔ انجینیرنگ میڈیکل اور فوجی کالجوں میں ایسا دیکھا گیا ہے چنانچہ خودی کا معیار گھٹاتے گھٹاتے ختم ہی کر دیا گیا ہو تو کیا عجب۔ جنگ کے تقاضے سب کچھ کراتے ہیں۔ دی محاربے کی شدت اور قوت بڑھی تو فوجی پالیسی اور پروگرام کی رُو سے بھرتی ہونے والوں کی عمر بھی بڑھا دی گئی۔ چنانچہ نوجوانوں کے ساتھ ان کے چچا ماموں خسر اور خالو وغیرہ سبھی جن کی خودی یا خواری پہلے سے مکمل ہو چکی تھی میدان میں آ گئے اور اپنی تقدیر اپنی رضا کے مطابق بنانے کے علاوہ دوسروں کی تقدیر بگاڑنے کا مزید منصب اختیار کر لیا اب صورتِ حال یہ ہو گئی تھی کہ اللہ تعالےٰ ان کی رضا کا خواستگار نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ خود اپنی رضا کا اعلان کر کے دفتر سے اس کی نقل اللہ تعالیٰ کے پاس بھیج دیتے یہ اقبال کے دوسرے شعر کا دور تھا جس میں انہوں نے بشارت دی تھی کہ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی کیا۔ ہندو کیا مسلمان اس شعر کے مبلغوں نے غریب ہنستے معصوم بچوں پر جو تباہی ڈھائی، نوجوانوں کو جس طرح برباد اور بوڑھوں کو بے وال وارث کیا اور بے شمار خاندانوں کی جان و مال اور آبرو جس بے دردی سے لوٹی گئی ہے ممکن ہے اس کا مرثیہ اس طرح لکھا جائے جیسا دلی کا لکھا گیا ہے اس زمانے میں ان دونوں اشعار سے اردو کا کوئی اخبار رسالہ تقریر خط و کتابت، اٹھنا بیٹھنا خالی نہ تھا۔ قطع نظر اس تباہی کے جن سے کتنے بے گناہوں کو گزرنا پڑا۔ موقع بہ موقع ہر کس و ناکس کی زبان اور قلم پر آنے سے ان دونوں اشعار کی وقعت مضحکہ خیز حد تک گر گئی۔

یہ دو ایک مثالیں صرف اقبال کے کلام سے دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ خاصی تعداد میں دوسرے شعرائے اردو اور فارسی کے اسی طرح کے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن ایسا کیا گیا تو یہ سلسلہ بہت طویل ہو جائے گا۔ خود ناظرین کے ذہن میں اس قبیل کے بے شمار اشعار ہوں گے جن کی بدنصیبی یا ان کو آنکھ بند کر کے استعمال کرنے والوں کی بد توفیقی پر یقیناً ماتم کیا جا سکتا ہے ذیل میں اس طرح کے کچھ اشعار ضرب الامثال فقروں یا مصرعوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ بخدا یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ، للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست:

ہر خوشۂ گندم کو جلا دو، ہر بلتیں جب مٹ گئیں، بنی آدم اعضائے یکدیگر اند. شاعری جزویست از پیغمبری، عدی را تیز تر می خواں، نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد، کعبہ میں کالا ڈو برہمن کو، بیمار کا حال اچھا ہے، آفاق میں کافر کا اور مومن میں آفاق کا گم ہونا وغیرہ. میں درخواست کروں گا کہ کچھ اور نہیں تو سالِ رواں کے آخر تک پامال اشعار اور کلمات کے استعمال سے جہاں تک ممکن ہو باز رہیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی ترغیب دیں کہ وہ باز رہیں. ایک دفعہ پھر میں یہ اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اشعار بڑے اچھے ہیں صرف بے تکے اور بے ٹکان استعمال سے ایک ہو گئے ہیں. یعنی تازہ اور کافی خون کی کمی کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں اگر ان کو کچھ دنوں آرام کرنے کا موقع دیا جائے تو اُمید کی جاتی ہے. ان کی صحت بحال ہو جائے گی!

طنز و مزاح پارے

رشید احمد صدیقی

★ "جہاں مذہب کا چرچا ہوگا وہاں اولاد کی کثرت ہوگی اور جہاں یہ دونوں ہوں گے وہاں شاعری کی وبا پھیلے گی. یوں بھی کہہ سکتے ہیں جہاں آبادی کی کثرت ہوگی وہاں روزی کی قلت ہوگی اور جہاں روزی کم ہوگی وہاں شعراء زیادہ ہوں گے. اور جہاں ایسا ہوگا وہاں روس یا امریکہ بھی ہوگا. اس لیے کہ روس میں شاعری کا دخل نہیں اور امریکہ میں روزی کی کمی نہیں." (مضمون: نیا سال اور پامال اشعار)

★ "شعر ہماری زبان پر ویسے ہی بے تکلف یا بے لگام آتا ہے، جیسے جھوٹ"..... (مضمون: نیا سال اور پامال اشعار)

★ "بڑے لیڈر اور بڑی حکومت پہچانی ہی اس اعتبار سے جاتی ہے کہ اس کے تصرف میں کتنے احمق ہیں"
(مضمون: اپریل فول)

★ "یہ کوئی ڈاکٹری نسخہ تھا اور کسی لیڈی ڈاکٹر نے لکھا تھا...... یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ مرض کا نام تھا یا مریض کا!" (مضمون: سویرے سے جو آنکھ کھلی)

★ "عام طور پر میں یا آپ (آپ کم میں زیادہ) بیوی میں وہ خوبیاں تلاش کرتے ہیں جو مجھ میں آپ میں ڈھونڈھے تک نہیں ہوتیں. بیوی ملے تو ایسی یعنی جوان، خوبصورت، تندرست، دولت مند، سمجھدار، نیک، کم سخن اور ــــ لاوارث! لاوارث اس لیے کہ اس کا کوئی وارث ہوا تو ایسی متاعِ بے بہا کو میرے آپ کے سپرد کیوں کر کر دے گا!" (ریڈیائی تقریر: بیوی سے متعلق)

رشید احمد صدیقی

بدیہی

اگلے زمانہ میں جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئی لوگ عبادت کرنے لگتے تھے اس کے بعد شعر کہنے لگے۔ اب لڑنے لگتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ آدمی اپنے آپ کو دھوکا دیئے بغیر جی نہیں سکتا۔ چاہے دھوکا اپنے آپ کو دیا جائے چاہے کسی دوسرے کو۔ چاہے وہ ادنی درجہ کا دھوکا ہو چاہے اعلیٰ درجہ کا۔ غرض بغیر اس کے زندگی بسر نہیں ہو۔ کوئی دوسرا ہم کو دھوکا دے تو ہم برا مانتے ہیں لیکن خود اپنے آپ کو دیں تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔ جتنا بڑا دھوکا اپنے کو دیتے ہیں اتنا ہی زیادہ خوش ہوتے ہیں جیسے کسی دوسرے کو دے رہے ہوں۔ "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے" غالب اور ان کی شراب کا اتنا ترجمان نہیں جتنا ہمارا آپ کا سب کا، جن میں کالا چور بھی شامل ہے۔

ہر شخص کی ہر خواہش دنیا کی کوئی طاقت پوری نہیں کر سکتی۔ جو شخص جتنا بڑا احمق یا نالائق ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اپنی ہر خواہش کے پورا کرنے پر زور دے گا۔ لیکن دنیا میں کون ایسا ہے جو کسی نہ کسی حد تک یا کسی نہ کسی معاملہ میں احمق یا نالائق نہ ہو۔ میں تو دونوں ہوں اس لیے عورت اور بیوی دونوں سے نباہ کر سکتا ہوں۔ پھر تھوڑا بہت احمق یا نالائق نہ ہوئے بغیر کیسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی"!

سوال اتنا بیوی کا نہیں ہے جتنا کہ عورت کا۔ مرد، عورت چاہتا ہے بیوی پاتا ہے کبھی بیوی چاہتا ہے عورت پاتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ایک انتظام میں جو سوسائٹی افراد سے یا افراد سوسائٹی سے لیتے ہیں۔ فرد اور سوسائٹی کی آویزش و آمیزش سے زندگی کی گاڑی معلوم راستے سے نامعلوم منزل کو چلی جارہی ہے۔ کبھی تیز گام چلی اور کبھی۔ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں! اس سفر پر جس کی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

اتنی دیر تک اس طرح کی باتیں سننے کا کوئی متحمل نہیں ہو سکتا۔ جہاں نقاد بھی نعرے لگانے لگے ہوں وہاں شعر و ادب کی خیر کب تک کوئی منائے گا۔ اچھا چھوڑیئے اس قصہ کو۔ آپ نے عورت کی تخلیق یا شانِ نزول کا ایک لطیفہ یا روایت تو سنی ہوگی یعنی جب مرد وجود میں آگیا تو کچھ مدت بعد زندگی کی بے کیفی سے تنگ آکر برہما کے حضور میں حاضر ہوا اور اپنی زار و زبوں زندگی کا حال سنا کر فرمائش کی کہ اس کی تفریح و تسکین کا کوئی سامان پیدا کر دیا جائے۔ برہما کے پاس تخلیق کا کوئی سامان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے تمام موجوداتِ ارضی و سماوی سے تھوڑی تھوڑی چیزیں یا خاصیتیں اٹھائیں اور عورت کی تشکیل کر دی۔ مثلاً کسی سے رنگ، کسی سے روشنی کہیں سے گرمی، کہیں۔

گداز، کہیں سے شوخی، کہیں سے شگفتگی، کہیں سے بھولا پن، کہیں سے اوچھا پن، کسی سے تواضع، کسی سے تجبر، کہیں سے نرمی، کہیں سے سختی، کہیں سے گرفت، کہیں سے گریز، کہیں سے دھوپ کہیں سے چھاؤں کسی سے مشفقت۔ کسی سے شقاوت۔ کہیں سے شرار کہیں سے شبنم اور عورت کی شکل اور سیرت دے کر اس عجیب و غریب مجموعہ کو مرد کے سپرد کر دیا۔

مرد اسے پا کر بہت خوش ہوا لیکن جلد ہی اکتا کر برہما کے پاس پہنچا اور فریاد کی کہ خداوند اسے واپس لے لیا جائے۔ اس نے اپنی جھک جھک اور بک بک سے زندگی دوبھر کر دی۔ برہما نے عورت کو واپس لے لیا۔ اور مرد خوش ہو کر لوٹ آیا۔ لیکن جلد ہی پھر زندگی میں خلا محسوس کرنے لگا اور برہما کے آستانہ پہ حاضر ہو کر عرض کی خدایا! عورت کو واپس کر دیا جائے۔ بغیر اس کے زندگی روکھی اور ویران ہے۔ برہما نے التجا قبول کی اور عورت کو حوالہ کر دیا۔ لیکن ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ وہ پھر برہما کے حضور میں پہنچا۔ اور گڑگڑانے لگا۔ الٰہا نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اس مصیبت کو تو واپس ہی لیا جائے۔ ہم نے تجھ سے آسائش طلب کی تھی تو نے آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ ہم نے تجھ سے انعام چاہا تھا۔ تو نے ہمارا انجام سپرد کر دیا۔ یہ تو تجھ سے بھی زیادہ خدمت کی طلب گار رہتی ہے۔ تیری عبادت اور اس کی خدمت، خاکم بدہن اتنا بار اور ایسوں کا بار ہم سے نہیں اٹھ سکتا۔ برہما نے کہا بھاگ جاؤ۔ اب اسے واپس نہیں لیا جائے گا۔ یہ کیا مذاق بنا رکھا ہے کہ نہ اس کے ساتھ تم رہ سکتے ہو نہ اس کے بغیر رہ سکتے ہو! اس کے بعد کی ایک ضعیف سی روایت یہ ہے کہ چلتے چلتے مرد نے کہا۔ خداوندا جو تیری مرضی ہو۔ لیکن ہماری حالتِ زار پر بھی نظر رکھو! ہم تیرے بغیر یا تیرے ساتھ بھی تو نہیں رہ سکتے! سنتے ہیں اس پر برہما سوچ میں پڑ گئے۔ پھر مسکرائے ــــ اور عورت سے شادی کر لی! کہتے ہیں برہما اس کے بعد پھر کبھی نہ مسکرائے۔

شوہر اور بیوی کے تعلقات کو اس لطیفہ کی روشنی میں پرکھتے رہنے سے "بہتوں کا بھلا ہوگا" بشرطیکہ اشتہاری دوا اور اشتہاری بیوی دونوں سے بچتے رہیں!

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ عورت مرد کی پسلی کی ہڈی سے پیدا کی گئی اور عورت ہی مرد کو اغوا کر کے اس دنیا میں لائی۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ شیطان نے عورت کے ذریعہ مرد کو بہکایا اور گیہوں کھانے کی پاداش میں مرد عورت اور شیطان تینوں آسمان سے زمین پر پھینک دیئے گئے۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہیں میں گیہوں کھانے کھلانے میں بڑی احتیاط برتنے لگا ہوں بالخصوص جب سے امریکہ سے گیہوں آنے لگا ہے!

میں روایات کا بڑا احترام کرنے لگا ہوں۔ اکثر خدا کے خوف سے کبھی کبھی مولویوں کے ڈر سے۔ لیکن اکثر میرے دل میں یہ وسوسہ بھی گذرا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیطان کو عورت نے دھوکا دیا ہو۔ یہ بات میرے دل میں شیطان نے یقیناً نہیں ڈالی ہے۔ شیطان اتنا کم ظرف نہیں کہ وہ عورت کے دھوکا پر پولیس میں رپٹ لکھوائے یا اردو کے سستے بازاری اخبارات میں مضمون لکھنے لگے یہ بات میرے دل میں اس لیے آئی کہ میرا دل چاہتا ہے۔ کہ ایسا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔ میں اس کی کوئی دلیل نہیں دے سکتا دلیل کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں۔ جی چاہنا خود کیا کم دلیل ہے۔ میں عورت کا تو یقیناً دوست ہوں اور شیطان کا بھی خواہ مخواہ دشمن نہیں ہوں۔ اس لیے کہ ان دونوں کے بغیر زندگی بقول ایک بزرگ کے جو انگریزی کے دو ہی چار الفاظ سے واقف لیکن ہر انگریزی دان پر بھاری ہیں "شو دار ہو پھر رونق)

نہیں رہتی۔ انہیں دوست کا قصہ ہے۔ کسی خاتون کو دیکھ آئے تھے۔ بولے "رشید صاحب آپ نے ۔۔۔۔ کو دیکھا ہے" میں نے کہا دیکھا ہے۔ بولے واللہ غضب کی "ایبل فیشن" ہے! میں نے دوست کے انتخاب کرنے میں اکثر دھوکا کھایا ہے لیکن دشمن کا انتخاب کرنے میں غلطی نہیں کی۔ اس لیے اس کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ سوسائٹی کے ناقص ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اچھے دشمن نایاب ہوں!

میں عورت کو عزیز رکھتا ہوں۔ شاید اسی لیے بیویاں مجھے بالکل عزیز نہیں رکھتیں۔ عورت کو عزیز رکھنے کی بنا پر میں چاہتا ہوں کہ شیطان کو دھوکا دینے کا سہرا اسی کے سر رہے۔ دھوکا دینا بجائے خود کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن عورت کا شیطان کو یا اس خاکسار کو دھوکا دینا بیویوں کو پسند ہو یا نہ ہو۔ مجھے تو پسند ہے ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ مجھ میں شیطان موجود ہے۔ البتہ میں عورتوں کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ وہ دھوکا دینے کی کوشش کریں۔ اس لیے کہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ وہ دھوکا دے نہیں پاتیں کھا یقیناً جاتی ہیں۔ اور ترقی پسندوں کو اللہ واسطے بے قافیہ نظمیں کہہ کر جوابدہی کرنی پڑتی ہے۔

بیوی ملے تو ایسی یا بیوی ملی تو ایسی یا بیوی نہ ملے تو کیسی! سوالات کا سلسلہ ہے بیویوں کی اقسام نہیں۔ ان میں ایک ارمان ہے دوسری شامت اور تیسری ماتجیر شما سلامت میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تینوں میں کون سی بات ایسی ہے جس پر مجھے گفت گو کرنی ہے گفتگو تو بہرحال کرنی ہے۔ اس لیے اور کہ جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے اس وقت بات کرنا اور کیے جانا ضروری ہوجاتا ہے بالخصوص جب بیویوں سے متعلق بات کرنی ہو۔ اس لیے کہ میں نہ کروں گا تو خود بیویاں بات کرنے لگیں گی اور سنا یہ گیا ہے کہ بیویاں بات کرنے پر اتر آتی ہیں تو فرشتے دنیا سے اٹھا لیے جاتے ہیں۔ اور کوئی دوسرا بیویوں سے متعلق گفت گو کرے تو فرشتے خود بخود ادھر ادھر ہوجاتے ہیں۔ فرشتہ خصلت شوہر بھی!

آج کے موضوع یعنی بیوی ملی تو ایسی پر گفت گو کرنے کا وعدہ مجھ سے ایک خاتون نے لیا تھا۔ خاتونوں سے جو وعدہ کیا جائے اس کا پورا کرنا میرے نزدیک کوئی ایسا گناہ بھی نہیں۔ اس لیے کہ خاتون کا قانون سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اور جہاں قانون نہیں وہاں گناہ نہیں۔ جس کی بعض مفسروں نے یہ بھی تعبیر کی ہے کہ جہاں قانون نہیں وہاں گناہ نہیں یا جہاں گناہ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں! میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر اس بارے میں کوئی قانون بھی ہو تو وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ سزا نہیں دے سکتا اس لیے کہ اگر کسی شخص سے کوئی جرم اپنے تحفظ یا سخت اشتعال یا سراسیمگی اور مایوسی میں سرزد ہوجائے تو عدالت ملزم کو بالکل بری نہیں کردیتی تو سزا میں یقیناً بہت کچھ تخفیف کردیتی ہے۔ خواتین سے وعدہ کرلینا بھی کچھ اسی طرح کی بات ہے!

لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ ریڈیو کا محکمہ خواتین کے معاملہ میں اتنا سخت گیر ہوگا کہ مجھے گرفتار کرکے آپ کے سامنے پیش کردے گا ریڈیو کا کہنا یہ ہے کہ حفاظت خود اختیاری وغیرہ برحق لیکن حماقت کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ حماقت کا پوائنٹ ایسا ہے۔ جیسے میں نے نہایت فخر کے ساتھ تسلیم کرلیا۔ اس لیے کہ حماقت کرنا میں اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہوں، اور اسے کسی قیمت پر کسی کے حوالہ کرنا نہیں چاہتا بالخصوص جہاں عورتوں کا پیچ ہو یا پولیس بیچ بچاؤ کررہی ہو!

یں نے ابھی ابھی بتایا تھا کہ جب بات سمجھ میں نہ آئے تو بات کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ
ہوتا ہے کہ دوسرے کی سمجھ میں بات نہیں آنے پاتی ۔ بے سمجھے بات کرنا اور پٹنے سے بچ جانا بڑا فن ہے
ر پٹتے جانا، لیکن بات بنائے جانا بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے اسے کوئی "روایت" کے نام سے موسوم کرتا ہے
کوئی "تجربہ" سے۔ لیکن ریڈیو پر گفتگو کرنے میں ایک بڑی آسانی یہ ہے کہ آپ کو کوئی پیٹ نہیں کر سکتا
۔ سننے والوں کا حافظہ اتنا قوی نہیں ہوتا کہ جب آپ برآمد ہوں تو ان کو یاد رہے کہ وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک
۔ نا چاہتے تھے۔ خود میرا خیال یہ ہے کہ جب میرا حافظہ کمزور ہوا ہے میں نے جھوٹ بولنا ترک کر دیا ہے یہ اور
ت ہے کہ آپ میرے سچ کو کبھی جھوٹ سمجھ کر ہنستے ہوں اور میرے جھوٹ کو سچ سمجھ کر خواتین مجھے دعائیں دیتی
ں اور آپ دونوں کو دیکھ کر پیچھے تالیاں بجاتے ہوں!

عام طور پر میں یا آپ (آپ کم میں زیادہ) بیوی میں وہ خوبیاں تلاش کرتے ہیں جو مجھ میں آپ میں دُور دُور
ںا ہوتیں بیوی ملے تو ایسی "یعنی جوان خوبصورت، تندرست، دولت مند، سمجھ دار، نیک لکھی پڑھی اور
۔ لاوارث! لاوارث اس لیے کہ اس کا کوئی وارث نہ ہوا تو وہ ایسی متاعِ بے بہا کو میرے آپ کے سپرد
ہوں کر دے گا!

دُنیا میں ایسی بیویاں ہوتی کہاں ہیں۔ ممکن ہے پیغمبر ایسے ہوتے ہوں۔ شاید اسی وجہ سے عورتوں کو
بری نہیں دی گئی۔ لیکن اپنی یا آپ کی خاطر نہ سہی بیویوں کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان خوبیوں کی بیویاں
.تی ہیں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی بیویاں میری یا آپ کی نہیں ہوتیں۔ دوسروں کی ہوتی ہوں گی۔
، لیے کہ اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ نری بیویاں تو ہمارے آپ کے حصہ میں آتی ہیں اور ان کی خوبیاں دوسروں
حصہ میں۔ عبادت میری حوریں آپ کی!

بیوی کی ان خوبیوں سے جو میں ابھی گنا آیا ہوں اگر شوہر کو فائدہ پہنچ جائے تو میرا آپ کا کیا اجارہ۔
ن ساری خوبیوں کے باوجود یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میاں بیوی کے تعلقات "بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے
ھا تو یہاں تک گیا ہے کہ معقول مرد اور معقول عورت اچھے میاں بیوی نہ بن سکے اور نامعقول مرد اور
معقول عورت اچھے میاں بیوی ثابت ہوئے۔

شوہر اور بیوی کا خون کا رشتہ نہیں ہوتا۔ قانون اور اخلاق کا ہوتا ہے جسے مانیئے تو سب کچھ اور
مانیئے تو کچھ بھی نہیں لیکن خون کا رشتہ مانیئے یا نہ مانیئے اپنا رنگ دکھا کر رہتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری
ں کہ محض شوہر اور بیوی ہو جانے سے دونوں کے تعلقات پائیدار اور خوشگوار ہوں۔ خواہ یہ شوہر اور
ی غزلیات سے برآمد ہوئے ہوں خواہ بے قافیہ نظموں سے۔ خواہ چور بازار سے! پھر ہم میں ایسوں کی بھی
ں نہیں جو ان خوبیوں کی عورت کو بیوی بنا کر اپنی خوبیوں کو کہیں اور تلاش کرتے پھرتے ہیں ایسے لوگ تمام عمر
۔ شعر پڑھتے رہتے ہیں یا چولہے پر بیٹھے رہتے ہیں بات دراصل یہ ہے کہ مرد عورت، شوہر بیوی بننے کے بعد
نقاب ہوتے ہیں۔ پہلے نہیں اور نقاب کا چکر کوئی معمولی چکر نہیں ہے۔ غالب نے جو یہ کہا ہے۔ ؎
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں ؎ زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

شاعری میں تو ممکن نہیں ہے شادی میں

یہ جو بتایا جاتا ہے کہ اس عمر میں اس عمر کی بیوی موزوں یا مفید ہوتی ہے۔ اور اس عمر میں اس عمر کی یا شوہر کے لیے بیوی جوانی میں کچھ اور ہوتی ہے اور بڑھاپے میں کچھ اور ممکن ہے سچ ہو۔ یعنی بعض دواؤں کی مانند بیویاں کسی درجہ میں گرم ہوتی ہوں اور کسی درجہ میں سرد یا کسی درجہ میں تر ہوتی ہوں اور کسی میں خشک یا ممکن ہے بعض مسہل کے خواص ہوں یعنی کم کھائیے تو قابض اور زیادہ کھائیے تو قبض کشا یا ملین یا صبح کھائیے تو سونا، سہ پہر میں چاندی اور رات ہمّا سیسہ بہرحال کچھ ہی ہو مجھے بیویوں کا یہ نسخہ ترکیب استعمال معلوم نہیں اور معلوم بھی ہو تو میں اس پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا اس لیے یہ آپ سب جانتے ہیں۔ کہ جب مقدمہ زیر سماعت ہو تو اس پر رائے زنی کرنا توہین عدالت کا موجب ہوتا ہے جو خطرہ سے خالی نہیں۔

جنسی جذبات بڑے قوی اور خطرناک ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان پر قابو رکھنے کے لیے شادی کے قوانین بڑے سخت رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جو مذہب جتنا قدیم ہے اس کے ہاں شادی کے قوانین اتنے ہی سخت رکھے گئے ہیں اور جو مذہب یا مسلک جتنا جدید ہے اس کے ہاں یہ پابندیاں اتنی ہی آسان ہیں۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ شادی کے قوانین کی سخت گیری کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب یہ اصول مانا جا رہا ہے کہ آدمی کے اس جذبہ کی روک تھام سے نقصان زیادہ اور فائدہ کم ہے۔ سائنس کی تحقیقات فطری قانون کا پتہ چلاتی ہے اور اس کی نوعیت بتاتی ہے۔ یہ تحقیقات اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن جس طرح قوانین فطرت پر قابو پانے کے لیے سائنسدان کوشش کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں اسی طرح حیوانی و شہوانی جذبات کی روک تھام کے لیے مذہب و اخلاق نے قاعدے منضبط کئے ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ سائنس کے قاعدے قانون چنانچہ میرا خیال یہ ہے کہ آدمی کے حیوانی جذبہ پر سے پابندیاں ہٹا لینا یا ہلکا کرتے رہنا صحیح و صالح نقطۂ نظر نہیں ہے۔ شادی کے قانون اور شہوت کے قانون میں فرق کرنا اور رکھنا ہر حال میں لازم آتا ہے!

یہاں اس بحث کی تفصیل میں پڑنے کا موقع ہے نہ ضرورت لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ کسی برائی کو فطرت کا تقاضا قرار دے کر رورعایت سے کام لینا ان بھلائیوں کے حق میں مضر ہے جو انسانیت کا تقاضا مانی گئی ہیں۔ آج کل یہی ہو رہا ہے۔ یعنی فطرت کے تقاضوں کو انسانیت کے تقاضوں پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ دنیا کو آج جن ہولناکیوں کا سامنا ہے اس کا بھید یہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اپنی خلقت کے اعتبار سے عورت ماں بننا چاہتی ہے لیکن مرد اُسے بیسوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس فطری المیہ کو ہلکا کرنے کے لیے قانون اور اخلاق نے شادی کا ادارہ قائم کیا۔ پھر بھی مرد اپنی شرافت کا اتنا قائل نہیں ہے جتنا عورت کے شباب کا۔ سارا جھگڑا اتنا اور اسی کا ہے۔ اس پر چاہے پرانی چال کے شعراء غزل لکھیں یا نئی چال کے شعراء بے نقط تصنیف فرمائیں یا یہ خاکسار ریڈیو پر گفتگو کرے بات جہاں کی تہاں رہتی ہے۔

بیوی میں طرح طرح کی خوبیاں تلاش کرنے والوں کی اکثریت کی نیت میں فتور ہوتا ہے۔ یا عقل میں۔ یعنی یا تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ بیوی اتنی بے وقوف ہو کہ وہ ان پر مرے اور یہ کسی اور پر مریں یا یہ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی خوبیوں کا مصرف یہی ہے کہ وہ شوہر کی بدچلنی پر پردہ ڈالتی رہے۔ بیوی کا حسن و شباب شوہر کی ہوسناکی سے کہیں زیادہ کم عمر ہوتا ہے۔ ایسے شوہروں

کو یہ لطیفہ تو معلوم ہی ہوگا کہ اپنی اولاد اور دوسرے کی بیوی ہمیشہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور محبوبہ کے عیب منکوحہ کے ہنر سے اکثر زیادہ دلکش ہوتے ہیں!

آخر میں اتنی بات کہنا چاہتا ہوں کہ زمانہ اور زندگی کے طور طریقوں کے بدلنے سے شوہر اور بیوی کے وہ آداب بھی بدل گئے جو پرانے زمانے سے چلے آ رہے تھے۔ مشینی دور میں ماورائی باتوں کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا ہے۔ عورت یا بیوی کے مسئلہ کو ماورائیت سے جدا کر کے دیکھنا کچھ اچھے آثار نہیں۔ اس مشینی دور میں عورت گھاٹے میں ہے۔ میرے نزدیک عورت کا چھوٹے سے چھوٹا نقصان بھی مرد کے بڑے سے بڑے نقصان سے زیادہ المناک ہوتا ہے عورت کا میرا تصور کچھ اسی طرح کا ہے۔ عورت میرا تصور چاہے جیسا رکھتی ہو۔!

طنز و مزاح پارے

——— رشید احمد صدیقی

★ "آج کل وہ زمانہ ہے جب روزگار ملنے کا امکان گھٹتا جا رہا ہے اور بیوی ملنے کا خدشہ بڑھتا جا رہا ہے۔"
(مضمون: ضرورت ہے)

★ "اگر لوگوں نے یہ کہا یہ عریاں یا فحش ہے تو کہہ دوں کہ تم سمجھتے نہیں یہ آرٹ ہے۔ اگر لوگوں نے کہا مہمل یا سرقہ ہے تو کہہ دوں گا کہ اسی کو ریسرچ کہتے ہیں۔" (مضمون: پاسبان)

★ "ڈاکٹروں نے مرض کو اور مولویوں نے مذہب کو ہوا بنا رکھا ہے۔" (مضمون: کاروان پیلاست)

★ "صاحبو! اردو، ہندی، ہندوستانی، ایک ہی زبان کے مختلف نام ہوں یا نہ ہوں اس بدنصیب ملک کے خوش نصیب لیڈروں کے لڑنے جھگڑنے کے مختلف بہانے ضرور ہیں۔" (خطبۂ صدارت اردو کانفرنس بریلی)

★ "پہلے زمانہ میں لوگ امام ضامن باندھ کر سفر کیا کرتے تھے۔ اب بیمہ کرا کے سفر کرتے ہیں۔" (خنداں)

★ "رقیب کو درمیان سے اٹھا لیا جائے تو دنیا کے ڈرامے میں ہیرو ہیروئن، میاں بیوی بن کر رہ جائیں اس کے معنی یہ نہیں کہ میاں بیوی بننا کوئی نامعقول بات ہے اور ہیرو ہیروئن بننا کوئی بڑے فخر کی بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب کا عنصر حذف کر دینے کے بعد عشق و محبت کی حیثیت وہی رہ جاتی ہے جو سورج نکلنے سے پہلے تاروں کی بنائی جاتی ہے۔"

(مضمون: اردو شاعری میں رقیب)

رشید احمد صدیقی

گھاگھ

گھاگھ کی ہیئتِ تحریری اور ہیئتِ صوتی دونوں گھاگھ کو کسی تعریفِ منطقی کا محتاج . . . . نہیں کرتیں اگر اس کی کوشش کی جائے تو باوجود سعی دماغ سوزی کے کوئی اطمینان بخش نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ لیکن ہندوستانی بیوی اور برطانوی اقتدار کے مانند اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو پھر سب کچھ ہے اولاد بھی ہے اور افلاس بھی۔ خطابات بھی ہیں۔ اور مارشل لا بھی۔ گھاگھ کی منطقی تعریف منطق سے نہیں بلکہ تجربے کی جا سکتی ہے اور تجربہ وہ چیز ہے جس کو عقل مند صرف سمجھ لیتا ہے احمق برتنا چاہتا ہے اور یہ گھاگھ ... کا اولین اصول ہے کہ برتنے کے بجائے سمجھنے کی کوشش کرنا زیادہ مفید و محفوظ ہے۔ گھاگھ کی کوئی مخصوص تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے اگر ہر ایجاد کے لیے ایک ماں کی ضرورت ہے تو ہر ضرورت کے لیے ایک گھاگھ بھی لازمی ہے۔ گھاگھ موجود نہ ہو تو دنیا سے ضرورت کا عنصر یک قلم مفقود ہو جائے اور پھر اس کے بعد

طلبِ عشق ز بے سامانی عالم

کا نصف انسداد تو یہی مذاہب کے قانون سے جتنا زیادہ ... ہو جائے۔

گھاگھ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ... گھاگھ نہ سمجھا جائے۔ کوئی شخص گھاگھ ہونے کا مدعی ہو تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ گھاگھ نہیں گھامس ہے۔ لیکن گھاگھ اور گھامس میں امتیاز کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کسی روشن خیال بیوی کے جذبۂ شوہر پرستی اور کسی مولوی کے جذبۂ خدا ترسی کا صحیح اندازہ لگانا۔ گھاگھ کا امتیاز خصوصی یہ ہے کہ وہ کبھی مار نہ کھائے اگر مار کھائے تو بس سمجھ لیجیے کہ گھاگھ نہیں گھامس تھا۔ اطبا نے اسی مماثلت سے ہیضہ اور تخمہ کا فرق متعین کیا ہے۔ مر جائے تو ہیضہ ورنہ تخمہ۔ اپنے وجود اور زندگی کے اعتبار سے گھاگھ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صرف پیدا ہو جاتا ہے انسانی اعتبار سے وہ مولوی اور ملاؤں، پیروں سے بالکل علیحدہ ایک چیز ہے۔ مولوی، ملا اور پیر کی اولاد اکس آفیسو (با اعتبار عہدہ) مولوی اور پیر ہوتا ہے۔ دوسری طرف جہاں تک عہدہ اور منصب کا تعلق ہے گھاگھ کا درجہ ... اس کو محض اس بنا پر گھاگھ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کا گھاگھ ہونا کسی ... سے رہا ہے۔ اس کو محض اس بنا پر گھاگھ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس گھاگھیت ہر فرد

اور طبقہ میں مسلّم ہے۔

ایشیائی شعرا کے معشوق کی مانند گھاگھ کا حلیہ بھی آج تک متعین نہیں ہو سکا ہے کیونکہ گھاگھ ایک عالم گیر نوعیت ہے۔ ہر طبقہ اور ہر جماعت میں ایک گھاگھ موجود ہوتا ہے۔ تمدن، اخلاق، حکومت، مذہب، عورت، غرض کہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن سے انسان خود متاثر ہوتا ہے لیکن دوسروں کو ڈراتا ہے کسی نہ کسی گھاگھ کی حامل ہوتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جسمانی انحطاط یا کہولت گھاگھ کو گھاگھس میں تبدیل کر دیتی ہے گھاگھ کی مثال بندوق چلانے والے کی ہے بعض لوگ بندوق داغتے ہیں مثلاً کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوا یا اس قسم کی کوئی اور تقریب ہوئی اور کسی کے پاس پڑوس والے نے آکر بندوق داغ دی۔ کچھ لوگ بندوق چھوڑتے ہیں۔ یعنی شکار دیکھ کر فیر کر دیتے ہیں۔ اب یہ شکار کا کام ہے کہ وہ شکار ہو جائے یا اس سے انکار کر دے۔ اگر راستے میں مرد عورت یا بچے آجائیں تو بچنے کی ذمہ داری بھی انھیں کی ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو بندوق چلاتے ہیں اور اس میں اوسط درجے کے شکاری آجاتے ہیں۔ چلانے میں ارادہ اور صحت نشانہ کا عنصر بھی مضمر ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بندوق لگاتے ہیں۔ لگانے سے مراد یہ ہے کہ نشانہ خطا ہی نہیں کرتا۔ اسی طور پر چونکہ گھاگھ دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر فائر کرنے کا ماہر ہوتا ہے اس لیے اپنی گھاگھیت کے شباب میں تو وہ بندوق لگاتا ہے اور جوں جوں اس پر کہولت طاری ہوتی ہے وہ تنزل کے مدارج طے کرتا ہوا آخر میں صرف بندوق داغنے لگتا ہے اور بالکل پا موز گھاگھس ہو کر رہ جاتا ہے۔

گھاگ کا مسلک فقط گھاگیت ہے وہ جذبات سے یکسر معرا ہوتا ہے۔ وہ فکر مجسم اور انائے متشکل ہے وہ اپنے مقاصد کے حصول میں نہ جاہل کو جاہل سمجھتا ہے اور نہ عالم کو عالم وہ اپنے تبحر اور کمال کے باوجود بھی کسی احمق کے سامنے جس سے اس کا مطلب اٹکا ہو، آپ کو احمق ظاہر کرنے میں تامل نہ کرے گا۔ اس کے نزدیک احمق اور جاہل کے سامنے احمق تر اور جاہل تر بننے سے زیادہ دلچسپ کوئی اور مشغلہ نہیں ہے۔ اس کے لیے دنیا میں مطلب نکال لینا ہی مقصودِ حیات ہے۔ دنیا کو بھلا کہیے یا برا جب تک وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے خواہ اس کے مقاصد کی نوعیت کچھ ہی ہو۔ وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے اور دنیا کے بھلا یا برا کہنے کو وہ دنیا کی گمراہی اور دنیا والوں کا اعترافِ شکست تصور کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ کامیابی بجائے خود ایک مقصد ہے جس کے حصول میں دنیا کی بھلی یا بری رائے کو کوئی دخل نہیں ہے۔

لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ گھاگھ کا سوسائٹی کے جس طبقہ سے تعلق ہوتا ہے اسی حیثیت سے اس کی گھاگھیت کے مدارج ہیں۔ معمولی اور متوسط طبقہ کا گھاگھ اعلیٰ طبقہ کے گھاگھ پر فوقیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی "بڑا آدمی" گھاگھ تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کو اپنی گھاگھیت کے نباہنے کی بہت سی سہولتیں میسر ہیں وہ اپنی اسکیم یا اپنی تجویز کو جبراً منوا سکتا ہے وہ نہایت بھدّے طریقے سے دفع الوقتی کر سکتا ہے اور لوگوں کو کسی قسم کا مطالبہ یا مواخذہ کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ گھاگھیت نہیں "گھاگھیوریت" (پرونانی گرینڈ موزیت) ہے لیکن دوسری طرف ایک معمولی اور متوسط درجہ کے آدمی کو معمولی اور متوسط طبقہ کے لوگوں کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ اور وہ متوسط طبقہ والے گھاگھ کے پیچھے اس طور پر پڑ سکتے ہیں جس طور پر درتیب سنبھل سکے پیچھے بعض

خرید الاصیل بن جاتے ہیں یا پھر "جونی والوں کے ہاتھ جو حالت کسی تھیٹر کے منیجر کی ہوتی ہے۔ بہرحال ایسی حالت میں اگر گھاگھ اپنی گھاگھیت کو نباہ دے تو پھر اسے "گھاگھ ملنگ گھاگھ" سمجھنا چاہیے۔

گھاگھ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ سوسائٹی کے ہر طبقہ میں ہوتا ہے مثلاً سیاسی گھاگھ، مذہبی گھاگھ، تمدنی گھاگھ، عاشق گھاگھ، معشوق گھاگھ، چوبیس گھنٹہ گھاگھ وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی گھاگھ کو قوم اور حکومت کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو کسی قمارخانہ کے منیجر کو قماربازوں کے نسبت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہارنے جیتنے والوں کا حشر کچھ ہی کیوں نہ ہو، جیت ہر حال میں اسی کی ہے۔ سیاسی گھاگھ کرسیٔ صدارت پر سب سے زیادہ ہار پہن کر بیٹھتا ہے اور تحریر و تقریر میں صرف پریس اور حکومت کے نمائندوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن اگر گولیاں چلنے والی ہوں یا طوق و رسی کی باری آئی تو پھر وہ اپنے ... ڈرائنگ روم یا قافلہ کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا ہے جتنا مسٹر لائیڈ جارج برطانوی اقتدار کو ارباب آئی۔سی۔ایس کے آہنی پنجوں میں سمجھتے ہیں۔ اس کے نزدیک قوم کی حیثیت ایک نعش کی ہے۔

موقع ہو تو اس پر ایک مزار تعمیر کر کے نذرانے اور چڑھاوے وصول کیے جا سکتے ہیں یا پیش قدمی کی ضرورت ہو تو راستہ کی ناہمواری اور خندقیں بھی اسی سے پر کی جا سکتی ہیں۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد کی بنا پر جنازہ اور جلوس کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے وہ حکومت سے خفیہ طور پر ڈرتا ہے اور حکومت اس سے علی الاعلان ڈرتی ہے۔ قوم اس کی پرستش کرتی ہے لیکن وہ اس کو کبھی نہیں بھولتا کہ قوم بڑے آدمی کی دوستی سے بھی زیادہ بے اعتبار ہے۔ اس لیے وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرتا کہ اگر یہ دوستی قائم نہ رہی تو پھر وہ دھوبی کے کتے کو بھی رشک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے نہ یہ کہ موقع کو اس سے فائدہ پہنچے۔ وہ ایک بے باک اور بہادر شخص کی مثل اپنے آپ کو خطرے میں بھی ڈال دیتا ہے۔ لیکن اسی وقت جب اسے یقین ہو کہ خطرہ سے اس کو نہیں بلکہ خود خطرہ کو اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ کبھی انتہا پسند نہیں ہوتا لیکن انتہا پسندوں سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ایک شل مقدمہ ہے جس پر ہر قسم کے فیصلے صادر کیے جا سکتے ہیں، وہ متنازعین کے بجائے وجہ تنازع بننا پسند کرتا ہے۔

لیکن اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک حد تک تجربات اور مبادیات سے تعلق رکھتا ہے اس سے گھاگھ کی عملی کارگزاریوں پر کافی روشنی نہیں پڑتی۔ اس قسم کا طرز انتشار یا انداز بھی ایک قسم کی گھاگھیت ہے۔ اس لیے اب ہم مختلف قسم کے گھاگھ کا غیر گھاگھ ناظرین سے تعارف کراتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ممکن ہے کوئی بزرگ دبلے پتلے، لمبی ناک جس کی ناک پر جلی کا شیشہ کی دھاگوں سے بندھی ہوئی عینک رکھی ہو، نکیلی داڑھی اور گھنی مونچھیں، منہ میں کوئی دانت نہ ہو لیکن لوگ بالخصوص ان کی بیوی یا دوسروں کے بچے ان کے دانت کاٹنے سے خائف ہوں، جسم پر جھریوں سے زیادہ رگیں نمایاں ہوں۔ ان کی نظر سے یہ مضمون گزرے اور وہ اظہار تنفس کے سلسلہ میں چھینک [illegible] جھریاں [illegible] اور سانس یا غصہ [illegible] گھونٹ کر کہہ دیا۔ "مہمل نقرہ لایعنی [illegible] فہم گھاگھ"!

سیاسی گھاگھ کا بیان اوپر آچکا ہے لیکن ممکن ہے غیر گھاگھ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ اس لیے یہاں مزید تشریح یا تفصیل غیر موزوں نہ ہوگی۔ سیاسی گھاگھ کا ہندوستان میں ایک حد تک فقدان ہے بہت ممکن ہے بعض لوگوں کا عقیدہ ہو کہ تھوڑے عرصہ کے بعد بعض سیاسی گھاگھس مکمل گھاگھ ہو جائیں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج تک کوئی گھاگھس، گھاگھ میں نہیں تبدیل ہوا۔ البتہ بعض اسباب کی بنا پر گھاگھ گھاگھس ہو گیا ہے اور اس کا سبب محض یہ ہے کہ گھاگھ بجائے خود ایک قسم ہے اور تنزل کر سکتا ہے ترقی نہیں کر سکتا۔ گھاگھ ایک پاور ہاؤس کی مانند ہے۔ وہ صرف ایک پہیہ کو گردش دیتا ہے۔ معمولی لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ایک پہیہ گردش کر رہا ہے لیکن اگر تفتیش کی جائے تو معلوم ہو کہ اس کا تعلق اور تسلسل بے شمار دیگر مختلف اقسام کی مشینوں سے ہے۔ کہیں توپ ڈھل رہی ہے اور کہیں صرف سوئی کا ناکہ بنایا جا رہا ہے۔ کہیں آبشار ہے کہیں جہنم تیار، کہیں برف رکھنے کے لیے کپڑے تیار ہو رہے ہیں۔ اور کہیں بھوکا رکھنے کے لیے خرمن جمع کیا جا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ گھاگھ بولنے کے موقع پر صرف سوچتا ہے اور چھینکنے کے بجائے صرف جمائی لے لیتا ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ پیش آئے گا تو وہ ہندوستانی بن جائے گا اور ہندوستانی ہونے کا موقع آن پڑے تو وہ ہندو یا مسلمان بننے کا دعویٰ کرے گا اور بشرط محال کوئی ایسا موقع پیش آجائے جہاں دونوں حالتیں نازک ہوں تو پھر وہ تارک الدنیا بن جائے گا۔

گھاگھ ضابطہ فوجداری اور کتب الہامی دونوں کی توانائی اور ناتوانی سے واقف ہوتا ہے وہ ایک طرف سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے لیکن دوسری جانب آزادی کے لیے جنگ کرنے والوں کو ان کا صحیح جانشین سمجھتا ہے۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر جیل خانہ میں چکی پیسنے والوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ وہ ملک الموت سے بھی زیادہ مساوات پسند ہے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ ملک الموت کی مانند اپنے آپ کو کسی دوسرے ملک الموت کی زد میں نہ پائے ورنہ پھر وہ مساوات پسندی کا اتنا ہی بڑا دشمن ہے جتنا لیبر پارٹی یا ہمارے شعرا کا بگڑا ہوا معشوق!

گھاگھ حکومت کے خطابات سے اجتناب کرتا ہے لیکن خطاب یافتوں کو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے ...... وہ کبھی کونسل اور کمیٹی میں نہیں بولتا لیکن کونسل اور کمیٹی میں بولنے والے ہمیشہ اسی کی زبان سے بولتے ہیں۔ وہ ہندو مسلم نفاق پر سب سے زیادہ آنسو بہائے گا۔ لیکن یہ اسی کی ذات ہے جو ہندو مسلم اتحاد کو کبھی منعقد نہیں ہونے دیتی۔ وہ کبھی قانون کا مسودہ نہیں پیش کرے گا۔ لیکن ناممکن العمل ترمیم پیش کرنے میں اپنے سے آگے کسی کو بڑھنے نہیں دے گا۔ وہ کبھی بیمار نہیں پڑتا۔ اس کی بیماری صرف ایک سیاسی تعطیل ہے جس کو وہ جب چاہتا ہے منا لیتا ہے۔ یورپ کا امن تیاری جنگ کا پیش خیمہ ہے لیکن سیاسی گھاگھ کا بیمار ہونا فی الحقیقت اس کا اچھی صحت منانا ہے۔ وہ صرف ایک طریقہ علاج کا قائل ہے یعنی نقل مکان یا نقل وطن جس طرح ہر ہندوستانی زندہ رہنے اور رکھنے کے لیے یورپ جاتا ہے اور ہر غیر ملکی مارنے اور مرنے کے لیے ہندوستان آتا ہے۔ اسی طرح ہمارا سیاسی گھاگھ زندہ رہنے کے لیے بیمار پڑتا ہے اور مارنے کے لیے ہندوستان واپس آجاتا ہے۔

اب رہا مذہبی گھاگھ کو مذہب سے وہی نسبت ہے جو آج کل کے نوجوانوں کو اپنے والدین سے ہوتی ہے۔ بعض

اپنے والدین کو اپنا کمزور اور بعض اپنا مضبوط پہلو سمجھتے ہیں۔ ایک موقع پر تو وہ ان کو والسرائے اور گورنر کے آستانوں کی جبہ سائی کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر وہ خود تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہے اور ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال تر ہونا چاہتا ہے تو پھر وہ اپنے والدین کو والسرائے اور گورنر کے چپراسی سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال مذہبی گھاگھ کا ہے۔ ایک موقع پر تو وہ مذہب کا نام لے کر ہجرت پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور دوسروں کو ہجرت کرا بھی دے گا لیکن دوسری جگہ وہ اسی مذہب کی آڑ پکڑ کر دارالحرب میں سود بھی لینے لگے اور شاید بدلے سبب جاہلی کی بیوی سے دوسرا نکاح بھی کر لے۔

مذہبی گھاگھ کی بے شمار اقسام ہیں، مولوی گھاگھ، مولانا گھاگھ، پیر گھاگھ، ملا گھاگھ وغیرہ، انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً جائزہ لیا جاتا لیکن اندیشہ ہے کہ اس طور پر دوسرے گھاگھوں کا تذکرہ نہ ہو سکے گا۔ اس لیے یہاں مذہبی گھاگھ کے سلسلہ میں جو کچھ اظہارِ خیال کیا جائے گا اسے گھاگھ ناظرین علی قدرِ مراتب ہر ایک نمونہ پر تطبیق دے لیں۔ مولانا گھاگھ اور مولوی گھاگھ میں وہی فرق ہے جو گویئے اور شاعر میں ہے۔ ایک صرف گاتا ہے دوسرا گاتا بھی ہے اور رقص بھی کرتا ہے۔ مولوی نرا گھاگھ ہوتا ہے مولانا اکثر گھاگھس بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب آج کل کی موجودہ فضا ہے۔ ترکِ موالات اس کی بہترین کسوٹی تھی۔ اس میں کتنے مولانا گھاگھ، گھاگھس ہو گئے لیکن مولوی کو دیکھیے تو قول و فعل دونوں میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ ایک طرف وعظ کہتا رہا اور فتوی تکفیر دیتا رہا۔ دوسری طرف دعوت رد نہ کی اور تعددِ ازدواج میں کمی نہ کی۔ تارکِ موالات رہا، تارکِ لذات نہ ہوا۔

تمدنی گھاگھ بھی صرف مذہبی گھاگھ کا ایک شاخسانہ ہے، وہ اپنی تمدن کے حسن و قبح پر پورا عبور رکھتا ہے لیکن عملاً اس کو صرف "مذہبانہ کا رنگ" سمجھتا ہے، بالعموم وہ مذہبی دقتوں کو تمدن کی گتھی سے حل کر دیتا ہے اور تمدن کی پیچیدگیوں کو مذہبی الجھنوں سے سلجھاتا ہے۔ تصانیف کے اعتبار سے اس کی نمایاں مثال "اسپرٹ آف اسلام" ہے۔ ساری کتاب پڑھ لینے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اسلام سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ یورپ سے مرعوب ہو کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ بہت سے امور میں مصنف کا مدعا کچھ یوں ہو رہا ہے۔ یعنی اسلام میں وہ سب موجود ہے جو آج یورپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ مصنف نے یورپ کی ساری خوبی یا خرابی کو تراش خراش یا گھٹا بڑھا کر ثابت کیا ہے کہ "اسپرٹ آف اسلام" یہی ہے یا یہ ہو سکتی ہے۔ ایک غیر گھاگھ مصنف یہ کبھی نہ کرتا اور شاید کر بھی نہ سکتا۔ وہ اسلام کو پیش نظر رکھ کر یورپ اور اس کے تمدن کا جائزہ لیتا، اس کی دوسری مثال ایک حد تک وہ دو نظمیں ہیں جن کی تلخیص ان دو مصرعوں میں بیان ہو سکتی ہے:

(۱) مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

(۲) ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

علیحدہ علیحدہ تو یہ خیالات بالکل صحیح ہیں لیکن دقت اس وقت پڑتی ہے جب کسی ہندی مسلمان کو:

اک نالہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

کی ضرورت پیش آتی ہے۔ "ہندی پہلے یا مسلمان پہلے" کا مسئلہ ایسا ہے جس میں پھنس کر کتنے گھاگھ، گھاگھس ہو گئے لیکن خالص گھاگھ اس مخمصے میں پڑتا ہی نہیں۔ مشہور ہے:

"پیش ملا، قاضی، پیش قاضی، ملا، پیش ہیچ ہر دو، و پیش ہر دو ہیچ!

وہ "پیش ہر دو" کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا لیکن اگر کبھی ایسی نوبت آجائے تو پھر وہ ایک تیسری چیز بن جاتا ہے اور وہ بھی ایسی جس کے سامنے ملا اور قاضی دونوں ہیچ مثلاً "علیگ!"

فرض کیجیے تمدنی گھاگھ پردہ یا تعددِ ازدواج کے موافق ہے لیکن وہ ان دونوں کا وہیں تک رفیق رہے گا جب تک اس کو لطف و تفریح کی ضرورت نہ محسوس ہوگی لیکن اگر کبھی اس کے خلاف حالت پیدا ہوگی تو پھر وہ اسی تمدن کی آڑ لے کر پردہ کا مخالف بن جائے گا اور اپنے اس فعل کے جواز میں یہ دلیل پیش کرے گا کہ وہ عوائدِ رسمیہ سے بغاوت نہیں کر سکتا تھا کسی چیز کا بے طلب حاصل ہونا ہی اس چیز سے متمتع بہ ہونے کی سند جواز ہے۔ اس کے ہاں اصول اور پالیسی دو مختلف چیزیں ہیں، اصولاً وہ پردہ کے موافق ہے۔ لیکن پالیسی کے اعتبار سے وہ اس نفع سے گریز نہیں کرنا چاہتا تھا جو بے پردگی سے وابستہ ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایک بار تو وہ خاندان و ملت کے مطالبات کے سامنے جھکتا ہے اور دوسری بار اپنی کمزوریوں کی آڑ پکڑتا ہے۔ بظاہر کمزوریوں کی آڑ پکڑنا بجائے خود ایک مستقل کمزوری ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ انسان کی کمزوریاں ہی ہیں جن سے تمدن کا تاروپود وابستہ ہے۔

اب رہے عاشق گھاگھ اور ان کے نیچے الف معشوق گھاگھ

اس سلسلہ میں جہاں اور بہت سی دقتیں اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اس میں ایک یہ بھی ہے کہ جو اصول اب تک ہم نے گھاگھ اور گھاگھس کا رکھا تھا یعنی گھاگھ ممکن ہے گھاگھس بن جائے۔ یہ ناممکن ہے گھاگھس گھاگھ کے زمرے میں آسکے، یہاں پہنچ کر بالکل منقلب ہو جاتا ہے۔ اس دیار میں فلسفۂ گھاگھیات کچھ اور حکم لگاتا ہے یعنی ہر عاشق اور معشوق پہلے گھاگھس ہوتا ہے اور اس کے بعد گھاگھ بن جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں ان حالتوں میں گھاگھیت کا دوران قیام بہت کم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد عاشق اور معشوق دونوں مسلسل گھاگھ رہتے ہیں۔ عشق کی آمد تو ایسی ہوتی ہے جیسے ۱۹۱۹ء کا انفلوئنزا 'تو چل میں آیا'۔ اس دوران میں شادی خودکشی یا جیل خانہ کی زد میں آگئے تو خیر ورنہ پھر دونوں طرف سے محاصرہ بندی شروع ہو گئی۔ فرمائش کا جواب غزلوں سے اور غزلوں کا جواب فرمائشوں سے پورا ہونے لگا، گھاگھیت نے اور زور پکڑا تو غزلوں سے خطوط پر آگئے اور خطوط کا مجموعہ بعد میں شائع کر دیا گیا، انا للہ!

ہر عاشق گھاگھ کا امتیاز خصوصی یہ ہے کہ وہ بدصورت ہو، مریض ہو، مفلس ہو۔ بدمزاج بیوی کا شوہر ہو قسم قسم کے متعدد بچوں کا باپ یا پھر ان سب کا مجموعہ آرٹسٹ ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ ایسے بزرگ کو کون بدنصیب قابلِ التفات سمجھے گا۔ یہ ایک راز ہے جس کو غیر آرٹسٹ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اصل یہ کہ گھاگھ کے نزدیک ہر چیز اکتسابی ہے۔ وہ اپنے عشق و عاشقی کا کرشمہ نئے نئے انداز سے دکھاتا ہے۔ جب "محفلِ یار" میں صورت و شکل کا مسئلہ چھڑ جائے گا تو وہ اپنے مرض کے پہلو کو نمایاں کرے گا یعنی اگر وہ تندرست ہوتا تو حسن میں اس کا کوئی نظیر نہ ہوتا۔ جب دولت و افلاس کا قصہ پیش ہوگا تو وہ اپنی بدمزاج بیوی کو معرضِ بحث میں لائے گا۔ غرض کہ اسی طور پر وہ صورت بدلتا رہے گا اور یہ کبھی ظاہر یا ثابت نہ ہونے دے گا کہ اس میں عاشق بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اب ذرا محبوب کی گھاگھیت ملاحظہ فرمائیے اس کا مسلک :

دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

ہوگا جب آپ اس سے انتہائی تلطف کے متمنی ہوں گے تو وہ آپ سے انتہائی سرد مہری برتے گا اور جب مرض یا افلاس یا بیوی کے اندیشے سے آپ کترا کر نکلنا چاہیں گے تو پھر اس طرف سے ایسی پیش قدمی ہوگی گویا گھا گھسیت کا دور تازہ ہوگیا۔ اول تو بہ حیثیت ایک سچے گھا گھ کے آپ ہر جیہ باداباد کہہ کر اس دلدل میں کود پڑیں گے پھیا اور آپ کی جان سے دور اگر آپ نے ایسا کیا تو پھر سمجھ لیجیے آپ کا وہی حشر ہوگا جو ہندوستانیوں کا لیبر پارٹی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔

گھا گھ، گھاگھس اور گھاگھیات کے سلسلہ میں یہیں تک پہنچا تھا کہ یکایک حاجی بلغ العلیٰ وارد ہوئے۔ حاجی صاحب نے حسب معمول آتے ہی سوالات وانتقالِ اضطراری واختیاری کا ایک ہنگامہ برپا کر دیا، کمرے میں داخل ہونے سے پہلے سلام علیکم، کمل بدوش، ریش بداماں ایک ہاتھ میں جریب زیتونی اور نسبتاً محفوظ دوسرا خالی اور نسبتاً خطرناک "کیا کر رہے ہو، نظر کیوں نہیں آتے، سگریٹ لاؤ میاں۔ ایک گلاس پانی! پانی میں کیا دیر ہے۔ کھانا کھا چکے ہو، کیوں میاں کچھ معلوم ہوا کمیشن والوں نے آج ٹینس کھیلی یا ڈاکٹر ضیاء الدین کا بیان لیا" اچھا بھائی کوئی گانا سنواؤ، ہا! آمدہ شہزادہ ہے گلشن ہے سارا لکھنؤ" سوالات کا ایک طرف یہ بے پناہ اور بے ربط سلسلہ دوسری طرف اسی عرصہ میں کرسی پر بیٹھے، ابھی ٹھیک طور پر جگہ نہیں پکڑی تھی کہ کھڑے ہو کر دیوار پر آویزاں تصویر دیکھنے لگے۔ وہاں سے جست کی تو چارپائی پر دراز، کمل میں ملفوف، چند لمحہ کے بعد اسی طور پر اٹھ بیٹھے جیسے کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آگئی ہو، پھر اسی طور پر لیٹ گئے گویا اس چیز کو اور اس کے ساتھ سارے کائنات کو صبر کر بیٹھے۔ اتنے میں پانی آیا۔ فرمایا "نہیں دیا سلائی لاؤ" دیا سلائی آئی تو اس سے دانت کھودنے لگے، کچھ کتابیں الٹیں، اخبار کے اوراق زیر و زبر کیے، پھر خود بخود فرمانے لگے "یہ سب کچھ ہوا یہ تو بتاؤ۔ . . . صاحب مکان پر ملیں گے۔ استنجا خانہ کدھر ہے، ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسی آمادگی ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا یہ آخری سوال بے محل تھا اور استنجا خانے ہی میں کھڑے ہے تھے۔ "اچھا خیر یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ تم لکھ کیا رہے تھے" عرض کیا "گھا گھ" فرمایا "کیوں جی تم اپنی شیطنت سے کب باز آؤ گے"۔ میں نے کہا وہ حصہ مضمون کے آخر میں آئے گا۔ "جو میں گفتہ گھا گھ" اور شیطان ایک ہی چیز ہے" ابھی جواب ختم نہیں ہو پایا تھا کہ حاجی صاحب صحن کے دروازہ پر سے غائب ہوتے نظر آئے۔ یا مظہر العجائب!

کہیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت میں ایک، نہ ایک گھا گھ کا ہونا لازمی ہے۔ یہاں تک کہ فرشتوں میں جب اندھا دھند عبادت ہونے لگی اس وقت منشاء ازلی نے اس کی ضرورت سمجھی کہ ان سادہ اوراق کو بھی کہیں نہ کہیں سے منقش بنا دیا جائے، ہیولیٰ آدم کی تکوین اور سادہ لوح فرشتوں کا یہ کہنا ہی کہ یہ صفحۂ ہستی پر جور و فساد پھیلائیں گے، گھا گھ کی آمد کا پیش خیمہ تھا، جس طور پر اکثر سب سے کٹر ملحد اور دہریہ ایک وقت میں سب سے کٹر اور متقی ہو جاتا ہے اسی طور پر معصوم ترین مخلوق میں سب سے بڑا گھا گھ معلم الملکوت پیدا ہوا گھا گھ کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ کبھی مار نہ کھائے۔ بفرض محال ایسا پیش آئے تو آپ آخر میں اسی نتیجہ پر پہنچیں گے یہ تو گھا گھ نہیں صرف گھاگھس تھا، "گندم برداشتم گھاگھس بر آمد" میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ اب ابلیس کے کارناموں پر غور کیجیے اور اگر پسند کیجیے تو ان کی "ہسٹری شیٹ" کا بالکل ابتدا سے جائزہ لیجیے، گندم جنتی پر آدم و حوا سے بازپرس کی گئی، گھاگھس سے گھگھی بندھ گئی، اپنے ظلم و خطا کا اس طور پر اعتراف کیا گویا آپ کو ظلم و خطا پر

قدرت تھی اور آپ ایسا کر بھی سکتے تھے۔ گھاگھ سے دریافت کیا گیا، بولے "مجھے آخر کس نے گمراہ کیا" یہ سوال، ارتکاب جرم سے بھی زیادہ پیچیدہ اور شاید اندیشہ ناک تھا۔ حکم دیا گیا گھاگھ اور گھاگھس دونوں جلاوطن کیے جائیں، گھاگھ کا نکالا جانا ملکوتی ڈسپلن کے ماتحت تھا۔ گھاگھس یوں خارج کیے گئے کہ وہاں پیاس جماعت کی تعداد ضرورت سے زیادہ تھی، خود ملائک کیا کم تھے، بہرحال گھاگھ اور گھاگھس دونوں اس دنیا میں آئے۔ اور محض اس بنا پر:

مزی اندر جہاں کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

جب سے انسان اور شیطان دنیا میں آئے، ان دونوں میں جنگ ہوا کی۔ انسان ایک تو بجائے خود گھاگھس دوسرے گھاگھسیت کو قدم قدم پر تقویت کرنے والے اسباب و عاملین بھی فراہم کیے گئے، کراماً کاتبین تعزیرات ہند بیوی، غرض کہ ان کی ہمیشہ مٹی پلید ہوا کی۔ انسان نے غلطی کی، کراماً کاتبین نے مسلسل مرتب کی کسی گھاگھس نے سزا دے دی، لیکن دوران میں بعض گھاگھسوں نے گھاگھ بننے کی کوشش کی یعنی معصیت سے لطف اندوز ہوئے لیکن اس کی ذمہ داری شیطان یا کسی دوسرے پر تھوپنی چاہی ایسا اس نے کسی دوسرے کو اس کے لیے انتخاب کیا۔ یہ طویلہ کا لیتا د کسی طور پر درست نہیں ہوتا تھا کہ زرتشتوں نے ہی دولت یل کا اغوا کر دیا۔ انھوں نے خیر و شر کے کمپارٹمنٹ بنا دیئے لیکن اصلاحات، مانٹیگو کے مانند محکمہ جات منتقلہ بھی ناکامیاب ثابت ہوئے اور گورنر کے اختیارات پھر حائل ہوئے۔

شیطان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ دنیا خوب ترقی کرے۔ وہ اپنی کامیابی اور کامرانی اسی میں سمجھتا ہے کہ انسانی عقل و فکر خود انسان ہی کے لیے ایک وسیلۂ آفت بن جائے اور خود شیطان کو ان کی فکر سے نجات ملے گھاگھ کا کمال یہ ہے کہ وہ گھاگھس کے ہر قصور کا ذمہ دار خود گھاگھس کو قرار دے اور گھاگھس اس پر بغلیں بجائیں شیطان اس راز کو خوب سمجھتا ہے کہ ذہین انسان کبھی بدمذاق نہیں ہو سکتا اور وہ اول تو فیل خانہ میں الم ترا کیف کی تلاوت ہی نہ کرے گا اور اگر ایسا کبھی پیش بھی آیا تو اس کی ذمہ داری سائنس یا حکومت کے سر تھوپے گا!

شیطان کا کمال یہ تھا کہ اس نے انسانوں کے دل سے جہاں خدا کو فراموش کرا دیا وہاں براہ راست اپنا نام بھی باقی نہ رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو بھلا دینا اتنا سنگین واقعہ نہ تھا جتنا خود شیطان کو بھلا دینا، یہ توہین خدا کو ناگوار ہوئی ہو یا نہ ہو شیطان اس کو بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس طور پر بھلا دیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس طور پر یاد کیا جائے جس طور پر ملا اور واعظ یاد کرنے یا کرانے کے عادی ہیں۔ وہ ہر چیز گوارا کر سکتا تھا، لیکن اپنے ساتھ بدمذاقی کبھی نہیں روا رکھ سکتا تھا، اس کے نزدیک انسان کی بدترین ذلیل خلقی بدمذاقی وہ تھی جو اس نے گیہوں کھا کر اعتراف کیا اور عفو تقصیر چاہی تھی۔ اس لیے اس نے یہ ترکیب کی کہ انسان سب کچھ وہ کرے جو وہ کرانا چاہتا تھا لیکن جب پکڑا جائے تو پھر چاروں طرف شانے چت نہ نظر آئے اور رو رو کر شیطان کو گالیاں دینے لگے۔ بیسویں صدی کا شیطان جمہوریت پسند تھا اس نے دربار عام کیا اور اپنی ساری ذریات سے مشورہ طلب کیا کہ وہ گھاگھسوں کے لیے کوئی چلتا ہوا فقرہ وضع کر دیں جس کی آڑ میں وہ سب کچھ کر سکیں جس کے لیے ہم سب اتنی مدت سے کوشاں ہیں۔ ہر ممبر نے باری باری کھڑے ہو کر اپنے وضع کیے ہوئے الفاظ فقرے یک مختصر سی تقریر کے ساتھ پیش کیے، تقریر شیطانوں کی آنت تھی، الفاظ بھی بے شمار تھے ہم صرف چند ایک

یاد رہ گئے ہیں ۔

آزادیٔ کار، آزادیٔ افکار، آزادیٔ نسواں وغیرہ وغیرہ معلم الملکوت نے تمام تقریریں سن کر آخر میں یہ فیصلہ صادر کیا :

"تمہارے پیش کردہ الفاظ و فقرے تمہاری محدود بصیرت و تجربہ کے نتائج ہیں ، ابدالآباد کی طرف سے یہ لفظ بر سرِ کار رہے گا ۔"

"آرٹ"

ناظرین کرام یہ گھاگھ کی آخری کڑی نہ تھی ، محفوظ یہی ہے کہ آخری کڑی کے پھیر میں آپ نہ پڑیں ۔ زرتشت نے آخر کیا کر لیا ۔ حکما اور ملاؤں نے کیا کر دکھایا اس کی خبر نہ لگائیے ورنہ آپ کی خبر بھی نہ ملے گی ۔ ۵۵

رشید احمد صدیقی

شادی کی سالگرہ کی تاریخ

اس دنیا میں ٹٹی پھاندتے رہنے کا جو کھیل ہم آپ کھیل رہے ہیں وہ نہ ہمارے لیے نیا ہے نہ ہمارے اسلاف یا اولاد کے لیے، کوئی خوشی سے پھاندتا ہے کوئی رو رو کر پھاندتا ہے۔ اس کود پھاند میں شادی وہ جست ہے جس کے بعد جست کا صرف ایک حادثہ اور رہ جاتا ہے اور وہ خاتمہ بالخیر کا ہے۔ شادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اندھیرے میں جست لگانا ہے۔ مرنا بھی ایک طرح سے اندھیرے ہی میں جست لگانا ہے۔ البتہ شادی اور موت میں ایک فرق یہ ہے کہ شادی میں ہم جست لگاتے ہیں۔ موت میں ہم جست کم لگاتے ہیں دھکیل زیادہ دیئے جاتے ہیں۔ شادی کے بعد ٹٹیوں[1] کی تعداد زیادہ کودنے کا حوصلہ کم اور سکت پست ہو جاتی ہے اس کا علاج بعضوں نے یہ نکالا ہے کہ بار بار شادی کرتے رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے امتحان کا نتیجہ شائع ہو جاتا ہے تو بعض بعض ناکام امیدوار دوسرا تیسرا اخبار اس نیت سے خریدتے ہیں کہ شاید پہلے میں نام چھپنے سے رہ گیا ہو تو دوسرے تیسرے میں مل جائے۔ جو لوگ شادی کے زیادہ عادی ہو جاتے ہیں وہ آخر میں ٹٹیوں ہی سے شادی کرنے پر اتر آتے ہیں۔ جب فتح ناممکن ہو تو مصالحت میں کیا ہرج!

سالگرہ کہیئے یا سال گرہ بات ایک ہی ہے۔ گرہ کے معنی نحوست ادبار اور شامت کے ہیں اور گرہ کے معنے وہی گرہ گانٹھ جیسے "گانٹھ کا پورا" یا "گرہ میں دام کہاں"! آج کی گفتگو میں سالگرہ کی جو معنے لغت ہی کے رہیں گے۔ یعنی نحوست اور شامت کا ایک سال کٹ گیا یا ان میں ایک سال کا اضافہ ہوا۔ جیل خانے کے قیدیوں کو اس کی خوشی ہوتی ہے کہ سزا بھگتنے کی جو میعاد مقرر کی گئی تھی اس میں ایک سال کم ہو گیا جنم قیدی۔ میاں بیوی کو اس موقع پر مبارک باد دی جاتی ہے کہ اپنی رہائی میں نہ انہوں نے حصہ لیا نہ قضاد

---

[1] میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ لفظ یہاں پہنچ کر کیا گل کھلائے گا اور اس سے زیادہ عبرت کی بات یہ ہے کہ باوجود کوشش کرتے رہنے کے اس کا جانشین دریافت نہ ہو سکا۔

قدر نے دلچسپی لی اور اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ سال ہر سال ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور اس طرح کی گرہوں پر گرہوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔

بعض میاں بیوی اس پر خوش ہو سکتے ہیں کہ ایسا ایک سال اور گزر گیا جس میں ایک کو بہتر میاں یا دوسرے کو بہتر بیوی نہ مل سکی۔ ممکن ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوں کہ ان سے بدتر رفیقِ زندگی پلے پڑتی تو کیا کرتے۔ ممکن ہے دونوں کو اس پر فخر بھی ہو کہ بدترین حالات کے ہوتے ہوئے انہوں نے جس طرح ایک دوسرے کے ساتھ نباہا اس کا اجر آخرت میں ان کو اس طرح دیا جائے کہ جنت میں ایک ساتھ رہنے کی سزا ملے۔ جنت کے بارے میں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہاں شوہر اور بیوی اپنی اس دُنیا کے تجربات یا پہلی جنت کی روایات اپنے ساتھ لے جا سکیں گے یا نہیں!

ایک دوست کا ارشاد ہے کہ شادی کی سالگرہ کی ایجاد کرنے والے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ ایک ہی شادی کی یاد ہر سال منائی جائے۔ ایک ہی شادی کی بار بار یاد منانا، خوشی منانا نہیں ہے۔ دُعائے مغفرت مانگنا ہے۔ خوشی اور فخر کی سالگرہ تو وہ ہے جو ہر سال نئی شادی پر منائی جائے۔ پُرانی شادی پر نئی سالگرہ منانا اور ہر سال منانا جہل مرکب ہے۔ شادی کے بہت سے فوائد بتائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے کے دواؤں کے فوائد بھی کچھ کم نہیں۔ ان دونوں سے کہیں زیادہ ان سزاؤں کے فوائد بتائے گئے ہیں جو تن بہ تقدیر شادیوں اور تیر بہدف دواؤں کے سلسلے میں تجربہ میں آئی ہیں۔ شادی کے فوائد کے سلسلے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے نسل بڑھتی ہے اور عقل گھٹتی ہے گویہ بتانا مشکل ہے کہ شادی کے بعد گھٹی یا عقل ماری گئی تھی اس لیے شادی کر لی۔

مجھے نہ شادی سے بیر ہے نہ اس کی سالگرہ منانے سے دشمنی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ شادی اور اس کی سالگرہ کی دیکھا دیکھی بے شمار ایسی سالگرہیں نکل آئی ہیں جن کو میں نہیں مناتا بلکہ وہ مجھے مناتی رہتی ہیں مثلاً اسی کو لے لیجیے شادی کی ہر سالگرہ جب ایک ادھ یا دو اولاد کی پیدائش سے شروع یا اس پر ختم ہو تو آپ مجھے کیا کہیں گے یا نفسِ سالگرہ پر کیا حکم لگائیں گے۔ والدین کی شادی کی سالگرہ اولاد کی پیدائش کی سالگرہ سے رشتہ جوڑے اور اولاد کی اولاد سے ملتی منتقل ہوتی والدین کی زندگی میں وقف علی الاولاد ہو جائے تو آپ کیا کہیں گے۔

میری زندگی ایک مسلسل سالگرہ بن کر رہ گئی ہے اپنی پیدائش اور شادی کی سالگرہ اولاد کی پیدائش شادی کی سالگرہ، ان کی اولاد کی پیدائش کی سالگرہ اسی طرح اعزا، احباب اولیاء اللہ کی پیدائش یا وفات کی سالگرہ اس کے بعد حشرات الارض کی سالگرہ چرند پرند، درند کی سالگرہ اور دوسرے موذیوں کی سالگرہ! آپ نے ایک مشہور تصویر دیکھی ہوگی جس میں ایک نہایت بلند بالا توانا اور تندرست آدمی ہے جس کے گرد سانپ لپٹا ہوا ہے سانپ کی گرفت اتنی سخت ہے کہ بدنصیب شخص کی نس نس چرچراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور چہرے سے کرب کا جو عالم نمایاں ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ آپ نے تصویر نہ دیکھی ہو تو اس کا اندازہ کسی نہ کسی حد تک ضرور کر سکتے ہوں گے اب یہ کیجیے کہ جن سالگرہوں کا میں

تذکرہ کیا ہے ان کو سانپ کی شکل دے کر میرے جسم کے چاروں طرف جکڑ دیجیے۔ بہترا شاہ دیکھئے البتہ
س میں تھوڑی سی ترمیم کرنی ہوگی۔ یعنی تصویر میں مرد کے جسم کو جتنا متناسب و مضبوط دکھایا گیا ہے میرا
جسم اتنا ہی کمزور کا واک ہوگا اور بشرہ میرا پہلے ہی سے ویسا ہے جیسا تصویر کا بعد میں ہوا ہے اس لیے
ممکن ہے آپ کو میرے سانپ کے بشرے میں وہ کرب جھلکتا ہوا ملے جو تصویر میں مرد کے بشرے میں نظر
آتا ہے!!

سالگرہ کے اس ذیل بادل میں میری شادی کی سالگرہ کی وہی حیثیت رہ گئی ہے جو قوم کے لیڈروں
میں حانیت، جوئی اور صلح پسندی کی ہوتی ہے۔ سال تو در کنار میرا تو ہر روز کسی نہ کسی سالگرہ سے سابقہ رہتا
ہے۔ یہاں تک کہ میں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ دنیا کا سارا چکر ہی سالگرہ کا چکر ہے۔ ہر انقلاب کی ا
جیہ کی جاسکتی ہو یا نہیں ہر تہذیب کی توجیہہ سالگرہ سے کی جا سکتی ہے۔

لیکن یہاں پہنچ کر میں شاید بہکنے لگا ہوں۔ یہ مہینہ رمضان شریف کا ہے اس میں بہکنے سے بچنا چاہیے
ر بہکانے سے بھی باز رہنا چاہیے۔

اچھا تو یہ دیکھئے۔ میرے مکان میں بڑے اونچے اونچے درخت ہیں۔ خوشنما بھی اور پھلدار بھی۔ گھنی
ملدار جھاڑیاں ہیں۔ ہموار سرسبز گھاس کا ایک مختصر ہموار تختہ بھی اور اس بیل کے کچھ اور پھول پتے!! ان
سب کو میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے اور ان کی خدمت کرنے میں دن رات اور سالہا سال مشقت اور دیر
ی اٹھائی ہے لوگوں کی پھبتیاں اور طعنے سنے ہیں۔ کبھی کبھی اس سلسلے میں بے ایمانی بھی کی ہے۔ اس لیے
نیت بھی خاصی مجروح ہوئی ہے۔ تقاضہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے بعد قوم بھی مجھے زیادہ سے زیادہ شادی
کے اور اتنی ہی سالگرہ منانے کا موقع دیتی۔ لیکن انجام یہ ہے کہ بستی ہی نہیں آس پاس کے تمام کوّے جنھوں
شادی کہیں کی ہو سالگرہ منانے میرے درختوں پر آجاتے ہیں۔ گھونسلے بناتے انڈے بچے دیتے۔ چنانچہ
نا رات وہ چیخ و پکار مچی رہتی ہے جیسے کسی بدتمیز دولت مند یا بدنصیب مفلس کے ہاں کوئی تقریب ہو اور
ڈ اسپیکر سے کوّا گوہار کا اعلان کیا جا رہا ہو۔

میں نے ان سے نجات پانے کے لیے ایک کوّا اسکواڈ رکھا جس کا سردار مالی کو مقرر کیا گیا لیکن سارے
ڈن نے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنالیا۔ وہ درخت کے قریب پہنچا نہیں کہ اس سب میرین یا مین آف وار
اوپر کوّوں نے جٹ پلینز JET PLANES منڈلانے اور جھپٹنے لگے اور اس کے سر اور کاندھوں پر
ن لوٹ کر گرنے لگے کہ اس نے استعفیٰ داخل کر دیا۔ پھر یہ کوّے ایسے ڈھیٹ ہو گئے کہ باورچی خانے سے کھانا
باہر سے معزز خواتین کا آنا بند ہو گیا۔ اس مہر و ماہ کی تاب نہ کوئی شریف لا سکتا تھا نہ کوئی شہدا! آپ
بتایئے کہ جن کو روزے میں روٹی نہ میسر آئے اور خواتین منہ نہ لگائیں وہ کیا منہ دکھائے اور کیوں کر جیے۔

میں نے مایوس ہو کر محلے کے تمام لڑکوں کو دعوت دی کہ وہ میرے ہاں آکر اپنی پیدائش یا اپنے والدین
سالگرہ منائیں۔ اس لیے کہ میں نے ہاتھ شکر کرتے سنا تھا کہ وہ بچوں کو دیکھتے ہی پرواز کرتے ہیں
تھے کہ اللہ تعالیٰ ابھی اپنی مخلوق سے مایوس نہیں ہوا ہے اور بدمعاشی سے کم تر درجہ کے لوگوں سے سُنا

تھا کہ لڑکوں نے شیطان کی پناہ مانگتا ہے۔ انجام یہ ہوا کہ چاولی کے پیتے ہم پیتے کوڑوں سے مل گئے اور میرے بیٹے موسمی، مالٹے اور چیچے کے درختوں پر ٹوٹ پڑے اور پھل ترکاری کو کیا ڈبیوں پر دھاوا بول دیا۔ اور سارے کوٹ سے درختوں اور منڈیروں پر بیٹھے شہد دیتے رہے۔ دیکھتے دیکھتے سارا باغ تاراج ہو گیا اور یہ گھنے کٹتے میرے درختوں ہی پر نہیں میرے مکان کے چپہ چپہ پر شادی کی سالگرہ در کنار یہی سوال منانے لگے۔

چند ہی دنوں بعد کالے پیلے چیونٹے اپنی اپنی شادی یا شادی کی سالگرہ منانے کے لیے نکلنا شروع ہو گئے۔ اخباروں میں موسم کے بارے میں کچھ ہی خبر کیوں نہ ہو کر محکمہ موسمیات کہاں جھیل فرما رہے ہیں۔ یا کہستان جھک مار رہے ہیں میں برسات کا یقین ہی نہیں کرتا یہاں تک کہ ایک دن دفعتاً معلوم ہوگا کہ خاکسار کے کھانے کی تمباکو پینے کی تمباکو میں منتقل ہونے لگی ہے اور دودھ کا غریب خانہ جگہ جگہ سے چیونٹے اگلنے لگے ہیں۔ پھر مجھے یقین ہو جائے گا کہ برسات نازل ہو گئی۔ ٹھیک جس طرح انگلستان میں سرما کے آخری دور میں کسی صبح کو اٹھ کر دیکھیں گے کہ وہ تمام درخت جو برف کی گرفت میں آ کر سب کچھ کھو بیٹھے تھے دفعتاً ایک صبح کو نپلوں سے مرصع و مزین ہو گئے اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بہار کا موسم آ گیا۔

سارے چیونٹے تو در و دیوار پر رینگنے لگیں گے۔ جیسے موزیک کے فرش کے کالے دانے زندہ اور بیدار ہو کر صلح کا جلوس نکال رہے ہوں اور پیلے چیونٹے جہاں تہاں اسطور پر نمودار ہوں گے۔ جیسے گزشتہ عالمگیر جنگ میں غنیم کی افواج کا کسی پوائنٹ ابھار شروع ہوتا تھا اور یہ ابھار پھیل کر کسی طرف ٹوٹ پڑتا۔ ابھی یہ قصہ ختم نہ ہوتا کہ خبر آئی کہ دیمکوں نے میرے اچھے سے اچھے گلابوں سے کورٹ شپ شروع کر دی۔ آج اس درخت کا زوال ہو گیا اور کل اس کی نسل ماری گئی۔ اور یہ سب اس لیے کہ آس پاس کے جتنے حشرات الارض ہیں ان سب نے کورٹ شپ ہنی مون، سالگرہ منانے اور وصیت نامے مرتب کرنے کے لیے مجھ غریب کے بیت الحزن کو منتخب کر لیا ہے۔ خدا جانے اس گھر کی کیا خاصیت ہے اور یہ زمین و آسمان کے کس 'پاکٹ' میں آ گیا ہے کہ جا ہے جو شادی کی سالگرہ منانے کے لیے یہیں قدم رنجہ فرمائے گا۔ جیسے کسی زمانے میں پہلے اس ملک کو دوسرے ملک والوں نے بنا رکھا تھا۔

اس کے بعد طوطے اپنی سالگرہ یا اپنا کوئی قومی تہوار منانے کے لیے میرے گھر کا رخ کریں گے۔ اور ان کا پرے کا پرا اپنے قومی نعرے لگاتا ہوا میرے امرود اور شریفے کے درختوں پر چھاپا مارے گا۔ اور ان کا کوئی علاج نہیں۔ اردو کے ایک شاعر نے زاہد سے شکایت کی ہے کہ میں نماز کیوں کر پڑھوں اس لیے کہ جو تیری نماز کا وقت ہے وہی میری مے نوشی کا وقت ہے شاعر کو اس شوخی اور شامت کی جو سزا دی جائے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں وہ تو یوں بھی حق بخشوائے رہتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں ٹھیک جس وقت کہ میں علاج کے وقت خدا کے حضور میں گڑگڑاتا ہوں کہ وہ مجھ پر اور طوطے میرے پھلدار درختوں پر رحم فرمائیں طوطوں کی سالگرہ چاندنی گلے سے چاند کے پھلوں کو غارت کرتی رہتی ہے اور مجھے اپنی ہی نہیں سارے جہاں کی مخلوقات اور موجودات کی پیدائش و شادی کی سالگرہ یا وفات کی برسی پر لعنت بھیجنے پر اکسایا کرتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک جشن زیر بحث کا تعلق ہے شادی اور غمی کی تقریبات کا نتیجہ یکساں یکساں ہے۔ شادی کے بعد

ورثا اور وفات کے بعد دکھلا! بچپن میں اپنے حیا والی [illegible] ایک تماشا کرتا تھا "جس گناہ کے بدلے اٹھیا"ا
اس میں کچھ روایت اور علامت کمی ہوئی ہے ان سے مدتوں لطف اندوز ہوا ہوں اور اب بھی جب اپنے
آپ کے [illegible] ہوتا ہوں یعنی [illegible] کسی پاس نہیں ہوتے تو اس سے بعض ترقی پسند خیالات و جذبات بیدار ہونے
لگتے ہیں۔ مومن کا مشہور شعر کہ پڑنے شاید [illegible]

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!

تو یہ [illegible] میرے آس پاس ہوتے ہیں چنانچہ میرے لیے مومن کا یہ شعر بھی غارت ہو گیا!

ہر تاریخ کا خاصہ ہے کہ وہ آ کر رہتی ہے والد اس کا بڑا احسان ہے کہ وہ گزر بھی جاتی ہے۔ مجھے اپنی
شادی کی سالگرہ سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی شادی کے عواقب سے، جن میں سالگرہ کی تقریب کچھ کم اہمیت نہیں
رکھتی۔ میں خود اپنی شادی کی سالگرہ نہیں مناتا کوئی اور میری شادی کی سالگرہ منائے تو میں اسے قتل بھی نہیں
کر سکتا۔ اس کا سبب کچھ یہ بھی ہے کہ میں خود قتل ہونا پسند نہیں کرتا۔ قتل کیا جانا بڑی ذمہ داری کی بات ہے یا
ایسے شخص کے لیے جس پر نہ قوم کو فخر ہو نہ قاتل کو۔ اپنی شادی کی سالگرہ نہ منانے کے باوجود مجھے برابر معلوم رہتا
ہے کہ میری شادی کب ہوئی تھی۔ اس لیے [illegible] حساب کتاب کی واقفیت کی ضرورت ہے۔ میں حساب میں کچا
ہوں۔ آج سے نہیں عمر بھر سے لیکن زندگی کے حساب کتاب اتنے دیکھے اور برتے ہیں کہ جتنے کمتی یا حاجی حساب
میں [illegible] آئینہ کی طرح روشن ہو جاتے ہیں اس لیے کہ میں کتابی ہندسوں سے کام نہیں لیتا اپنے انجام سے حساب لگاتا
ہوں۔ مثلاً روپے پیسے کا حساب ہو تو میں یقین سے بتا سکتا ہوں کہ بقایا میرے ذمہ نکلے گا۔ کسی سے لڑائی جھگڑا
ہو تو قصور میرا نکلے گا۔ اور شادی کسی کی ہو سالگرہ کے اخراجات میرے ذمہ آئیں گے۔

خواتین کے بارے میں میرا ناچیز عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی تقریب میں شرکت کی دعوت رد نہیں کر سکتیں اپنی اہمیت
اور دوسروں کے فضیحتے کو مشتہر کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ وہ اپنے اپنے
گھر والوں ہی کی نہیں بلکہ پاس پڑوس، احباب و اعزا سبھی کی سالگرہ یا سال تمام وغیرہ قسم کی تاریخیں کبھی نہیں بھولتیں
تاریخیں نہ بھولنے کا انہوں نے ایک عجیب گر نکالا ہے وہ ہر واقعہ کی یاد کو اپنے کسی کارنامے سے ربط دے لیتی ہیں۔
مثلاً وہ بیاہ کر آئیں تو کس کا کونسا بچہ کس عمر کا تھا یا کوئی دوسرا بیاہ کر آیا تو ان کا کون سا بچہ کہاں اور کس حال میں تھا۔
وہ کسی نہ کسی بچے کی عمر سے دنیا کے ہر واقعہ کو کہیں نہ کہیں سے جوڑ دیں گی آپ ہی بتائیے جن کے بیشمار اولاد ہو اس
کے یہاں سالگرہ [illegible] تپا لگانے کی کیسی کیسی سہولتیں فراہم ہوں گی۔

میں حساب ہی نہیں حافظہ کا بھی کچا ہوں۔ مجھے واقعات [illegible] یاد رہتے ہیں [illegible] تو بالکل
یاد نہیں رہتا یا یقیناً غلط یاد آتا ہے مثلاً تاج محل کے بارے میں مجھ سے کوئی شریف آدمی پوچھے کہ کیا ہے کس نے
کب تعمیر کیا تو تاج محل اہرام مصر نہیں ہے لیکن اگر کوئی مفسد یہ پوچھے کہ ان میں کس کی عمر پہلے ہوئی اور کوئی تعجب
نہیں اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا اور یہ محض اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کہنا نے کی مجھ
سے فرو گذاشت ہوگی اور پوچھنے والا میرے جواب سے اس بے تمیزی سے لطف اٹھانے کا کہ مجھے تاج محل اور اہرام
مصر دونوں سے الفت ہو جائے گی۔

خواتین کی مانند نہیں تو ان کے احترام میں میں کوئی ایسی تاریخ نہیں بتا سکتا جس سے میرے یا ان کے بارے میں ناخوشگوار نتائج نکالے جا سکتے ہوں۔ شادی کی سالگرہ کے بارے میں کچھ کہنا یا اس کی تاریخ کا پتہ دینا بعض سنجیدہ اور وسیع مصالح کے خلاف پڑتا ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری شادی ضرور ہوئی۔ اور بے شمار سالگرہوں کے واقعے آئے لیکن دوسری بے شمار سالگرہوں میں تاریخوں کا ایسا تصادم ہوتا رہا کہ مجھے اپنی سالگرہ سے ہمیشہ دست بردار ہونا پڑا۔ جہاں کہیں اور جب کبھی کسی حق سے دست بردار ہونے کا سوال اٹھا ہر شخص کی نظر میری طرف اٹھی ہے! اور نہ بھی اٹھے تو ایسے مواقع پر میرا ضمیر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور میں بیٹھ گیا ہوں۔ جس شخص کا ضمیر اس درجہ خود پسند اور مصلحت ناآشنا ہو اس کی شادی کی سالگرہ کو کون خاطر میں لائے گا۔

کچھ دن ہوئے ایک نہایت معمر مشہور اور معزز میاں بیوی کی سالگرہ کی تقریب کا حال ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ بتایا یہ گیا تھا کہ عین جشن کے موقع پر بجلی کی روشنی بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب روشنی واپس آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بت بنے بیٹھے تھے! اس واقعہ کو میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو سنایا تو بولے اگر یہ واقعہ میری شادی کی سالگرہ پر پیش آتا تو کچھ تعجب نہیں میں بھی کچھ اسی قسم کی حرکت کرتا یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں کا ہاتھ اپنے اپنے کانوں پر دھرا ہوا ہوتا۔

رشید احمد صدیقی

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ٭ لیکن میری عمر تمام نہیں ہوتی

آج تک یاد نہیں گھر بھر میں کوئی مجھ سے سویرے اٹھا ہو اور رات میں میرے بعد سویا ہو۔ دو کتے البتہ ایسے ہیں جو میرے صحن میں ان دو درختوں پر الگ الگ آکر بیٹھتے ہیں جو ایک دوسرے اور میری چارپائی سے پندرہ فٹ کے فاصلہ پر واقع ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں مجھے باری باری لعنت بھیجنا شروع کرتے ہیں۔ خدا جانے یہ کتے کون ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں اور کیوں ہیں؟

یہ یقیناً میاں بیوی نہیں ہیں۔ میاں بیوی میں اتنا اتفاق کہاں کہ سالہا سال پابندی سے ایک زبان ہو کر صبح کے وقت آئیں اور مجھے لعنت بھیج کر جائیں۔ دونوں عورتیں نہیں اس لیے کہ دو عورتیں ایک ہی شخص پر زیادہ دن تک لعنت نہیں بھیج سکتیں، ایک ان میں سے اس شخص سے شادی کرلے گی اور طوقِ لعنت بن جائے گی۔ دونوں مرد بھی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ مرد کو اپنی لعنتوں سے کہاں چھٹکارا کہ وہ مجھ پر لعنت بھیجنے کی تفریح میں پڑے۔ شور کرکے ان کو اڑا نہیں سکتا اس لیے کہ یہ کتے تو میرے شور سے اڑ جائیں گے لیکن دوسرے کتے جو ان سے بھی زیادہ کتے ہیں وہ اٹھ بیٹھیں گے جن میں ذرا فاصلہ پر جہاں نوکروں کا خاندان سوتا ہے وہاں بھی ایک سے ایک اچھے درخت ہیں۔ ان کے آس پاس ہر طرح کے متعلقات بھی پھیلے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وہاں نہ جائیں گے۔ میں ان کو چھوڑ کر اپنا کمرہ کھولوں گا، دروازہ پر پانچ سات مینڈک اور ہزاروں لاکھوں مچھر ہوں گے اور میرے ساتھ کمرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اب میرا کام یہ ہے کہ ان مینڈکوں کو چارپائی یا تخت کے نیچے گھس کر نکالوں اور مچھروں پر دوائی چھڑکوں، مینڈک تو کودتے پھاندتے غائب ہو جاتے ہیں۔ مچھروں کا حال یہ ہے کہ جب سے ان پر ڈاکٹروں نے کچھ اتہامات لگائے ہیں انہوں نے [illegible] چھوڑ دیا۔ کمرے میں روشنی کرکے پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہوں۔ جہاں [illegible] بنتا ہے اور ریشمی مینڈکوں سے اور یہ کمبخت مینڈک اتنی قریب سے داد دیتے ہیں کہ چونک پڑتا ہوں کہ کہیں [illegible] زیادہ مجھ پر تو نہیں بیٹھے ہیں۔

میں نے اپنے مکان کا مردانہ حصہ کچھ دنوں سے مقفل کر دیا ہے۔ کھلا رہتا تھا تو چور چارپائی اٹھا لے جاتے تھے، مویشی باغ چر جاتے تھے اور راستے سے گزرنے والے نماز پڑھنے آجاتے تھے، [illegible]

سے لوٹا پانی تولیا جانماز منگائی ان سب کے ساتھ، نماز باجماعت اپنے گھر جاکر پڑھی۔

زنان خانے کا دروازہ میرے سائبان سے خاصے فاصلہ پر واقع ہے صبح سے رات گئے تک کھٹ کھٹ ہوتی رہے گی اور میں جا جاکر دیکھوں گا کہ کیا حادثہ ہے حادثات ملاحظہ فرمائیے۔ فلاں کا انتقال ہوگیا آپ کیا کر رہے ہیں۔ فلاں کا ڈنر ہے آپ مدعو ہیں فلاں رسالہ نکلنے والا ہے ایک مضمون لکھیے اور پانچ خریدار بنا دیجیے۔ فلاں سہیلی رہی ہے۔ نماز پڑھنی ہوگی۔ فلاں کی بیوی بھاگ گئی ہے ذرا چوکنے رہیے گا۔ ایک بچہ گم ہوگیا ہے ذرا دیکھیے گا آپ کے بچوں میں تو نہیں مل گیا۔ میں فیل ہوگیا ہوں ممتحن نے بے ایمانی کی ہے۔ ذرا وائس چانسلر صاحب سے چل کر کہہ دیجیے اور فارن کا اسکالرشپ بھی تو وائس چانسلر صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے میرا ایک سال بیچ رہے گا۔ رجسٹری کا معاملہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ یونیورسٹی میں اتنے لکچرر ہیں۔ لٹریچر ٹیوٹوریل۔ اتنی میٹنگ۔ اتنے انٹرویو، اتنی سی سفارش کم واپس آیا۔ ڈاک دیکھیں۔ فلاں صاحب نے اتنے روپے لے لیے ہیں۔ اور ہدایت دی گئی ہے کہ تم بچے لے لیں۔ فلاں کا لڑکا ہے تین، بیوی، بچے ایک خانم اور نوکرانیوں کے ہمراہ ایک ہفتہ کے لیے آ رہے ہیں۔ بڑا فرصت کا کام ہے۔ میں اردو میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا یا چاہتی ہوں۔ عنوان یہ ہوگا۔ مقالہ آپ لکھ دیجیے۔ از خوردان خطا، بزرگان عطا! ایک اردو کانفرنس ہو رہی ہے صدارت فرمائیے ورنہ تازہ کلام سے مشرف فرمائیے۔ میرے نانا کا انتقال ہوگیا۔ وہ ان پر ایک مضمون لکھ دیجیے، جیسا کہ آپ ایسے موقعے پر اکثر لکھا کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سے اردو میں جن لوگوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے ان کے مقالات کا خلاصہ لکھ بھیجیے۔ کھانا کھانے بیٹھا۔ نوکروں کی چوری، گندگی اور دوسروں کے اخلاقات و عادات پر جھگڑا شروع ہوگیا۔ نوکروں سمیت سب نے اپنے زور اور ظرف کے بقدر حصہ لیا۔ کھانا ختم ہوا۔ بات بڑھ گئی۔ کمرے میں آکر لیٹا۔ برآمدے میں بچوں نے فٹ بال شروع کردیا، سینے کی مشین چلنے لگی اور نل پر جو میرے کمرہ کی دیوار سے لگا ہوا ہے۔ کپڑا دھویا پچھاڑا جانے لگا۔

چار بجتے بجتے خواتین تشریف لانا شروع کریں گی۔ اب میں کمرہ میں مقید ہوگیا خواتین کے ساتھ ان کی لڑکیاں، نوکرانیوں کے بچے۔ تعداد کے لیے چند سے متعدد ہیں۔ ان کی تعداد کے لیے اب تک کوئی چند سعد نہیں ہوسکا۔ ان کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر محلہ کے کتے، بلی۔ بکری۔ مرغی سب آن پہنچے۔ ان سب نے سارے پھول پودے روند ڈالے۔ خواتین نے پنکھا، پانی۔ پان جانماز مانگی اور بیک وقت بولنا، ہنسنا، چیخنا شروع کردیا اور بیچ بیچ میں سماعت پیکران کے ہر جگہ پیک ڈالنی شروع کردی یہ قافلہ اٹھ کر یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا۔ وہاں سے تھیں اور ادھر میں کب چلا جاؤں گا۔

رشید احمد صدیقی

دیہاتی ڈاکٹر

میرے گاؤں میں پہلے پہل ہسپتال قائم ہوا۔ پُرانے امراض کو نئے نام دیئے گئے۔ نئے امراض کو پُرانی کیفیتوں میں منتقل کیا گیا۔ پہلے جو بے قاعدہ مرتے تھے اب باقاعدہ مرنے لگے۔ جہاں آسیب کا دخل تھا وہاں ڈاکٹر نے دخل پایا۔ سرسوں پھولتی اور چیچک پھیلتی رہتی جن گھروں میں تلسی کے پودے تھے ان میں کونین مکسچر کی شیشیوں کو جگہ ملی۔

نئے ہسپتال کے پہلے ڈاکٹر صاحب میرے بڑے دوست تھے نہایت موٹے بھدّے کالے رنگ کے اور آواز بڑی باٹ دار۔ بڑے زور سے ہنستے تھے۔ ہر کام جلد سے جلد کرنے کے عادی تھے۔ چیر پھاڑ کے بڑے شائق تھے۔ کہا کرتے تھے کیا کریں چیر پھاڑ کے موقعے نہیں ملتے۔ کاش کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ ملیریا کا علاج چیر پھاڑ سے کیا جاتا۔ دیہاتیوں سے اس طور پر گھُل مل کر باتیں کرتے کہ اکثر یہ دریافت کرنا مشکل ہو جاتا کہ گنوار کون ہے اور ڈاکٹر کون!

نسخہ لکھنے کے بعد بعض دیکھتے اور بعض دیکھ کر قہقہہ لگاتے گنوار سمجھتا انہوں نے اپنے قہقہے سے دُکھ بھگا دیا۔ دوا تجویز کرنے میں جتنا وقت سوچ سمجھ کر صرف کرنا چاہیئے تھا اس سے زیادہ وقت قہقہہ لگانے اور دوا کی ترکیب استعمال بتانے سمجھانے پر صرف کرتے تھے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے دواؤں میں کوئی اثر نہیں ہوتا سارا اثر ڈاکٹر میں ہوتا ہے۔

ہسپتال کے عملے میں ایک نہایت دھان پان سے کمپاونڈر تھے۔ پان زیادہ اور کھانا کم کھاتے تھے۔ کپڑے نہایت باریک اور معطر سے پہنتے تھے۔ کبھی کبھی گنگنایا بھی کرتے تھے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک بار نہایت ہی گھن گرج لہجہ میں قہقہہ لگا کر کہا "بھائی اس پیشے میں قہقہے لگاؤ ورنہ بعض طبیعتیں تنگ کرنے لگ جائیں گے۔ نہیں معلوم ٹیلی فون سے ڈاکٹر صاحب کا کیا مطلب تھا لیکن ٹیلی فون کا لفظ بعض بعض اوقات بھی ایک شگفتگی سے انہوں نے کہا اس کا اثر یہ ہوا کہ کمپاونڈر صاحب نے ہنسنا قہقہہ لگانا تو کیا اس دن سے گنگنانا بھی ختم کر دیا۔

ایک ایمبولینس بھی تھا۔ اس بھبگی کا نام ہکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب گھر کا موقع میں ڈاکٹر صاحب کا اڈا تھا

ہاتھ بٹایا کہ اب اس کا درجہ ہسپتال کے تمام عملے سے زیادہ اور ڈاکٹر صاحب سے کچھ ہی کم تھا۔ اس زمانے میں جلنے یا اسپٹک قسم کی مرہم پٹی کا کوئی تصور نہ تھا یعنی بے احتیاطی سے زخم کا بگڑ جانا یا احتیاط برتنے سے زخم کا جلد بھر آنا۔

چیر پھاڑ کا کوئی مریض آجاتا تو ڈاکٹر صاحب ایک نعرہ لگاتے "بھگا!" اور بس بھگا کے چارج میں چلا جاتا تھی۔ اور ایک کیتلی۔ کیتلی میں نیم کی پتی ابلتی رہتی تھی۔ جھاڑو سے کوڑا کرکٹ جمع کر کے کیتلی کے لیے ایندھن فراہم کیا جاتا۔ چیر پھاڑ سے پہلے آج کل بہت سے بے معنی تکلفات کیے جاتے ہیں۔ ایک دن پہلے سے جہاں نشتر لگنا ہوتا ہے اس کی مالش اور دستار بندی کی جاتی ہے۔ پھر مارفیا کا انجکشن دیا جاتا ہے پھر ایک ناپ ہر قسم کے معائنے کرواتے ہیں۔ میز پر لٹانے کے بعد کلوروفارم سنگھاتے ہیں اور پھر جو چاہے کرتے ہیں۔ ہمارے دیہاتی ہسپتال میں یہ تکلفات کہاں!

بھگا مریض کے پاس آیا۔ املی کے درخت (جہاں کیتلی تھی) کی جڑ پر لٹا کر زخم کا معائنہ کیا۔ پھوڑا نرم نہ ہوا تو دبا دبا کر اسے دیکھا۔ پھر پلٹس بنا ڈالا اور جو کچھ مقویات برآمد ہوئے اُسے مریض ہی کے میلے کچیلے انگرچھے سے صاف کر دیا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آگئے۔

مریض کراہا۔ ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگایا اور بھگا نے کیتلی سنبھالی۔ ڈاکٹر صاحب کلوروفارم یا بے ہوشی کی سنگھانے کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے بھئی کلوروفارم میں جھگڑا ہی جھگڑا ہے۔ اول تو حاکم لوگ اس کا حساب مانگتے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا اثر بعد میں ایسا خراب پڑتا ہے اور درد سر کی وہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ گنوار لوگ ڈاکٹر کو گدھا سمجھنے لگتے ہیں اور ان کو انگریزی دوا سے نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک گاؤں میں میں نے کلوروفارم استعمال کرایا تھا۔ مریض بے ہوش ہوا تو اس کے رشتہ داروں نے ڈنڈا سنبھال کہنے لگے۔ تو نے ہمارے چاچا کی جان لے لی۔ بڑی مشکل سے میری جان بچی۔ اس کے بعد جب چاچا ہوش میں آئے تو کچھ ایسی کرنے لگے کہ بھتیجوں کو خیال ہوا انہیں نے کوئی آسیب کر دیا۔ جب تک ان کا درد سر اور متلی نہ گئی میں اپنے گھر میں رہا۔ تو بھئی اب اس جھگڑے میں کون پڑے۔

اب کلوروفارم کا بدل ملاحظہ فرمائیے۔ مریض کی ران میں پھوڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بات کرتے کرتے ایک قہقہہ لگایا اور آناً فاناً اس کی دونوں ٹانگیں اپنی ٹانگوں کے شکنجے میں کس لیں۔ بھگا نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ پہلے مریض منت سماجت کرتا رہا اور ڈاکٹر صاحب بھی نرم نرم باتوں سے اس کو تسکین دیتے اور برابر یہی کہتے رہے کہ پھوڑا دیکھ رہا ہوں کچھ کروں گا نہیں۔ اتنے میں جیب سے نشتر نکالا اور ایک قہقہہ لگا کر ہاتھ مارا تو ہاتھ اور دونوں پھوڑے میں تیر گئے۔ مریض نے چیخ ماری اور ڈاکٹر صاحب کو گالی دینی شروع کی اور ان تمام گالیوں کو جو کھیت جوتتے وقت بیلوں کو دیتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اور بھگا کی گرفت ایسی نہ تھی کہ اس کی ایک بوٹی بھی کہیں سے جنبش کر جاتی۔ پاس ہی کیتلی رکھی تھی۔ اسے جلدی سے زخم پر انڈیل دیا اور مریض کی لنگوٹی سے زخم کو باندھ دیا۔

اس دوران میں مریض کی گالی، ڈاکٹر صاحب کا قہقہہ، رشتہ داروں کی چیخ پکار، ایک ایسا سماں تھا جو اب بھی سیلون کے زنانے میں تھرڈ کلاس کے مسافروں میں نظر آجاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فارغ ہوئے اور ایک ہلکی سی چپت مریض کو رسید کرکے قہقہہ لگاتے ہوئے کھڑے ہوئے اور بولے بھاگ جاؤ چنگے ہوگئے۔ مریض اور رشتہ داروں نے دُعا دینی شروع کی اور ڈاکٹر صاحب نے کیتلی کے بقیہ جوشاندہ سے ہاتھ اور نشتر دھوکر ہسپتال کا رستہ پکڑا۔ بعد میں زخم کی ڈریسنگ بجھاتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ جب تک نیم کا جوشاندہ اور بجھا کی خدمت ہے زخم خراب نہیں ہو سکتا۔

طنز و مزاح پارے

رشید احمد صدیقی

* "دیہاتی سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے۔ اِلّا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت حی و قائم ہے اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے، اِلّا عورت۔ دیہاتی عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے اور شہری آلۂ تفریح۔ دیہاتی کے نزدیک عورت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور کشاکشِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تازہ دم ہو کر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک عضویاتی ضرورت ہے یا ایک وسیلۂ تفریح۔ جس کے لیے اس نے چوپائی اپسایا لو تعمیر کیا ہے۔"
* میرا کہنا یہ ہے کہ بھیک مانگنے میں کبھی کچھ کم سلیقے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ بھیک اس طرح مانگیے کہ لوگ چندہ مانگنا سمجھیں۔ یا ہیری اس طرح کریئے کہ لوگ سمجھیں مذاق یا قوم کی خدمت کر رہا ہے یا قرض اس طرح مانگیے کہ لوگ سمجھیں ملک خطرہ میں ہے یا بیک وقت سب کچھ ہو رہا ہے اور ہم آپ سمجھیں ترقی پسند ہے۔

(کیا کیا نہ کیا دولت کی خاطر)

لطائفِ رشید

سلیمان اطہر جاوید (ڈاکٹر)

• پروفیسر ابوبکر احمد حلیم کسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ رشید صاحب ہمیشہ عید پر ان کے مکان پر ملاقات کو جایا کرتے تھے۔ جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد کسی کو اطلاع دیے بغیر وہ لکھنؤ چلے گئے۔ دو دن بعد بقر عید تھی۔ رشید صاحب حسب معمول عید ملنے ان کی کوٹھی پر گئے، تو لائبریری کے ایک کارکن مشتاق حسین صاحب نے بتایا کہ حلیم صاحب تو لکھنؤ گئے ہیں۔ رشید صاحب نے کہا: وہ اپنی خو بدل لیں، لیکن مشتاق صاحب، آپ گواہ رہیے کہ ہم نے اپنی وضع نہیں بدلی۔

• ایک خاتون جو رشید صاحب کی بہت مداح تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملاقات کو آئیں۔ دوران گفتگو میں کہنے لگیں: میں آپ کو اس وقت سے جانتی ہوں، اور جب ہی سے پسند بھی کرتی ہوں، جب ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ رشید صاحب نے فوراً جواب دیا، غضب کیا آپ نے کہ مجھے جانتی تو آپ شادی سے قبل تھیں، اور ملاقات کو اب اس وقت آئیں، جب آپ کی شادی ہو چکی۔

• حکیم عبداللطیف اور رشید صاحب نینی تال میں تھے۔ شام کے وقت سیر کو نکلے، تو کچھ دیر سستانے کو ایک جگہ ٹھہر گئے۔ ان سے بلندی پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے دو چار کنکر لڑھک کر نیچے آئے، ان میں سے ایک رشید صاحب کے چشمے پر لگا۔ رشید صاحب نے حکیم صاحب کو مخاطب کر کے کہا: حکیم صاحب، آپ نے کچھ کیا ہو، تو کیا ہو، لیکن سنگسار میں کیا جا رہا ہوں۔

ظہیر احمد صدیقی (پروفیسر)

• ایک افسانہ نگار کو اپنے افسانے پڑھ کر سنانے کا بے حد شوق تھا، اگر افسانہ مکمل نہ ہو تو پلاٹ ہی سنا دیتے تھے۔ ایک دن وہ رشید صاحب کو اپنے ایک افسانے کا پلاٹ سنا رہے تھے۔ ان کا تکیہ کلام تھا: "دیکھا آپ نے" "دیکھا آپ نے" جسے وہ بار بار دہراتے جاتے تھے۔ رشید صاحب حسب معمول پان کھا رہے تھے اور سر جھکائے کچھ ... میں مشغول تھے، اور یہ صاحب اپنا پلاٹ سنا رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔

"ایک سنسان بیابان تھا (دیکھا آپ نے) رات کا سناٹا، ہُو کا عالم ......
(دیکھا آپ نے) اس سناٹے میں ایک اُلّو اڑا (دیکھا آپ نے)

رشید صاحب نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور کہنے لگے: "جی ہاں، حضرت! دیکھ رہا ہوں"۔

● علیگڑھ کی نمائش کے مشاعرے کی صدارت گوپی ناتھ امن لکھنوی فرما رہے تھے۔ طلبہ اور ایک شاعر میں جھڑپ ہو گئی، جس کی وجہ سے مشاعرے میں یک گونہ بدمزگی اور انتشار پیدا ہو گیا۔ جب دوسری مرتبہ امن صاحب علیگڑھ تشریف لائے، تو گفتگو کے دوران میں رشید صاحب نے ان سے دریافت کیا: "امن صاحب! آپ یہاں کے لڑکوں کے رویّے سے کچھ آزردہ تو نہیں ہوئے؟" امن صاحب نے جواب دیا: "جی نہیں آزردگی کی کیا بات ہے، ابھی حال میں میرٹھ کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا، وہاں اس سے بھی بڑھ کر بدنظمی دیکھی"۔
بیساختہ رشید صاحب نے ہنس کر کہا: "سچ ہے جہاں اس طرح کا آشوب نمایاں ہو، وہیں امن کی ضرورت ہوتی ہے"۔

● بیگم ممتاز حیدر صاحبہ (پرنسپل گرلز کالج، علیگڑھ) نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ گرلز کالج کی میٹنگ کے لیے تاریخ مقرر کر دیں۔ رشید صاحب نے جواب میں لکھ دیا کہ "تاریخ تو لڑکی والوں کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے، آپ مجھ سے تاریخ کے تعیین کا اصرار کر رہی ہیں"۔

● رشید صاحب کے پاس یونیورسٹی کے کچھ ممبرانِ اسٹاف بحث کرتے ہوئے آئے۔ بحث اس مسئلہ پر تھی کہ ایک عورت کا اگر پہلا شوہر طلاق دے دیتا ہے، یا وہ مر جاتا ہے اور عورت دوسری شادی کر لیتی ہے، تو اس عورت کے پہلے اور دوسرے شوہر کا آپس میں کیا رشتہ ہوگا۔ رشید صاحب نے برجستہ جواب دیا "ہم زلف کہیے"۔

حشمت حسین عثمانی۔

غالباً ۱۹۳۴ء کے جاڑوں کی ایک رات تھی۔ علیگڑھ میونسپل ہال میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جگر مرادآبادی کی آمد آمد تھی، اور مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ بدنظمی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ جلسہ کی صدارت رشید احمد صدیقی صاحب فرمائیں گے اور حضرت جگر مرادآبادی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ اس کے بعد چند مقامی اور بیرونی شعرا کا نام ان کے مدارج کی ترتیب سے پکارا گیا۔ مگر مجمع کو قرار نہ تھا، جو جگر صاحب کا کلام سننے کے لیے بے تاب تھا۔ یہاں تک کہ لوگ فرش پر بیٹھے رہنے کے بجائے کھڑے ہو گئے، جس سے صاحبِ صدر و شعرا نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ قریب تھا کہ مجمع بے قابو ہو جاتا۔ اتنے میں رشید صاحب نے مائکروفون اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: "حضرات! جگر صاحب آ گئے ہیں اور وہ میری تحویل میں ہیں۔ وہ ضرور آپ کو اپنا کلام سنائیں گے، بشرطیکہ آپ میری بات سنیں۔" اس پر مجمع خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رشید صاحب نے اپنے خصوصی انداز میں حاضرین کو محبت آمیز لہجہ میں سرزنش کی اور علیگڑھ کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نظم و ضبط کی اپیل کی۔ فرمایا: "دنیا میں دو ہستیاں شاید سب سے زیادہ قابلِ رحم ہوتی ہیں، ایک بارات کا دولہا اور دوسرا مشاعرہ کا صدر۔ پہلی حالت سے گزر چکا ہوں، مجھ پر گزر چکی اور خدا نہ کرے دوبارہ گزرے۔ دوسری حالت سے آج دوچار ہوا ہوں۔ آپ نے مجھ جیسے [illegible] کو مشاعرے کی صدارت کے لیے نامزد کر کے دانشمندی یا غیر دانشمندی کا ارتکاب کیا ہے، اس سے اب مفر ممکن نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ میرے صبر اور اپنے سکون کو مزید امتحان و خطر میں نہیں ڈالیں گے۔" اس کے بعد جگر صاحب سے خاص فرمائش کر کے ان کی ایک مشہور غزل سے مشاعرے کا آغاز کرایا۔ مگر یہ اجتماع کی

ابن حسین نوقلمونی کے ساتھ جب معرکۃ الآرا مشاعرہ اختتام پذیر ہوا، تو لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ پہلے کبھی اتنا مشکل کر حاصل مشاعرہ صدر کی تقریر تھی یا شعرا کا کلام۔

● رشید صاحب کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیش رو صدر شعبہ مولانا احسن مارہروی تھے۔ مولانا حضرت داغ کے شاگرد عزیز اور ان کے لوازمتوں میں شمار ہوتے تھے۔ جب مولانا کے انتقال کی خبر رشید صاحب کو ملی، تو بے اختیار فرمایا:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔ اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

اور طلبا بھی ان کے ساتھ آبدیدہ ہو گئے۔

● ان کے ایک شاگرد رشید نے لوپر کا مخملی جوتا بنوا کر لائے اور بڑی عقیدت و احترام سے خود انھیں پہنانے لگے شاگرد نے احتراماً کہا کہ پاؤں تک مشکل رسائی ہوئی ہے، محروم نہ کیجیے۔
رشید صاحب نے برجستہ فرمایا: "سر حاضر ہے"۔

● عید کی تہنیت کے لیے لوگ رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے اور رشید صاحب انھیں مٹھائی، سویاں اور پھل پیش کر رہے تھے۔ ایک صاحب کی نگاہ سنگتروں پر تھی مگر وہ اُسے اٹھانے میں پس و پیش کر رہے تھے کیونکہ وہ کچھ ترش قسم کے معلوم ہوتے تھے۔ رشید صاحب نے فرمایا: کھانے والے کا احسان ہوگا میرے اوپر، شوق فرمائیے۔

محمد حسن (پروفیسر)

علی گڑھ میگزین (اردو) کے ایک مدیر خاصے بدخط تھے۔ انھوں نے اداریہ لکھ کر رشید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ رشید صاحب نے جہاں تہاں سے دیکھا، کچھ ترمیم اور اضافے کے بعد انھیں واپس کر دیا اور لکھ بھیجا:
"اداریہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن جناب! یہ آپ پاؤں سے لکھنے کی عادت کب چھوڑیں گے؟"

● انھیں مدیر نے علی گڑھ میگزین کے مندرجات کے ذرا شاعرانہ عنوانات فہرستِ مضامین میں تجویز کیے تھے، مثلاً منظومات کے حصے کا عنوان تھا "گل پیرہن" اسی طرح دوسرے عنوانات بھی خاصے شاعرانہ تھے۔
رشید صاحب نے ان تمام عنوانات کو قلم زد کر دیا اور کہا "اور تو سب ٹھیک ہے، لیکن یہ طوائفوں کے سے نام بدل دیجیے"۔

● ڈاکٹر عبدالعلیم، شعبۂ عربی و علوم اسلامیہ کے صدر تھے۔ علیم صاحب لینن کی سی مختصر ڈاڑھی رکھتے تھے، اور یہ ڈاڑھی ان کی شخصیت کا جزو ہو گئی تھی۔ علیم صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں مقنن اور یونی ورسٹی کے معاملات میں قانون داں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ایک دن میں نے رشید صاحب کی موجودگی میں علیم صاحب سے پوچھا: "یہ آپ کو قانون سے دلچسپی کیسے اور کب سے پیدا ہو گئی؟"
علیم صاحب بتانے لگے "میرے والد وکیل تھے، وہ صرف ایسے مقدمات لیتے تھے، جن کے بارے میں انھیں یقین ہو کہ ان کا مؤکل حق پر ہے۔ جب میں بچہ تھا۔۔۔"
رشید صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "آپ کبھی بچے بھی تھے؟"
یہ جملہ اس وجہ سے بڑا برمحل تھا کہ علیم صاحب کم سخنی، سنجیدگی اور وقار کا مجسمہ تھے۔

● حیدرآباد کی رضاکار تحریک کے رہنما قاسم رضوی کبھی علی گڑھ کے طالب علم رہے تھے اس زمانے میں

رشید صاحب فارسی پڑھانے پر نئے نئے مامور ہوئے تھے۔ پہلے ہی کلاس میں قاسم رضوی سے سابقہ پڑا۔ رشید صاحب عرفی یا انوری کا قصیدہ پڑھانا شروع کیا۔ مطلع ہی پڑھا تھا کہ قاسم رضوی نے مطالبہ کیا کہ اس شعر کی تقطیع کیجیے۔ رشید صاحب کو برا لگا کہ اس شخص کو معلوم ہے کہ عروض وغیرہ سے میں دور بھاگتا ہوں، پھر اس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ میرا پہلا کلاس ہے اور اس طرح کسی کو تنگ کرنا علی گڑھ کے شیوے کے خلاف ہے مگر انھوں نے بے تامل تقطیع کر دی: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ قاسم رضوی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ رشید صاحب نے سوال کیا: "آپ مطمئن ہو گئے؟" قاسم رضوی نے کہا: "جی ہاں"

رشید صاحب نے کہا "ویسے جو تقطیع میں نے کی، وہ غلط تھی"۔ اس پر زبردست قہقہہ پڑا اور قاسم رضوی ایسے شرمندہ ہوئے کہ دوبارہ کلاس میں کبھی تنگ نہ کیا۔

۰ رشید صاحب سے ایک بار میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک بڑے شاعر کی کیا پہچان ہے؟"

: "جو شاعر خدا سے جتنا بے باک اور عورت سے جتنا محتاط ہو، وہ اتنا ہی بڑا شاعر ہے"

● علی گڑھ میں ایک زمانے میں استاد چھوارا کے نام سے ایک شخص ہوتے تھے۔ موزوں طبع تھے۔ کچھ آمد بھی تھی، کچھ وضع قلندرانہ تھی، مفلوک الحال رہتے تھے مگر ہر مشاعرے میں ضرور پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار مشاعرے سے نکل رہے تھے، رشید صاحب نے پوچھا: "استاد! آپ نے کلام نہ سنایا؟"

انھوں نے ازراہِ انکساری کہا: "بھلا، ہم جاہل کیا کلام سناتے؟" رشید صاحب نے کہا: "نہیں استاد، کبھی کبھی جاہل بھی بڑی بات کہہ جاتا ہے"۔ استاد نے برجستہ کہا: "آپ نے کیا پتے کی بات کہی ہے"

ایک خاتون کا ناول چھپ کر آیا، نام تھا: "راہِ عمل" کہنے لگے: "لیجیے، اب عورتیں بھی راہِ عمل دکھانے لگیں"

اقبال علی گڑھ آئے، تو رشید صاحب نے پوچھا: حضرت، اگر ایک دور میں دو مردِ مومن پیدا ہو جائیں تو ...؟"

ایک صاحب زادے نے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ شیروانی کے بٹن ٹوٹے رہتے تھے، پاجامہ میلا اور سلوٹوں بھرا ہوا، ڈاڑھی کے بال پریشان، ٹوپی مڑی تڑی۔ بار بار وہ کلاس میں آتے جاتے، رشید صاحب کے سامنے سے گزرتے تھے۔ ایک دن رشید صاحب نے انھیں بلایا اور کہا: "حضرت! اس قسم کے لباس پر میرا کاپی رائٹ ہے۔ اسے صرف میں پہن سکتا ہوں۔ آئندہ آپ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آیا کریں"۔

ایک مصنف شکار کے افسانے لکھا کرتے تھے۔ کسی شکار سے واپس آئے تھے اور رشید صاحب کو اپنی مہم کا حال سنا رہے تھے۔ بال خشک اور بکھرے ہوئے، خط بڑھا ہوا، چہرے مہرے اور لباس سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی شکار سے لوٹے ہیں۔ رشید صاحب گردن جھکائے نہایت صبر و سکون سے ان کے قصے سن رہے تھے۔ دورانِ گفتگو انھوں نے پوچھا: "رشید صاحب، کیا آپ نے کبھی پہاڑی الو دیکھا ہے؟"

رشید صاحب نے گردن اٹھائی اور انھیں غور سے دیکھا: "جی نہیں! دیکھ رہا ہوں"۔

● عصمت چغتائی ایک دفعہ ان سے ملنے آئیں۔ رشید صاحب کھرپی لیے گلاب کے پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہ سمجھیں کہ کوئی مالی ہے۔ ان سے کہا رشید صاحب سے کہو، انھیں اطلاع کر دو۔ رشید صاحب اسی طرح کھرپی ... اندر تو خیال ... یہ کہتی ... شاید ابھی سے آپ ہیں؟ رشید صاحب نے کہا: یوں تو اس گھر میں سب سے پرانا مالی یہی ہوں؟

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی سرگرمیاں

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی تشکیل حکومت نے [illegible] ۱۹۷۵ [illegible]
آندھرا پردیش [illegible]
[illegible] شکل دی گئی ہے۔

مخدوم ایوارڈ [illegible] ۱۹۹۳ [illegible]
پر مشتمل ہے۔

مجموعی خدمات پر انعامات: [illegible]
مطبوعات پر انعامات: سال ۱۹۹۳ میں شائع شدہ (۷۲) مطبوعات پر ۳ لاکھ ۲۶ ہزار اور ۱ ہزار روپے کے انعامات [illegible]
سال ۱۹۹۴ کی مطبوعات پر انعامات کا ابھی اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

مسودات پر مالی اعانت: ریاست کے (۳۰) سے زائد مصنفین کے مسودات کی اشاعت کے لیے ۱۹۹۳ میں [illegible]
روپے فی کس کے حساب سے تقریباً [illegible] لاکھ روپے کی اعانت دی گئی۔ ۱۹۹۴ کے لیے ابھی اعلان نہیں کیا گیا۔

رسائل و جرائد کی مالی اعانت: ۱۹۹۳ء میں سب رس (۱۲) ہزار، شگوفہ (۷) ہزار، ادیب کی کائنات (۵) ہزار، ہمارے نونہال [illegible]
اور شاداب کو (۲) ہزار روپے کی مالی اعانت دی گئی۔

عوامی لائبریریوں کے لیے اعانت: ریاست کی تقریباً (۴۰) لائبریریوں کو ۱۹۹۳ء میں فی لائبریری (۱) ہزار اور (۴۰۰) روپے کے
حساب سے بہ شکل کتب امداد دی گئی۔ ۱۹۹۴ء کے لیے ابھی اعلان نہیں کیا گیا۔

میرٹ اسکالرشپ: ریاست کے اردو ذریعۂ تعلیم اور اردو زبان اول یا دوم کے پہلی تا پی ایچ ڈی کے (۱) ہزار سے زائد طلبہ و
طالبات کو ۱۹۹۳ء میں (۲۶۲) لاکھ روپے کے اسکالرشپ دیئے گئے۔ ۱۹۹۴ء میں ۳½ لاکھ روپے کے اسکالرشپ دیئے جا رہے ہیں۔

اردو خبر رساں ایجنسیوں کی اعانت: اردو کی (۷) خبر رساں ایجنسیوں کو علامتی امداد کے طور پر ۳۰ ہزار روپے کی اعانت
دی گئی جو اردو صحافت کی غیر معمولی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۹۴ء کا اعلان ابھی نہیں کیا گیا ہے۔

اردو کمپیوٹر کورس: اردو کمپیوٹر کورس کا ماہ فروری ۹۴ سے (۴) بیاچس کے ساتھ آغاز ہوا تھا اور (۴۸) طلبہ و طالبات کمپیوٹر کے
(۸) بیچس بشمول اردو کمپوزنگ میں (۶) ماہ کی تربیت مکمل کر چکے ہیں۔ مزید (۴۸) طلبہ و طالبات کے (۴) بیچس کا نومبر ۹۴ سے آغاز
ہو چکا ہے۔ ماہ مئی کے وسط میں پہلے بیاچ کے تربیت یافتگان کو صداقت نامے عطا کئے جا رہے ہیں۔

اردو ٹائپ رائٹنگ کورس: گزشتہ دو سال میں تقریباً (۵۰) طلبہ و طالبات لوئر و ہائر کے امتحان میں شرکت کر چکے ہیں۔ اس سال (۴) طلبہ شرکت کر [illegible]

تلگو اردو ڈکشنری: اردو اکیڈمی نے تلگو۔ اردو ڈکشنری کی تیاری، طباعت و اشاعت کا اہم کام شروع کیا ہے۔ تقریباً ۲۷ ہزار
الفاظ کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ۵۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ڈکشنری شائع کرنے کا پروگرام ہے۔

سرگرمیوں کی غیر مرکوزیت: اردو اکیڈمی کی سرگرمیاں صرف شہر حیدرآباد تک محدود نہیں بلکہ اس کے (۳) علاقائی اور (۱۱) ضلعی مراکز
سارے ریاست میں موجود ہیں۔ حکومت کی خواہش پر اکیڈمی نے حیدرآباد اور بعض اضلاع اردو بھون کی تعمیر کا کام بھی شروع کیا ہے۔

جاری کردہ: شعبۂ تعلقات عامہ اردو اکیڈمی، 11-4-637 لے کی کارڈس حیدرآباد – 500004 فون 314236

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

ہیڈ آفس: 4-1-022/5 ۔ سکریٹریٹ ... اسٹیٹ، عابد روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلائے جانے والے ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات دو اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت سے کاروبار کرنے کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سائیکل ایجنسی، ہینڈلوم، ترکاری فروشی، بیمہ فروشی، الیکٹرک کا کاروبار وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ... کارپوریشن سے دیا جاتا ہے۔ اور اس کو بینک آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور ما باقی بینک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھاپہ خانہ پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرض دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 4 فیصد پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا (2) اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لیکر 30 نومبر ۹۵ء تک 57,567 افراد میں 12,58,37,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت [illegible],85,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال ۹۶-۹۵ سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 686 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 69,21,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 2,27,44,000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن ۹۳ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 15 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر میں، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشن، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ، وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹرس پر بھی کام کررہی ہیں۔

خواہش مند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

کے۔ عبدالحق

مینیجنگ ڈائرکٹر۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ——— (اداریہ)

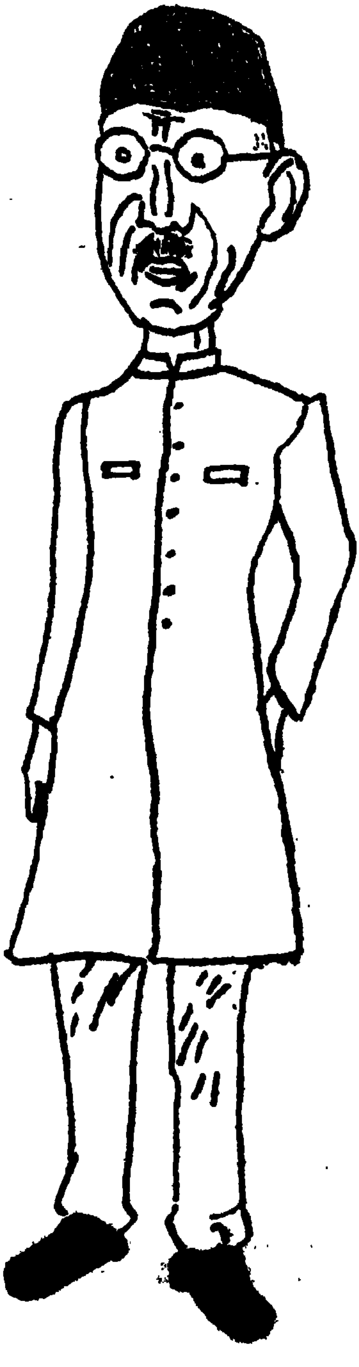
رشید احمد صدیقی اردو طنز و مزاح کا معتبر اور اہم نام ہے۔ انھوں نے اردو میں پہلی بار طنز و مزاح کی جامع تعریف لکھی اور اس کی ذیلی شاخوں کی نشاندہی کی۔ ایک طرف اس فن کے رموز اور امکانات سے آگاہ کیا دوسری جانب نثری طنز و مزاح کو اپنی تحریروں کے ذریعہ ادبی معیار اور وقار عطا کیا۔ ان کے مضامین میں خالص ظرافت نہیں بلکہ زیرلب تبسم پیدا کرنے والی شگفتگی ملتی ہے۔ ان کی تحریریں ایک ذہین و فطین ادیب کے بصیرت افروز خیالات ہیں جن میں فکر کی گہرائی کے ساتھ کلاسیکی رچاؤ، اور اعلیٰ سماجی اخلاقی و تہذیبی اقدار سے گہرا رشتہ ملتا ہے۔ گنجہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ میں شامل خاکوں اور ذاکر صاحب کے علاوہ چیدہ چیدہ مختلف احباب پر لکھے گئے خاکوں کے توسط سے خود رشید احمد صدیقی کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے خاک اڑانے کے لیے بھی خاکے نہیں لکھے خاکے ہوں کہ انشائیے ان کی تحریروں میں ایک عجب شائستگی، بردباری اور رچی ہوئی ظرافت اور ادبی شان نظر آتی ہے۔ ہمارے لیے ضروری تھا کہ رشید احمد صدیقی جیسے صاحب طرز ادیب کی شخصیت اور فن کو ایک خصوصی شمارے کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کرتے اور اس طرح رشید احمد صدیقی کی صد سالہ سالگرہ کے پروگراموں میں شریک ہوتے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے بروقت اس ذمہ داری کا احساس دلایا۔

شگوفہ کے پہلے شمارہ سے ہی اطہر صاحب کا قلمی تعاون ہمیں حاصل ہے اور انھوں نے اسے ہمیشہ اپنا رسالہ سمجھا۔ اپنے ہی جریدہ کا مہمان مدیر بننا انھیں گوارا نہ تھا لیکن میرے اصرار پر یہ رول بھی نبھانے کے لیے وہ تیار ہو گئے۔ پروفیسر سلیمان اطہر کا میں ممنون ہوں کہ اپنی شدید مصروفیات کے باوجود انھوں نے اس خصوصی نمبر کے لیے کافی مواد فراہم کیا۔ اور مشوروں سے نوازا۔ بیرون ملک ترسیل کی مشکلات کی وجہ سے ہم رسالہ کی ضخامت میں اضافہ نہ کر سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔

○ شگوفہ کا آئندہ شمارہ سالنامہ ہوگا جو یکم فروری کو شائع ہوگا ۱۹۹۶ء کے لیے سالانہ زرخریداری ایک سو روپیہ ہوگی۔

■■

رشید احمد صدیقی



۱۸۹۲ء ۲۴ر دسمبر پیدائش بمقام مڑیاہو

۱۹۱۴ء انٹرنس امتحان کی کامیابی اور سیول کورٹ میں ملازمت۔

۱۹۱۵ء ایم اے او کالج میں شرکت

۱۹۱۷ء ایم اے او سے انٹرمیڈیٹ میں کامیابی

۱۹۱۹ء ایم اے او (الہ آباد یونیورسٹی) سے بی اے

۱۹۲۱ء ایم اے او (الہ آباد یونیورسٹی) سے ایم اے فارسی

۱۹۲۰ء ـ ۲۲ ایڈیٹر علی گڑھ میگزین

۱۹۲۱ء ـ ۵۸ اسسٹنٹ کیپر اور کیپر ڈیوٹی سوسائٹی علی گڑھ

۱۹۲۱ء لکچرر اردو فارسی علی گڑھ یونیورسٹی

۱۹۲۳ء شادی

۱۹۲۶ء "سہیل" کا اجرا

۱۹۳۴ء ۱۷ر اگست سے ریڈر شعبہ اردو علیگڑھ مقرر

۱۹۳۵ء اپنے مکان کی تعمیر

۱۹۴۰ء "خنداں" کی اشاعت

۱۹۴۱ء "مضامین رشید" کی اشاعت

۱۹۴۲ء اُردو کانفرنس حیدرآباد کی صدارت

۱۹۴۸ء ـ ۶۶ نائب شیخ الجامعہ، جامعہ اردو علی گڑھ

۱۹۵۴ء پروفیسر کے عہدہ پر ترقی

۱۹۵۵ء 'جدید غزل' کی اشاعت

۱۹۵۸ء لڑکی اسما کا انتقال

۱۹۵۸ء 'آشفتہ بیانی میری' کی اشاعت

۱۹۵۸ء یکم مئی وظیفہ پر علٰحدگی

۱۹۶۰ء ڈائرکٹر ریڈنگ میٹریل پروجکٹ، مسلم یونیورسٹی

۱۹۶۳ء پدما شری کا اعزاز

۱۹۶۶ء ـ ۷۲ شیخ الجامعہ، جامعہ اردو

۱۹۷۱ء ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ

۱۹۷۳ء یوپی اردو اکیڈمی اوارڈ

۱۹۷۶ء اعزازی ڈاکٹر جامعہ اردو علیگڑھ

۱۹۷۶ء اعزازی ڈی لٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۹۷۷ء ۱۵ر جنوری اِنتقال بمقام علیگڑھ

دی چار مینار کوآپریٹو اربن بینک لمیٹڈ حیدرآباد

چار مینار کوآپریٹو بینک مختصر عرصہ میں حیدرآباد و سکندرآباد کے ممتاز بینکوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ تا حال ۳۵ کروڑ روپے سے زائد ڈپازٹ اکٹھے کئے جا چکے ہیں جو ایک قابل فخر اعزاز ہے۔ اس بینک کے جملہ چھے (۶) برانچس شہر کے مختلف اہم مقامات پر برسرکار ہیں۔ تمام برانچوں میں این۔آر۔آئی کھاتوں کی سہولت موجود ہے۔ تا حال این۔آر۔آئی ڈپازٹس ۴ کروڑ تک پہنچ چکے ہیں۔

- چار مینار کوآپریٹو بینک تمام قومیائے ہوئے بینکوں سے زائد شرح سود ادا کرتا ہے۔
- مزید تین برانچس مانصاحب ٹینک، ملے پلی، ہارکس پر عنقریب کھولی جائیں گی۔

مزید تفصیلات کے لئے مندرجہ ذیل کسی بھی برانچ سے ربط پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہیڈ آفس:
22-7-387/4
پرانی حویلی حیدرآباد
Tel: 523785 Fax 91-840-565913

۲۔ سلطان شاہی برانچ
22-2-445
مغل پورہ۔ حیدرآباد

۳۔ بھولک پور برانچ
1-7-166
مشیرآباد۔ حیدرآباد

۴۔ محبوب چوک برانچ
21-2-409/12
سٹی مارکٹ لاڈ بازار۔ حیدرآباد

۵۔ ٹولی چوکی برانچ
9-4-64/8
حکیم پیٹ روڈ۔ ٹولی چوکی۔ حیدرآباد

۶۔ اعظم پورہ برانچ
16-7-385/1
اعظم پورہ۔ حیدرآباد

170673
14.10.9?

ابراہیم علی خاں
منیجنگ ڈائرکٹر

کاظم نواز جنگ
چیرمین



..N.No. 15622/68 | **SHUGOOFA** | Postal Regd. No.H/HD-6
Vol. 28 Copy 12 | **HYDERABAD** | RASHEED SIDDIQUI NUMBER
Phone : 595716